شمشیر کا قرض



شمشیر کا قرض

خان آصف



القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 , 042-37668958
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

خوب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت
جدت اور معیار کے ساتھ

باہتمام.....محمد علی قریشی

باراوّل............... 2012ء
مطبع............... نیئر اسد پریس لاہور
کمپوزنگ............... کلائکس گرافکس
قیمت............... -/500 روپے

پیش لفظ

ظہیر الدین بابر تاریخ کا ایک روشن باب اور عزم و ہمت کی چٹان تھا۔ جس نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ماضی کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو منگولوں کے اس فرزندِ جلیل نے اپنے آباء و اجداد کی تاریخ ہی بدل ڈالی۔

والدِ گرامی خان آصف کی زیرِ نظر تحریر ازبکستان کے شہر فرغانہ میں پیدا ہونے والے اسی عظیم الشان شہنشاہ کے حالاتِ زندگی، جدوجہد اور فتوحات کے بارے میں ہے۔ یہ وہی شہنشاہ ذی وقار تھا جس کے بزرگوں نے ظلم و ستم کی لاتعداد فصلیں بوئیں۔ مگر اُس نے اپنے حُسنِ سلوک اور اعلیٰ ظرفی سے مطلق العنان شہنشاہیت کے معنی ہی بدل ڈالے۔

بابر وہ حکمراں تھا جس نے اپنے دشمنوں سے شمشیر و سناں کے لہجے میں وہ گفتگو کی، جو تاریخِ انسانی کبھی فراموش نہیں کر پائے گی۔ وہ جسموں کا ہی نہیں، دلوں کا بھی فاتح ٹھہرا۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ وہ سیّد مہدیؒ جیسے مردِ قلندر کی دعاؤں کا ثمر تھا۔ جنہوں نے بارگاہِ ذوالجلال میں وارثِ فرغانہ کی پیدائش کے لئے دن رات دعائیں کی تھیں۔ اور جس کے سر پر حضرت موسیٰ عاشقانؒ جیسے مردِ روشن ضمیر کا دستِ شفقت تھا۔ آپ کی دعاؤں اور محبتوں کے سائے میں رہ کر اُس نے ان گنت فتوحات حاصل کیں۔ اُس کے گنتی کے مغل شہ سواروں نے پانی پت کی تاریخی جنگ میں عظیم الشان فتح حاصل کی۔

اُسی مردِ حق کی دعا سے بابر نے کفر کی سرزمین پر اللہ کا گھر تعمیر کر کے عہدِ وفا نبھایا۔ جو ''بابری مسجد'' کے نام سے آج بھی ہندوستان کی سرزمین پر موجود ہے۔

والدِ محترم کی یہ تاریخی تحریر آج محمد علی قریشی صاحب کی گراں قدر کوششوں اور بے حد اصرار پر کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ اور اُن کی اس کوشش کے لئے میں اُن کی دل سے مشکور و ممنون ہوں۔

(اسماء خان آصف)

سمرقند کے ایک سرسبز و شاداب گوشے میں ایشیا کے عظیم فاتح امیر تیمور کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا تھا۔ صاحبقراں کا مدفن صناعی اور دلکشی کا بہترین نمونہ تھا' مگر دیکھنے والوں کو وہاں ایک ناقابل بیان ویرانی محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ امیر تیمور کے مقبرے میں سیکڑوں فانوس روشن کئے جاتے تھے' لیکن پھر بھی سمرقند کے باشندوں کو ایک عجیب سی تاریکی کا احساس ہوتا تھا۔

تیمور کا حکمراں پوتا ابوسعید مرزا چاہتا تھا کہ مقبوضہ علاقوں کے تمام لوگ صاحبقراں کے مقبرے پر ایک عقیدت خاص کے ساتھ حاضر ہوا کریں۔ ابوسعید مرزا کی اس خواہش کا ایک ہی مفہوم تھا کہ امیر تیمور مرنے کے بعد بھی عام لوگوں کی نظروں میں اس طرح محترم ٹھہرے جیسے کوئی امام یا کوئی ولی کامل۔ اس سلسلے میں ابوسعید مرزا نے حکم بھی جاری کیا تھا کہ سمرقند اور گرد و نواح کے لوگ ہفتے میں ایک دن صاحبقراں کے مقبرے کی زیارت کے لئے جمع ہوا کریں مگر مقامی آبادی نے اس حکم کا کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا تھا۔ بس سرکاری ملازمین ہی اپنے حکمراں کی خوشنودی کے لئے جھکے ہوئے سروں کیساتھ امیر تیمور کے مقبرے پر حاضر ہو جایا کرتے تھے۔

جب ابوسعید مرزا سمرقند کی رعایا کو مجبور نہ کرسکا تو اس کے ایک مصاحب حسام بیگ نے نئی چال چلتے ہوئے کہا۔

''رعایا کے جسم آپ کے تابع ہیں' مگر دل و دماغ پر شیخ احمد غیاث کی حکمرانی ہے۔''

شیخ احمد غیاث کے والد ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔ احمد غیاث نے اپنے سرمایہ دارانہ ماحول کے تقاضوں سے بغاوت کرتے ہوئے مذہبی تعلیم حاصل کی اور ہمیشہ کے لئے دنیاوی رنگینیوں سے منہ موڑ لیا۔ ان کے دن حصول تعلیم میں گزرتے اور راتیں یاد الٰہی میں' پھر جب شیخ احمد غیاث کے والد کا انتقال ہوا تو ایک بہت بڑی رقم وراثت کے طور پر ان کے حصے میں آئی۔ احمد غیاث نے حاصل ہونے والی دولت کا بڑا حصہ ایک مدرسے کی تعمیر میں خرچ کر دیا۔ اس مدرسے میں تمام طالب علم مفت تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ طالب علموں کی اکثریت مفلس و نادار بچوں پر مشتمل تھی۔ سمرقند کے بعض امراء کے بچے بھی اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جب اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں سمرقند کے امراء شیخ احمد غیاث کو معاوضہ دینے کی کوشش کرتے تو شیخ انتہائی پرجلال لہجے میں فرماتے۔ ''چند سکوں کے عوض اپنا علم فروخت نہیں کرتا یہ میرا مدرسہ ہے' اشیائے خوردنی کی کوئی دکان نہیں۔''

شیخ احمد غیاث کی اس قلندرانہ ادا نے انہیں عوام کے ساتھ ساتھ خواص کے حلقوں میں بھی معزز و محترم بنا دیا تھا۔ ابوسعید مرزا کا مصاحب خاص حسام بیگ بھی ایک بار شیخ احمد غیاث کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اس نے کسی مفلس و نادار انسان کی طرح شیخ کے حضور اپنی درخواست پیش کی تھی۔ ''حضرت! سارے عالم میں آپ کے

روحانی کمالات کا شور ہے پھر یہ ابر کرم مجھ پر کیوں نہیں برستا؟" مجھے بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اگر ایک
آپ کی نظر کرم میری جانب اٹھ جائے تو گردش وقت کے سارے انداز بدل جائیں گے اور میں آسانی
باعہ وزارت خزانہ کے منصب تک پہنچ جاؤں گا۔ شیخ بس یہی میرا ایک خواب ہے جسے دیکھتے دیکھتے آ
پتھرانے لگی ہیں۔ اگر آپ کی دعاؤں سے مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی تو آپ کے مدرسے کے نصیب
جاگ جائیں گے۔ میں اس ناپختہ عمارت کو نیا انداز تعمیر دے کر محلات شاہی کے مقابل کھڑا کر دوں گا۔"

ابھی حسام بیگ کے ان دل آزار جملوں کی گونج باقی تھی کہ شیخ احمد غیاث پر حالت جلال طاری ہو
رب بے نیاز کی قسم! اگر ابو سعید مرزا میرے روبرو یہ دعویٰ کرتا تو پھر میں اسے جواب دیتا۔ تجھ سے کیا
کروں کہ تو تو اس کی گلیوں کا خارش زدہ کتا ہے۔ فوراً اس جگہ سے اٹھ جا اور اپنے آقا کے تلوے چاٹ۔
تک کہ وقت معلوم آ پہنچے اور پھر تجھے معلوم ہو جائے کہ تقدیر کسے کہتے ہیں؟"

حسام بیگ ایک ریاکار اور کمینہ انسان تھا۔ شیخ احمد غیاث کے مکتب سے نکل کر اس نے دل ہی دل میں
کیا تھا کہ وہ سمرقند کے اس فاقہ کش درویش کو معاف نہیں کرے گا۔ آج وہی حسام بیگ بڑی عیاری کے سا
سعید مرزا کو شیخ احمد غیاث کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

"تو غلط کہتا ہے حسام بیگ" اپنے مصاحب خاص کی بات سن کر ابو سعید مرزا نے انتہائی تند و تیز لہج
کہا۔ "تو یہ کیوں بھولتا ہے کہ احمد غیاث کے باپ دادا ہمارے ارفع و اعلیٰ خاندان کے نمک خور تھے پھر احمد
اہل سمرقند کے دلوں پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں!" یہ کہتے کہتے جوش جذبات سے ابو
مرزا کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

"اپنی شمشیر آب دار کی قسم ہمارے اقتدار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ وہ کوئی گوشہ نشیں درویش
کوئی طالع آزما سیاستدان۔ اہل سمرقند کے جسموں پر ہی نہیں' دل و دماغ پر بھی ہماری ہی حکمرانی ہے۔" ابو
مرزا کے چہرے پر نخوت و غرور کا گہرا رنگ ابھر آیا تھا۔

ابو سعید مرزا ایک دنیا دار حکمراں تھا اور ہمہ وقت اپنی سیاسی فتوحات پر نازاں رہتا تھا۔ اس نے اپنی نو
کے زمانے میں کئی جنگیں لڑیں اور حیرت انگیز طور پر فتح و نصرت سے ہمکنار ہوا۔ اپنی فطری ذہانت کے سب
سعید مرزا نے حصول اقتدار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جیسے ہی فضا سازگار ہوئی' ابو سعید مرز
اپنے چچا زاد بھائیوں (مرزا شاہ رخ کے بیٹوں) کے خلاف بخارا میں علم بغاوت بلند کیا اور ایک خوا
معرکے کے بعد ان پر غالب آ گیا۔ پھر 855 میں موروثی تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ تقدیر قدم قدم پر اس کا
دے رہی تھی۔ نتیجتاً ابو سعید مرزا نے بہت ہی کم مدت میں ماوراء النہر' بدخشاں' کابل اور غزنی کو اپنے ز
کر لیا۔ پھر پورے ترکستان میں اس کا سکہ و خطبہ جاری ہو گیا اور ہندوستان کے بعض علاقے بھی اس کی
میں شامل ہو گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ابو سعید مرزا کی فوجیں عراق میں داخل ہو گئی تھیں اور اس
اقتدار کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ الغرض ان ہی پیہم فتوحات نے امیر تیمور کے پوتے کو حد سے زیادہ مغ
دیا تھا۔ جب اس کے خوشامدی مصاحب حسام بیگ نے ایک بوریا نشیں درویش شیخ احمد غیاث کی حکمرانی کا
تو ابو سعید مرزا مشتعل ہو گیا۔

"مگر احمد غیاث کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟" ابو سعید مرزا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

حسام بیگ نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے اپنی
"وہ بوریا نشیں فقیر بڑی عسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔"
چلی۔
دیجئے وہ فاقہ زدہ انسان صاحبقراں
"اس کے خالی دامن میں اپنے دست کارکشا سے چند طلائی سکے ڈال
شان میں قصیدے پڑھنے لگے گا اور پھر اہل سمرقند پر یہ راز فاش ہو جائے گا کہ امیر تیمور کس جاہ و جلال کے
تھے اور ان کی بلند اقبالی کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔ جب وہ بوسیدہ لباس فقیر فاتح عالم کی بخشی ہوئی خلعت
اپنی دستار سے امیر کی قبر صاف کرے گا تو اہل شہر یہ منظر دیکھنے کے لئے قطار در قطار اسی طرف کا رخ
یں گے اور اس طرح شاہ والا کے فرمان مقدس کی آبرو رہ جائے گی ...... ورنہ اب تو یہ صورتحال ہے کہ اگر میں
عالم کے حضور کم ذات اور بدنسب لوگوں کی باتیں دہرا دوں تو آسمان ٹوٹ پڑے گا اور گناہ گار کے ہونٹ
لرزہ جائیں گے۔" یہ کہتے حسام بیگ نے ابو سعید مرزا کے پیروں پر سر رکھ دیا ...... "اے صاحب جاہ و جلال
سے اس فرمان مقدس کی تذلیل برداشت نہیں ہوتی۔ اگر چند روز میں شاہ والا کے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی تو
وں کے دلوں سے چنگیز خان کے جانشین کی ہیبت اٹھ جائے گی اور حضور کے دشمن ناسازگار فضا سے غیر معمولی
ی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

⌑ ⌑ ⌑

سمرقند کے ایک
سپاہیوں نے ابو سعید مرزا کے حکم پر شیخ احمد غیاث کے ساتھ بڑا بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔
عالم کو ابو سعید مرزا کے سامنے پیش کرتے ہوئے پوری طاقت سے دھکا دیا گیا۔ یہاں تک کہ شیخ کی دستار کھل کر
زمین پر گر گئی اور احمد غیاث تخت کے پائے سے ٹکرا گئے۔ چوٹ کی شدت سے ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ پھر وہ
بڑی مشکل سے اٹھے اور اپنی دستار کو سر پر باندھ لیا۔
پیشانی اور رخساروں
"دیکھنے والے گواہ ہیں کہ میں خود چل کر ایک حکمراں کے دربار تک نہیں آیا ہوں۔"
سے بہنے والا خون شیخ کی داڑھی کو بھگوتا ہوا سینے پر جمتا جا رہا تھا' مگر احمد غیاث کے لہجے کی طمانیت اور ٹھہراؤ سے
ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس سنگین حادثے کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔ "تنہا اور نحیف و نزار جسم تیرے طاقتور
شہسواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے مجبور کر دیا گیا۔ پھر بھی اے ابو سعید مرزا! پورے ہوش و حواس کے
ساتھ سن لے کہ میرا کمزور جسم ضرور تیرے دربار میں موجود ہے' مگر میری روح اور میرے دل و دماغ یہاں حاضر
نہیں ہیں اور وہ حاضر ہو بھی نہیں سکتے۔ بے شک! تو نے میرے گوشت اور ہڈیوں کو اپنے حکم کی زنجیر پہنا دی'
مگر میرا ذہن اور میرا قلب ابھی تک آزاد ہیں' وہ تیری غلامی سے انکار کرتے ہیں۔"
"ہم چاہتے ہیں کہ تو صاحبقراں کے مزار کا خدمت گار بن جا اور صبح و شام اپنی دستار سے امیر عالی مقام کی
قبر پر جاروب کشی کر! ہماری دلی خواہش ہے کہ تو شب و روز امیر تیمور کی شان میں قصیدہ خوانی کرے تا کہ اہل
سمرقند کو فاتح ایشیا کی عظمتوں کا ادراک ہو سکے۔ ہم یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ ترکستان اور
دیگر ممالک کے لوگ صاحبقراں کے مزار پر اس طرح قطار در قطار آئیں جیسے وہ امام بخاریؒ کی قبر پر حاضر ہوتے
ہیں اور پھر دیکھنے والے بے ساختہ پکار اٹھیں کہ دنیا میں صاحبقراں سے بڑا کوئی فاتح نہیں۔"
ابو سعید مرزا کا خیال
ابو سعید مرزا کے ذہن میں پیدا ہونے والا شیطانی وسوسہ اس کی زبان تک آ گیا تھا۔
میں انہیں
الفاظ سن کر شیخ احمد غیاث لرز اٹھے۔ "ابو سعید مرزا تیرے سپاہیوں نے مجھے جس قدر اذیتیں پہنچائی ہیں

اللہ کے واسطے معاف کرتا ہوں۔ دولت و اقتدار کی کثرت نے تجھے ذہنی خلل میں مبتلا کر دیا ہے۔ اللہ کی عطا ہوئی بے شمار نعمتوں کا شکر ادا کر اور اپنے دل و دماغ کو اس شیطانی حربے سے محفوظ رکھ۔ مجھے واپس جانے دے کہ علم کے طلب گار مدرسے میں خالی بیٹھے ہوں گے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تجھے کیا خبر کہ تیری ا نادانی نے کیسے قیمتی لمحات برباد کر دیئے۔ ابو سعید مرزا! مجھے جانے دے اور فوراً اپنے اس گناہ سے تائب ہو جا تیرے پاس بھی وقت بہت کم ہے۔''

''اے سمرقند کے کوچہ گرد! تجھے نہیں معلوم کہ ہم حرف انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔'' ابو سعید مرزا غضب ناک ہونے کے بجائے مسکرایا۔ وہ ایک درویش بے سروساماں کی بے چارگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ''تو کو سے وقت کی بات کر رہا ہے؟ یہاں تو سارا وقت ہی ہماری گرفت میں ہے۔ ہم تجھے اس طرح جانے نہیں د گے۔''

''اہل دربار! تم گواہ رہنا کہ حجت پوری ہو چکی اور اللہ کے اس عاجز بندے نے اپنا فرض ادا کر دیا۔''

احمد غیاث نے ابو سعید مرزا کے درباریوں پر نگاہ کی' مگر وہاں سب کے چہروں پر نخوت و غرور کا رنگ نمایاں تھا آنکھوں میں شدید نفرت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ پورے دربار میں بس ایک مولانا قاضی تھے جو بہت ز پریشان نظر آرہے تھے۔

مولانا قاضی سمرقند کے ایک عالم و فاضل انسان تھے۔ دینوی علوم میں مہارت رکھنے کے ساتھ سا سیاست کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اگر چہ درویشی ان کا مزاج نہیں تھا پھر بھی وہ صاحب کردار شخص تھے انہیں اندازہ تھا شیخ احمد غیاث جواں سال ہونے کے باوجود کس پائے کے بزرگ ہیں' لیکن وہ ایک مرد درویش ابو سعید مرزا کے پنجہ ظلم سے نجات دلانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ یہی وہ احساس مجبوری تھا جس کے باعث مولانا قاضی شدید اذیت میں مبتلا تھے اور بار بار پتھرائی ہوئی آنکھوں سے شیخ احمد غیاث کی طرف دیکھ رہے تھے

''یہ ممکن نہیں ابو سعید مرزا!'' شیخ احمد غیاث کی نظریں دربار کے مختلف گوشوں سے گزرتی ہوئیں مغل حکمرا کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ ''حضرت امام بخاریؒ دلوں کے فاتح ہیں' ان کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں ہوگا تیرے دادا نے اپنے عہد اقتدار میں صرف جبر و ستم کی فصل بوئی' اب تو چاہتا ہے کہ اس کی قبر پر انوار بار نزول ہو۔ معاذ اللہ! اگر تیرے دادا کی قبر شق ہو جائے تو تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ وہ کس اذیت و کر میں مبتلا ہے اور اس پر کیسا دردناک عذاب نازل ہو رہا ہے۔'' شیخ احمد غیاث کی گری گفتار سے ابو سعید مرزا پیرہن اقتدار جل اٹھا تھا۔ اہل دربار نے آج سے پہلے کسی انسانی لہجے کی ایسی سرکشی نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے سب کے سب فرط جذبات سے پتھرا کر رہ گئے تھے۔

پھر شیخ پر تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ احمد غیاث پر دن میں کئی بار تازیانے برسائے جاتے۔ کئی بار ان لباس خون سے سرخ ہو جاتا اور وہ کئی بار بے ہوش ہو جاتے۔ جب بھی ہوش آتا تو ان سے ایک ہی مطالبہ جاتا۔

''صاحبقراں کے مزار کی مجاوری قبول کر لے ورنہ تیرے اور موت کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔''

شیخ احمد غیاث جابر وقت کے مطالبے کا ایک ہی جواب دیتے۔ ''میں اپنی موت سے راضی ہو چکا ہوں ب مجھے اسی کا انتظار ہے۔''

¤¤¤

احمد غیاث نے تیس سال کی عمر میں صفیہ خاتون نام کی ایک انتہائی دیانتدار لڑکی سے شادی کی تھی۔ صفیہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ صفیہ کے ماں باپ اچانک طاعون کی خوفناک وباء میں مبتلا ہو کر لقمہ اجل بن چکے تھے۔ بس دور کی ایک رشتے دار عورت سارہ تھی جو خود بھی اپنے شوہر اور کئی بچوں کے ساتھ غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ صفیہ نے دو سال تک رفاقت کا حق اس طرح ادا کیا کہ احمد غیاث اپنی شریک حیات سے راضی تھے پھر یہ وفا شعار و اطاعت گزار بیوی اپنی خوبصورت ترین نشانی چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

احمد غیاث نے اپنے نومولود بچے کا نام جمال الدین احمد رکھا' جسے وہ محبت میں احمد جمال کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ بچہ اپنے رنگ اور نقش و نگار کے اعتبار سے اس قدر دلکش تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ احمد جمال کے چہرے سے شعاعیں سی پھوٹتی تھیں۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی کی سی شعاعیں جنہیں دیکھ کر نظروں کو سکون اور دل و جان کو قرار حاصل ہوتا ہے احمد غیاث جب بھی احمد جمال کی طرف دیکھتے تو بڑے پرسوز لہجے میں دعا کرتے۔

''خلاق عالم تجھے ہر بری نظر سے محفوظ رکھے۔''

بغیر ماں کے بچے کی پرورش کرنا ایک بڑا آزمائشی مرحلہ تھا۔ احمد غیاث نے صفیہ کی رشتے دار عورت سارہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ احمد کو دودھ پلانے کے ساتھ ساتھ بچے کی نگہداشت بھی کرے۔ اس سلسلے میں احمد غیاث ہر ماہ سارہ کو بہت زیادہ معقول معاوضہ دیا کرتے تھے۔ ان کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ اس بہانے سارہ کے بچوں کی بھی مالی امداد ہو جائے گی۔ اگر چہ خود ان کے خاندان میں بھی کئی عورتوں نے رسم دنیا نبھانے کے لئے احمد جمال کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لینا چاہی تھی' لیکن احمد غیاث ایک غیرت مند انسان تھے۔ انہوں نے کسی تامل کے بغیر احسان جتانے والی ان عورتوں کی مصنوعی ہمدردی کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ سارہ کے انتخاب کی وجہ بھی تھی کہ وہ ایک پرہیز گار خاتون تھی۔ اس لئے احمد غیاث چاہتے تھے کہ ان کے بچے کے جسم کو پروان چڑھانے والا دودھ کسی صاحب کردار عورت کا دودھ ہو' نتیجتاً سارہ بڑے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ احمد جمال کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ احمد جمال کی خاطر اپنے بچوں کو بھی نظر انداز کر دیتی۔ شیخ احمد غیاث جب یہ منظر دیکھتے تو شدت جذبات سے ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے اور وہ سارہ کے حق میں دعائے خیر کرنے لگتے۔

جب احمد جمال ڈیڑھ سال کا ہوا تو شیخ احمد غیاث نے کسی قدر سکون کا سانس لیا۔ باپ کو دیکھ کر بچے کا ہمکنا' بے اختیار مسکرانا اور غوں غاں کی آوازوں میں باتیں کرنا' بڑے جانفزا مناظر تھے۔ ایسے مواقع پر انہیں صفیہ بہت یاد آتی اور کچھ دیر کے لئے شیخ احمد غیاث کا روشن چہرہ بجھ کر رہ جاتا۔ پھر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے۔

''دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی طرف لوٹ جانے والا ہے۔''

پھر وقت نے عجیب کروٹ لی۔ احمد غیاث پس دیوار زنداں جا پہنچے۔ شیخ کو یقین ہو چلا تھا کہ ابو سعید مرزا ان کی جرأت گفتار کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ مگر انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مغل

حکمران درندگی کے آئین کو اپنے روز و شب کا معمول بنا لے گا۔

حسام بیگ احمد غیاث کے شیر خوار بچے کو گود میں لئے کھڑا تھا اور احمد جمال باپ کو دیکھ کر بار بار ہمک رہا تھا۔ شیخ نے بے قرار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے' مگر دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے پر اذیت و کرب کا دھواں پھیل گیا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان آہنی سلاخیں حائل تھیں۔

''احمد غیاث! تمہارے اس خوبصورت بیٹے کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔'' حسام بیگ بڑے سفاکانہ انداز میں مسکرایا۔

شیخ نے ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جو اپنی شمشیریں بے نیام کئے حسام بیگ کے عقب میں کھڑے تھے۔ بس لمحوں کی بات تھی۔ احمد غیاث نے اپنے پگھلتے ہوئے اعصاب پر قابو پالیا اب وہ پھر ایک آہنی چٹان نظر آرہے تھے۔ ''میری طرح میرا بیٹا بھی اللہ کی امانت ہے ...... اور اللہ اس پر قادر ہے کہ جس طرح چاہے اپنی امانت واپس لے لے۔''

شیخ کی استقامت دیکھ کر حسام بیگ کا مکروہ چہرہ زرد پڑ گیا۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے یتیم بنا کر بھکاریوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔'' ابوسعید مرزا کے بے ضمیر مصاحب نے نئے زاویے سے ایک باپ کی روح پر نشتر زنی کی۔

''اگر احمد جمال بھی یتیم ہو گیا تو زمین پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔'' شیخ کے لہجے میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ ''بے شمار بچے اپنے سینوں پر داغ یتیمی سجائے کوچہ در کوچہ پھرتے رہتے ہیں۔ اللہ بے نیاز ہے جسے جیسا چاہے لباس پہنا دے۔''

''بہت خود غرض اور بے رحم باپ ہے۔'' حسام بیگ نے آخری نفسیاتی ضرب لگانے کی کوشش کی۔

شیخ نے اس کے طنز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ''جان پدر! اس وقت اپنے باپ کی باتوں کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا مگر آنے والا وقت تجھے سمجھا دے گا کہ تیرا باپ خود غرض اور بے رحم نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر احمد غیاث نے اپنے دونوں ہاتھوں سلاخوں سے باہر نکال دیئے اور بیٹے کے گلاب جیسے رخساروں کو چھونے کی کوشش کی۔

حسام بیگ نے پھر اسی درندگی کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

باپ اور بیٹے کے درمیان فاصلے پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ احمد جمال رونے لگا۔ شیخ کا دل جو برگ گل سے بھی زیادہ نرم و نازک تھا' اس سے خون رسنے لگا۔ احمد غیاث نے نم آلود آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''الفراق! میرے بیٹے جمال الدین احمد! الفراق!'' یہ کہہ کر شیخ نے منہ پھیر لیا۔

⌑ ⌑ ⌑

پھر جابروں کی عدالت آراستہ ہوئی۔ درباری منصف قاضی عبید نے معصوم رعایا کو بغاوت پر اکسانے کے جرم میں احمد غیاث کے قتل کا فیصلہ سنا دیا۔

شیخ سے آخری خواہش پوچھی گئی تو انہوں نے اپنی عزیزہ سارہ کو طلب کر کے سرگوشی کے انداز میں وصیت کی۔ ''میں جا رہا ہوں تم احمد جمال کا خیال رکھنا۔'' اس کے بعد ایک صندوقچی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں اتنی رقم موجود ہے کہ اگر احتیاط سے خرچ کرو گی تو پریشانی کے کئی سال گزر جائیں گے اس کے بعد اللہ وارث ہے وہ تمہیں اس دنیا میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔''

⌑ ⌑ ⌑

پھر احمد غیاث قتل کر دیئے گئے جب شیخ کا خون آلود جسم ساکت ہو گیا تو ابوسعید مرزا نے بڑی رعونت سے

''ہم نے آخری زبان بھی کاٹ دی اب کوئی نہیں بولے گا۔''

سمرقند کی فضاء پر ناقابل بیان سناٹا طاری تھا۔ مکانوں کے دروازے بند تھے اور مکین خوف و دہشت سے رہے تھے۔ شاہراہیں سنسان پڑی تھیں اور گلیاں ویران ہو گئی تھیں۔ ابوسعید مرزا کے حکم پر احمد غیاث کی لاش کو ہر در کوچہ پھرایا جا رہا تھا اور شاہی نقیب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

''یہ اس شخص کا انجام ہے جو صاحبقراں امیر تیمور کے جاہ و جلال کا منکر تھا۔''

ابوسعید مرزا نے شیخ احمد غیاث کے قتل کے ساتھ یہ حکم بھی نافذ کر دیا تھا کہ ان کا مدرسہ مسمار کر دیا جائے۔ ستم کا عجیب مظاہرہ تھا۔ ایک طرف شیخ کے خون آلود جسم کو سمرقند کے گلی کوچوں میں پھرایا جا رہا تھا اور دوسری طرف ابوسعید مرزا کے کارندے اس درسگاہ کی بنیادیں کھود رہے تھے۔ جہاں تعمیری علم کی فصل بوئی جاتی تھی اور اس زمین سے مردان باخبر پیدا ہوا کرتے تھے۔

پھر جب شیخ کا جسد خاکی مدرسے کے کھنڈر میں رکھا گیا اور شاہی نقیبوں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ ''آؤ اور اس شخص کا چہرہ دیکھ لو جو صاحبقراں کے عظمت و جبروت کا انکار کرتا تھا۔'' تو کوئی ایک شخص بھی احمد غیاث کے جنازے کے قریب نہ آیا بس وہی ایک شکستہ دل عورت شیخ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ سارہ کی شدید خواہش تھی کہ احمد جمال آخری بار اپنے مرحوم باپ کا چہرہ دیکھ لے مگر پھر یہ سوچ کر وہ احمد جمال کو گھر چھوڑ آئی کہ کہیں بچے کے معصوم ذہن پر اس لرزہ خیز منظر کا کوئی خوفناک اثر مرتب نہ ہو۔

پھر جب شاہی جاسوسوں نے ابوسعید مرزا کو یہ اطلاع دی کہ ایک ملازمہ کے سوا احمد غیاث کی لاش پر ماتم کرنے والا کوئی نہیں اور شہر کا ہر فرد شاہ والا کے قہر سے پناہ مانگ رہا ہے تو چند لمحوں کے لئے اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ ابھر آئی پھر وہ کسی درندے کی طرح غرایا ''حرام موت کس کو نصیب ہوئی؟''

''احمد غیاث کو'' سرکاری جاسوس لرزتے ہوئے جسموں کے ساتھ سجدے میں چلے گئے۔ ''یہی موت اس کا مقدر تھی اور آئندہ بھی جو سیاہ بخت' صاحبقراں کے جلال کی روشن نشانیوں کی جھٹلائے گا اسے بھی ایسی ہی موت نصیب ہو گی۔''

''بے شک!'' ابوسعید مرزا کی درندگی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ ''تم حکومت کی طرف سے غسال' گورکن اور نماز جنازہ پڑھانے والے امام کا بندوبست کرو۔ احمد غیاث تو دنیا کا سب سے زیادہ لاوارث انسان ثابت ہوا۔ شاہی خزانے سے کفن لو اور اسے تاریک گڑھے میں اتار دو۔ ہم چاہتے تو یہی تھے کہ صاحبقراں کی شان میں گستاخی کرنے والے کو قبر کی جگہ بھی نصیب نہ ہو مگر آخر ہمارا انداز کرم بھی تو کوئی چیز ہے ...... اور یہ ہمارا کرم ہی ہے کہ ہم احمد غیاث جیسے معتوب و مقہور کو کفن کے ساتھ دو گز زمین بھی دے رہے ہیں۔''

⌑ ⌑ ⌑

شیخ احمد غیاث کی خوں رنگ میت کو اٹھا کر اس قبرستان میں لے جایا گیا' جہاں سمرقند کے غریب لوگ دفن ہوا کرتے تھے۔ حسام بیگ تدفین کی نگرانی کر رہا تھا۔ اچانک جاسوس سپاہیوں نے حسام بیگ کو خبر دی کہ ایک

انسانی ہجوم قبرستان کی طرف آرہا ہے۔ حسام بیگ نے گھبرا کر دیکھا آنے والے تمام لوگ ایک ہی جیسے ا
زیب تن کئے ہوئے تھے۔ سفید و بے داغ اور بے شکن لباس ...... سب کے سروں پر ایک ہی جیسے سفید عما
تھے۔ دراز قامت کشادہ آنکھوں' بلند پیشانیوں اور روشن چہروں والے لوگ۔ حسام بیگ نے سپاہیوں کو حکم د
وہ ان نافرمانوں کو قبرستان کی طرف آنے سے روک دیں ...... مگر جب سپاہی اپنی بے نیام شمشیریں لیکر ا
ہجوم کی طرف بڑھے تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ پتھر کے ہوگئے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد خوف و دہشت کے زیر اثر
سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔

حسام بیگ نے انہیں فاتح عالم کے قہر سے ڈرایا تو ایک شخص آگے بڑھا اور انتہائی باوقار لہجے میں کہنے
"اگر تمہارے فاتح عالم میں اتنی جرأت ہے تو اس سے کہو کہ وہ اپنے محل سے باہر آکر دیکھے۔ اہل ایمان کس ط
مرتے ہیں اور ان کی میت کس طرح اٹھائی جاتی ہے؟"

حسام بیگ اس طرح قصر شاہی پہنچا' جیسے اس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو۔ پھر جب اس نے لر
آواز میں یہ واقعہ ابوسعید مرزا کے گوش گزار کیا تو مغل حکمراں پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "ناقابل یقین! یہ
ممکن ہے؟"

پھر کچھ دیر بعد ابوسعید مرزا نے اپنے سپہ سالار مہران سمرقندی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "مہران! اگر وہ
شوریدہ سر نافرمانی سے باز نہ آئیں تو انہیں بے دریغ قتل کردے۔ احمد غیاث کو لاوارثوں کی طرح ہی دفن
پڑے گا"

مہران سمرقندی فوج کا ایک دستہ لیکر قلعے کے دروازے سے باہر نکلا مگر جیسے ہی انسانی ہجوم پر اس کی نظ
اسے سکتہ سا ہوگیا۔ ہر طرف سر ہی سر تھے اور سفید دستاریں ہی دستاریں تھیں۔ بے شمار روشن چہرے دیکھ کر اا
روح کانپ اٹھی۔ پھر وہ تیزی سے پلٹا اور اپنے تلوار کھول کر ابوسعید مرزا کے قدموں میں رکھتے ہوئے بولا۔
والا! یہ سمرقند کے باغی نہیں' کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہیں۔ آپ کا یہ نمک خوار ان لوگوں پر خنجر آزمائی کی طاقت
رکھتا۔"

ابوسعید مرزا مہران سمرقندی کا اعتراف ناکامی سن کر پاگل ہوگیا اور اس نے صورتحال کا جائزہ لئے
اپنے سپہ سالار کے قتل کا حکم جاری کردیا۔

پھر مغل حکمراں نے نائب سپہ سالار ذیشان مرزا کو حکم دیا کہ وہ باغیوں کے اس ہجوم کو تہہ تیغ کر ڈالے
مگر کچھ دیر بعد ذیشان مرزا بھی خوف و دہشت سے لرزتا ہوا واپس آگیا اور ابوسعید مرزا کے قدموں پر سر رکھ
یہ وزاری کرنے لگا۔ "فاتح عالم! وہ سرکش و باغیوں کا گروہ نہیں بلکہ سمرقند کی زمین پر انسانوں کی شکل میں
اور ہی مخلوق اتر آئی ہے۔"

جن لوگوں نے شیخ کا جنازہ اٹھایا تھا وہ "رجال الغیب" تھے۔ رجال الغیب "اللہ کی وہ مخلوق ہے
انسانی آنکھ سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اللہ زمین پر اپنے احکام نافذ کرنے کے لئے انہی دو مخلوقات سے کام
ہے۔ ایک فرشتے اور دوسرے رجال الغیب۔" یہ "رجال الغیب" ہی ہیں جو انسانوں کو شدید ترین حاد
سے بچاتے ہیں ...... اور جب کسی شخص کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو اسے موت کے تاریک غار میں دھکیل د
[illegible]

ا، رجال الغیب میں شمار کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے اگر اللہ کی مرضی ہو تو
ل الغیب انسانی آنکھ پر بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ شیخ احمد غیاث کا جنازہ بھی رجال الغیب ہی نے اٹھایا تھا۔
ہ روشنی اور خوشبو بھی رجال الغیب کے متبرک وجود کا نتیجہ تھی جسے سمرقند کے ایک ایک باشندے نے کھلی
وں سے دیکھا اور محسوس کیا مگر حکمراں طبقہ جو بدترین گمراہیوں کا شکار تھا اپنے مشاہدات کو شیخ احمد غیاث کی
ہ بازیوں سے تعبیر کرتا رہا اور توبہ و استغفار کرنے کے بجائے رات بھر صراحی و ساغر اور نغمہ و رقص سے دل
تا رہا۔

⌑ ⌑ ⌑

شیخ کا شیر خوار بیٹا احمد جمال کئی دن تک بلک بلک کر روتا رہا۔ بے زبان بچہ اپنے جذبوں کا اظہار کرنے
قاصر تھا۔ مگر سارہ جانتی تھی کہ احمد جمال کو باپ کا انتظار ہے۔ وہ باپ جواب کبھی لوٹ کر نہیں آئیگا آخر ایک
سارہ شدید بے قراری کے عالم میں احمد جمال کو لیکر شیخ کی قبر پر چلی گئی۔ وہاں عجیب ہی عالم تھا۔ کچھ دیر کے
سارہ کو سکتہ سا ہو کر رہ گیا۔ شیخ احمد غیاث کی پوری قبر گلاب کے تازہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

"ظالموں کی اس بستی میں شیخ کی قبر پر کس نے پھول چڑھائے ہیں؟" سارہ پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت
ی سوچتی رہی۔ پھر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تو وہ قبر سے لپٹ کر رونے لگی۔ احمد جمال کی آواز سن کر سارہ
بےچین ہوگئی اور اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔

"بیٹے! تیرا باپ اس مٹی کے نیچے سو رہا ہے۔" سارہ دیوانہ وار احمد جمال کے رخساروں کو چوم رہی تھی۔
دوسروں کے بچوں کی تکلیف دیکھ کر بے قرار ہو جاتا تھا۔ اب وہ اپنے بیٹے کی چیخیں سن کر بھی نہیں آئے گا۔ وہ
گیا ہمیشہ کے لئے چلا گیا وہ اس بستی میں سب سے زیادہ سچا' ہمدرد اور شریف النفس انسان تھا۔ پھر بھی
لروں نے اسے قتل کردیا۔ یہاں سب کے سب آنکھ والے ہیں مگر کسی نے اس ظلم کو نہیں دیکھا۔" ضبط کی
یں ٹوٹ گئیں اور شدت غم سے بے قرار ہو کر سارہ چیخ اٹھی۔

"انسان دیکھے نہ دیکھے لیکن اللہ تو دیکھ رہا ہے۔" یکایک سارہ کے عقب سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ سارہ
برا کر پیچھے کی طرف پلٹی۔ اس کے سامنے سفید عمامے اور پیرہن میں ملبوس ایک بزرگ کھڑے تھے۔ ان
ک کا تعلق بھی "رجال الغیب" کی جماعت سے تھا اور ان ہی بزرگ نے شیخ غیاث کی نماز جنازہ پڑھائی
تھا۔

"تم نے یہاں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔" بزرگ سارہ سے مخاطب
ے۔ "آئندہ اس بچے کو لیکر قبرستان نہ آنا اور اسے اس وقت تک شیخ احمد غیاث کے متعلق کچھ نہ بتانا جب تک
یہ ہوش کی منزل کو نہ پہنچ جائے۔"

سارہ انتہائی ادب و احترام کے ساتھ نظریں جھکائے کھڑی رہی۔

پھر بزرگ نے احمد جمال کو اپنی آغوش میں لے لیا اور کچھ دیر تک پیار کرتے رہے۔

⌑ ⌑ ⌑

ایک یتیم اور شیر خوار بچہ اپنے باپ کو یاد کر کے روتا رہا ...... اور ابوسعید مرزا اپنے بیٹوں کی شادیوں کے جشن
مناتا رہا۔ کیف و نشاط کی ان تقریبات کو رنگین تر بنانے کے لئے مملکت کے گوشے گوشے سے حسین و جمیل رقاصائیں

طلب کی گئی تھیں۔ ابو سعید مرزا کثیر العیال تھا اور اسے قدرت نے گیارہ خوبصورت بیٹے عطا کئے تھے۔ سب سے بیٹا سلطان احمد مرزا سمرقند کا حاکم تھا۔ چوتھا بیٹا عمر شیخ مرزا تھا جسے فرغانہ اور اندجان کی حکومت دی گئی تھی۔ شیخ غیاث کے قتل سے ایک ماہ پہلے ابو سعید مرزا نے بڑی دھوم دھام سے سلطان احمد مرزا' سلطان محمود مرزا اور عمر شیخ کی شادیاں کی تھیں۔ مغولستان کے حکمراں یونس خان نے اپنی تین بیٹیاں ابو سعید مرزا کے بیٹوں کے عقد میں د تھیں۔ یونس خان کی سب سے چھوٹی بیٹی قتلغ خانم عمر شیخ مرزا کی بیوی تھی۔

عمر شیخ مرزا پندرہ دن تک اس جشن کیف و نشاط میں شریک رہا اور پھر اپنی بیوی کو لیکر سمرقند سے فر چلا آیا۔ اب فرغانہ کی راتیں روشن تھیں جام و سبو کھنکتے تھے اور شاہی محل پازیب کی جھنکاروں سے گونجتا رہتا تھ

جس رات سمرقند میں شیخ احمد غیاث کو قتل کیا گیا اسی رات سید علی مہدی قصر شاہی کی ایک دیوار سے لپٹ روتے رہے۔ سید احمد مہدی ایک خدا سیدہ بزرگ تھے اور چالیس سال سے فرغانہ میں مقیم تھے۔ سید مہدیؒ خاص عادت یہ تھی کہ وہ کبھی کسی سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ نصف شب کے بعد محل کے صدر دروازے سامنے ٹہلتے رہتے اور فجر کی اذان ہوتے ہی اپنی جھونپڑی کی طرف چلے جاتے جو دریا کے کنارے انہوں اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ قصر شاہی کے پہرے دار چالیس سال سے ان کا یہی عمل دیکھ رہے تھے مگر آج خلا عادت سید مہدیؒ محل کی دیوار سے لپٹے زار و قطار رو رہے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

"ظالمو! تم نے یہ کیا کیا؟ سورج کو قتل کر ڈالا۔ اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ عنقریب تم سب سب بے نشان ہو جاؤ گے۔"

سید مہدیؒ کئی دن تک اسی طرح آدھی رات کے کے وقت گریہ و زاری کرتے رہے۔ بالآخر قلعے کے محافظوں نے عمر شیخ مرزا کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ دوسرے روز نصف شب کے قریب فرغانہ کے حاکم اس کی بیوی قتلغ خانم اور مدارالمہام بابائے کابلی نے سید مہدیؒ کی چیخیں سنیں۔ سید کے شور فغاں سے عمر شیخ مرزا اور قتلغ خانم پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا مگر بابائے کابلی نے سید مہدیؒ کے اس عمل کو ایک دیوانے کا ہذیان کہہ کر نظر اندا کر دیا۔ پھر جب سید کا یہ پراسرار عمل مسلسل جاری رہا تو عمر شیخ مرزا نے ان کی جھونپڑی میں حاضر ہو کر اس گر دزاری کا سبب پوچھا مگر سید مہدیؒ نے مغل شہزادے کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد سید مہدیؒ چالیس دن تک قصر شاہی کی دیوار سے لپٹ کر روتے رہے۔ پھر اچانک غائب ہو گئے سید کی گریہ و زاری خ ہوئی تو عمر شیخ مرزا نے چین کا سانس لیا۔

ابو سعید مرزا کچھ دن پہلے ایک شورش کو کچلنے کے لئے عراق پہنچا تھا۔ یہاں اردبیل کے نواحی علاقے میں حسن ترکمان سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ پھر ایک خون ریز جنگ کے بعد وہ مرحلہ آ گیا کہ ابو سعید مرزا نے جان بچانے کے لئے فرار کی ذلت بھی گوارہ کرنی چاہی مگر فرشتہ اجل نے اس کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ آخر ابو سعید مرزا بھاگتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ مغلوں کی فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ ابو سعید مرزا کا جسم اپنے ہی گھوڑ دو کی سموں سے پامال ہوتا رہا' جب یہ طوفان رکا تو ابو سعید مرزا کی لاش اٹھائی گئی۔ "خود ساختہ فاتح عالم" کا چہ اس قدر مسخ ہو چکا تھا کہ پہچانا تک نہیں جاتا تھا۔

جس روز ابو سعید مرزا عراق میں قتل ہوا اسی رات ایک بار پھر سید مہدیؒ قلعے کی دیوار کے نیچے نمودار ہو۔ اور پورے زور شور کے ساتھ نعرہ زنی کرنے لگے۔

"تو سچا' تیرا وعدہ سچا...... نہیں ہے کوئی شریک تیرا...... سدا رہے تیرا پاک نام"

سید مہدیؒ کی اس نعرہ زنی کے چار پانچ دن بعد ایک برق رفتار قاصد نے فرغانہ پہنچ کر ابو سعید مرزا کے قتل دی تو عمر شیخ مرزا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور آن کی آن میں پورے شہر نے ماتمی لباس پہن لیا۔ اس حادثے کے بعد عمر شیخ مرزا سید مہدیؒ کی گریہ و زاری کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ پھر جب اس جاں گداز واقعے ندت کچھ کم ہوئی تو فرغانہ کا حاکم اپنے امراء کے ساتھ سید مہدیؒ کے پاس پہنچا۔ سید اس وقت ایک پھلدار ت کو پانی دے رہے تھے۔ انہوں نے عمر شیخ مرزا اور امرائے فرغانہ کی آمد کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اسی طرح ھیرے ہوئے اپنے کام میں مشغول رہے۔

"سارا شہر فاتح عالم کی موت پر مجھ سے تعزیت کر رہا ہے اور آپ اس طرح درختوں کو پانی دے رہے ہیں فرغانہ کے در و دیوار پر خوشیوں کی بارش ہو رہی ہے۔" عمر شیخ مرزا آہستہ آہستہ چلتا ہوا سید کے قریب پہنچا ی قدر تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ میرے اہل خانہ ہیں اور صبح سے پیاسے ہیں۔" سید مہدیؒ نے اسی طرح منہ ے ہوئے جواب دیا۔ "فرغانہ کے حکمراں کو معلوم ہونا چاہئے کہ انہیں رزق فراہم کرنا میرا فرض ہے۔"

"اور اپنے حکمراں کی موت پر تعزیت پیش کرنا آپ کے فرائض میں شامل نہیں؟" عمر شیخ مرزا کی آواز در بلند تھی۔

سید مہدیؒ نے پانی کا برتن زمین پر رکھ دیا اور تیزی سے عمر شیخ مرزا کی طرف پلٹے۔ "تو مجھے میرے فرائض مانے آیا ہے؟" یکا یک سید کا لہجہ شرربار ہو گیا تھا۔ "جب میرا محبوب قتل ہوا تھا تو مجھ سے تعزیت کرنے کون تھا؟ یہ تیرا جہاں دیدہ اتالیق' باکمال مدبر' عظیم دانشور' تجھے سیاست کے اصول سکھانے والا اور بندگان خدا حقوق غصب کرنے کی تعلیم دینے والا۔" سید نے انتہائی غضب ناک انداز میں بابائے کابلی کی طرف اشارہ تے ہوئے کہا۔ "کیا یہ آیا تھا مجھے پرسہ دینے؟ اور کیا یہ تیرے بدمست امراء آئے تھے مجھ سے تعزیت نے؟ اور کیا تیری رعایا ماتمی لباس پہن کر میرے گھر آئی تھی؟ بتا کون آیا تھا۔ میرے پاس؟ کون میرے غم شریک ہوا تھا اور کس نے مجھ سے ہمدردی کے دو الفاظ کہے تھے؟" سید کے ہونٹ بھی جل رہے تھے اور میں بھی۔

"سید! میں آپ کے پاس آیا تھا' مگر آپ نے تو مجھ سے بات تک نہ کی۔" عمر شیخ مرزا نے بہت آہستہ میں کہا۔ وہ سید مہدیؒ کو حالت جلال میں دیکھ کر سہم سا گیا تھا۔

سید اچانک کھوسے گئے تھے' جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے رک کر بولے۔ "ہاں! تو آیا تھا شہزادے! تیرا بہت بہت شکریہ۔ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔ میں بھی ے تیرے باپ کی موت پر تعزیت کرتا ہوں۔ اللہ اس کے گناہوں کو معاف فرمائے اور تجھے صبر دے۔" یہ ہہ کر سید مڑے اور دوبارہ پانی کا برتن بھرنے لگے۔

"سید! آپ کا محبوب کون تھا اسے کس نے قتل کیا؟ مجھے بتایئے! میں آپ کے ساتھ انصاف کروں گا۔" غانہ کا حاکم بار بار درخواست کرتا رہا' مگر سید مہدیؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجبوراً عمر شیخ مرزا قصر شاہی کی ف واپس لوٹ گیا۔

⌑ ⌑ ⌑

اقتدار کی کشاکش شروع ہو چکی تھی اور ابو سعید مرزا کے گیارہ بیٹے ایک دوسرے کے تاج و تخت کو للچائی ہ
نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ عمر شیخ مرزا کا خسر یونس خان بھی اس فکر میں تھا کہ موقع ملے تو
فرغانہ اور اندجان پر قبضہ کر لے۔ سمرقند کا حاکم اور عمر شیخ مرزا کا بڑا بھائی سلطان احمد مرزا ایک اوباش اور سخ
مزاج نوجوان تھا۔ باپ کے مرتے ہی وہ بے لگام ہو گیا اور رعایا پر بے دریغ ستم ڈھانے لگا تا کہ اگر کہ
بغاوت اور نافرمانی کی کوئی خفیہ چنگاری پرورش پا رہی ہو تو وہ شعلہ بننے سے پہلے ہی بجھ جائے۔

مولانا قاضی شیخ احمد غیاث کے قتل کے بعد سے بہت زیادہ اداس رہنے لگے تھے۔ پھر جب انہیں ابوس
مرزا کی عبرت ناک موت کی خبر ملی تو وہ لرز کر رہ گئے اور انہوں نے دل ہی دل میں اپنے خالق کو یاد کر
ہوئے کہا۔ ''بے شک! تو بڑا انصاف کرنے والا ہے۔'' مولانا قاضی جیسے باکردار عالم کے لئے سلطان احمد
کی محبت اور ماتحتی میں رہنا سخت دشوار تھا اور خود سلطان احمد مرزا کو بھی ایسے لوگ ناپسند تھے جو ہر وقت بندگ
خدا کے حقوق کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجبوراً مولانا قاضی سلطان احمد مرزا سے اجازت لیکر فرغانہ چلے گئے۔

سمرقند چھوڑنے سے پہلے مولانا قاضی کی شدید خواہش تھی کہ وہ شیخ احمد غیاث کی قبر پر حاضر ہو کر فاتحہ خو
کریں اور ان کے معصوم بچے احمد جمال کی کفالت کے لئے کچھ رقم دے دیں۔ مگر سلطان احمد مرزا کے خوف
وہ اپنی اس خواہش پر عمل نہ کر سکے اور خاموشی سے فرغانہ چلے آئے۔ اگر مولانا قاضی ایک نظر بھی احمد جمال
دیکھ لیتے تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ سمرقند کا سب سے مظلوم بچہ یہی ہے جس پر روزانہ نئی نئی آفات نازل ہ
رہتی ہیں۔ شیخ احمد غیاث نے اپنے یتیم بچے کے لئے جو رقم چھوڑی تھی وہ سارہ کے ناکارہ اور بدقماش شوہر
چرالی تھی۔ جب سارہ نے اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا تو شوہر نے اسے اس قدر مارا کہ وہ زخم
کی شدت کے سبب کئی دن تک پلنگ سے بھی نہ اٹھ سکی۔ پھر اس کے زخم بھر گئے تو وہ محنت مزدوری کر کے
جمال کی پرورش کرنے لگی۔ مگر اس طرح کہ سوکھی روٹی ہی اس بچے کا مقدر تھی۔

⌑ ⌑ ⌑

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور سیاست کی ہنگامہ خیزیاں بڑھتی رہیں اب عمر شیخ مرزا کو دشمنوں کی ر
دوانیوں سے زیادہ اولاد کی فکر ستانے لگی تھی۔ قتلغ خانم سے اس کی شادی کو چھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا
وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ قتلغ خانم اکثر رات کے سناٹے میں روتی اور پھر کسی بچے کی طرح ا
شوہر کے سینے پر سر رکھ کر بلکنے لگی۔ ''صاحب عالم! کہیں اس وجہ سے ہماری رفاقت ختم تو نہیں ہو جائے گی
میں ایک بانجھ عورت ہوں۔ خدا کی قسم! اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' پھر قتلغ خانم کی چیخیں ہذیانی ا
اختیار کر لیتیں۔ اولاد سے محرومی نے اسے نفسیاتی مریضہ بنا دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ روزانہ خواب میں عم
مرزا سے جدائی کے مناظر دیکھتی تھی۔ حاکم فرغانہ قتلغ خانم کو بہت سمجھایا' مگر وہ ہمیشہ ایک ہی خیال سے خوف
رہتی کہ کہیں عمر شیخ مرزا تخت کے وارث کے لئے دوسری شادی نہ کر لے۔

اس سلسلے میں شاہی طبیب مختلف طریقہ علاج آزما رہے تھے۔ پھر تمام ماہر طبیبوں نے اتفاق رائے
ساتھ عمر شیخ مرزا سے کہہ دیا۔ ''شاہ ولا! ملکہ عالیہ اولاد کی نعمت سے محروم رہیں گی۔ اب کوئی معجزہ ہی ان
ویران آغوش کو سرسبز و شاداب بنا سکتا ہے۔''

یہ سنتے ہی عمر شیخ مرزا کا سرخ و سفید چہرہ زرد ہو گیا تھا اور پھر اس نے ایک طویل آہ سرد کھینچی تھی جیسے

ہا شاہ ولا اس کے سپاہیوں نے خبر دی ہو کہ وہ جنگ ہار چکا ہے۔

فرغانہ کا مشہور درباری نجومی محمد شریف کئی سال سے پیشین گوئی کر رہا تھا کہ تخت کا وارث دنیا میں آنے ہی
والا ہے۔ ایک دن پھر اس نے زائچہ کھینچ کر حاکم فرغانہ کو اولاد نرینہ کی خوشخبری سنائی تو عمر شیخ مرزا پاگل سا ہو گیا
اس نے روشنائی کی شیشی اٹھا کر محمد شریف کے منہ پر الٹ دی اور تمام کاغذات کے پرزے کر ڈالے۔

''تو بھی جھوٹا تیرا علم بھی جھوٹا ...... اب اس وقت تک میرے سامنے نہ آنا جب تک تخت فرغانہ کا وارث
اس دنیا میں نہ آ جائے۔''

نجومی محمد شریف کی سیکڑوں پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی تھیں' مگر آج وہی ماہر فن خلوت گاہ شاہی سے
اس طرح نکلا کہ اس کے چہرے اور لباس پر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ قصر شاہی کے مکینوں نے بڑے حیرت و افسوس
کے ساتھ یہ تماشا دیکھا۔

⌑ ⌑ ⌑

اسی دوران ایک اور دردناک واقعہ رونما ہوا۔ قتلغ خانم کا چچا زاد بھائی مونس خان ایک جنگ میں مارا
گیا۔ اس سے پہلے اس کی بیوی گلزار بیگم کچھ دن وبائی بخار میں مبتلا رہ کر انتقال کر چکی تھی۔ اب مونس خان کی
چار سالہ بچی عالیہ تاجدار خانم ماں باپ کے سائے سے محروم دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ اگرچہ سیکڑوں رشتے دار
موجود تھے' لیکن تاجدار خانم کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب قتلغ خانم بھائی کی تعزیت کے لئے ترکستان
پہنچی اور اس نے تاجدار کو انسانی ہجوم میں کسی مجسمے کی طرح خاموش دیکھا تو دل پر ایسی چوٹ لگی کہ تڑپ کر رہ
گئی۔ خود بھی غم زدہ تھی' اس لئے ایک معصوم بچی کی تنہائی برداشت نہ کر سکی۔ پھر یہ خلش اس حد تک بڑھی کہ
قتلغ خانم نے اپنے باپ یونس خان سے کہہ دیا کہ وہ تاجدار کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہے۔ یونس خان نگار خانم کے
درد کو سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھر جب قتلغ خانم فرغانہ واپس آئی تو عالیہ تاجدار بھی
اس کے ہمراہ تھی۔

عمر شیخ مرزا نے انتہائی محبت آمیز نظروں سے اس گلاب جیسی بچی کو دیکھا جس کے سر پر یتیمی کی تیز دھوپ
پھیلی ہوئی تھی۔ ''تم نے بہت اچھا کیا نگار! اس طرح تمہارا دل بہل جائے گا اور اس بچی کو اس کی ماں بھی مل
جائے گی۔''

شوہر کی بات سن کر قتلغ خانم مسکرانے لگی' لیکن عمر شیخ مرزا نے صاف محسوس کر لیا کہ اس کی مسکراہٹ بہت
زخمی ہے۔

کچھ دن تک تو قتلغ خانم عالیہ تاجدار کی ناز برداریوں میں گم رہی' مگر اس کے سینے کا ناسور مستقل رستا
رہا۔ پھر وہ یکسانیت سے اکتا گئی اور بات بات پر تاجدار کو ڈانٹنے لگی۔ پرائی بیٹی کے وجود سے عورت کی اپنی کو
کی آگ نہیں بجھتی اور معاملہ تو ولی عہد سلطنت کا تھا۔ عالیہ تاجدار اس کا نعم البدل کس طرح ہو سکتی تھی۔ نتیجتاً قت
خانم پھر ان ہی اذیت ناک تنہائیوں میں گھر کر رہ گئی۔

عمر شیخ مرزا سے اپنی شریک حیات کا یہ کرب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ایک رات وہ شدید ذہنی انتشار کے ع
میں محل کی بالائی منزل پر ٹہل رہا تھا کہ اتفاق سے اس جگہ رک گیا جہاں سے کئی سال پہلے وہ سید مہدیؒ کی گر
وزاری سنا کرتا تھا۔

"ظالم! تم نے یہ کیا کیا؟ آفتاب کو قتل کر ڈالا۔ اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ عنقریب تم سب کے سب بے نشان ہو جاؤ گے۔"

ماضی کی داستان کا ورق کیا پلٹا کہ عمر شیخ مرزا کے دل و دماغ میں زلزلہ سے آ گیا۔

"پہلے میرا باپ بے نشان ہوا اور اب میں بے نشان ہو رہا ہوں۔" شدت خوف سے عمر شیخ مرزا کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

پھر یکایک قصر شاہی میں ہلچل سی مچ گئی۔ فرغانہ کا حاکم بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ تمام خدمت گار عمر شیخ مرزا کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ہر شخص حیران و پریشان تھا کہ آج شاہ والا کو کیا ہو گیا ہے؟ عمر شیخ مرزا نے محافظوں کو قلعے کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

پھر جب وہ تیزی کے ساتھ باہر نکلا تو مولانا قاضی نے حیرت ناک لہجے میں کہا۔ "شاہ والا! اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"سید کے پاس جا رہا ہوں۔" عمر شیخ مرزا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کون سید؟" مولانا قاضی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے کہ سید کون ہیں؟" عمر شیخ مرزا کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔

"کم سے کم محافظوں کو تو ساتھ لے لیجئے۔" مولانا قاضی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ "رات کے وقت حضور کا تنہا جانا مناسب نہیں۔ اندھیرے میں دوست اور دشمن کی تمیز باقی نہیں رہتی۔"

"یہ میرا اور سید کا معاملہ ہے۔ وہاں کوئی دوسرا نہیں جا سکتا۔" عمر شیخ مرزا پر وحشت سی طاری تھی۔

"تو کم سے کم اپنی تلوار ہی لے لیجئے۔" مولانا قاضی کی بے چارگی ناقابل بیان تھی۔

"سید کی بارگاہ میں مسلح ہو کر جانا سنگین بے ادبی ہے۔" عمر شیخ مرزا نے اپنے مشیر خاص کا ہر مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

سیکڑوں مسلح محافظ اور بے شمار خدمت گار قلعے کے دروازے پر اس حالت میں کھڑے تھے کہ ان کی سانسیں رکی جاتی تھیں...... اور عمر شیخ مرزا رات کی گہری تاریکی میں تن تنہا سید مہدیؒ کی جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

شہزادہ عمر شیخ مرزا کئی میل کا فاصلہ پاپیادہ طے کر کے سید مہدیؒ کی جھونپڑی تک پہنچا' مگر سید وہاں موجود نہیں تھے' فرغانہ کا حاکم بہت دیر تک سید کا انتظار کرتا رہا...... اور پھر رات کے اندھیرے ہی میں کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح قصر شاہی کی طرف لوٹ آیا۔

تمام امیروں' وزیروں' مشیروں' سپاہیوں' خدمت گاروں اور قصر شاہی کے مکینوں نے شہزادے کی بحفاظت واپسی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ان دنوں سیاسی حالات بڑے پریشان کن تھے۔ قدم قدم پر سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے اور ابو سعید مرزا کے سارے بیٹے اپنی اپنی مملکتوں کو توسیع دینے کی کوشش میں جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہے تھے۔ ایسی سنگین فضاء میں شہزادے عمر شیخ مرزا کا غیر مسلح ہو کر نصف شب کی تاریکی میں کئی میل کا پیدل سفر کرنا بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

شہزادے کی واپسی پر اس کے مشیر خاص مولانا قاضی نے پوچھا...... "صاحب عالم! آپ کس کی تلاش میں گئے تھے؟ اور یہ سید مہدیؒ کون ہیں۔" سمرقند سے آنے کے بعد عمر شیخ مرزا نے مولانا قاضی کو اپنا مشیر خاص بنا لیا تھا اس دوران ریاست کا مدار المہام بابائے کابلی مر چکا تھا۔ بابائے کابلی کے انتقال کے بعد مولانا قاضی کو "مشیر خاص" کے اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا گیا تھا۔ عمر شیخ مرزا قاضی کا بہت احترام کرتا تھا' مگر اس وقت وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اس لئے مولانا کی باتوں کا جواب دیئے بغیر اپنی خلوت گاہ میں چلا گیا۔

قتلغ خانم شوہر کا اداس چہرہ اور ویران آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئی...... "کیا صاحب عالم مجھے بھی نہیں بتائیں گے کہ رات کے اس اندھیرے میں کہاں تشریف لے گئے تھے؟" نگار خانم نے ایک خاص ادائے محبوبانہ کے ساتھ کہا۔

"تم میری زندگی کے ہر راز میں شریک رہی ہو نگار! مگر یہ ایک عجیب الجھن ہے۔" عمر شیخ مرزا رک رک کر بول رہا تھا اور اس کی آواز سے انتہائی شکستگی جھلک رہی تھی...... "جب تک میں خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا' تمہیں بھی نہیں بتا سکتا کہ آخر یہ الجھن کیا ہے؟"

خانم اپنے شوہر کی سب سے بڑی مزاج شناس تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عمر شیخ مرزا ایک بے حد محبت کرنے والا شوہر ہے' مگر جب وہ کسی معاملے میں خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کی مرضی کے خلاف زبان کھولنا آسان نہیں۔ مجبوراً قتلغ خانم خاموش ہو گئی لیکن پھر بھی وہ بڑی راز داری اور احتیاط کے ساتھ شوہر کی پراسرار حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہی۔

شہزادہ عمر شیخ مرزا مسلسل ایک ماہ تک رات کے مختلف حصوں میں سید مہدیؒ کی قیام گاہ پر جاتا رہا' مگر اسے

ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کچھ دن تک مغل شہزادے نے جھونپڑی کے باہر کھڑے ہو کر سید مہدیؒ کو پکارا اس خیال سے اندر جا کر بھی دیکھا کہ کہیں سید سو تو نہیں رہے ہیں؟ مگر عمر شیخ مرزا کی تمام طلب وجستجو رائیگاں گئی۔ سید کا دور دور تک کوئی نشان نہ ہوتا بلکہ ایسا لگتا جیسے سید اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔

اس دوران مولانا قاضی بار بار شہزادے سے اس کے اضطراب وجستجو کا سبب دریافت کرتے رہے، مگر شیخ مرزا ہر مرتبہ اس طرح دامن بچا جاتا، گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

پھر اس سلسلے میں فرغانہ کے حاکم نے ایک نیا راستہ اختیار کیا اس نے اپنے ایک معتبر جاسوس کو حکم دیا کہ سید مہدیؒ کو تلاش کرے اس طرح کہ سید اس کی موجودگی کا احساس نہ کر سکیں۔

پھر اسی رات شاہی جاسوس نے یہ عجیب وغریب اطلاع دی کہ سید مہدیؒ اپنی جھونپڑی میں موجود ہیں۔

عمر شیخ مرزا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور پیدل جانے کے بجائے ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر سید مہدیؒ کی قیام گاہ تک پہنچا...... مگر اس بار بھی ناکامی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ عمر شیخ مرزا شدید مایوسی اور شکستگی کے عالم میں نامراد واپس چلا آیا۔

پھر دوسری رات بھی مغل شہزادے نے یہی عمل دہرایا۔ جیسے ہی شاہی جاسوس نے یہ اطلاع دی کہ سید وہاں موجود ہیں۔ عمر شیخ مرزا گھوڑے پر سوار ہو کر جھونپڑی تک پہنچا، لیکن اس مرتبہ بھی ناکامی ہی اس کا مقدر رہی۔

فرغانہ کا حاکم انتہائی بے دلی اور جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اس نے جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو کر بآواز بلند کہا۔ "سید! میں خوب جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے میری رعایا کا ایک ادنیٰ فرد اس قابل ہے کہ وہ آپ کو دیکھ سکتا ہے، لیکن میری گناہ گار آنکھیں اس لائق نہیں کہ وہ آپ کے دیدار سے شرف یاب ہو سکیں۔"

پھر جب عمر شیخ مرزا واپس پہنچا تو شدت غم سے اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ ریاست کے مشیر خاص مولانا قاضی شاہی خلوت گاہ کے سامنے اس طرح ٹہل رہے تھے، جیسے وہ خود بھی کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہوں۔

عمر شیخ نے اپنے مشیر پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور خلوت گاہ کے دروازے میں داخل ہونے لگا۔ مولانا قاضی تیزی سے آگے بڑھے اور بلند آواز میں کہنے لگے...... "صاحب عالم! بس آج تنہائی کے چند لمحے مجھے عنایت کر دیجئے۔ اس کے بعد میں پھر کبھی آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔"

مولانا قاضی کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ عمر شیخ مرزا نے مڑ کر اپنے مشیر خاص کی طرف بہت غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "آئیے مولانا۔"

فرغانہ کے مشیر خاص نے شاہی خلوت گاہ میں داخل ہوتے ہی عرض کیا۔ "صاحب عالم مجھے اپنے اس غم میں بھی شریک کر لیجئے جس کی خلش آپ کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور جس کی تپش آپ کے شگفتہ چہرے کو کسی گیلی لکڑی کی طرح سلگا رہی ہے۔"

شہزادہ عمر شیخ مرزا بہت دیر تک گہرے سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا کہ مولانا قاضی سے اپنی زندگی کا یہ راز کہے یا نہ کہے؟ آخر اس نے اپنے دل کا غبار کم کرنے کے لئے ہونٹوں کو جنبش دی اور سید مہدیؒ کی گریہ وزاری کا سارا حال تفصیل سے سنا دیا۔

پھر جب فرغانہ کا حاکم خاموش ہوا تو اس نے مولانا قاضی کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا۔ مشیر خاص کا چہرہ ...ہو گیا تھا اور ان کے جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔

"میں اسی دن سے ڈرتا تھا صاحب عالم!" مشیر خاص کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

"کیسا دن؟" مولانا قاضی کا خوف و دہشت میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر عمر شیخ مرزا خود بھی وحشت زدہ نظر آنے لگا تھا۔

"اگر صاحب عالم دنیا کی اس تلخ ترین بات کو سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو یہ خادم کچھ عرض کرے۔" مولانا قاضی نے اپنے جذبات کی شدت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کہو مولانا! سب کچھ کہہ ڈالو! ہم میں بہت حوصلہ ہے۔" عمر شیخ مرزا کا اضطراب اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

مولانا قاضی کچھ دیر تک مناسب الفاظ تلاش کرتے رہے...... "چاہے اس جرم حق بیانی پر صاحب عالم مجھے قتل ہی کر ڈالیں، مگر آج میں سب کچھ کہہ ڈالوں گا۔ صاحب عالم! آپ نہیں جانتے کہ کیسا مرد پاکباز ایک حکمراں کی بے جا ضد پر قربان کر دیا گیا۔" مولانا قاضی کسی معصوم بچے کی مانند رو رہے تھے...... "شیخ احمد غیاث ہی تو کہتے تھے کہ حضرت امام بخاریؒ اور صاحب قراں امیر تیمور کی فتوحات میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے ایک دلوں کا فاتح تھا...... اور دوسرا جسموں کا...... دلوں کے فاتح کو کبھی موت نہیں آتی...... اور جسموں کا فاتح تو اپنی زندگی میں ہی مر جاتا ہے۔ اس ناقابل تردید سچائی کی جو سزا شیخ احمد غیاث کو دی گئی، واللہ وہ بڑا ظلم تھا۔ میں سید مہدیؒ سے واقف نہیں مگر آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ شیخ احمد غیاث ہی ان کے محبوب تھے...... اور سورج کے قتل سے مراد شیخ احمد غیاث ہی کا قتل ہے۔" مولانا قاضی زار و قطار رو رہے تھے۔

اپنے مشیر خاص کی زبانی یہ انکشاف سن کر شہزادے عمر شیخ مرزا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"صاحب عالم! آپ نے احمد غیاث کے بچے کو روتے نہیں دیکھا۔ جب شیخ قتل ہوئے تھے اس بچے کی عمر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اب احمد غیاث کی نشانی کس حال میں ہے؟ بھوک اور افلاس کی خوفناک آندھی نے اس چراغ کو بجھا دیا یا شیخ کے خون سے روشن ہونے والی وہ شمع مسلسل تند و تیز ہواؤں کی زد پر ہے۔ افسوس! مجھے کچھ خبر نہیں۔" شدید رقت آمیز لہجے میں شیخ احمد غیاث کے مدرسے اور گھر کے مسمار ہونے کا حال بھی سنا ڈالا۔

یہ ظلم اور مظلومیت کی عجیب داستان تھی جسے سن کر عمر شیخ مرزا بھی رونے لگا...... "مولانا! اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں اس سلسلے میں یکسر بے قصور ہوں مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں۔"

"فاتح عالم کا وہ بدکار مصاحب حسام بیگ جو شیخ احمد غیاث کے خلاف سازشیں کرنے میں پیش پیش تھا، آپ نے اپنی آنکھوں سے اس کا حشر نہیں دیکھا۔" یہ کہتے کہتے مولانا قاضی کے چہرے پر شدید نفرت کے سائے ابھر آئے تھے۔ "جب تک میں وہاں موجود تھا وہ منافق دربار کا سمرقند کے گلی کوچوں میں چیختا پھرتا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے بچا لو یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے تم انہیں روکتے کیوں نہیں؟ وہ بے نیام شمشیر لئے میری طرف آ رہے ہیں۔ حسام بیگ پاگل ہو گیا تھا اور اہل خانہ نے اس کی مجنونانہ حرکتوں سے تنگ آ کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔

اب اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ اندھیرا کہاں تک پھیلے گا اور کون کون بے نشاں ہوگا؟"

''مولانا!'' عمر شیخ مرزا نے بڑے دردناک لہجے میں اپنے مشیر خاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''عالم بے نشاں ہو چکے ہیں اور اب میں بے نشان ہو رہا ہوں۔''

''اللہ نہ کرے!'' مولانا قاضی نے گھبرا کر کہا فرغانہ کے مشیر خاص اس راز سے باخبر تھے کہ عمر شیخ مرزا کی شادی کو سات سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ مغل شہزادے نے اپنے بے نشاں ہونے کا ذکر کر کے اسی المناک واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''میں نے سید مہدیؒ سے ان کی گریہ وزاری کا سبب دریافت کرنے کی بہت کوشش کی تھی، مگر وہ مجھ سے گفتگو کرنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔'' عمر شیخ مرزا کا لہجہ بہت شکستہ تھا...... ''اور اب تو ان کی بیزاری کا یہ عالم ہے کہ وہ عام لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں اور مجھے نظر تک نہیں آتے میں کیا کروں مولانا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ سیاست کے محاذ پر دوست نما دشمنوں سے جنگ کروں ...... اور دل کے محاذ پر اپنی بیوی قتلغ نگار خانم کے نشتر برداشت کروں۔ ایک تنہا انسان دو محاذوں پر کس طرح لڑ سکتا ہے مولانا؟ اور نگار خانم بھی کیا کرے؟ آخر ایک عورت ہے اس سے اپنی کوکھ کی یہ ویرانی دیکھی نہیں جاتی۔ کوئی اور بے نشان ہو یا نہ ہو لیکن عمر شیخ مرزا ضرور بے نشاں ہو جائے گا۔ سید مہدیؒ کا طرز عمل بتا رہا ہے کہ وہ مجھے اپنے باپ کے گناہ کی معافی مانگنے کا موقع بھی فراہم کرنا نہیں چاہتے۔'' مغل شہزادے کے لہجے میں ایسی تھکن تھی جیسے ناقابل علاج بیماری میں مبتلا کوئی مریض آخری سانسیں لے رہا ہو۔

''سید ملیں گے کیسے نہیں؟'' اچانک مولانا قاضی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ ان کے لہجے میں شاہی منصب دار کے غرور کے بجائے ایک عجیب سا ناز اور احساس تفاخر تھا جیسے وہ سید مہدیؒ سے ایک نسبت خاص رکھتے ہوں ''سید اپنی رعایا سے کس طرح بے خبر رہ سکتے ہیں۔ انہیں آپ سے ملنا ہی ہوگا۔ مجھے اپنے ہمراہ لے چلئے۔''

¤ ¤ ¤

پھر دن کے اجالے میں شہزادہ عمر شیخ مرزا اپنے مشیر خاص مولانا قاضی کے ساتھ سید مہدیؒ کی بارگاہ جلال میں حاضر ہوا۔ خلاف معمول جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ عمر شیخ مرزا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ فرغانہ کے حاکم کا خیال تھا کہ آج بھی سید مہدیؒ اسے شرف ملاقات نہیں بخشیں گے۔ اس نے بڑی مایوسانہ نظروں سے مولانا قاضی کی طرف دیکھا۔

مولانا قاضی سر جھکائے ہوئے آگے بڑھے اور بلند آواز میں عرض کرنے لگے۔ ''سید! دروازہ کھولئے اور اپنی رعایا کی حالت زار دیکھئے۔''

مولانا قاضی کو سید کے دروزے پر صدا دیئے ہوئے بہت دیر گزر چکی تھی مگر سید کی جھونپڑی کا دروازہ ابھی تک نہیں کھلا تھا۔

مولانا قاضی نے دوبارہ انتہائی پرسوز لہجے میں آواز دی۔ ''سید! ہم آپ کے محبوب کی تعزیت کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔''

عمر شیخ مرزا کا خیال تھا کہ مولانا قاضی کی یہ صدا بھی بیکار جائے گی ...... مگر اس وقت فرغانہ کا حاکم حیران رہ گیا۔ جب اس نے جھونپڑی کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ پھر سید مہدیؒ اس طرح نمودار ہوئے کہ وہ بہت لاغر و

نڈھال نظر آ رہے تھے اور آنکھیں اس طرح سوجی ہوئی تھیں جیسے بہت دیر سے رو رہے ہوں۔

''یہاں کون ہے میرے محبوب کا ماتم کرنے والا؟'' سید مہدیؒ نے ویران اور غبار آلود آنکھوں سے مولانا قاضی کی طرف دیکھا۔ ''بھائی! آج تمہیں کیسے فرصت مل گئی؟ میرے محبوب کو گئے ہوئے تو زمانے گزر گئے۔'' سید مہدیؒ کے لہجے میں دل کا درد شامل تھا۔

مولانا قاضی دونوں ہاتھ باندھے اور سر جھکائے آگے بڑھے ''میں مولانا قاضی ہوں' ریاست فرغانہ کا مشیر سمرقند سے آیا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شیخ احمد غیاث سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ اس لئے تعزیت پیش کرنے میں بہت دیر ہو گئی اپنی اس کوتاہی پر شدید ندامت کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں۔'' یہ کہتے کہتے مولانا قاضی رونے لگے تھے۔

سید مہدیؒ بے قرار ہو کر آگے بڑھے اور فرغانہ کے مشیر خاص کو گلے لگا کر خود بھی رونے لگے ''مجھے سب خبر ہے۔ تم نے میرے محبوب کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی' مگر وہ ظالم و ستمگر کیسے سنتا کہ اقتدار نے اس کی سماعتوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے اور کیسے دیکھتا کہ جھوٹی طاقت کے نشے نے اس کی بینائی زائل کر دی تھی۔ خیر! آسمانوں پر یہی لکھا تھا کہ بوڑھا مہدی فرغانہ کی گلیوں میں روتا پھرے ...... اور اس کا جواں سال محبوب احمد غیاث خونیں کفن پہن کر عالم بالا کی طرف چلا جائے ...... موت اس فاتح عالم ابوسعید مرزا کی لاش کو کھینچ کر تاریک گڑھے میں ڈال دے۔'' سید مہدیؒ کی زبان سے آگ برس رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ ''میرے شہزادے کی بھی کسی کو خبر ہے؟''

''کون شہزادہ؟'' مولانا قاضی حیرت سے سید کی طرف دیکھنے لگے۔

''سمرقند میں ایک ہی تو شہزادہ ہے'' ...... سید مہدیؒ نے بڑے والہانہ لہجے میں کہا' مگر ان کے چہرے سے وہی ناقابل بیان اذیت جھلک رہی تھی۔ ''میرے محبوب احمد غیاث کا معصوم بچہ جس کے سر پر ابوسعید مرزا نے یتیمی کی تیز دھوپ پھیلا دی۔''

مولانا قاضی نے سید مہدیؒ کے سامنے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کر لیا کہ وہ والی سمرقند سلطان احمد مرزا کے خوف سے احمد جمال کی خبر گیری نہ کر سکے۔

پھر جیسے ہی مولانا قاضی خاموش ہوئے' عمر شیخ مرزا موقع غنیمت جان کر آگے بڑھا اور شیخ احمد غیاث کے غیر منصفانہ قتل پر سید مہدیؒ سے تعزیت کرنے لگا۔

سید مہدیؒ کچھ دیر تک بڑی خاموشی سے مغل شہزادے کی معذرت سنتے رہے۔ پھر یکایک غضب ناک ہو کر بولے۔ ''میرے روبرو یہ اقرار کر کہ تیرا باپ ظالم تھا اور اس نے عدل و انصاف کا خون بہایا۔''

''ہاں سید! میں اعتراف کرتا ہوں کہ شیخ احمد غیاث حق پر تھے۔ میرے باپ نے انہیں بے گناہ قتل کرا دیا ...... اور یہ ظلم نا انصافی کی ایک بدترین مثال ہے۔'' عمر شیخ مرزا کے لہجے میں کسی قسم کی ریاکاری یا بناوٹ نہیں تھی۔

سید مہدیؒ نوعمر شہزادے کے اس اعتراف سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ''پھر میں تیری تعزیت قبول کرتا ہوں۔ اللہ تجھے حق پر شہادت دینے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔''

سید مہدیؒ نے شرف ہم کلامی بخشا تو عمر شیخ مرزا کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ''سید! میں اپنے باپ کے اس گناہ کا

کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔'' فرغانہ کا حاکم کسی قدر پرجوش نظر آنے لگا تھا۔

''تو کفارہ ادا کرے گا؟'' سید مہدیؒ نے بڑی عجیب نظروں سے عمر شیخ مرزا کو دیکھا۔''پھر ساری دنیا کے سامنے عدالت آراستہ کر...... احمد غیاث کے بیٹے کے ہاتھ میں تلوار دے دے...... اور چپ چاپ قتل ہو جا...... ابوسعید مرزا کے گناہ کا کفارہ تو یہی ہے۔''

سید مہدیؒ کی بات سن کر عمر شیخ مرزا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

مولانا قاضی نے فوراً ہی درمیان میں مداخلت کی''سید محترم! شہزادے اس آزمائش کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔''

''تو پھر کفارے کی بات کیوں کرتا ہے؟'' سید مہدیؒ کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔''اس کی قبر ہے' اس کا اعمال نامہ ہے۔ اس نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہا ہوگا۔ تجھ پر اس کے گناہ کا کوئی بوجھ نہیں جا اپنی رعایا کی طرف دیکھ! پتہ نہیں' اور کہاں کہاں خونِ ناحق بہہ رہا ہوگا۔ اسے روکنے کی کوشش کر! کہیں وہ موجِ خوں تیرے محلات کو بھی بہا کر نہ لے جائے۔'' یہ کہتے ہوئے سیدی مہدی واپس جانے کے لئے مڑے۔

''سید عالی مرتبت!'' مولانا قاضی نے بڑے عاجزانہ لہجے میں التجا کی''شہزادے آپ کے در پر کچھ مانگنے آئے ہیں۔ یہ آپ کی رعایا ہیں' انہیں مایوس نہ فرمایئے!''

''میری رعایا؟'' سید مہدیؒ پلٹ کر عجیب سے لہجے میں بولے......''یہ کیسی تہمت ہے مجھ پر؟ جس سے اپنا بوجھ نہیں اٹھتا' وہ کسی دوسرے کو کیا دے سکتا ہے؟''

''سید! میں بے اولاد ہوں اور بے نشانی سات سال سے میرے تعاقب میں ہے۔'' بالآخر مغل شہزادے نے سید مہدیؒ کے حضور میں اپنی درخواست پیش کر دی۔

''اس دنیا میں ہزاروں بے اولاد زندہ ہیں۔ اگر اس قطار میں تو بھی شامل ہو گیا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ کاروبارِ حیات منقطع تو نہیں ہو جائے گا۔'' سید مہدیؒ نے اس طرح کہا جیسے وہ عمر شیخ مرزا کو نصیحت کر رہے ہوں۔''میری طرف کیوں نہیں دیکھتا۔ نہ بیوی نہ بچے...... نہ اہل خاندان...... اور نہ کوئی پڑوسی۔ پھر بھی زندہ ہوں' نہ تجھ سے شکوہ کرتا ہوں اور نہ اہلِ فرغانہ سے۔''

''سید! میں اس آزمائش کا متحمل نہیں ہو سکتا۔'' عمر شیخ مرزا رونے لگا۔''میں بہت کمزور انسان ہوں۔ آپ کو شیخ احمد غیاث کا واسطہ! میرے حق میں دعائے خیر فرما دیجئے ورنہ میں اس در سے واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر بے نشان ہی ہونا ہے تو پھر کیوں نہ اسی آستانے پر دم توڑ دوں۔''

''تو بہت ہوشیار ہے شہزادے!'' پہلی بار سید مہدیؒ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔''جب تجھ سے کچھ نہ بن پڑا تو میرے محبوب کو درمیان میں لے آیا۔ اللہ تم شاطروں سے محفوظ رکھے۔ انسانی کمزوریوں سے کیسا فائدہ اٹھاتے ہو؟''

''سید! آپ کے جاہ و جلال کی قسم! میں نے کسی سیاسی حیلہ گری سے کام نہیں لیا ہے۔'' عمر شیخ مرزا کے لہجے میں کھلی ہوئی سچائی شامل تھی۔''میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ شیخ احمد غیاث کو درمیان میں لے آؤں۔''

سید مہدیؒ کا رویہ بدل گیا۔ پھر عمر شیخ مرزا اور مولانا قاضی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے جھونپڑی کے

... میں داخل ہو گئے۔

... کی قیام گاہ بہت مختصر تھی۔ دو بوسیدہ چٹائیوں کے سوا وہاں کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ جس فرش پر سید ... تھے وہ کچا تھا' مگر صفائی ہر شے سے نمایاں تھی۔''والی فرغانہ بیٹھ جاؤ سید مہدیؒ آج تمہارا میزبان ہے۔'' سید نے اپنے سامنے بچھی ہوئی چٹائی کی طرف اشارہ کیا اور بہت غور سے عمر شیخ مرزا کے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔

اگرچہ مغل شہزادہ انتہائی قیمتی لباس زیب تن کئے ہوئے تھا' لیکن اس نے خاک آلود چٹائی پر بیٹھ جانے میں ... تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا۔

سید مہدیؒ نے سوکھے ہوئے انجیروں اور خوبانیوں سے عمر شیخ مرزا اور مولانا قاضی کی تواضع کی۔ پھر رسم ... ادا کرنے کے بعد والی فرغانہ سے مخاطب ہوئے۔''شیخ احمد غیاث کا معصوم بچہ اس وقت بہت برے حال میں ہے۔'' یہ کہتے کہتے سید مہدیؒ آبدیدہ ہو گئے۔''کیسی قیامت ہے؟ سمرقند کا شہزادہ اور ایسے دریدہ لباس میں ...؟ اس کی خبر لے۔ پھر ممکن ہے کہ اللہ تجھے بے نشان ہونے سے بچا لے۔''

''سید! مجھے حکم دیجئے۔'' عمر شیخ مرزا نے بے قرار ہو کر کہا۔

''حکم نہیں' ایک درخواست ہے۔'' اب سید مہدیؒ کے آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔''چاہتا ہوں کہ زندگی میں ایک بار اپنے شہزادے کو دیکھ لوں۔ بے وفا سانسوں کے کھیل کا کیا بھروسہ؟ خبر نہیں کب تماشا ختم ہو جائے ... اگلے سفر کا بلاوا آ جائے۔'' سید کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

¤ ¤ ¤

جب عمر شیخ مرزا نے اپنی بیوی قتلغ خانم کو یہ خوشخبری سنائی تو کچھ دیر تک اس پر ناقابلِ بیان سرشاری کی کیفیت طاری رہی۔ پھر خوابوں اور جذبوں کا سحر ٹوٹا تو وہ عجیب سی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

''صاحب عالم! کیا واقعی میں ماں بن جاؤں گی؟'' قتلغ خانم کے لہجے سے اچانک بے یقینی کا اظہار ہونے لگا تھا۔''کیا سید مہدیؒ اتنے ہی بڑے بزرگ ہیں کہ ان کی دعاؤں سے''ان ہونی'' باتیں ہو جاتی ہیں'' شدید ہیجانی کیفیت کے باعث اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ ٹوٹ جاتے تھے۔

''ہاں! میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ سید کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔'' عمر شیخ مرزا کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔''مگر تم بے یقینی کا شکار کیوں ہو؟ اہل اللہ کے بارے میں اس طرح نہیں سوچتے۔ یہ گستاخی ہے' بڑی بے ادبی ہے۔''

''مجھے اندھیروں اور محرومیوں کی طویل مسافت نے تھکا دیا ہے صاحب عالم!'' یہ کہہ کر قتلغ خانم نے شوہر کے سینے پر سر رکھ دیا اور سسک کر رونے لگی۔

عمر شیخ مرزا بہت دیر تک بیوی کو تسلیاں دیتا رہا۔''اندھیروں کا یہ سفر بہت جلد ختم ہو جائے گا اور سورج ... کے گھر میں اترنے ہی والا ہے۔''

پھر جب بہت دیر بعد قتلغ خانم جذبات کے حصار سے باہر نکلی تو ایک اور الجھن کسی خونخوار دشمن کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔''مگر آپ سمرقند کیسے جائیں گے صاحب عالم؟''

"کیوں؟" عمر شیخ مرزا نے چونک کر خانم کی طرف دیکھا۔

"آپ بابا جان کی حریص فطرت سے بخوبی واقف ہیں۔" خانم نے انتہائی تلخ لہجے میں اپنے باپ خان اور حقیقی بڑے بھائی سلطان محمود مرزا کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا یہ دونوں باپ بیٹے کئی بار عمر شیخ کے اقتدار کے خلاف گھناؤنی سازشیں کر چکے تھے' لیکن مولانا قاضی کے سیاسی تدبر اور عمر شیخ کی شجاعت و' مندی نے ابھی تک دشمنوں کو ان کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ اگرچہ یونس خان ایک طو عریض علاقے پر حکمرانی کر رہا تھا' لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کی اقتدار کی بھوک بڑھتی ہی تھی۔ عمر شیخ مرزا کے ساتھ اپنی بیٹی قتلغ خانم کی شادی کر کے بظاہر اس نے دو خاندانوں کے درمیان دوستی ک قائم کیا تھا' مگر در پردہ وہ فرغانہ اور اند جان پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ جب نگار خانم پر باپ کی اس بدنیتی کا راز ہوا تو بیٹی نے بڑے کربناک لہجے میں اشکبار آنکھوں کے ساتھ یونس خان سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"بابا جان! یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ کیا چند گز زمین بیٹی کی خوشیوں اور اس کے سہاگ سے زیاد ہوتی ہے؟"

"سیاست بڑی عجیب چیز ہوتی ہے قتلغ خانم!" یونس خان نے بیٹی کے آنسوؤں کو اس طرح نظر انداز تھا' جیسے وہ انسانی آنکھ میں آئے ہوئے اشک نہ ہوں بلکہ کسی نالی سے گزرنے والا غلیظ پانی ہو۔ "عمر ش ایک نا اہل حکمران ہے میں اپنی قوم کو ایک ناکارہ انسان کے حوالے نہیں کر سکتا۔" یونس خان بڑے سفاکا. میں اپنے اس داماد کی کردار کشی کر رہا تھا جسے وہ اپنا عظیم فرزند کہہ کر گلے لگایا کرتا تھا۔ منافقت کی یہ بڑی مثال تھی۔ ابھی وقت نے اسے کوئی مناسب موقع فراہم نہیں کیا تھا ورنہ یونس خان عمر شیخ مرزا کی پشت م آلود خنجر اتار دیتا۔

قتلغ خانم یونس خان کی انتہائی پست فطرت اور حریصانہ جذبوں کو بے نقاب دیکھ کر سخت برہم ہو گئی تھ آپ میرے محترم باپ ہیں یا معصوم اور مقدس رشتوں کی آڑ میں حرص و ہوس کے خونی تاجر؟"

"قتلغ! اگر تو حقیقتاً میری بیٹی ہے تو پھر میرے اس عظیم الشان منصوبے کی حمایت کر!" یونس خا ہونٹوں کو اس طرح جنبش ہوئی جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ بول رہا ہو۔ "میں صاحبقران امیر تیمور سے بڑی سلطن کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی سلطنت کہ جس کی مثال نہ ماضی میں ہو اور نہ مستقبل میں۔ پھر جب وقت کا مؤر دنیا کی تاریخ لکھے تو مجھے فاتح عالم کے نام سے یاد کرے۔ ایسا فاتح عالم کہ جس کے آگے سکندر کے کارنا. گرد ہو کر رہ جائیں۔"

قتلغ خانم انتہائی غضب ناک حالت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بابا جان! آپ کو تاریخ انسانی ضرور یا گی مگر کسی اور نام سے...... میں کبھی واپس نہ آنے کے لئے جا رہی ہوں۔ آج کے بعد میرے اور آ. درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔"

پھر قتلغ خانم نے اپنے شوہر کو بھی یونس خان کے ارادوں سے باخبر کر دیا۔ اس واقعہ کو کئی سال گز تھے۔ یونس خان کے بار بار بلانے کے باوجود خانم باپ سے ملنے کے لئے نہیں گئی تھی۔ اس دوران یونس مرتبہ منافقت و ریاکاری کی نقاب ڈال کر فرغانہ آیا تھا۔ عمر شیخ مرزا کے سینے میں بھی اپنے خسر کے لئے تن غبار بھرا ہوا تھا' مگر وہ بڑے صبر و ضبط کے ساتھ دنیاداری کی رسم نبھاتا رہا۔

آج جب عمر شیخ مرزا نے خانم کے سامنے سمرقند جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کی نظروں کے سامنے خان کا چہرہ ابھر آیا جس کی ایک ایک شکن کے پیچھے ہزاروں سازشیں کروٹیں لے رہی تھیں...... اور اسی ے کے پیش نظر اس نے شوہر سے سوال کیا تھا کہ آپ کس طرح سمرقند جائیں گے؟

عمر شیخ مرزا اپنی بیوی کے اس سوال کا مفہوم سمجھ گیا تھا مگر پھر بھی اس نے پر جوش لہجے میں کہا "مجھے بہر سمرقند جانا ہی ہوگا۔"

"آپ بابا جان کی بدنیتی سے پوری طرح آگاہ ہیں۔" قتلغ خانم کے چہرے سے گہری تشوش کا اظہار ہو تھا۔ "آپ کی عدم موجودگی میں فرغانہ کی حکومت کسی غیر متوقع حادثے کا بھی شکار ہو سکتی ہے...... اور خود ہی کے جاسوسوں کی یہ اطلاع ہے کہ بابا جان اور والیٔ سمرقند سلطان احمد مرزا میں گہرے تعلقات استوار چکے ہیں۔"

قتلغ خانم نے اپنے ایک اور خدشے کا اظہار کر دیا تھا۔ اس طرح عمر شیخ مرزا کے لئے سمرقند بھی ایک غیر لوظ مقام تھا' پھر جب مغل شہزادے نے مولانا قاضی کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو مشیر خاص بھی بہت زیادہ یشان نظر آنے لگے۔

"صاحب عالم! اس سلسلے میں میری رائے یہی ہے کہ آپ خود سمرقند تشریف نہ لے جائیں۔" مولانا ضی رک رک کر بول رہے تھے۔ "میں بھائی کو بھائی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں' مگر یہ بات ضور والا جانتے ہیں کہ شہزادے سلطان احمد مرزا کی نیت صاف نہیں ہے۔"

"مگر سید نے تو براہ راست مجھے اس کام کا حکم دیا ہے۔" عمر شیخ مرزا نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "میں اس ا میں رہوں نہ رہوں مگر سید کی خواہش کے احترام میں سمرقند ضرور جاؤں گا۔" عمر شیخ مرزا کے لہجے میں بڑی ملامت تھی۔ "آپ نے سید کی آنکھوں کی طرف نہیں دیکھا' ان میں کیسی حسرت تھی' کیسی التجا تھا۔"

قتلغ خانم' مولانا قاضی اور تمام امرائے سلطنت خوشامد کی حد تک اصرار کرتے رہ گئے لیکن عمر شیخ مرزا تین جانبازوں کا ایک دستہ اپنے ہمراہ لے کر سمرقند کی طرف روانہ ہو گیا۔ فرغانہ کا قاصد ایک برق رفتار گھوڑے پر ار ہو کر پہلے ہی سمرقند کی جانب روانہ ہو چکا تھا تا کہ سلطان احمد مرزا کو اس کے چھوٹے بھائی کی آمد سے باخبر سکے۔

⌑ ⌑ ⌑

جب فرغانہ کے قاصد نے والیٔ سمرقند سلطان احمد مرزا کو اس کے چھوٹے بھائی کی آمد کی خبر دی تو وہ ت سے جھوم اٹھا۔ "میرے باپ کی نشانی!" سلطان احمد مرزا نے قاصد کے سامنے بڑے والہانہ انداز میں دنی کی۔ "میرا چھوٹا بھائی عمر شیخ مرزا' جسے دیکھنے کو یہ آنکھیں ترس گئی تھیں۔ شہنشاہوں کی طرح اس کا تقبال کرو کہ وہ سمرقند میں آنے والا سب سے معزز و محترم مہمان ہے۔"

پھر جب فرغانہ کے قاصد کو شاہی حرم سرا میں ٹھہرا دیا گیا تو سلطان احمد مرزا نے اپنے مشیران خاص کو ت میں طلب کر لیا۔ "یہ ہماری بلند اقبالی ہے کہ شکار خود ہی شکار گاہ کی طرف آ رہا ہے۔ اب فرغانہ اور اند ان ہماری دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔" سلطان احمد مرزا بار بار شراب کے گھونٹ لے رہا تھا اور جوش

جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

چھوٹے بھائی کو محبت اور خون کے رشتے کا فریب دینے کے لئے سلطان احمد مرزا قصر شاہی سے باہر اور سمرقند کی سرحد پر پہنچ کر اس نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ عمر شیخ مرزا کا استقبال کیا۔ اپنے برادر خورد سے بار گلے ملا اور کئی مرتبہ اس کی پیشانی اور رخساروں کو بوسے دیئے۔ عمر شیخ مرزا نے بھی اپنے بڑے بھائی کے اس فریب محبت کا والہانہ انداز میں شکریہ ادا کیا مگر فرغانہ کا حاکم پوری طرح ہوشیار تھا اور ایک ایک قدم بڑی احت سے اٹھا رہا تھا۔

سلطان احمد مرزا پہلے دن ہی عمر شیخ مرزا کو گرفتار کر لینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ تکلف ضیافت کے بعد جیسے ہی محفل رقص و جام شروع ہو' عمر شیخ مرزا کے ساغر میں بے ہوشی کی تیز دوا ملا جائے اور جب فرغانہ کا حکمراں اپنے حواس کھو بیٹھے تو اسے مخصوص کمرے میں پہنچانے کے بجائے زیر زمین خانے میں ڈال دیا جائے۔ مغل فرمانرواؤں کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ نہ صرف خود پوری آزادی کے ساتھ شرا پیتے تھے بلکہ اپنے نوعمر بیٹوں کو بھی اپنے ہاتھوں سے یہ کثیف پانی پلایا کرتے تھے۔ سلطان احمد مرزا نے شاہی رسم کے پردے میں اپنا خوف ناک منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

پھر جب رات کا کھانا ختم ہو چکا تو سمرقند کے حاکم نے اپنے ایک معتمد خدمت گار کو تنہائی میں طلب کیا ابھی وہ شیخ مرزا کی شراب میں بے ہوشی کی تیز دوا ملانے کا حکم دینے ہی والا تھا کہ اس کے پیٹ میں شدید اٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سلطان احمد مرزا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور شاہی حرم سرا اس کی تیز چیخوں گونجنے لگی۔ تمام درباری طبیب والیٔ سمرقند کی نگہداشت کے لئے دوڑ پڑے۔ شروع میں اسے بدہضمی کا درد دیا گیا مگر بعد میں سارے حکیموں نے اتفاق رائے کے ساتھ کہا کہ یہ درد ''قولنج'' ہے۔ اکسیر کا درجہ رکھنے کئی دوائیں آزمائی گئیں مگر درد کی شدت میں کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔ عمر شیخ مرزا بھی ساری رات بھائی سرہانے بیٹھا رہا۔

تیز درد کا یہ سلسلہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ قصر شاہی میں ایک کہرام سا برپا تھا۔ درباری طبیب مشوروں کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یہ بیماری نہیں' کوئی نادیدہ عذاب ہے۔ ریاست کے علماء کی ہدا پر غریبوں میں صدقات بھی تقسیم کئے گئے۔ مسجدوں میں' گھروں میں دعائیں بھی کرائی گئیں مگر کوئی افاقہ ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس درد قولنج میں سلطان احمد مرزا کی موت واقع ہو جائے گی۔ مجبوراً ایک درباری عالم' شعیب نے ڈرتے ڈرتے والیٔ سمرقند کو مشورہ دیا۔

''شاہ والا سے نادانستگی میں کسی بے گناہ انسان کی دل آزاری ہو گئی ہے۔ اگر فاتح عالم اس کوتاہی کا ا فرمادیں تو بہت ممکن ہے کہ یہ درد تھم جائے۔''

اس وقت عمر شیخ مرزا بھائی کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ سلطان احمد مرزا کو فوراً ہی اپنا خوف ناک منصوبہ آ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ میں آئندہ اپنے چھوٹے بھائی کے خلاف کوئی سازش نہیں کروں اس خیال کے آتے ہی سلطان احمد مرزا کو محسوس ہوا کہ درد کی شدت میں کمی آنے لگی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد آ آہستہ یہ درد ختم ہو گیا۔ والیٔ سمرقند نے سکون کا سانس لیا اور قصر شاہی میں ایک عظیم الشان جشن صحت انتظامات کئے جانے لگے۔ مسلسل پندرہ دن تک کسی قسم کی غذا نہ کھانے کے باعث سلطان احمد مرزا اتنا کا

یا تھا کہ بستر پر اٹھ کر بھی نہ بیٹھ سکتا تھا۔

عمر شیخ مرزا کے بے شمار قیمتی لمحات ضائع ہو گئے تھے۔ مگر وہ ایک شریف النفس شہزادہ تھا۔ اس نے ب نہیں سمجھا کہ وہ بڑے بھائی کی سنگین بیماری کے دوران اپنے مقصد کو تکمیل تک پہنچائے اور خاموشی کے لہ سمرقند سے رخصت ہو جائے۔ پھر جس روز سلطان احمد مرزا کو درد قولنج سے نجات ملی۔ اسی دن عمر شیخ مرزا ے احمد غیاث کا ذکر چھیڑا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ شیخ کے یتیم اور بے سہارا بچے کو اپنے ہمراہ فرغانہ ے جانا چاہتا ہے تاکہ فاتح عالم ابوسعید مرزا کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جا سکے۔

احمد غیاث کے ذکر پر سلطان احمد مرزا سخت برہم ہو گیا اور شدید ناتوانی کے سبب بستر پر لیٹے ہی لیٹے شیخ ے بارے میں انتہائی نازیبا کلمات ادا کرنے لگا۔ ''فاتح عالم سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا وہ نمک حرام اسی ل تھا۔''

''برادر بزرگ! میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔'' عمر شیخ مرزا بہت آہستہ اور سلجھے ہوئے لہجے میں بات رہا تھا۔ ''جو ہو گیا سو ہو گیا مگر اب میں چاہتا ہوں کہ اس کی تلافی ہو جائے۔''

''جو چاہو کرو۔'' سلطان مرزا نے انتہائی تلخ اور نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''خود ہی ڈھونڈ لو اور پھر فرغانہ ے جاؤ اس نحوست کو تاکہ میرا ملک پاک ہو جائے۔''

عمر شیخ مرزا کوئی جواب دیئے بغیر اٹھ گیا۔

¤ ¤ ¤

پھر جب کئی دن کی تلاش کے بعد فرغانہ کا حاکم شیخ احمد غیاث کے بیٹے احمد جمال تک پہنچا تو کانپ کر رہ یا۔ سورج جیسا روشن چہرہ رکھنے والا ایک سات آٹھ سالہ بچہ ایک شکستہ حال عورت کے ساتھ پتھر اٹھا رہا تھا۔ روں کی رگڑ لگنے سے اس کا گلاب جیسا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا تھا۔ پھٹے پرانے لباس سے اس بات کی جمانی ہو رہی تھی کہ بچہ انتہائی غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ جفاکش عورت سارہ تھی' جس نے ید محنت و مزدوری کر کے احمد جمال کو اس عمر تک پہنچایا تھا۔

جب عمر شیخ مرزا نے اپنی آمد کا قصہ بیان کیا تو سارہ زار و قطار رونے لگی۔ ''شہنشاہ! اس میں میرا کوئی ور نہیں ہے۔ اگر وہ بد بخت و نامراد شیخ کی چھوڑی ہوئی رقم نہ چراتا تو میرا یہ شہزادہ اس حال میں نہ ہوتا۔'' ارہ نے اپنے ناکارہ شوہر کے گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ گواہ ہے کہ میں نے اسے مزدوری ے لئے مجبور نہیں کیا۔'' سارہ نے شدت جذبات میں احمد جمال کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مگر یہ بڑے غیرت مند پ کا بیٹا ہے' اس نے گوارہ نہیں کیا کہ بوڑھی ماں پتھر ڈھوئے اور بیٹا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔''

عمر شیخ مرزا غریب سارہ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ ''بے شک! آپ ایک امانت دار خاتون ں اور میں آپ کے کردار کی عظمتوں کو سلام کرتا ہوں۔''

''نہیں شہنشاہ! بڑے تو آپ ہیں۔'' سارہ نے گھبرا کر کہا۔ ''آپ بہت بڑے ہیں کہ پہلی بار اس بچے کے م میں شرکت کرنے آئے ہیں ورنہ اب تک تو ایسا لگتا تھا جیسے اس پوری ہستی میں کوئی انسان ہی نہیں رہتا۔'' یہ تے کہتے سارہ کی دھندلی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ''شہنشاہ اس بچے کے باپ کے ساتھ بڑا

......" اچانک اسے ان بزرگ کی ہدایت یاد آ گئی جو شیخ احمد غیاث کے قتل کے بعد قبرستان میں نظر آئے تھے۔ انہوں نے سارہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب تک احمد جمال ہوش اور جوانی کی منزل تک نہ پہنچ جا[ئے] اس وقت تک اسے یہ نہ بتانا کہ اس کا باپ کون تھا اور جابران وقت نے شیخ احمد غیاث کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس تنبیہ کے یاد آتے ہی سارہ نے بدحواس ہو کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

عمر شیخ مرزا سمجھ گیا کہ سارہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "میں جانتا ہوں خاتون! بتانے وال[ے] نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں اسی کام سے سمرقند آیا ہوں۔ اب اس بچے کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو[گی] میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

⌘⌘⌘

عمر شیخ مرزا کی رخصت سے پہلے سلطان احمد مرزا نے اپنے چھوٹے بھائی کی گرفتاری کے کئی منصو[بے] بنائے مگر ہر بار اسے یہی محسوس ہوا جیسے نادیدہ ہاتھ اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ سلطان احمد مرزا نے اپنے مشیر[وں] سے اس بات کا ذکر کیا تو سیاسی شعبدہ بازوں کی یہ جماعت بھی خوف زدہ نظر آنے لگی۔

"تو پھر شہزادے کو جانے دیجئے فاتح عالم!" تمام مشیروں نے بیک زبان کہا۔ "جب سے وہ یہاں آ[ئے] ہیں آپ کسی نہ کسی الجھن کا شکار ہیں۔"

شدید نقاہت کے سبب سلطان احمد مرزا اس وقت بھی بستر پر دراز تھا۔ "مگر میں اپنے شکار کو اس طرح [کیسے] جانے دوں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے سپہ سالار فرغل کو طلب کیا اور اسے سمجھانے لگا۔ "تم پانچ ہزار سوار س[اتھ لے کر] عمر شیخ مرزا کا تعاقب کرو۔ پھر جب وہ سمرقند کی حدود سے بہت دور نکل جائے تو اسے اور اس کے سپاہیوں ک[و] تیغ کر ڈالو۔ مگر اس طرح کہ حملے کے وقت تمہارے لباس بدلے ہوئے ہوں۔ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ ح[ملہ] آور سمرقند سے نہیں کسی اور ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔"

سپہ سالار فرغل نے سر اطاعت خم کیا اور الٹے پاؤں خلوت گاہ شاہی سے نکل کر چلا گیا۔

دوسرے دن عمر شیخ مرزا نے نماز فجر ادا کی۔ بڑے بھائی سے مل کر رخصت کی اجازت طلب کی۔ سلط[ان] احمد مرزا نے معذرت چاہی کہ وہ اپنی جسمانی کمزوری کے باعث اسے الوداع کہنے کے لئے قصر شاہی [کے] دروازے تک بھی نہیں جا سکتا۔ عمر شیخ مرزا بڑی گرم جوشی کے ساتھ اپنے برادر بزرگ سے گلے ملا۔ پھر محل [سے] نکل کر شیخ احمد غیاث کی قبر پر حاضر ہوا۔ پھر سارہ کے گھر پہنچا جہاں احمد جمال نئے لباس میں ملبوس سفر کے [لئے] تیار کھڑا تھا۔ عمر شیخ مرزا نے سارہ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ وقت رخصت اپنے جذبات کو قابو میں رکھے ورنہ ا[س] کے آنسو احمد جمال کے پیروں کی زنجیر بن جائیں گے۔ سارہ کئی دن سے ایک مجسمے کی طرح خاموش تھی، مگر ج[ب] عمر شیخ مرزا نے احمد جمال کو اپنی سواری میں بٹھایا تو وہ شیخ زادے کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ ماں کی حالت دیکھ کر احمد جمال بھی مچل گیا۔ پھر بڑی مشکل سے صورت حال قابو میں آئی۔ عمر شیخ مرزا کو احمد جمال [سے] وعدہ کرنا پڑا کہ وہ بہت جلد اپنی ماں سے ملنے کے لئے سمرقند آئے گا۔

پھر جانے والے چلے گئے۔ شکستہ دل سارہ آسمان کی طرف دیکھ کر روتی رہی اور عمر شیخ مرزا بار بار احمد ج[مال] کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب سمرقند کی سرحد ختم ہوئی تو فرغانہ کے حاکم نے پلٹ کر اس طر[ف دیکھا]

تھا جہاں احمد غیاث کی قبر تھی۔

"الفراق! شیخ محترم! الفراق!" عمر شیخ مرزا نے بلند آواز میں کہا اور احمد جمال کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ [دیے]۔

✽

مغل شہزادہ اس راز سے بے خبر تھا کہ پانچ ہزار مسلح سپاہی خونخوار درندوں کی طرح اس کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ عمر شیخ مرزا تو بس ایک خیال کی لذت سے سرشار تھا کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا ہے۔

سمرقند کی سرحد سے بہت دور نکل جانے کے بعد سپہ سالار فرغل نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ عمر شیخ مرزا پر حملہ کر دیں۔ ابھی سلطان احمد مرزا کے سپاہیوں اور عمر شیخ مرزا کے محافظوں میں تقریباً ایک میل کا فاصلہ تھا۔ پھر جیسے ہی سمرقند کے فوجیوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار بڑھائی۔ یکایک تیز ہوا چلنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔ گرد و نواح کے تمام علاقوں کو ایک خوفناک سیاہ آندھی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آن کی آن میں فرغل کے سیکڑوں سپاہی گھوڑوں کی پشت سے گر کر زخمی ہو چکے تھے۔

"اپنا سفر روک دو اور آندھی کے تھم جانے کا انتظار کرو۔" سپہ سالار فرغل نے چیختے ہوئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

پھر جب کئی گھنٹے بعد آندھی رکی اور فضا صاف ہوئی تو سازش کی پوری بساط الٹ چکی تھی۔ فرغل کا خیال تھا کہ عمر شیخ مرزا اور اس کے محافظ بھی یہیں کہیں قریب ہی زخمی حالت میں زمین پر پڑے ہوں گے، لیکن سمرقند کا پورا لشکر اس وقت حیران رہ گیا جب دور دور تک فرغانہ کے سپاہیوں کا پتا نہیں تھا۔

"یہ کیسی آندھی تھی کہ اس نے ہمارے لشکر کو تہ و بالا کر ڈالا مگر دشمنوں کا ایک ایک سپاہی محفوظ رہا۔" سپہ سالار فرغل بہت دیر تک وحشیوں کی طرح بڑبڑاتا رہا۔

پھر جب اس نے سلطان احمد مرزا کو یہ اطلاع دی تو والی سمرقند خوف و دہشت سے لرزنے لگا۔

⌘⌘⌘

سید مہدیؒ کچھ دیر تک سکتے کے سے عالم میں احمد جمال کو دیکھتے رہے۔

احمد جمال حیران و پریشان کبھی ایک فقیر بوریا نشین کو دیکھتا اور کبھی عمر شیخ مرزا کو، اس کی معصوم آنکھوں میں بیک وقت کئی سوال ابھر رہے تھے۔ عمر شیخ مرزا احمد جمال کی ذہنی کشمکش کو سمجھ گیا۔ پھر اس نے جھک کر سرگوشی کی۔ "شیخ زادے! یہی ہیں تمہارے والد محترم کے دوست!"

احمد جمال نے چند قدم آگے بڑھ کر سید مہدیؒ کو سلام کیا۔ سید مہدیؒ بے قرار ہو کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے اور احمد جمال کو اس طرح گلے لگا لیا جیسے کئی دن کا پیاسا پانی کے برتن کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا ہے۔ آج سید کو اپنے جذبوں پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار احمد جمال کی پیشانی، رخساروں اور ہاتھوں کو چوم رہے تھے۔ پھر یکایک کھڑے ہوئے اور چمکتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"آفتاب فرغانہ کی زمین پر اتر آیا ہے۔ اب یہاں کبھی اندھیرا نہیں ہوگا۔"

پھر مختصر سے سکوت کے بعد سید مہدیؒ فرغانہ کے مشیر خاص سے مخاطب ہوئے۔ "یہ بڑے عالم و فاضل باپ کا بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھنا۔"

''سید عالی مرتبت! آپ مطمئن رہیں۔'' مولانا قاضی نے سر کو خم کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ایک ہاتھ میں کتاب دینا اور دوسرے میں شمشیر!'' سید مہدیؒ نے مولانا قاضی کو ہدایت کی پھر احمد جمال کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بولے۔ ''جاؤ شہزادے! تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔''

احمد جمال سید مہدیؒ کے لئے اپنے دل میں عجیب سی قربت محسوس کر رہا تھا۔ ''آپ میرے والد دوست ہیں' پھر میں کہاں جاؤں؟ آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔''

''شہزادے جھونپڑیوں میں نہیں رہتے۔'' سید مہدیؒ نے بڑی محبت سے احمد جمال کے رخساروں کو چھ ہوئے کہا۔ ''تم مجھ سے دور کب رہو گے؟ میں خود روزانہ اپنے شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا کروں گا۔''

⌑ ⌑ ⌑

قصر شاہی میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ جو بھی احمد جمال کو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ سید مہدیؒ نے ہی کہا تھا کہ سورج فرغانہ کی زمین پر اتر آیا ہے۔ شاہی خاندان کے افراد اور قلعہ کے سارے مکین گھنٹوں جمال کا چہرہ دیکھتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اتنا خوبصورت بچہ نہیں دیکھا تھا۔ قتلغ خانم کے مرحوم مونس خان کی چھ سالہ بچی عالیہ تاجدار خانم پہلے دن سے ہی احمد جمال کے قریب رہنے لگی تھی جیسے اسے ساتھی مل گیا ہو۔

عمر شیخ مرزا بھی ناقابل بیان خوشی محسوس کر رہا تھا اور اس نے احمد جمال کی نگہداشت کے لئے کئی خ گار وقف کر دیئے تھے۔

بس ایک قتلغ خانم تھی' جس نے احمد جمال کو دیکھ کر اپنے دل میں ایک عجیب سے خلش محسوس کی تھی ا یہی خلش بڑھتے بڑھتے ناپسندیدگی کا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ وہ اکثر انتہائی تلخ لہجے میں شوہر سے شکایت ''کیا مجھ جیسے اعلیٰ نسب خاتون کو تخت کے وارث کے لئے ایک ایسے بچے کا احسان مند ہونا پڑے گا کہ جس کوئی خاندان ہے' نہ کوئی نام' نہ کوئی نسب یہ سید مہدیؒ نے ہمیں کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہم اپنی ؟ کی خدمت کرتے رہیں اور پھر اس خدمت گزاری کا صلہ کیا ہے؟ احمد جمال کو یہاں آئے ہوئے تین س چکے ہیں مگر تخت کا وارث؟''

عمر شیخ مرزا قتلغ خانم کی تلخ گفتگو سن کر گھبرا جاتا۔ ''ملکہ فرغانہ خدا کے لئے اپنی زبان پر قابو رکھو! احمد بے نسب نہیں' شیخ زادہ ہے۔''

''ایسے بے شمار شیخ زادے میرے باپ دادا کی روٹیوں پر پلا کرتے ہیں۔'' اولاد سے محرومی کے ا نے قتلغ خانم کو اس قدر سخت مزاج بنا دیا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غضب ناک ہو جاتی تھی۔ ''یہ ش نہیں' منحوس زادہ ہے۔ اگر یہ اتنا ہی سعید ہوتا تو پیدا ہوتے ہی اس کا باپ کیوں قتل ہو جاتا' اسے لے جا پاگل سید کی جھونپڑی میں چھوڑ آیئے۔ اس کی ذات سے وابستہ تمام برکتیں اسی دیوانے کو مبارک ہوں، سے یہاں آیا ہے میرے محل کی ویرانیاں کچھ اور بڑھ گئی ہیں۔''

بیوی کے لہجے کی زہرناکی اور مزاج کی برہمی دیکھ کر عمر شیخ مرزا خاموش ہو جاتا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اب احمد جمال چودہ سال کا ہو چکا تھا۔ سات سال کے عرصے میں اس ـ

قاضی سے مختلف علوم سیکھے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ فنون جنگ کی بھی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ شہزادیاں اور امراء کی لڑکیاں اس کی قربت کے بہانے ڈھونڈتی تھیں مگر احمد جمال عالیہ تاجدار خانم کے سوا کسی دوشیزہ سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا اور یہ تعلق بھی بچپن کی طویل رفاقت کے سبب تھا' البتہ عالیہ تاجدار خانم قصر شاہی کی رنگین فضاؤں سے متاثر ہو کر احمد جمال کی محبت کے خواب دیکھنے لگی تھی۔

قتلغ خانم نے اپنی بھتیجی کی نگاہوں کا بدلہ ہوا زاویہ دیکھ لیا تھا اور وہ بار بار اسے احمد جمال کے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔ اتفاق سے ایک دن احمد جمال نے بھی ملکہ فرغانہ کے تحقیر آمیز الفاظ سن لئے۔ قتلغ خانم عالیہ کو انتہائی سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ قصر شاہی کا پروردہ ایک غلام زادہ ہے تجھے زیب نہیں دیتا کہ تو اس کی قربت تلاش کرنے کے لئے اپنے منصب سے گر جائے اور وقار شاہی کو داغ دار کر ڈالے۔''

''ملکہ معظمہ!'' عالیہ تاجدار خانم نے مؤدب اور شائستہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے احمد جمال سب سے زیادہ عزیز ہے میں اس سے ترک تعلق نہیں کر سکتی اور جہاں تک وقار شاہی کا سوال ہے تو میں اپنے منصب کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہوں۔''

قتلغ خانم نے عالیہ کے جذبوں کی سچائی اور لہجے کی بے باکی کو شرمناک قرار دیا اور اتنی طاقت سے اپنی بھتیجی کے تھپڑ مارا کہ اس کے گلاب جیسے رخساروں پر نیلے نشانات ابھر آئے۔

اس واقعہ نے احمد جمال کی پرسکون زندگی میں ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ اسی روز سید مہدیؒ سے ملا اور عرض کرنے لگا۔ ''بابا! مجھے بتایئے کہ میں کون ہوں ملکہ فرغانہ نے میرے باپ کے ساتھ غلامی کا رشتہ جوڑ دیا ہے۔''

سید مہدیؒ شروع میں روزانہ احمد جمال سے ملنے کے لئے قصر شاہی تشریف لے جاتے تھے مگر قتلغ خانم کا متکبرانہ سلوک دیکھ کر وہ الٹے قدم لوٹ آتے تھے۔ اب کئی سال سے احمد جمال ہی ان سے ملنے آتا تھا اس دوران کئی بار عمر شیخ مرزا نے سید مہدیؒ کے انداز تغافل کی شکایت کی تو انہوں نے کہہ کر ٹال دیا کہ اب وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے کئی میل کا پیدل سفر کرنے سے قاصر ہیں پھر والیٔ فرغانہ نے اپنی محرومی کا ذکر کیا تو سید فرمانے لگے۔ ''پہلے ملکہ عالیہ اپنے دل سے حسد کا غبار تو دھو ڈالیں پھر تخت کا وارث بھی دنیا میں آ جائے گا''

عمر شیخ مرزا نے قتلغ خانم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی' مگر احساس برتری میں مبتلا عورت نے اپنے کان بند کر لئے تھے اور وہ احمد جمال کو منحوس اور سید مہدیؒ کو ایک شعبدہ باز بوڑھا ہی کہتی رہتی تھی۔ عمر شیخ مرزا اپنی ازدواجی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لئے خاموش ہو جاتا اور قتلغ خانم حسد اور محرومی کی آگ میں دن رات جلتی رہتی۔

سید مہدیؒ کو اندازہ نہیں تھا کہ احمد جمال کے سینے میں اٹھنے والا طوفان اتنی شدت اختیار کر جائے گا آخر انہیں شیخ احمد غیاث کے بیٹے کو سب کچھ بتانا پڑا۔ ''مگر شہزادے! تم کسی سے انتقام نہ لینا یہ تمہارے گھرانے کی روایتوں کی شایان شان نہیں' عمر شیخ مرزا ایک شریف النفس انسان ہے تم اسے چھوڑ کر نہ جانا کہ اللہ اپنے رازوں کو بہتر جانتا ہے تمہیں کسی اور ہی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ قتلغ خانم جیسی کم ظرف عورتوں کی طعنہ زنی سے گھبرا کر اپنا راستہ نہ بدل دینا بس تمہارے بابا کی یہی نصیحت ہے اور یہی وصیت ہے۔''

پھر فرغانہ کے وارث کی آمد کے آثار نمایاں ہونے لگے قصر شاہی خوشی کے شادیانوں سے گونج اٹھا کیف و نشاط کا ہنگامہ خیز رقص شروع ہوگیا۔ عمر شیخ مرزا نے سید کی خدمت میں حاضر ہو کر شکریہ ادا کیا کہ ان دعاؤں کے بار آور ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔

''تو نے بہت صبر کیا ہے عمر شیخ مرزا!'' سید مہدیؒ کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''عدل و انصاف اور صلہ رحمی سے کام لینا پھر اللہ تجھے بے نشان ہونے سے بچا لے گا۔''

⌑ ⌑ ⌑

پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا قتلغ خانم اذیت ناک وسوسوں کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ اب اسے ایک خیال پریشان کر رہا تھا کہ دنیا میں آنے والا بچہ تاج فرغانہ کا وارث ہو یا پھر......؟ قتلغ خانم اس سے آگے سوچ ہوئے لرز جاتی تھی اگر ملکہ فرغانہ کے بطن سے کوئی لڑکی پیدا ہو جاتی تو یہ کوئی انوکھا واقعہ نہ ہوتا۔ دنیا میں ہزاروں ایسی مثالیں موجود تھیں کہ طویل انتظار کے بعد ماؤں کی ویران آغوش تو آباد ہوگئی' مگر وہ اولاد نرینہ سے محروم رہیں۔ قتلغ خانم بھی یہ سوچ کر دحشت زدہ ہو جاتی عمر شیخ مرزا اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا لیکن سالہا سال تک مایوسیوں کے حصار میں قید رہنے کی وجہ سے قتلغ خانم نفسیاتی خلل میں مبتلا ہوگئی تھی۔

پھر ایک دن احمد جمال سید مہدیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو سید خلاف عادت بہت اداس نظر آرہے تھے۔ احمد جمال نے اداسی کا سبب پوچھا تو سید مہدیؒ نے ناسازی طبع کا بہانہ کر دیا پھر اچانک اٹھے اور لکڑی کے ایک صندوق میں سے قلم دوات نکال کر لائے۔ احمد جمال بڑی حیرت سے سید کے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ سید ایک کھال نما کاغذ پر کچھ تحریر کرتے رہے پھر اس کاغذ کو تہہ کر کے احمد جمال کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمانے لگے۔

''شہزادے! اس کاغذ کو کسی مضبوط چمڑے کے غلاف میں محفوظ کر لینا اور اس کی بہت حفاظت کرنا۔ جب فرغانہ کے تخت کا وارث ہر طرف سے آفات و مصائب میں گھر جائے تو میری یہ تحریر اس کے حوالے دینا۔''

''بابا! ابھی تو فرغانہ کا وارث دنیا میں آیا بھی نہیں ہے۔'' احمد جمال نے حیران ہو کر کہا۔

''شہزادے! تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اسے غور سے سنو!'' سید مہدیؒ نے مشفقانہ انداز میں احمد جمال کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بزرگوں کے احکام پر اپنی قیاس آرائیاں مسلط نہ کیا کرو یہ بری عادت ہے۔''

احمد جمال نے سر جھکا لیا وہ شدید ندامت محسوس کر رہا تھا۔

پھر سید نے احمد جمال کو اس طرح رخصت کیا کہ بہت دیر تک اسے سینے سے لگا کر پیار کرتے رہے آخر میں اپنی دستار اتار کر شیخ زادے کے سر پر باندھ دی۔ ''اس بوسیدہ اور کم قیمت کپڑے کی حفاظت کرنا۔ شہزادے یہی تمہارا تاج ہے اور یہی تمہاری خلعت شاہی ہے۔''

احمد جمال کے لئے یہ سب کچھ بہت غیر معمولی تھا' مگر وہ سید مہدیؒ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

پھر دوسرے دن شاہی نقاروں پر ایسی ضرب پڑی کہ شہر کی فضاء لرز اٹھی شادی کے پندرہ سال بعد قتلغ خانم کے یہاں ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا تھا۔

عمر شیخ مرزا پر بہت دیر تک وارفتگی کی سی کیفیت طاری رہی' پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سید مہدیؒ کی قیام گاہ پر پہنچا۔ جھونپڑی کا دروازہ بند تھا۔ والیٔ فرغانہ نے با آواز بلند اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی' مگر جب طویل انتظار کے بعد سید کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو عمر شیخ مرزا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سید مہدیؒ بوریے کی چٹائی پر اس طرح لیٹے تھے جیسے وہ گہری نیند سو رہے ہوں۔

''سید! آپ کی دعائیں قبول ہوگئیں اور فرغانہ کا وارث منتظر ہے کہ آپ اس کے کان میں اذان دیں۔'' ...ل جذبات سے عمر شیخ مرزا کی آواز لرز رہی تھی۔

بار بار پکارنے کے باوجود جب سید مہدیؒ کی طرف سے جواب نہیں آیا تو عمر شیخ مرزا نے سید کے پیروں کو ...وا۔ سید کا جسم بہت زیادہ سخت محسوس ہو رہا تھا۔ عمر شیخ کانپتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے سید مہدیؒ کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

سید مہدیؒ کے دونوں ہاتھ اس طرح بندھے ہوئے تھے' جیسے کوئی اہل ایمان نماز ادا کرتا ہے۔ ان کے ...نٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور نیم باز آنکھوں کے زاویے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی دلکش ...ین منظر دیکھ رہے ہیں۔

عمر شیخ مرزا کچھ دیر تک سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہا پھر بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ...مہدیؒ بڑی خاموشی کے ساتھ اس دار فانی سے رخصت ہوگئے تھے۔

⌑ ⌑ ⌑

سید مہدیؒ تمام عمر خاموش رہے اور خاموشی ہی کے ساتھ دنیا سے گزر گئے۔ اہل شہر کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہاں کون آیا تھا اور کون چلا گیا؟ مولانا قاضی سید کے مقام سے کسی قدر واقف تھے' اس لئے ان کی موت کی خبر سن کر بے قرار ہوگئے اور انتہائی دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگے۔

''آج فرغانہ ایک مرد بزرگ کی موجودگی کی سعادت سے محروم ہوگیا۔''

عمر شیخ مرزا بہت مضطرب تھا۔ بار بار سید مہدیؒ کے بے جان جسم کی طرف دیکھتا اور آہ زاری کرتے ہوئے کہتا...... ''سید! یہ کیسی خوشی ہے کہ اپنے وارث کا استقبال کروں اور آپ کو قبر میں اتار دوں۔''

احمد جمال کی حالت عمر شیخ مرزا سے بھی زیادہ شکستہ تھی۔ وہ غم سے نڈھال تھا اور سید مہدیؒ کے قدموں سے لپٹا رو رہا تھا...... ''بابا! اگر آپ کو ایسے ہی چلا جانا تھا تو پھر مجھے سمرقند سے یہاں کیوں بلایا تھا؟'' احمد جمال کو محسوس ہوا جیسے وہ دوسری بار یتیم ہوگیا ہے۔ یتیمی کا پہلا زخم اسے یاد نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ محض ڈیڑھ سال کا ایک بے جان اور بے شعور بچہ تھا...... مگر دوسرا زخم تو عین عالم شباب میں اس کے سینے پر لگا تھا۔ احمد جمال سے اس زخم کی خلش برداشت نہیں ہو رہی تھی...... ''مجھے زنجیریں پہنا دیں اور خود چلے گئے۔ یہ کیسی ناانصافی ہے اور یہ کیسا ظلم ہے؟''

عمر شیخ مرزا زنجیروں کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ وہ تو احمد جمال کی چیخیں سن کر بدحواس ہوگیا تھا...... ''صبر کرو شیخ زادے! اللہ کی یہی مرضی تھی۔ اگر تم اسی طرح روتے رہے تو پورا فرغانہ تمہارے آنسوؤں میں غرق ہو جائے گا۔''

عمر شیخ مرزا کے لہجے میں بڑی شفقت اور بے ساختگی تھی۔ احمد جمال اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

پھر سید مہدیؒ کو ان ہی کی جھونپڑی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ عمر شیخ مرزا سید کی قبر پر ایک شاندار عمارت تعمیر کرانا چاہتا تھا' مگر اس نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ سید والیٔ فرغانہ کو سخت لہجے میں تنبیہ کر رہے تھے۔

''مجھے یوں ہی بے نشان رہنے دے۔''

قتلغ خانم نے بھی سید مہدیؒ کے انتقال کی خبر سنی تھی' مگر اسے کوئی صدمہ نہیں ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی سید کے لئے اپنے دل میں کدورت رکھتی تھی۔ پھر بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں اسے اتنا بھی ہوش نہیں رہا کہ کس کی دعاؤں اور برکتوں سے فرغانہ کے تخت کا وارث اس دنیا میں آیا ہے؟

سید کے انتقال کے بعد احمد جمال کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ جب سے اس نے اپنے بارے میں قتلغ خانم کے تحقیر آمیز کلمات سنے تھے۔ وہ بہت اداس رہنے لگا تھا۔ اگر سید مہدیؒ اسے قصر شاہی میں رہنے کے لئے پابند

...ہے تو وہ عیش و آسائش کی بھرپور زندگی چھوڑ کر کبھی کا اپنی غریب ماں سارہ کے پاس سمرقند جا چکا ہوتا۔ پھر ...ہ مہدیؒ بھی دنیا سے رخصت ہوگئے تو پندرہ سالہ احمد جمال پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ کسی جلتے ہوئے ...ی طرح بجھا' پھر اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ٹھنڈی راکھ کا ایک ڈھیر ہے۔

...یسے ہی اذیت ناک لمحوں میں قتلغ خانم کی بھتیجی عالیہ تاجدار خانم اس کے قریب آئی...... ''احمد! میں سید بابا ...ت پر دلی تعزیت پیش کرتی ہوں۔ مجھے اپنے ماں باپ یاد نہیں' اس لئے میں بھی بابا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ...''

عالیہ احمد جمال کی ہم عمر تھی' اسی وجہ سے وہ اسے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب کرتی تھی۔ احمد جمال اپنے ...وش سے بے خبر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے عالیہ تاجدار خانم کے لہجے کی شکستگی پر چونک جانا پڑا۔ احمد جمال ...ڑی حیرت سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا آبشار جاری تھا اور اس کے گلرنگ ...و گرم ہوا کے تیز جھونکوں نے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

عالیہ کی یہ حالت دیکھ کر احمد جمال بے قرار ہوگیا مگر اچانک اسے قتلغ خانم کا ذلت آمیز سلوک یاد آگیا......

''...الیہ! تم ایک غلام زادے کے پاس مت آیا کرو۔'' ...... یکا یک احمد جمال نے بچپن کے ساتھ سے اجنبیت ...ار کر لی تھی۔

''احمد! تم غلام زادے نہیں ہو۔'' ...... عالیہ کی لرزتی ہوئی آواز میں بڑی اپنائیت تھی...... ''حقیقتاً تم ہی ...ادے ہو' غلام تو ہم لوگ ہیں۔''

''تم کیا جانو کہ میں کون ہوں؟'' احمد جمال نے عالیہ تاجدار خانم کے اس طرز تخاطب کو بھی طنز کا ایک ...از سمجھا تھا۔

''میں نہیں جانوں گی پھر کون جانے گا؟'' آج عالیہ عجیب سے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ''مجھے سید بابا ...نے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

فرط حیرت سے احمد جمال کی آنکھیں کچھ اور کشادہ ہوگئی تھیں...... ''کیا تم میرے بابا سے ملتی رہی ہو؟'' ...د جمال کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''ہاں! تمہاری خاطر مجھے سید بابا کے پاس جانا پڑا۔'' آج عالیہ خانم نے بڑے معصومانہ انداز میں اپنی ...بت کا اظہار کر دیا تھا۔

''تو پھر تم یہ بھی سن لو کہ اگر بابا نے مجھ پر پابندی عائد نہ کر دی ہوتی تو میں نفرتوں کے اس جہنم سے بہت ...ور جا چکا ہوتا۔'' چند لمحوں کے لئے احمد جمال کو عالیہ کی طلب و جستجو پر حیرت ہوئی تھی' مگر اس کے لہجے میں وہی ...لخی پوشیدہ تھی۔

''بابا کا حکم ہے کہ تمہیں اسی جہنم میں رہنا ہوگا۔'' عالیہ تاجدار خانم بڑے اثر انگیز لہجے میں بول رہی تھی۔ ''اور اگر خدانخواستہ تم نافرمانی کے مرتکب ہو کر اس جہنم سے نکل گئے' تب بھی میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔''

اگرچہ عالیہ خانم احمد جمال کی ہم عمر تھی' لیکن ذہنی اور دیگر فنون کی کتابوں کے مطالعے نے اسے اپنے سن و سال ...ے مقابلے میں زیادہ ہوشیار و تجربہ کار بنا دیا تھا۔

''میں کسی کی قربت گوارہ نہیں کرتا......'' احمد جمال کے لہجے سے وہی مردم بیزاری کا رنگ جھلک رہا تھا۔

''احمد! تم صرف اپنے فعل کے ذمے دار ہو۔'' عالیہ تاجدار خانم کے لفظوں میں بڑی گہرائی تھی۔ ایسا لگ

رہا تھا جیسے پندرہ سالہ دوشیزہ کے اندر ایک جاں نثار عورت بیدار ہوگئی ہو۔ ''تم کسی دوسرے کے جذبوں کو پابند کرنے کا حق نہیں رکھتے۔''

''عالیہ! تم نہیں جانتیں کہ اہل اقتدار نے میرے بے گناہ باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟'' احمد جمال پھر اپنے ماضی کی طرف لوٹ گیا اور اس کے ہونٹوں سے آگ برسنے لگی۔

''گزرے زمانے کو بھول جاؤ احمد!'' خانم نے تلخیوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کو محبت کی پھوار سے بجھانے کی ناکام کوشش کی...... ''حال کی طرف دیکھو اور مستقبل پر نظر رکھو۔''

''مجھے نہ حال کا اعتبار ہے اور نہ مستقبل کا۔'' احمد جمال عذاب ناک یادوں کی گرفت سے نکلنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ''اب میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ تم پر بھی نہیں۔'' احمد جمال نے عالیہ تاجدار خانم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے عالیہ کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور اس کے تابناک چہرے پر اذیت و کرب کے تاریک سائے پھیل گئے' مگر اس بلند حوصلہ لڑکی نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ''احمد! خدا کی یہ وسیع و عریض دنیا ابھی اہل وفا سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ بہت جلد تمہیں اعتبار بھی آجائے گا۔'' یہ کہہ کر عالیہ تاجدار خانم چلی گئی اور احمد جمال حیرت سے اس کم سن دوشیزہ کو دیکھتا رہ گیا' جو اپنے قد اور ذہنی سطح سے زیادہ بلند باتیں کر رہی تھی۔

⌑ ⌑ ⌑

عمر شیخ مرزا کئی دن سے احمد جمال کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ اس نے بارہا نہایت مشفقانہ لہجے میں احمد جمال کو تسلیاں دی تھیں' مگر احمد جمال کی اداسیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ فرغانہ کے وارث کی آمد پر قصر شاہی میں ایک ہنگامہ خیز جشن برپا تھا' لیکن احمد جمال محل کے ایک گوشے میں الگ تھلگ بیٹھا در و دیوار کو تکتا رہتا پھر سبزہ زار میں آ کر نیلگوں آسمان کو گھورتا رہتا۔ جیسے وہ فلک کی وسعتوں میں کسی گمشدہ شے کو تلاش کر رہا ہے۔

آخر جب ایک دن عمر شیخ مرزا سے احمد جمال کی یہ حالت برداشت نہ ہو سکی تو اس نے شیخ احمد غیاث کے حساس فرزند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ زادے! آخر وہ کون سا غم ہے جس نے تم سے تمہارے روز و شب کی ساری رعنائیاں چھین لی ہیں؟ کیا قصر شاہی کے کسی مکین نے تمہیں کوئی آزار پہنچایا ہے؟''

احمد جمال اس وقت درختوں کے ایک کنج میں خاموش بیٹھا تھا۔ والیٔ فرغانہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر عمر شیخ مرزا کا سوال سن کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ نہیں صاحب عالم! بس بابا کی یاد ستا رہی تھی' مجھے کیسے نازک وقت میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے؟'' احمد جمال جبراً مسکرایا مگر اسے اپنے لہجے کی شکستگی پر قابو نہیں تھا۔

''تم تنہا کہاں ہو فرزند؟'' عمر شیخ مرزا نے آگے بڑھ کر احمد جمال کو گلے سے لگایا۔ ''اگرچہ میں تمہارا باپ نہیں ہوں لیکن پھر بھی کیا تمہیں اس سینے میں باپ کی محبت کی گرمی محسوس نہیں ہوئی؟''

''بے شک! آپ نے ایک یتیم بچے کو اتنا دیا کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر بابا کی بات اور تھی۔''

وہ مجھے سب کچھ دے گئے۔''
وال رک رک کر بول رہا تھا۔ ''ان کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں تھا لیکن
لمحوں کے لئے عمر شیخ مرزا سناٹے میں آگیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ احساس یتیمی کا بیج
ر ایک تناور درخت بن چکا ہے اور اس کی جڑیں احمد جمال کے دل و دماغ سے گزر کے اس کی روح کی
ہوں تک اتر گئی ہیں۔ حاکم فرغانہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ سات آٹھ سال تک شدید غربت و افلاس کی فضاء میں
ل پانے والا بچہ' قصر شاہی کی پرکیف زندگی سے اس قدر مطمئن ہو گیا ہوگا کہ اس کے ذہن میں عذاب ناک
ل کی کوئی دھندلی سی یاد بھی محفوظ نہیں ہوگی ...... مگر آج احمد جمال کی مبہم گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ پندرہ
گزر جانے کے باوجود وہ روز اول کی طرح غموں کی رہ گزر پر تنہا کھڑا ہے۔ عمر شیخ مرزا احمد جمال سے پوچھنا
تھا کہ آخر سید مہدیؒ نے اسے کونسی نعمت بے بہا بخشی ہے اور قصر شاہی نے اس کے ساتھ کس بدسلوکی کا
ہرہ کیا ہے؟ لیکن حاکم فرغانہ وقت کی نزاکت کو دیکھ کر بات بدل گیا۔
''فرزند! تم نے ابھی تک اپنے چھوٹے بھائی کو بھی نہیں دیکھا ہے۔'' عمر شیخ مرزا نے احمد جمال کے
باروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''صاحب عالم! میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔'' احمد جمال نے اسی بے دلی کے ساتھ جواب دیا۔ ''نہ ماں ہیں'
اپ' نہ کوئی عزیز' نہ رشتے دار...... میں تو تنہا ہوں اور اس محل میں میری حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہیں۔''
اب عمر شیخ مرزا احمد جمال سے تفصیلی گفتگو کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ''احمد! آج تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ آخر
ری محبت میں کیا کمی رہ گئی ہے؟ وہ کون ہے جس نے تمہارے دل و دماغ میں نفرتوں اور تلخیوں کا زہر بھر دیا
ہے؟''
احمد جمال کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے عمر شیخ مرزا کے سامنے اپنے دل کا بارگراں اتار
دیا۔ ''صاحب عالم! مجھے پتا نہیں تھا کہ میں آٹھ سال سے اپنے باپ کے قاتلوں کی بھیک پر پل رہا ہوں۔''
عمر شیخ مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو فرزند؟'' حاکم فرغانہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ''تم
سے کس نے کہا کہ قصر شاہی کے مکین تمہارے باپ کے قاتل ہیں؟''
احمد جمال نے قتلغ خانم کی تمام ذلت آمیز گفتگو عمر شیخ مرزا کے سامنے دہراتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک منحوس
اور لعنت زدہ بچہ ہوں۔ صاحب عالم! اب مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں اپنی ذات سے وابستہ لعنت اور نحوست کو
یہاں سے بہت دور لے جاؤں۔ بس میں اسی دن کا انتظار کر رہا تھا کہ تاج فرغانہ کا وارث دنیا میں آجائے۔ اللہ
نے آپ کو بامراد کیا۔ ملکہ عالیہ کو فرزند بلند اقبال مبارک ہو' میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مبارکباد دینا
چاہتا تھا' مگر اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں میری بدبختیوں کا سایہ شہزادے پر نہ پڑ جائے۔''
عمر شیخ مرزا ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ احمد جمال حرف بہ حرف سچ بول
رہا ہے۔ متکبرانہ فطرت نے قتلغ خانم کو ایک تند مزاج خاتون بنا دیا تھا۔ اس کی زبان آگ کی زبان تھی اور اسی
آتش نوائی نے بارہا احمد جمال کے لباس وقار کو جلانے کی کوشش کی تھی۔ بیک وقت کئی مسائل الجھ کر رہ گئے تھے۔
عمر شیخ مرزا بڑی ذہانت سے انہیں سلجھانا چاہتا تھا...... ''فرزند! جب تم اپنی زندگی کے سب سے اذیت ناک واقعہ
سے باخبر ہو ہی چکے ہو تو پھر یہ بھی سن لو کہ میں تمہارے محترم باپ کا قاتل نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سید
مہدیؒ نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ میں اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے تمہیں فرغانہ لایا تھا۔

اپنے ذہن پر زور دے کر یاد کرو میں نے گزشتہ آٹھ سالوں میں کبھی تمہیں ڈانٹا' کبھی تم پر ہاتھ اٹھایا' کبھی کوئی سرزنش کی' ایک بچے کی حیثیت سے تم نے بہت سی غلطیاں کیں مگر میں نے کبھی اونچے لہجے میں باز پرس نہیں کی کہ کہیں تمہارے دل کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔

یاد کرو میرے بیٹے! یاد کرو۔'' عمر شیخ مرزا نے بے قرار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ احمد جمال کے کاندھوں پر رکھ دیئے۔ ''کیا کسی آقا کا طرز عمل ایسا ہوتا ہے؟ اور کیا کسی غلام کی ناز برداریاں اس طرح کی جاتی ہیں؟ مجھے بتاؤ فرزند! مجھے بتاؤ۔''

''نہیں صاحب عالم! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' عمر شیخ مرزا کی جذباتی کیفیت دیکھ کر احمد جمال بھی مضطرب ہو گیا تھا۔

''پھر مجھے دوسروں کے گناہوں کی سزا کیوں دے رہے ہو؟'' شدت جذبات سے عمر شیخ مرزا کی آنکھیں چھلکنے لگی تھی۔ ''فاتح عالم ابوسعید مرزا کے حکم پر تمہارے والد محترم قتل کئے گئے اور ملکہ فرغانہ نے تمہیں نحوست و بد بختی کا طعنہ دیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے بتاؤ!''

''نہیں! خدا کی قسم! آپ کا کوئی جرم نہیں!'' عمر شیخ مرزا کے جذبوں کی وارفتگی نے احمد جمال کی آنکھیں بھی نم آلود کر دی تھیں۔ ''آپ بہت شفیق و مہربان شخص ہیں۔ مجھے کبھی کبھی آپ کی ذات میں اپنے باپ کا عکس دکھائی دیتا ہے۔''

''پھر اپنے باپ کو چھوڑ کر کیوں جانا چاہتے ہو؟'' عمر شیخ مرزا جمال کو گلے لگا کر زار و قطار رونے لگا۔

احمد جمال سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ خود بھی عمر شیخ مرزا کے سینے میں منہ چھپا کر سسکنے لگا۔

''کیا سید نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم قصر شاہی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے؟'' عمر شیخ مرزا نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

احمد جمال نے گھبرا کر سر اٹھایا اور اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''بابا کے حکم کی زنجیر ہی تو میرے پیروں میں پڑی ہوئی ہے۔''

''اس کے باوجود تم فرغانہ کی سرحدوں سے بہت دور جانا چاہتے ہو؟'' عمر شیخ مرزا کے لہجے میں شدید کرب بھی تھا اور شکایت بھی۔

''صاحب عالم! آپ نہیں جانتے کہ ملکہ عالیہ مجھ سے کیا سلوک روا رکھتی ہیں؟'' احمد جمال کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے تپتے ہوئے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

''کیا تم میری خاطر لفظوں کے یہ نشتر برداشت نہیں کر سکتے؟'' عمر شیخ مرزا کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی۔

''میں ملکہ عالیہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ ان کی ویران آغوش غنچہ نو شگفتہ سے بھر گئی ہے میرا خیال ہے کہ اب وہ اس تلخ کلامی سے باز آ جائیں گی۔''

⌑ ⌑ ⌑

پھر جب احمد جمال عمر شیخ مرزا کے ہمراہ شاہی حرم سرا میں پہنچا تو ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ خواتین کو ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک اندھیری رات کے پردے سے ماہتاب نکل آیا ہو' احمد جمال ہمیشہ حرم سرا کی طرف

۔ گریزاں رہتا تھا۔ اسے قدم قدم پر نئے نئے فتنوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ خاندان تیموری کی جواں سال امیر زادیاں اور محل کی خواصیں ہر وقت اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے بہانے تلاش کرتی رہتی ۔ وہ مجبوراً عمر شیخ مرزا کے ساتھ حرم سرا کی طرف آیا تھا۔ جہاں فرغانہ کے وارث کو دیکھنے کے لئے ۔ ہام تھا۔ احمد جمال پر نظر پڑتے ہی نازنینوں کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ بہت سے دلوں میں سرکش لمنے لگے مگر احمد جمال اپنے اطراف سے بے خبر تخت فرغانہ کے وارث کو دیکھنے رکا جو آنکھیں بند کئے اپنی خانم کے پہلو میں سو رہا تھا۔

''ملکہ عالیہ کو فرزند بلند اقبال مبارک ہو۔'' احمد جمال نے انتہائی شائستہ لہجے میں قتلغ خانم کو مخاطب کرتے ۔ رض کیا۔

ملکہ فرغانہ کے ہونٹوں پر ایک بے رنگ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے آمرانہ انداز میں سر کو ہلکی سے جنبش ۔ ے احمد جمال کی مبارک باد قبول کی..... مگر دوسرے ہی لمحے خانم کی نظر اپنے نومولود فرزند پر گئی اور پھر ۔ چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ کبھی وہ تخت فرغانہ کے وارث کو دیکھتی اور کبھی احمد جمال کو۔ عمر شیخ مرزا کے بیٹے کا رنگ سرخ و سفید تھا اور نقش و نگار بھی دلکش تھے' مگر وہ احمد جمال جیسا حسین نہیں تھا۔ قتلغ خانم کچھ دیر تک دونوں کا ۔ رتی رہی' لیکن جب اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ احمد جمال اس کے بیٹے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ۔ شخصیت رکھتا ہے تو ایک تنگ نظر عورت کی طرح خانم کا فطری حسد بیدار ہو گیا اور پھر اس نے احمد جمال ۔ طرف سے منہ پھیر لیا۔ احمد جمال سمجھ بھی نہ سکا کہ ملکہ فرغانہ کی اس حرکت کا کیا مفہوم تھا؟ وہ تو محض اس ۔ ے بہل گیا کہ فرغانہ کو پندرہ سال کی طویل محرومی کے بعد اس کا وارث مل گیا تھا۔ اس وارث کا نام محمد بابر ۔ ار کھا گیا۔

⌑ ⌑ ⌑

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ بابر مرزا اب چھ سال کا ہو گیا تھا۔ خوبصورت نقش و نگار رکھنے والا ایک ذہین ۔ یکھنے والوں کو بابر کا عہد طفلی بہت زیادہ غیر معمولی نظر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں ۔ یہ تھی کہ وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا۔ مست ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ کر وہ اس طرح خوش ہوتا جیسے دو بلیاں آپس ۔ لڑ رہی ہوں۔ حالانکہ بابر کی عمر کے دوسرے بچے ہاتھیوں کی چنگھاڑ سن کر اپنے باپوں کی گود میں خوف سے ۔ م جاتے تھے۔ وہ اس قدر نو عمری میں اتنے اعتماد سے گھوڑے کی پشت پر بیٹھتا جیسے وہ کوئی تجربہ کار اور عمر ۔ شہسوار ہو۔ شمشیر زنی کی تربیت حاصل کرتے وقت بابر اس طرح تلوار پکڑتا جیسے وہ خود اس فن کا استاد ہو ۔ اس کو سکھانے والا ایک نو آموز شاگرد۔ بابر مرزا کی یہ استقامت دیکھ کر مولانا قاضی اکثر عمر شیخ مرزا سے ۔ ہتے۔

''صاحب عالم! خدا شہزادے کو نظر بد سے بچائے' ان کی رفتار و گفتار میں بڑے حکمرانوں کی سی شان نظر ۔ تی ہے۔''

مولانا قاضی جیسے عالم و فاضل انسان کی زبان سے اپنے بیٹے کے لئے تعریفی کلمات سن کر عمر شیخ مرزا باآواز ۔ ند خالق کائنات کا شکر ادا کرتا اور تقریباً روزانہ ہی بابر کی نذر اتاری جاتی اور غریبوں میں صدقات تقسیم کئے

جاتے۔

بابر مرزا کا فطری رجحان بھی بڑا عجیب تھا۔ ایک طرف وہ مولانا قاضی سے سیاست و مذہب کی تعلیم حاصل کر رہا تھا' دوسری طرف اپنے وقت کے مشہور نجومی سے ستاروں کا علم سیکھ رہا تھا۔ تیسری طرف فرغانہ کے نامور سپہ سالار سے جنگ کی تربیت دے رہے تھے اور چوتھی طرف وہ ترکی شعر و ادب میں بھی بے پناہ دلچسپی لے رہا تھا۔ غیر معمولی ذہانت اور فطرت کی اسی رنگا رنگی نے بابر کی شخصیت میں عجیب دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ بابر بیک وقت جفاکش' جرأت مند' شجاع اور بے خوف بھی تھا اور دوسری طرف انتہائی رحم دل اور سخی بھی۔ اگر کوئی ضرورت مند بابر سے سوال کرتا تو وہ ہمیشہ سوالی کو اس کی طلب سے زیادہ بخش دیتا۔

اس دوران قدرت نے عمر شیخ مرزا کے دامن کو مزید خوشیوں اور نعمتوں سے بھر دیا تھا۔ بابر کی پیدائش کے دوسرے سال عمر شیخ مرزا کے یہاں ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جہانگیر مرزا تجویز کیا گیا...... اور تیسرے سال ایک خوبصورت لڑکی خانہ زاد بیگم پیدا ہوئی مگر عمر شیخ مرزا کے ان دونوں بچوں کی ظاہری شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

فرغانہ کے بام و در پر فراغت و سکون کی بارش ہو رہی تھی' لیکن احمد جمال کے شب و روز بڑی بے آرامی میں گزر رہے تھے۔ چند سال پہلے عمر شیخ مرزا کی دلداری کے باعث احمد جمال کو جو اطمینان قلب حاصل ہوا تھا اسے قتلغ خانم کے جارحانہ اور تحقیر آمیز سلوک نے ایک بار پھر غارت کر دیا تھا۔ احمد جمال بابر مرزا کے لئے اپنے دل میں ایک خاص کشش محسوس کرتا تھا اور خود بابر بھی اس سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا تھا مگر خانم ہمیشہ اپنے بیٹے کو احمد جمال سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ملکہ فرغانہ نے بڑی راز داری کے ساتھ محل کے کئی خدمت گار مردوں اور کنیزوں کو احمد جمال کی جاسوسی پر مامور کر دیا تھا۔ انہیں واضح الفاظ میں حکم دیا گیا تھا کہ بابر مرزا کو احمد جمال سے تنہائی میں نہ ملنے دیا جائے اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے تو احمد جمال کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھی جائے۔ احمد جمال کا دل چاہتا تھا کہ وہ فرصت کے لمحات میں بابر مرزا کے ساتھ سیر و تفریح کرے' مگر آج تک اسے ایسا کوئی موقع میسر نہیں آیا تھا۔ وہ جب بھی ملکہ فرغانہ کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا۔ قتلغ خانم اسے انتہائی تلخ لہجے میں جھڑک دیتی۔ "بابر مرزا ایک شہزادہ ہے اور شہزادوں کے پاس ان فضول کاموں کے لئے وقت نہیں ہوتا۔"

خانم کی اس سفاکی پر احمد جمال تڑپ اٹھتا اور اسے یہ محسوس ہوتا جیسے ملکہ فرغانہ نے بھرے دربار میں اس کے چہرے پر سیاہی مل دی ہو۔

پھر اگر کبھی اتفاق سے اسے مغل شہزادے کی قربت میسر آ جاتی اور وہ سبزہ زار میں بابر کے ساتھ ٹہل رہا ہوتا تو اچانک ہی قصر شاہی کی کوئی جاسوس کنیز کسی آفت ناگہانی کی طرح نازل ہو جاتی اور بابر مرزا کو مخاطب کر کے کہنے لگتی۔ "شہزادہ عالم تشریف لے چلئے! ملکہ عالیہ آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔"

شروع شروع میں احمد جمال نے اسے محض اتفاق سمجھا' مگر جب بار بار یہی عمل دہرایا گیا تو احمد جمال پر یہ تکلیف دہ حقیقت فاش ہو گئی کہ ملکہ فرغانہ بابر مرزا سے اس کی ملاقاتوں کو پسند نہیں کرتی۔ پھر اسی وقت احمد جمال کی سماعتوں میں سید مہدیؒ کے یہ الفاظ گونجنے لگتے۔ "شہزادے! کوئی بھی صورت حال ہو مگر تم وارث فرغانہ کو چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔"

احمد جمال شدید اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ سید مہدیؒ کی ہدایت کو یاد کر کے رو پڑتا۔ "بابا! میرے اور وارث فرغانہ کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل ہے۔ پھر میں کیا کروں؟ مجھے کوئی دوسرا حکم دیجئے۔" احمد جمال بہت دیر تک عالم تصور میں سید مہدیؒ سے مخاطب رہ کر اپنے دل کا غبار دھوتا رہتا۔

پھر کچھ عرصے بعد یہ غبار مزید گہرا ہو گیا تو ایک روز احمد جمال نے عمر شیخ مرزا سے ملکہ فرغانہ کے بے رحمانہ سلوک کی شکایت کی۔

"فرزند! عورتوں کی باتوں پر زیادہ سوچ کر اپنا ذہن برباد نہ کیا کرو۔ تم صرف اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا کرو راستے کے سنگریزے اتنے با اختیار نہیں کہ وہ تمہارے پیروں کی زنجیر بن جائیں۔"

"میں کب تک اپنا سفر جاری رکھوں صاحب عالم! میری تو کوئی منزل ہی نہیں ہے۔" احمد جمال کے لہجے میں بڑی تپش تھی۔ "بابا فرمایا کرتے تھے کہ میں وارث فرغانہ کو چھوڑ کر نہ جاؤں اور وارث فرغانہ مجھ سے اس طرح جدا ہے جیسے دریا کا دوسرا کنارہ۔ میں نہیں جانتا کہ اس ہدایت میں کیا نکتہ پوشیدہ ہے؟ پھر بھی میں نے ان سے یہ درخواست کی ہے کہ مجھے کوئی دوسرا حکم دیا جائے۔ صاحب عالم! مجھے دوسروں کی مزاجی کیفیت کا اندازہ نہیں' مگر میرا اپنا حال یہ ہے کہ میں بھیک میں دی ہوئی زندگی بھی قبول نہیں کرتا یہ عیش و آسائش تو بہت معمولی چیزیں ہیں۔"

احمد جمال کے لہجے کی سرکشی محسوس کر کے عمر شیخ مرزا کا چہرہ بجھ گیا۔ "فرزند! میں تمہاری غیرت و خودداری کا قائل ہوں' مگر میری مجبوریوں کا بھی کچھ لحاظ کرو۔ میں بیرونی محاذ پر دشمنوں سے الجھا ہوا ہوں اور اب میرے گھر میں بھی ایک نیا محاذ کھل گیا ہے۔" عمر شیخ مرزا بڑے شکستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ "میرا خیال تھا کہ اولاد کی دولت پانے کے بعد وہ مغرور و بد دماغ عورت عاجز و انکسار کا پیکر بن جائے گی مگر آج اندازہ ہوا کہ انسانی فطرت بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ سید نے کچھ سوچ کر ہی تمہیں یہ حکم دیا ہوگا جب تک اس حکم کے اسرار کھل نہیں جاتے اس وقت تک کچھ اور انتظار کر لو۔ ویسے بابر ابھی بچہ ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب ہوش و خرد کی منزل پر پہنچے گا تو وہ خود بخود تم سے آ ملے گا۔"

"اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟" احمد جمال نے تھکی تھکی سی ایک گہری سانس لی اور کمرے کی چھت میں آویزاں خوبصورت فانوس کو دیکھنے لگا۔

پھر جب عمر شیخ مرزا نے ملکہ فرغانہ سے اس کے حاسدانہ اور سنگدلانہ سلوک کی شکایت کی تو قتلغ خانم انتہائی غضب ناک لہجے میں کہنے لگی۔ "میں اس غلام زادے پر اعتبار نہیں کرتی۔ وہ کسی وقت بھی میرے معصوم بچوں سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بابر مرزا کو اس سے دور دور رکھتی ہوں۔ مجھے آپ کا یہ انداز کرم بھی پسند نہیں۔ پنج لوگ اس قدر التفات کے لائق نہیں ہوتے۔"

"بیگم! اللہ کے قہر سے ڈرو۔" عمر شیخ مرزا آج پہلی بار اپنی بیوی کے سامنے چیخا تھا۔ "میں تو اس تصور سے ہی لرز جاتا ہوں کہ کہیں تمہارا یہ تکبر پوری ریاست کو کسی دردناک عذاب میں مبتلا نہ کر دے۔"

"ہم بڑے ہیں اور بڑے ہی رہیں گے۔" قتلغ خانم کے غرور کا وہی انداز تھا۔

عمر شیخ مرزا غصے میں بھرا ہوا کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

اور قتلغ خانم جیسی کینہ پرور عورت کے دل میں احمد جمال کی طرف سے ایک نئی گرہ پڑ گئی۔

احمد جمال ایک بار پھر مایوسیوں کے گرداب میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ عالیہ تاجدار خانم اپنی پھوپھی کے
سے باخبر تھی' اس لئے احمد جمال کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ہدایت کرتی رہتی۔ رات کے وقت جب'
موقع ملتا' وہ احمد جمال کے کمرے میں چلی آتی اور اسے محلاتی سازشوں کے بارے میں تفصیل سے سمجھ
جمال عالیہ کی طویل تقریریں سن کر برہم ہو جاتا۔

''کیسی سازشیں اور کیسی احتیاطیں؟'' احمد جمال بے خوف و خطر ہو کر جواب دیتا۔ ''ہم لوگ تو
ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔ میرے باپ کو کسی جرم کے بغیر قتل کر ڈالا۔ ایک دن مجھے بھی کسی خطا کے بغیر تو
ریزہ کر دیا جائیگا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا؟''

''تم مجھے بھی ان ہی لوگوں میں شامل سمجھتے ہو؟'' احمد جمال کے لہجے کی نشتریت سے عالیہ کی ر
زخمی ہو جاتی اور اس کے گل رنگ چہرے پر تپ دق کے مریض کی سی زردی چھا جاتی۔

''پھر کون ہو تم؟'' احمد جمال کے ہونٹوں سے چنگاریاں اڑنے لگتیں..... ''ان ہی کی تو اولاد ہو'

''اور میری محبت؟'' یکایک عالیہ تاجدار خانم کی آنکھوں میں دھواں سا بھر جاتا وہ برسوں سے ا
کے تغافل کو ہنس کر برداشت کر رہی تھی' مگر آج اس کے سینے پر ایسا زخم لگا تھا کہ جس کی خلش سے آگ
گرم غبار اٹھا اور پھر پلکیں بھیگ گئیں۔

''قتلغ خانم کے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک یتیم و بیسر لڑکی کی محبت ہی کیا؟'' احمد جمال کی زبان آ
بن گئی تھی۔ ''اگر تم با اختیار ہوتیں تو تمہارے وعدے کو پرکھنے کی کوشش کرتا۔''

جواب میں عالیہ نے کچھ نہیں کہا بڑی عجیب نظروں سے احمد جمال کی طرف دیکھا اور آہستہ آہ
سے نکل کر چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد احمد جمال نے خود کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ وہ دن بھر شمشیر زنی اور شہسواری کی مشق
سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک کتابوں کے مطالعے میں غرق رہتا۔ پھر عشاء کے بعد سید مہدیؒ کی
جاتا اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتا کبھی وحشت دل حد سے گزر جاتی تو سمرقند کی طرف رخ کر لیتا اور ا
یاد کر کے روتا رہتا اب یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا۔

عالیہ تاجدار خانم بھی باقاعدگی کے ساتھ احمد جمال کے کمرے میں آتی اور کچھ دیر تک خاموشی
اسے دیکھتی رہتی پھر چپ چاپ واپس چلی جاتی۔ احمد جمال بھی عالیہ کی موجودگی کو محسوس کر لیتا' مگر اس
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دونوں کے درمیان ایک عجیب سی خاموش جنگ جاری تھی۔

ایک دن قتلغ خانم کی جاسوس کنیز نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''ملکہ معظمہ کے خاندا
خطرے میں ہے۔ سادہ دل عالیہ تاجدار خانم اس فریب کار احمد جمال میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے
قتلغ خانم اس قربت کو بچپن کی رفاقت سمجھ رہی تھی' مگر آج اسے اندازا ہوا کہ دریا کا پانی کنارو ل
نکل آیا ہے اور موجوں کی یہ طغیانی کسی خوفناک سیلاب کا پیش خیمہ ہے ایک تو شاہی خاندان کے وقار کا
دوسرے احمد جمال سے شدید نفرت۔ قتلغ خانم نے فوری فیصلہ کر لیا کہ وہ دونوں کے درمیان ناقابل شک
کھڑی کر دے گی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں مغلستان سے خانم کی رشتے کی بہن کا لڑکا سکندر مرزا فرغانہ آیا ہوا تھ

اور بدتہذیب نوجوان تھا۔ قصر شاہی میں قدم رکھتے ہی سکندر مرزا کی آوارہ نظریں عالیہ تاجدار خانم کے
ل چہرے پر پڑی تھیں اور اس کے حسن کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک بار سکندر مرزا نے عالیہ خانم سے بڑے
انداز میں اظہار محبت بھی کر ڈالا تھا مگر عالیہ نے اسے اس قدر غضب ناک لہجے میں تنبیہ کی تھی کہ وہ
اس کے قریب آنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ عشق میں ناکامی سے دو چار ہو کر سکندر مرزا نے اپنی خالہ خانم
سامنے دامن مراد پھیلا دیا تھا۔ اس کی شادی عالیہ تاجدار خانم سے کر دی جائے ملکہ فرغانہ نے اپنے بھانجے کو
ہ سمجھ کر بہانے سے ٹال دیا تھا۔ مگر آج عالیہ کو احمد جمال کی طرف ملتفت پا کر خانم کا غصہ بھڑک اٹھا تھا
عالیہ جیسی حسین تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکی سکندر مرزا جیسے بدقماش نوجوان کے لائق نہیں تھی لیکن احمد جمال
وابستگی کے باعث نگار خانم کو اپنی بھتیجی سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ وہ خود پرست اور بے رحم عورت ایک ہی
ات میں دو معصوم انسانوں سے بدترین انتقام لینا چاہتی تھی۔

پھر ایک رات ملکہ فرغانہ نے عالیہ تاجدار خانم کو خلوت میں طلب کر کے اپنا ظالمانہ فیصلہ سنا دیا۔ ''عالیہ!
ملوت کے ہنگاموں میں ہمیں خیال ہی نہیں رہا کہ تم جوان ہو گئی ہو۔ بہر حال ہم طے کر چکے ہیں کہ اب تمہاری
شادی کر دی جائے۔ میرے خیال میں سکندر مرزا تمہارے لئے بہترین شوہر ثابت ہوگا۔''

پہلے تو کچھ دیر کے لئے عالیہ سناٹے میں رہ گئی۔ پھر اس نے سنبھل کر فرغانہ کی مغرور ملکہ کے سامنے
ناقابل بیان جرأت گفتار کا مظاہرہ کیا۔ ''خیر! سکندر مرزا تو ایک کھلا ہوا حیوان ہے' اگر کوئی فرشتہ صفت انسان
بھی ہوتا تو میری مرضی کے بغیر یہ شادی ممکن نہیں تھی۔ ملکہ معظمہ.....! کم سے کم آپ نے مجھ سے تو معلوم کر لیا
ہوتا۔'' عالیہ تاجدار خانم کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ ''کیا میں بھیڑ بکری ہوں کہ جس کی رسی پکڑ کر کوئی قصاب
ذبح خانے کی طرف لے جائے۔''

عالیہ کا جواب سن کر قتلغ خانم پاگل ہو گئی۔ ملکہ فرغانہ نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس بیباک لڑکی کے
رخساروں پر کئی تھپڑ مارے جو اپنے حقوق کے لئے تنہا جنگ کر رہی تھی۔

عالیہ تاجدار خانم کو اپنی پھوپھی کی طرف سے اس جارحیت کی توقع نہیں تھی۔ ایک ثانئے کے لئے اسے سکتہ
سا ہو گیا' مگر دوسرے ہی لمحے اس نے نگار خانم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''بس ملکہ! معظمہ! میں کوئی کنیز یا لونڈی نہیں
ہوں۔''

''تو لونڈیوں سے بھی بدتر ہے ناہنجار!'' نگار خانم ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی..... ''ناشکر گزار احسان
فراموش!'' ملکہ فرغانہ نے اپنی بھتیجی کے لئے ایک زبان میں کئی تہمتیں تراش دی تھیں۔

حرم سرا میں ایک شور سا برپا تھا کسی کنیز نے عمر شیخ مرزا کو بھی اس ہنگامہ آرائی کی خبر کر دی۔ والیٔ فرغانہ تیز
قدموں سے چلتا ہوا خانم کی خواب گاہ میں داخل ہوا پھر اس نے اپنی بیوی کی جلتی آنکھیں اور عالیہ کا اداس چہرہ
دیکھا شوہر کے سوالات کی بارش سے پہلے ہی خانم نے اپنے غیظ و غضب کا سارا اسلحہ استعمال کر ڈالا۔ عمر شیخ مرزا
نے آگے بڑھ کر عالیہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اسے سہارا دیکر کمرے سے باہر لے جانے لگا۔

''یہ سکندر مرزا سے شادی کرے گی یا مغلستان واپس چلی جائیگی۔'' قتلغ خانم نے شوہر کی موجودگی کا
احساس کئے بغیر چیختے ہوئے کہا۔

عمر شیخ مرزا نے پلٹ کر انتہائی خشمگیں نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا اور عالیہ کو لے کر خانم کی خواب گاہ

سے نکل گیا۔

عالیہ نے عمر شیخ مرزا سے صاف صاف کہہ دیا کہ ایک سکندر مرزا ہی پر منحصر نہیں، نہیں کرے گی الوقت کسی کے ساتھ بھی شادی۔ والیٔ فرغانہ نے اس فیصلے کا سبب پوچھا تو عالیہ نے دلائل سے ثابت کر شریعت اسے اس بات کا پورا اختیار دیتی ہے۔

عمر شیخ مرزا نے اپنی غضب ناک بیوی کو صحیح صورتحال سمجھانے کی کوشش کی تو خانم ایک بار پھر شعلے کی بھڑک اٹھی۔ ''وہ بے حیا عالیہ اس غلام زادے احمد جمال کی پرفریب باتوں سے متاثر ہو کر اس کے عشق ہوگئی ہے اور میں اپنے عظیم و محترم خاندان کی رسوائی برداشت نہیں کرسکتی۔ آپ دونوں کو بتا دیجئے کہ ان فرغانہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔''

عمر شیخ مرزا شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ اس نے انتہائی مجبوری کی حالت میں عالیہ سے اس نازک پر گفتگو کی عالیہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا پھر اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ رک رک کر احمد جمال کی اعتراف کرلیا۔ ''صاحب عالم! یہ درست ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے راستے کا انتخاب کرلیا ہے، مگر یقین کریں کہ یہ راستہ لعنت و رسوائی کا نہیں ہے میں آپ کو کسی موڑ پر مایوس نہیں کروں گی۔''

عمر شیخ مرزا عالیہ کے انتخاب پر خوش تھا لیکن اس کے ذہن میں قتلغ خانم کی یہ بات کسی زہریلے کا طرح کھٹک رہی تھی کہ احمد جمال معصوم عالیہ کو ورغلا کر خاندان شاہی سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ سیاسی خیزوں اور محلاتی سازشوں کے سبب انسانی رشتوں کے بارے میں عمر شیخ مرزا کا یقین متزلزل ہوتا جارہا تھا اس نے ایک دن احمد جمال کو بھی تنہائی میں طلب کرلیا۔ حاکم فرغانہ کی خواہش تھی کہ احمد جمال سے گفتگو کے بعد وہ عالیہ خانم سے اس کی شادی کردے۔ عمر شیخ مرزا کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ و تھا کہ جواں سال عورت اور مرد کی قربت کسی وقت بھی کوئی خوفناک طوفان اٹھا سکتی ہے اسی طوفان کے آثا کر عمر شیخ مرزا نے احمد جمال کو اس سنگین صورتحال سے باخبر کردیا۔

''صاحب عالم! میری ذاتی حیثیت اس قابل نہیں کہ میں شاہی خاندان سے رشتہ قائم کرنے کا خوا دیکھ سکوں۔'' احمد جمال کا لہجہ پر اعتماد بھی تھا اور باوقار بھی ...... ''عالیہ خود اس حقیقت سے گواہی دیں گی ان کا بہت احترام کرتا ہوں مگر ان کے لئے اپنے دل میں کوئی جذباتی گوشہ نہیں رکھتا۔''

احمد جمال کی طرف سے انکار سن کر عمر شیخ مرزا کا ذہن مزید الجھ گیا اور اس کے چہرے سے پریشانی لگی۔

''صاحب عالم! میں تو ایک کنیز کی عزت و آبرو کا بھی لحاظ رکھتا ہوں۔'' حاکم فرغانہ کو پریشان دیکھ جمال بھی فکر مند نظر آنے لگا۔ ''اور پھر آپ تو میرے محسن ہیں، اگر کبھی میرا زاویہ نگاہ بدل گیا تو اپنی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بجھا دوں گا۔''

عمر شیخ مرزا نے مضطرب ہو کر احمد جمال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مجھے یقین ہے فرزند! تم ایسا گے۔''

☆☆☆

عالم فرغانہ عالیہ سے کھل کر بات نہیں کرسکتا تھا۔ مجبوراً اس نے اپنی ایک معتمد کنیز زریں الماس کے یعہ عالیہ پر اس حقیقت کا انکشاف کرا دیا کہ احمد جمال اس سے کوئی جذباتی رشتہ نہیں رکھتا۔ نتیجتاً بھی مناسب کسی دوسرے راستے کا انتخاب کرے۔ عالیہ نے زریں الماس کے سامنے اعتراف کرلیا کہ وہ اس راز ا خبر ہے، مگر پھر بھی اس کے جذبوں کی رہ گزر تبدیل نہیں ہوسکتی۔

عمر شیخ مرزا نے بہت چاہا کہ قتلغ خانم کے غصے کی آگ سرد ہو جائے لیکن ملکہ فرغانہ نے عالیہ کے انکار کو انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ بالآخر عمر شیخ مرزا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''نہ احمد جمال پر قصر شاہی کے دروازے بند گے اور نہ عالیہ یہاں سے کہیں اور جائے گی۔ تم دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔''

قتلغ خانم مغرور و بد دماغ ضرور تھی، مگر احمق نہیں تھی۔ اس نے ایک ہی نظر میں شوہر کے بگڑے ہوئے اس کو پہچان لیا اور خاموش ہوگئی...... مگر اس کے سینے میں بھڑکنے والی نفرت و انتقام کی آگ کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔

بابر مرزا نوعمری کے باعث صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اپنی ماں کو انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں پا کر اتنا ضرور جان گیا تھا کہ قصر شاہی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے۔ جب بابر نے قتلغ خانم سے اس کا سبب پوچھا تو ملکہ فرغانہ کی زبان بے قابو ہوگئی۔

''یہ سب کچھ اس غلام زادے کی وجہ سے ہورہا ہے۔'' قتلغ خانم نے احمد جمال کا نام لیتے ہوئے کہا۔

''صاحب عالم تو فرماتے ہیں کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں''...... بابر مرزا نے چونک کر اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔

''اس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔'' قتلغ خانم نے بڑی عیاری سے اپنے معصوم بیٹے کی سماعت میں احمد جمال کے خلاف نفرت کا زہر ٹپکانا شروع کردیا تھا۔ ''وہ تمہارے ٹکڑوں پر پلنے والا ایک بھکاری ہے، جسے صاحب عالم کی بے جا نوازشات نے اس قابل بنا دیا ہے کہ اب وہ خاندان شاہی کے وقار سے کھیل رہا ہے۔''

''میں صاحب عالم سے بات کروں گا۔'' بابر مرزا ماں کی باتیں سن کر مشتعل ہوگیا تھا۔

''نہیں شہزادے! تم صاحب عالم سے اس کا ذکر نہیں کروگے۔'' قتلغ خانم نے بابر مرزا کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بس تمہیں میری یہی نصیحت ہے کہ ہر وقت اس سے ہوشیار رہنا۔ وہ بہت فریب کار انسان ہے۔''

بابر مرزا کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور معصوم ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند لمحوں میں برسوں کے رشتے بدل جائیں گے۔

اس واقعہ کے بعد جب ایک دن احمد جمال نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں بابر مرزا کو ''بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا تو فرغانہ کے ولی عہد کا انداز بدل گیا۔ ''احمد جمال! آئندہ مجھے شہزادہ عالم کہہ کر پکارا کرو...... تم میرے بھائی نہیں، ایک ادنیٰ خدمت گار ہو۔''

چند لمحوں کے لئے احمد جمال پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''میں شکر گزار ہوں آج شہزادہ عالم نے اپنے اور میرے درمیان قائم ہونے والے برسوں پرانے رشتے کی وضاحت کردی۔''

بابر مرزا احمد جمال کے لفظوں میں پوشیدہ اذیت کو نہ سمجھ سکا۔

قتلغ خانم مرزا کو احمد جمال سے بدظن کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور احمد جمال اسی رات سید مہدیؒ کو
سے سوال کر رہا تھا...... ''بابا! میں کب تک اس آزمائش میں مبتلا رہوں گا؟''

⌑ ⌑ ⌑

عالیہ کے سلسلے میں بظاہر ملکہ فرغانہ نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مگر در پردہ وہ اپنی لاوارث بھتیجی کو ا
آزار پہنچا رہی تھی۔ عالیہ سے تمام مراعات چھین لی گئی تھیں اور اب وہ قصر شاہی میں ایک لونڈی کی سی ز
گزار رہی تھی۔ ایک دن جب عمر شیخ مرزا کی کنیز زریں الماس نے اپنے آقا کو یہ تکلیف دہ خبر دی تو والیٔ فر
کے دل و دماغ جل اٹھے۔ پھر اس نے عالیہ سے بات کی تو وہ بلند حوصلہ دوشیزہ مسکرانے لگی۔

''صاحب عالم! میں آپ سے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا شکایت کرتی۔''

''یہ معمولی بات نہیں بیٹی کہ خاندان شاہی کی ایک محترم لڑکی کو غیروں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا
گیا۔'' عمر شیخ مرزا کے لہجے میں غصے کی تپش بھی شامل تھی اور دل کا درد بھی۔

''میں نہیں چاہتی صاحب عالم کہ میری وجہ سے قصر شاہی میدان جنگ بن جائے اور مملکت کے دشمن ا
تماشے سے لطف اندوز ہوں یا سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔'' عالیہ خانم بڑے صبر و استقامت
مظاہرہ کر رہی تھی۔

''بیٹی! اس سے تو بہتر ہے کہ تم اپنے وطن کی طرف لوٹ جاؤ۔'' اگرچہ عمر شیخ مرزا اپنے خسر یونس خان
برادر نسبتی کو پسند نہیں کرتا تھا' لیکن اس نے بڑے کرب کے عالم میں یہ مشورہ دیا تھا۔

''دل تو چاہتا ہے صاحب عالم' مگر کیا کروں کہ اپنے عہد سے مجبور ہوں۔'' عالیہ خانم نے جھکی نظروں'
ساتھ بہت آہستگی سے کہا۔

''کیسا عہد؟'' عمر شیخ مرزا نے گھبرا کر کہا اور پھر کچھ سوچ کر عالیہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

عالیہ خاموشی سے چلی گئی۔ ایک حیادار دوشیزہ حاکم فرغانہ کو کس طرح بتاتی کہ مغلستان چلے جانے کے ب
وہ احمد جمال کی دید سے محروم ہو جائے گی۔

احمد جمال بھی ان تمام باتوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ کئی بار عالیہ خانم کو شادی کر لینے کا مشورہ دے چکا
...... مگر عالیہ کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ جب سے احمد جمال نے اس کی محبت کو ٹھکرایا تھا وہ مسلسل خاموش ر
لگی تھی' روزانہ پابندی کے ساتھ احمد جمال کے کمرے میں جاتی' اسے کچھ دیر تک بغور دیکھتی اور چپ چا
واپس چلی آتی۔

⌑ ⌑ ⌑

عالیہ کے انکار کے بعد سکندر مرزا مایوس ہو چکا تھا۔ مگر قتلغ خانم اب بھی اسے تسلیاں دیتی رہتی تھی۔
''گھبراؤ نہیں سکندر! عالیہ کو میرے فیصلے کے آگے خم ہونا ہی پڑے گا۔ وہ ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی کتنے دن
کنیزوں کی طرح زندگی بسر کرے گی۔ بس کچھ دن اور انتظار کر لو۔''

سکندر مرزا ملکہ فرغانہ کے وعدوں سے بہل جاتا اور عالیہ خانم کے حوالے سے رنگین خواب دیکھنے لگتا۔
خانم کو سکندر مرزا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی بات اونچی رکھنے کے لئے عالیہ کے جھکنے کا انتظار کر رہی
تھی اور عالیہ چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ارادوں کی مالک تھی۔ اس نے ملکہ فرغانہ کے ساتھ محل کی کنیزوں کا
ذلت آمیز سلوک بھی برداشت کیا مگر اپنی پھوپھی سے رحم کی التجا نہیں کی۔

اس کشمکش میں چار سال گزر گئے۔ اب بابر مرزا دس سال کا ہو گیا تھا۔ قدرت نے وارث فرغانہ کو
جسمانی اور دماغی صلاحیتوں سے اس قدر نوازا تھا کہ بابر مرزا اتنی کم عمری میں بھرپور اور بالغ نظر نوجوان آتا
تھا۔ مولانا قاضی اور دیگر ماہرین فن کی تربیت نے بابر کے دماغ کو روشن' سینے کو کشادہ اور بازوؤں کو فولاد بنا
دیا تھا مگر احمد جمال کے ساتھ اس کا رویہ آقاؤں جیسا تھا اور یہ قتلغ خانم کی اس سازش کا نتیجہ تھا کہ ملکہ فرغانہ
ایک طویل عرصے سے احمد جمال کے خلاف اپنے بیٹے کے کان بھر رہی تھی۔ بابر عمر شیخ مرزا کے سامنے احمد
جمال کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آتا اور حاکم فرغانہ کی غیر موجودگی میں اس پر اس طرح حکم چلاتا جیسے
احمد جمال قصر شاہی کا ادنیٰ ملازم ہو۔ بابر کا یہ عمل قتلغ خانم کی منافقانہ حکمت عملی کے زیر اثر تھا۔ وہ مغرور و
عیار عورت یہ نہیں چاہتی تھی کہ عمر شیخ مرزا پر اس کی سازشوں کا لامتناہی سلسلہ بے نقاب ہو جائے۔ احمد جمال
نے بابر سے اس کے جارحانہ رویے کی کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ تو ولی عہد سلطنت کی نادانیوں پر مسکرا دیا
کرتا تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

پھر جب عالیہ کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو ملکہ فرغانہ کی سازشوں نے نیا رنگ اختیار کر لیا۔ قتلغ
خانم نے سکندر مرزا سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ احمد جمال کے خوبصورت چہرے کو بگاڑ دے کہ اس کے
دلکش نقش و نگار ہی سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ فطری حسد کے علاوہ ملکہ فرغانہ کے اس جابرانہ حکم کی ایک خاص وجہ
یہ تھی کہ کچھ اور مغل شہزادیاں بھی احمد جمال کی ذات میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگی تھیں۔ سکندر مرزا برسوں سے

رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔ ملکہ فرغانہ کا اشارہ پاتے ہی وہ آمریت کی سازشوں کا آلہ کار بننے کے لئے تیار ہو گیا۔

فرغانہ کی قدیم رسم تھی کہ ہر سال شہسواری کا ایک مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ احمد جمال گزشتہ کئی سال سے مقابلہ جیت رہا تھا۔ اب کی بار اس مقابلے کا اہتمام ہوا تو سکندر مرزا نے سائیس سے مل کر احمد جمال کے گھوڑے کے نعل ڈھیلے کرا دیئے۔ نتیجتاً گھڑ دوڑ اپنے عروج پر پہنچی تو بیک وقت کئی کیلیں نکل گئیں اور گھوڑا الجھ کر گر پڑا۔ احمد جمال دور تک گھسیٹتا چلا گیا۔ اس کے شدید چوٹیں آئیں مگر چہرہ محفوظ رہا۔ اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔

پھر سکندر مرزا کے اشارے پر رات کے وقت احمد جمال کے کمرے میں آگ لگا دی گئی۔ سکندر مرزا خیال تھا کہ زخمی ہونے کی وجہ سے احمد جمال بستر سے نہیں اٹھ سکے گا اور آگ کے شعلے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیں گے...... مگر احمد جمال نے غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا۔ اس کے زخموں سے خون بہتا رہا' ہڈیاں چٹختی رہیں اور وہ کھڑکی توڑ کر باہر کود گیا۔ اس واقعہ کو بھی ایک حادثے سے تعبیر کیا گیا مگر عمر شیخ مرزا گہری سوچ میں گم تھا اور اس کی پیشانی لکیروں سے بھری ہوئی تھی۔ احمد جمال کبھی اپنے کمرے کا دروازہ مقفل نہیں کیا کرتا تھا دشمنوں نے اسی سے فائدہ اٹھایا تھا اور نصف شب کے قریب دبے پاؤں داخل ہو کر ریشمی پردوں میں آگ لگا دی تھی۔

دوسرے حادثے پر عالیہ کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس نے بے اختیار روتے ہوئے کہا تھا...... ''احمد! حادثہ نہیں کوئی گہری سازش ہے۔''

''میں کس کا نام لوں' میری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔'' احمد جمال نے بڑی سادگی سے جواب دیا کمرے کے منقش در و دیوار کو دیکھنے لگا جن پر رنگین زنجیروں کا گمان ہوتا تھا۔

سازش بے نقاب ہو جانے کے خوف سے سکندر مرزا کچھ دن خاموش رہا۔ پھر جب احمد جمال مکمل طور صحت یاب ہو گیا اور حسب معمول رات گئے سید مہدیؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر محل واپس لوٹا تو فانوس بجھا دیئے گئے تھے۔ وہ دبے قدموں تاریک راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی نے ایک گوشے سے نکل کر اس کے چہرے تیزاب سے بھرا ہوا پیالہ پھینکا۔ نشانہ خطا ہو گیا اور تیزاب احمد جمال کے چہرے کے بجائے کاندھوں پر گرا۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی پھر وہ سنبھلا۔ کوئی سایہ راہ داری میں بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔

''بزدل! اندھیرے میں وار کرتا ہے۔'' احمد جمال پوری طاقت سے چیخا۔

رات کے سناٹے میں آواز اتنی تیز تھی کہ قصر شاہی کے سارے مکین جاگ اٹھے۔ مسلح محافظ دوڑ پڑے فانوس جلا دیئے گئے۔ احمد جمال کی پشت جگہ جگہ سے زخمی تھی۔ تیزاب نے کھال کو جلا کر رکھ دیا تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

عالیہ عمر شیخ مرزا کے سینے پر سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔ ''صاحب عالم! یہ کیا ظلم ہے؟ کیا آپ وقت انصاف کریں گے جب وہ قبر میں سو جائے گا۔''

حاکم فرغانہ نے اسی وقت حکم جاری کر دیا تھا کہ مجرم کو تلاش کیا جائے...... مگر مجرم کا نشان کیسے ملتا'

...جرم کی پردہ پوشی کر رہا تھا۔

اس واقعہ پر بابر مرزا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں...... ''احمد جمال! میں تمہارے مجرم کو بڑی عبرت ناک سزا دوں گا۔''

''خدا آپ کو محفوظ رکھے شہزادے! ہمارا کیا ہے' پیادے ہیں' سالار کی مرضی پر قربان ہو جائیں گے مگر نہیں کریں گے۔'' احمد جمال مسکرا رہا تھا مگر اس کے لہجے میں بڑا کرب پوشیدہ تھا۔

اور آج اس کرب کو بابر مرزا نے بھی محسوس کر لیا تھا...... ''یہ میرے پیادے ہیں احمد جمال اور میں اپنے پیادوں کو اس طرح مرنے نہیں دوں گا۔''

''احمد! خدا کے لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' عالیہ نے بے قرار ہو کر احمد جمال کے قدموں پر سر رکھ دیا تھا۔

''عالیہ! اپنے سر کی عظمت کو پہچانو!'' زخمی احمد جمال نے پیروں کو کھینچتے ہوئے کہا...... ''اپنے باپ کی طرح قبر ہی میری منزل ہے۔ تم اطمینان رکھو! ابھی وہ منزل دور نظر آتی ہے۔''

''فرزند! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔'' عمر شیخ مرزا نے احمد جمال کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

''اب تک مجرم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔''

''آپ کیوں بار بار ندامت اٹھاتے ہیں صاحب عالم!؟'' احمد جمال کے لہجے میں بڑی طمانیت تھی ''قانون زندہ ہے تو ایک دن مجرموں کو تلاش کر ہی لے گا...... اور اگر قانون مر گیا تو پھر جرم کی زندگی بہت طویل ہو گی۔''

⌑ ⌑ ⌑

سکندر مرزا اپنی مسلسل ناکامیوں پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آخر اس کے اعصاب ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔ وہ کچھ دیر تک سرگوشیوں کے انداز میں ملکہ فرغانہ سے گفتگو کرتا رہا۔ جواب میں قتلغ خانم نے اپنے سر کو جنبش دی جیسے وہ اس کی تائید کر رہی ہو۔ پھر سکندر مرزا رات کے اندھیرے میں دس مسلح سپاہیوں کو لے کر سید مہدیؒ کی قبر کی طرف چلا۔ آج وہ احمد جمال کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

سکندر مرزا مسلح سپاہیوں کے ساتھ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بے نیام تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام۔ اگر کوئی بے خبر شخص بھی اس وقت سکندر مرزا کو اس حالت میں دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ وہ اپنے دشمن پر شدید حملہ کرنے والا ہے۔ ڈوبے ہوئے چاند کی رات تھی' اس لئے ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ سیاہ بادلوں نے فرغانہ کی فضا کو تاریک تر بنا دیا تھا۔ ہلکی ہلکی مرطوب ہوا اور کبھی کبھی بجلی کی چمک اس بات کا کھلا اشارہ تھا کہ جیسے تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہونے والی ہے۔ سکندر مرزا موسم کی خرابی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے اس راز سے باخبر ہو چکا تھا کہ احمد جمال بلاناغہ عشاء کی نماز کے بعد سید مہدیؒ کی قبر پر حاضری دیا کرتا تھا اور وہاں ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھ کر ذکر الٰہی میں

مشغول رہتا تھا۔ احمد جمال سکون دل کی تلاش میں تھا اور سکندر مرزا اس خوبصورت نوجوان کے تعاقب میں' جسے وہ ذہنی طور پر اپنا رقیب تسلیم کر چکا تھا۔

سازش مکمل ہو چکی تھی۔ منصوبے کی تکمیل سے پہلے سکندر مرزا نے اپنے شریک کار سپاہیوں کو آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا...... ''تم نے اب تک اس نامراد پر جتنے وار کئے وہ سب کے سب غیر مؤثر تھے۔ اگر اس بار بھی وہ بد ذات بچ گیا تو پھر تمہاری جان کے لالے پڑ جائیں گے۔'' اس وقت سید مہدیؒ کی قبر اور سکندر مرزا کے سپاہیوں کے درمیان تقریباً ایک میل کا فاصلہ حائل تھا۔ یکایک اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لی تھیں اور ایک جگہ ٹھہر کر تیز سرگوشی کے انداز میں وہ ان سپاہیوں سے مخاطب تھا جو قتلغ خانم کی طرف سے ملنے والے بڑے انعام کی لالچ میں احمد جمال کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

''ایسا ہی ہوگا سردار!'' جواب میں اس سپاہی کی سرگوشی ابھری جس نے کچھ دن پہلے احمد جمال کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ ''آپ مطمئن رہیں حضور والا! اس بار آپ کے غلام کا نشانہ خطا نہیں کرے گا۔ آج کی رات احمد جمال کے بھیانک انجام کی رات ہے۔ آپ کے منصوبے کے عین مطابق اسے قتل کر کے اس طرح کسی تاریک گھڑے کے حوالے کر دیا جائے گا کہ صاحب عالم کے جاسوس تمام عمر اس کی لاش کو ڈھونڈتے پھریں گے۔ آخر ایک دن مملکت فرغانہ کے گرد و پیش میں یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ احمد جمال خوفزدہ ہو کر رات کے اندھیرے میں کہیں فرار ہو گیا۔'' سپاہی نے دبے دبے مگر پرجوش لہجے میں سکندر مرزا کے منصوبے کی وضاحت کی۔

ایک بار پھر سپاہیوں نے بڑے خوفناک عزائم کے ساتھ اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور انہیں انتہائی جارحانہ انداز میں ایڑ دی۔ گھوڑے برق رفتاری سے آگے بڑھے ابھی سکندر مرزا نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ بجلی کی کڑک اتنی شدید تھی کہ کچھ دیر کے لئے اہل فرغانہ کو اپنے کانوں کے پردے پھٹ جانے کا گمان ہونے لگا۔ محل کے باہر کھلے مقامات پر رہنے والے کچھ لوگوں نے بجلی کو زمین پر گرتے اور پھر آن کی آن میں سیاہ بادلوں کی طرف واپس جاتے دیکھا تھا۔

خود احمد جمال بھی جو بہت دیر سے سید مہدیؒ کی قبر کے نزدیک بیٹھا اپنے اوراد و وظائف میں مشغول تھا۔ بجلی کی غیر معمولی کڑک سن کر اچھل پڑا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اسے بھی اپنی سماعت کے چلے جانے کا شبہ ہوا مگر جب کچھ دیر بعد ہوا کی سرسراہٹ' درختوں کے پتوں کا شور' جھینگروں اور دوسرے برساتی کیڑوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو اس نے خالق ارض و سما کا شکر ادا کیا اور اللہ کے قہر سے پناہ مانگنے لگا۔

⌑ ⌑ ⌑

دوسرے دن راستہ گزرنے والوں نے گیارہ انسانوں اور گھوڑوں کی جلی ہوئی لاشیں دیکھیں تو خوف سے سہم گئے۔ آسمانی بجلی نے تمام جانداروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر سارے انسانوں کے چہرے محفوظ تھے۔ پھر جب یہ اطلاع قصر شاہی پہنچی تو ہلچل سی مچ گئی۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا۔ بتانے والوں نے بتایا تھا کہ تمام مرنے والے فرغانہ کے سپاہی ہیں اور جلی ہوئی شمشیریں بعد از مرگ بھی ان کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ یہ المناک خبر سن کر عمر شیخ مرزا اور دوسرے اراکین سلطنت اداس ہو گئے تھے۔ لیکن قتلغ خانم کے چہرے کے رنگ اڑ

تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ سکندر مرزا ملکہ فرغانہ سے اجازت لے کر ہی احمد جمال ؑاقب میں کیا گیا تھا۔ قتلغ خانم کا خیال تھا کہ سکندر مرزا زیادہ سے زیادہ نصف شب کے قریب اسے احمد ے قتل کی خوشخبری سنا دے گا' مگر جب آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی سکندر مرزا واپس نہیں آیا تو ملکہ ؛ شدید اضطراب کا شکار نظر آنے لگی۔ پھر اس نے گھبرا کر اپنی ایک معتمد کنیز کو احمد جمال کے کمرے کی طرف کیا۔ شاہی کنیز نے کچھ دیر بعد واپس آ کر ملکہ فرغانہ کو یہ حیرت انگیز اطلاع دی کہ احمد جمال کے کمرے کا زہ اندر سے بند ہے۔ یہ علامت اس بات کی کھلی دلیل تھی کہ احمد جمال بحفاظت اپنی خواب گاہ میں واپس گیا ہے۔

''پھر سکندر مرزا اور اس کے ساتھی سپاہی کہاں رہ گئے؟'' ملکہ فرغانہ نے انتہائی بدحواسی کے عالم میں ا۔ ''اگر بالفرض سکندر مرزا کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے تو اسے بلا تاخیر قصر شاہی واپس لوٹ آنا چاہئے۔'' قتلغ ا کے دماغ پر نئے نئے اندیشوں کی یلغار تھی اور اس کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ پھر گزرتے ہوئے ۔ کے ساتھ ساتھ ملکہ فرغانہ کی وحشت میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ وہ ساری رات نہ سو سکی۔

پھر جب دن کی روشنی میں بجلی سے ہلاک ہونے والے سپاہیوں کی موت کی خبر قصر شاہی پہنچی تو ملکہ فرغانہ کا تیزی سے دھڑکنے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے فرغانہ کی رعایا کے سامنے اس کا جرم بے نقاب ہو گیا ہو۔ لمحوں کے لئے قتلغ خانم پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر ملکہ انہ نے بہت مختصر سے وقت میں اپنے شکستہ اعصاب پر قابو پا لیا۔ قتلغ خانم کے لئے یہ بات باعث اطمینان ، کہ ایک بھی سپاہی زندہ نہیں بچا تھا۔ اب کون اس کے منصوبے کو بے نقاب کرتا اور کون اس کے خلاف اہی دیتا؟

پھر جب برق تپاں کا شکار ہونے والے سپاہیوں کی لاشیں فوجی چھاؤنی میں لائی گئیں اور والیٔ فرغانہ ۓ سکندر مرزا کا جلا ہوا جسم دیکھا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ عمر شیخ مرزا کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ب وقت کئی سوالات اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں سکندر مرزا دس مسلح اہیوں کے ساتھ ایک ویران علاقے کی طرف کیوں جا رہا تھا؟ اور وہ علاقہ جو سید مہدیؒ کی قبر کے بہت یب تھا...... اور جہاں شب کے ابتدائی حصے میں احمد جمال پابندی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ عمر شیخ مرزا کے ن کے پردے پر احمد جمال کا چہرہ ابھرا تو والیٔ فرغانہ کی آنکھوں کے سامنے سے گہرے حجابات اٹھنے لگے۔ لیہ سے شادی کرنے کے لئے سکندر مرزا کی جنونی خواہش' عالیہ کا اس رشتے سے انکار' پھر احمد جمال کے اتھ پیش آنے والے حادثات...... عمر شیخ مرزا کے ذہن کی گرہ کھل گئی تھی' مگر وہ مجرموں کے خلاف کوئی ثبوت بں نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرے سپاہیوں کو خاموشی کے ساتھ قبر میں اتار دیا گیا' لیکن سکندر مرزا قتلغ خانم کا رشتے دار تھا۔ اس لئے ے شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ پھر اسی رات جب عمر شیخ مرزا کو خلوت میسر آئی تو اس نے بڑے اثر لیز لہجے میں اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا نظام انصاف بھی بڑا عجیب ہے۔ جب انسان مجرموں کو تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو ایک ن قدرت اس مقدمے کا فیصلہ کر دیتی ہے......''

"کیسا مقدمہ اور کیسا فیصلہ؟" قتلغ خانم نے چونک کر کہا۔ اگرچہ وہ والیٔ فرغانہ کا اشارہ سمجھ چکی تھی' لیکن پھر بھی جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔

"احمد جمال کے مقدمے کا فیصلہ!" عمر شیخ مرزا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شاہی جاسوس مجرم سکندر مرزا تک پہنچنے میں ناکام رہے تو ایک غیبی ہاتھ نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور ایسا فیصلہ سنا دیا جسے ساری دنیا کی عدالتیں بھی منسوخ کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔" یہ کہتے کہتے عمر شیخ مرزا کا لہجہ شدید تلخی و نفرت سے بھر گیا تھا۔

چند لمحوں کے لئے قتلغ خانم کو یوں محسوس ہوا جیسے حاکم فرغانہ کے سامنے اس کی تمام تر مجرمانہ سرگرمیاں بے نقاب ہو گئی ہوں ...... مگر وہ اول و آخر ایک شاطر عورت تھی۔ اس لئے فوراً ہی سمجھ گئی اور اونچے لہجے میں شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں صاحب عالم کہ سکندر مرزا احمد جمال کے معاملات میں ملوث تھا؟" قتلغ خانم کے لہجے سے شاہانہ تمکنت کا اظہار ہو رہا تھا اور بات کرتے کرتے اس کی بھنویں کھنچ گئی تھیں۔ کاش! آپ مرنے والے پر یہ سنگین الزام عائد نہ کرتے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ میرا بھتیجا یکسر بے قصور تھا' مگر اس انہونی کا کیا علاج کہ آسمانی بجلی نے اسے دفعتاً کھا لیا۔" یہ کہتے کہتے قتلغ خانم کی آواز بھرا گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے ہلکی ہلکی نمی جھلکنے لگی تھی۔ جیسے وہ سکندر مرزا کی لاش پر خاموش ماتم کر رہی ہو۔

"ملکہ فرغانہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے طویل غور و فکر اور گہرے مشاہدے کے بعد اس معاملے میں لب کشائی کی ہے۔" یک بیک والیٔ فرغانہ کا لہجہ انتہائی ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ "کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے بھتیجے سکندر مرزا پر بہتان تراش رہا ہوں؟ اور کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ میں اپنے اللہ سے نہیں ڈرتا؟" عمر شیخ مرزا کی کشادہ پیشانی پر کئی بل پڑ گئے تھے۔ "سکندر مرزا عالیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا' مگر عالیہ بچپن کی رفاقت کے سبب احمد جمال کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو بلاشبہ دنیا کا حسین ترین نوجوان ہے۔ سکندر مرزا اپنے حریف کی مردانہ وجاہت کو برداشت نہ کر سکا اور دن رات حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ اسی آگ کی تپش نے اس کم ظرف انسان کو احمد جمال سے انتقام لینے پر اکسایا۔ پھر بڑی ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ بندی کی گئی' مگر احمد جمال شہ سواری کے مقابلے میں مرتے مرتے بچا۔ پھر جب سکندر مرزا کی یہ تدبیر بھی ناکام ہو گئی تو اس نے احمد جمال کے دلکش چہرے کو تیزاب کے ذریعے بگاڑنے کی کوشش کی' لیکن غیبی ہاتھ نے اسے ایک بار پھر بچا لیا۔ گھڑ دوڑ کے میدان میں پیش آنے والے واقعہ کو میں نے بھی ایک اتفاقی حادثہ سمجھا تھا مگر احمد جمال کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کی مذموم حرکت ایک کھلی ہوئی سازش تھی۔ اس المناک واقعہ کی خبر سن کر میرا ذہن فوری طور پر سکندر مرزا کی طرف گیا تھا' مگر میں نے کچھ انصاف کے تقاضوں اور کچھ رشتے داری کے باعث سکندر مرزا پر ہاتھ نہیں ڈالا۔" یہ کہہ کر والیٔ فرغانہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا اور قتلغ خانم کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔

ملکہ فرغانہ کی آنکھوں میں خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں اور چہرے کی سرخ رنگت زردی مائل ہو چکی تھی۔

عمر شیخ مرزا نے مختصر سے وقفہ سکوت کو توڑ دیا اور دوبارہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "حالانکہ یہ میرے لئے

واضح اشارہ تھا کہ سکندر مرزا احمد جمال کے سلسلے میں ایک ذلیل فطرت رقیب کا کردار ادا کر رہا ہے' لیکن میرے پاس اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی۔ مجبوراً میں نے وقت کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ فرغانہ کے گوشے گوشے میں اپنے جاسوسوں کے پہرے بٹھا دیئے تھے۔ قصر شاہی کا مکین ہونے کے سبب سکندر مرزا میری تمام کارروائیوں سے باخبر تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ قانون اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اس کے جرم کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس لئے سکندر مرزا نے بہت عجلت میں احمد جمال کے قتل کا منصوبہ بنایا اور بگڑے ہوئے موسم کی آڑ لے کر قصر شاہی سے نکل کھڑا ہوا مگر ......"

ابھی عمر شیخ مرزا کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ قتلغ خانم درمیان میں ہی بول اٹھی۔ "نہیں صاحب عالم! یہ میرے بھتیجے پر ایک سنگین تہمت ہے۔" ملکہ فرغانہ ابھی تک سکندر مرزا کے مجرمانہ افعال کی نفی کر رہی تھی۔ "احمد جمال کے لئے سکندر مرزا کے دل میں کدورت ہو سکتی ہے' مگر وہ اس کی جان کے درپے نہیں تھا۔"

"ملکہ عالیہ!" عمر شیخ مرزا نے اونچی آواز میں کہا۔ اب والیٔ فرغانہ کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ "اگر آپ کا اعلیٰ ظرف اور معصوم بھتیجا احمد جمال کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا تو برسات کی اندھیری رات میں مسلح ہو کر قصر شاہی سے باہر کیوں نکلا تھا؟" یکایک عمر شیخ مرزا کی آواز تلخی و نفرت سے بھر گئی تھی۔

قتلغ خانم کے پاس شوہر کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ ملکہ فرغانہ نے احساس ندامت سے سر جھکا لیا۔

"آخر اس پر ایسی کون سی افتاد آ پڑی تھی کہ وہ بدترین موسم اور شب کی تاریکی میں ایک ویران علاقے کی طرف جا رہا تھا؟" عمر شیخ مرزا نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ "اور یہ دس مسلح سپاہی اس کے ہمراہ کیوں گئے تھے؟"

قتلغ خانم نے گھبرا کر سر اٹھایا اور بار ندامت سے دوبارہ گردن جھکا لی۔

"آپ جانتی ہیں ملکہ عالیہ؟" جوش جذبات میں عمر شیخ مرزا نے اپنی بیوی کے دونوں بازو پکڑ لئے اور پھر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کو خبر بھی ہے کہ سکندر مرزا کس مقام پر مرگ ناگہانی کا شکار ہوا؟ مسلح سپاہیوں اور احمد جمال کے درمیان مشکل سے تین چار سو گز کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا کہ آسمان سے برق ٹوٹی اور ستم گروں کو ان کے منصوبوں کے ساتھ راکھ کر کے اپنے مرکز کی طرف لوٹ گئی۔ سکندر مرزا اس راز سے باخبر تھا کہ احمد جمال روزانہ رات کے وقت اپنے روحانی باپ سید مہدیؒ کی قبر پر تنہا جاتا ہے۔ سکندر مرزا نے رات کی تاریکی اور احمد جمال کی تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قتل کرنے کے لئے فرغانہ کے ماہر شمشیر زنوں کی مدد حاصل کی۔ بظاہر وہ فتنہ پرداز اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے تھے مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ منزل فنا کے مسافر تھے اور موت اپنا خونی دہن کھولے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھی۔" عمر شیخ مرزا نے اپنی بیوی کے دونوں بازو چھوڑ دیئے اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ والیٔ فرغانہ پر شدید اضطراب کی کیفیت طاری تھی کچھ دیر بعد ٹہلتے ٹہلتے وہ قتلغ خانم کے پاس ٹھہرا اور اسے عجیب سے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "ملکہ عالیہ نے یہ منظر تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ بجلی کی تمازت سے سکندر مرزا کا پورا جسم کوئلہ بن چکا تھا' مگر یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ تمام ہلاک ہونے والوں کے چہرے مکمل طور پر محفوظ تھے۔ آپ جانتی ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟" شدت غضب سے عمر شیخ مرزا کا لہجہ جل رہا تھا۔

قتلغ خانم نے بڑی ہمت کر کے سر اٹھایا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھا' ملکہ فرغانہ دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا' جیسے وہ خود بھی مجرم ہو...... اور واقعتاً بنیادی مجرم وہی تھی' مگر وقت نے اس کے جرم پر گہرا پردہ ڈال رکھا تھا۔

''قدرت اہل فرغانہ کو بتانا چاہتی ہے کہ جب زمین والے مصلحت و نفاق کے باعث انصاف کرنے سے عاجز ہوتے ہیں تو پھر مظلوموں کے مقدمات آسمان کی عدالت میں پیش کر دیے جاتے ہیں...... اور آسمانی عدالت وہ ہے جہاں قانون کے کارندوں سے ذرہ برابر بھی غلطی نہیں ہوتی۔ ہم احمد جمال کے ساتھ انصاف نہ کر سکے تو قدرت نے اس کے مقدمے کا فیصلہ کر دیا اور مجرموں کے چہروں کو اس لئے محفوظ رکھا گیا کہ لوگ آسانی سے انہیں پہچان لیں۔ مجھے تمام عمر اس بات کا قلق رہے گا کہ میرے ہی گھر کے ایک فرد نے احمد جمال کی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا۔ کاش! ایسا نہ ہوتا۔''

اب قتلغ خانم کے پاس فرار کے لئے کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ مجبوراً اس نے سکندر مرزا کو مجرم قرار دے دیا۔ ''مجھے خود بھی اس کا بہت افسوس ہے صاحب عالم!'' ملکہ فرغانہ کا چہرہ بجھا بجھا تھا مگر لہجے میں وہی ریاکاری تھی۔

''سکندر مرزا کی موت کا معاملہ جدا ہے۔ اس نے جو کچھ بویا تھا اس کی فصل کاٹ لی۔'' عمر شیخ مرزا ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا...... ''میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ احمد جمال کے ساتھ آپ کا طرز عمل کیا ہے؟'' بالآخر والیٔ فرغانہ نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

قتلغ خانم نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔ ''میرا طرز عمل؟'' ملکہ فرغانہ کے ماتھے پر کئی شکنیں نمودار ہو گئی تھیں...... ''میں نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟''

خانم کی بے حسی اور غرور کا وہی عالم تھا۔ عمر شیخ مرزا نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا تاہم اس کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ ''آپ اسے ماں کی محبت دینے پر قادر تھیں مگر آپ نے ہمیشہ اس کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا۔ اگر غرور شاہی کی داستان یہیں ختم ہو جاتی تو میں آج بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا' مگر کیا کروں کہ آپ نے تو شفقت و مہربانی کے سارے راستے بند کر دیے۔ میں نے احمد جمال سے کہا تھا کہ وہ وارث فرغانہ کو اپنا چھوٹا بھائی کہہ کر پکارے' مگر آپ کی تعلیم و تربیت نے بابر مرزا کو بھی اس کا آقا بنا ڈالا۔''

''بابر مرزا اس کا آقا ہے اور آقا ہی رہے گا۔'' قتلغ خانم ایک بار پھر درمیان میں بول اٹھی تھی۔

عمر شیخ مرزا بیوی کے اس طرز کلام پر بری طرح جھنجلا اٹھا تھا۔ ''خاموش ہو جائیے ملکہ عالیہ اور خدا کے قہر سے امان طلب کیجئے۔ احمد جمال پر کئے جانے والے کس کس ظلم کا حساب پیش کروں؟ عالیہ' احمد جمال کی طرف متوجہ ہوئی تو آپ نے اس معصوم بچی پر اپنی نوازشات کے دروازے بند کر دیئے اور اسے قصر شاہی کی ایک ادنیٰ کنیز بنا کر رکھ دیا۔ کیا آپ اس لئے تو احمد جمال سے حسد نہیں رکھتیں کہ وہ تمام مغل شہزادوں اور خود آپ کے بیٹوں سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت نوجوان ہے؟ اور کہیں آپ کی نفرت و حقارت کا یہ سبب تو نہیں ہے کہ بابر مرزا سید مہدیؒ کی دعاؤں سے پیدا ہوا ہے اور ان دعاؤں کا براہ راست تعلق بھی احمد جمال کی ذات سے ہے؟''

شوہر کی گفتگو سن کر قتلغ خانم بدحواس ہو گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے عمر شیخ مرزا نے اس کے دل کا جو

...دراصل ملکہ فرغانہ کی یہی نفسیاتی گرہ تھی کہ وہ احمد جمال کو دیکھ کر شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ...ایک درویش زادے سے عمر شیخ مرزا کی بے پناہ محبت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ دوسرے یہ خلش ...اسے نہیں بیٹھنے دیتی تھی کہ اس کی ویران آغوش سید مہدیؒ کی دعاؤں سے آباد ہوئی تھی...... اور سید ...بھی ایک بدحال درویش تھے۔ اس سلسلے میں خود قتلغ خانم بھی کچھ زیادہ قصوروار نہیں تھی کہ اس کی پرورش ...ایسی فرمانرواؤں کے درمیان ہوئی تھی جو تاج و تخت کے سوا کسی چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ پھر اسے ...بتاتا کہ انسانی کردار کی بلندی کیا ہے اور چٹانوں پر بیٹھے درویش شاہان کج کلاہ سے بھی عظیم تر ہوتے ہیں۔ ...اس تربیت نے قتلغ خانم کو حد درجہ مغرور اور سرکش بنا دیا تھا۔ آج جب عمر شیخ مرزا نے اس کی اس کمزوری پر ...ایسی ضرب لگائی تو وہ تڑپ اٹھی۔ چند لمحوں کے لئے سہمی ہوئی نظروں کے ساتھ والیٔ فرغانہ کی طرف دیکھتی ...اور پھر اپنی جھوٹی انا کا بھرم رکھنے کے لئے خود پرستی کے اسی خول میں واپس لوٹ آئی جہاں اس نے عمر کا ...بڑا حصہ گزارا تھا۔

''کچھ بھی ہو صاحب عالم! میں بابر مرزا پر کوچہ گردوں کے بچوں کا سایہ بھی پڑنے نہیں دوں گی۔'' قتلغ ...کے لہجے میں وہی تمکنت تھی...... ''وہ نجیب الطرفین شہزادہ ہے اور اس کی تربیت اسی انداز میں ہوگی۔''

''ملکہ عالیہ! میں نے اپنے حوصلے سے کہیں زیادہ آپ کی ناز برداریاں کی ہیں۔'' یکایک عمر شیخ مرزا کا ...لہجہ آمیز ہو گیا تھا۔ ''آپ قصر شاہی میں نئی نئی تقریبات آراستہ کریں' اپنے جسم کو قیمتی پتھروں اور زیورات ...سے سجائیں' اپنے غرور کا مجسمہ نصب کر کے فرغانہ کی خواتین کے لئے سجدہ ریزی کے احکامات جاری کر دیں' ...مگر میرے بچوں کو حیوانیت کے مقتل کی بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے کوئی سمجھوتہ نہیں ...کروں گا۔''

قتلغ خانم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں' اس نے پہلی بار عمر شیخ مرزا کے یہ آتشیں تیور دیکھے تھے ورنہ وہ ...آج تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ والیٔ فرغانہ اس کے غمزہ و ادا کا ایسا اسیر ہے جو اپنی ساری زندگی اس کی زلف کے ...سائے میں حسن کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے گزار دے گا...... مگر آج اس نے عمر شیخ مرزا کا دوسرا چہرہ دیکھا تھا جو ...ایک جانباز شمشیر زن اور سخت گیر حکمراں کا چہرہ تھا۔

''اور یہ بھی سن لیجئے ملکہ عالیہ!'' عمر شیخ مرزا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نے میرے ...حکم سے سرتابی کی اور اپنی دیرینہ روش نہیں بدلی تو میں تینوں بچوں کو آپ سے جدا کر کے اندجان بھیج دوں ...گا۔ واللہ! میں کوئی بے رحم حکمراں نہیں' ایک فرض شناس باپ ہوں۔'' بیوی کے ردعمل کا انتظار کئے بغیر عمر شیخ مرزا ...ملکہ قتلغ کی خواب گاہ سے باہر جانے لگا۔

ملکہ فرغانہ کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

خواب گاہ کے دروازے میں پہنچ کر عمر شیخ مرزا رک گیا اور پھر یکایک مڑ کر قتلغ خانم سے مخاطب ہوا۔

''اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ احمد جمال کو ایک شفیق ماں کی آنکھوں سے تو نہیں دیکھ سکتیں پھر بھی ...خدا کے لئے اس سے نفرت نہ کیجئے۔ نفرت بڑے خسارے کی تجارت ہے۔ حرص و ہوس کے اس بازار سے کبھی ...کوئی تاجر سلامتی کے ساتھ نہیں گزرا۔ میری مسلسل ہدایت کے باوجود اگر آپ نے نفرتوں کا یہی کاروبار جاری ...رکھا تو [illegible] کے انجام پر ضرور غور کر لیجئے۔'' یہ کہہ کر عمر شیخ مرزا ملکہ فرغانہ کی خواب گاہ سے باہر

نکل گیا۔

شوہر کے جاتے ہی قتلغ خانم کی وہی سفاک فطرت عود کر آئی۔ احمد جمال کے لئے اس کے سینے میں نفرت کی ایک تند و تیز لہر اٹھی، مگر فوراً ہی اسے عمر شیخ مرزا کے الفاظ کی بازگشت سنائی دی اور اس بازگشت کے دوران اس کی نظروں کے سامنے سکندر مرزا کی لاش کا منظر ابھر آیا۔ کوئلے کی طرح جلا ہوا جسم، خوف سے ابلی آنکھیں، ہونٹوں کا بگڑا ہوا زاویہ، باہر نکلی ہوئی زبان، ایک انتہائی بدہیئت چہرہ جسے دیکھ کر ڈر محسوس ہو۔ سکندر کا تصور کرتے ہی قتلغ خانم کے جسم میں بھی خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

⌑ ⌑ ⌑

اگرچہ عالیہ نے احمد جمال سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ لیکن جب اسے سکندر مرزا کی موت کی خبر ملی اور میں جگہ جگہ کی جانے والی سرگوشیوں کے ذریعے دیگر تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ بے اختیار احمد جمال کے کمرے کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ بظاہر دونوں کے درمیان برسوں سے کوئی رسم و راہ نہ لیکن در پردہ عالیہ احمد جمال کی ایک ایک مصروفیت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ اس کے دل کا تقا اور وہ اپنے دل سے مجبور تھی مگر اس طرح کہ کبھی کسی کے سامنے اپنے جذبوں کی نمائش نہیں کرتی تھی۔ پھر شاہی کا ایک ایک مکین جانتا تھا کہ عالیہ احمد جمال کے عشق میں کسی شمع کی مانند قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے۔ اس کے برعکس احمد جمال اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ عجیب یکطرفہ عشق تھا اور آ عشق رات کی تاریکی میں ایک پاک دامن اور غیرت مند دوشیزہ کو اس کے محبوب کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ عالیہ ایک لمحے کے لئے احمد جمال کے کمرے کے سامنے ٹھہری۔ اسے معلوم تھا کہ احمد جمال روزانہ کے معمول کے مطابق سید مہدیؒ کی قبر پر حاضری دے کر واپس آ گیا ہوگا۔ پھر عالیہ خانم کا ہاتھ بلند اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ احمد جمال جاگ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس نے درواز دیا۔ نظروں کے سامنے چادر میں لپٹا ہوا ایک نسوانی سایہ موجود تھا۔ آنے والی خاتون کی جسامت دیکھ جمال نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے دروازے پر موجود نسوانی سایہ عالیہ کے سوائے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نے دبے لہجے میں احتیاطاً پوچھ لیا۔

"کون؟"

"میں عالیہ!" سائے کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

احمد جمال راستے سے ہٹ گیا اور اس نے عالیہ کو اندر آنے کے لئے راستہ دیدیا۔ عالیہ آہستہ آہستہ سے چلتی ہوئی کمرے کے وسط میں جا کر رک گئی۔ عالیہ کے آنے سے کچھ دیر پہلے احمد جمال سونے کے پر دراز ہو چکا تھا اور اسی رعایت سے کمرے میں گہرے سبز رنگ کا فانوس جل رہا تھا۔ یہ روشنی اس قدر کہ آنے والے کے خدوخال بھی نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ مجبوراً احمد جمال نے آگے بڑھ کر نیا فانوس روشن پھر وہ چند لمحوں کے لئے عالیہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کہاں وہ شادابی حسن کا دلنشیں پیکر اور کہاں یہ بجھا بجھا چہ تیز دھوپ نے کسی نوشگفتہ گلاب کو جھلسا کر رکھ دیا ہو۔ اگرچہ عالیہ کے سر پر عیش و نشاط کا گہرا سائبان تھا کے اپنے اندر محرومیوں کی ایک بھڑکتی ہوئی آگ تھی اور اسی آگ نے اسے سر سے پاؤں تک جلا کر رکھ

حالت دیکھ کر احمد جمال کو پہلی بار اپنے دل پر دباؤ سا محسوس ہوا۔ اس نے چاہا کہ وہ عالیہ سے شگفتگی کا ہے مگر فوراً ہی اس نے اپنے سینے میں اٹھنے والی جذبات کی اس لہر کو دبا دیا۔

"بیٹھو عالیہ!" احمد جمال نے آبنوس کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیسے آئیں؟ کیا مجھ سے کوئی خاص کام ہے؟" احمد جمال کے لہجے میں وہی بے نیازی تھی جس کا مظاہرہ وہ کئی سال سے کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" یکایک عالیہ کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھر آئی اور ویران آنکھوں میں روشنی کے قمقمے جھلملانے لگے۔ "آج میں بہت خوش ہوں جمال!" عالیہ کے لہجے میں ایسی اپنائیت تھی کہ احمد جمال نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ "تمہارے تمام مجرم اپنے بدترین انجام کو پہنچ گئے۔"

"میرے مجرم؟" احمد جمال نے چونک کر کہا۔ وہ عالیہ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

"سکندر مرزا اور اس کے ساتھی برسوں سے تمہاری زندگی کے درپے تھے۔" یہ کہتے کہتے عالیہ کے چہرے پر نفرت و غضب کی پرچھائیاں لرزنے لگیں اور آنکھوں سے انگارے سے برسنے لگے۔ "شہ سواری کے مقابلے میں پیش آنے والا وہ خوفناک حادثہ اور تمہارے چہرے پر تیزاب پھینکے جانے کا واقعہ اس بدنہاد سکندر مرزا ہی کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ فرغانہ کے قانون کی بینائی بہت کمزور ہے اس لئے وہ گناہ گاروں کی جماعت کو تلاش نہ کر سکا۔ پھر مجرموں نے تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ان کی چالیں بہت باریک تھیں اور حربے مکمل تر تھے مگر قدرت نے ان کی تدبیروں کو انہی پر الٹ دیا۔"

ایک لمحے کے لئے احمد جمال کے چہرے پر حیرت و خوف کا ہلکا سا سایہ ابھرا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے سے کئی دبیز پردے ہٹتے چلے گئے۔ کچھ دیر تک اس کا ذہن ماضی کے ناہموار راستوں پر تیزی سے گردش کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا اور حال کی دنیا میں لوٹ آیا۔

"میں نے تو سکندر مرزا کا کچھ نہیں بگاڑا۔" اب احمد جمال بہت مطمئن لہجے میں بات کر رہا تھا۔ "اس لئے وہ میرا مجرم نہیں ہو سکتا۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور اپنی اسی جنونی خواہش کے تحت مجھے حاصل بھی کرنا چاہتا تھا۔" عالیہ نے کسی قدر پرجوش لہجے میں کہا۔ "مگر جب اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں تو وہ تمہاری جان کا دشمن بن گیا۔" یہ کہتے کہتے عالیہ کے چہرے پر شرم و حیا کی ہلکی ہلکی سرخی ابھر آئی۔

"مگر میں نے تو کبھی تم سے محبت نہیں کی۔" احمد جمال نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "سکندر مرزا بہت نادان تھا کاش! وہ ایک بار مجھ سے اس موضوع پر گفتگو کر لیتا۔ پھر نہ وہ رقابت کی آگ میں جلتا اور نہ آسمان سے اس پر برق ستم ٹوٹتی۔ بہرحال میں نے اسے معاف کر دیا۔ اب اس کے ذمہ میرا کوئی حساب نہیں ہے۔ اللہ بھی اسے معاف فرمائے۔"

عالیہ کا چہرہ دھواں ہو کر رہ گیا۔ احمد جمال نے ایک بار پھر اس کی محبت کی نفی کر دی تھی اور پاکیزہ و بے لوث جذبوں کو بڑی بے رحمی سے پامال کر ڈالا تھا۔ ناکام محبت دوشیزہ نے بڑی حسرت زدہ نظروں سے احمد جمال کی طرف دیکھا اور چپ چاپ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"عالیہ! میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ تم مجھ سے نہ ملا کرو۔" احمد جمال نے بے رخی کا ایک اور سنگین مظاہرہ کیا۔ "میں نہ اہل دنیا کی ہمدردیوں کا طالب ہوں اور نہ مجھے کسی کی محبت کی ضرورت ہے۔ یہ تم شہزادیوں اور

شہزادوں کے کھیل ہیں خدا کے لئے مجھے اس تماشے میں شریک نہ کرو۔ یہ مجھ پر تمہارا آخری احسان ہوگا۔"

عالیہ بڑے صبر کے ساتھ اپنے دل پر کی جانے والی اس نشتر زنی کو برداشت کرتی رہی۔ پھر جب احمد جمال کی آواز کمرے کی فضا میں ڈوب گئی تو عالیہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے سے نکل آئی۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ احمد جمال اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کا مذاق اڑائے۔

عالیہ کے جاتے ہی احمد جمال نے تمام فانوس بجھا دیئے۔

¤ ¤ ¤

سکندر مرزا کی موت کے بعد قتلغ خانم کے مزاج میں بس اتنی سی تبدیلی آئی تھی کہ اس نے اپنے بڑے بیٹے بابر مرزا کو احمد جمال کے خلاف بھڑکانا بند کر دیا تھا اور وہ عارضی انقلاب بھی محض عمر شیخ مرزا کی سخت تنبیہ کے باعث رونما ہوا تھا۔ اس نے کئی بار احمد جمال کے خلاف نیا منصوبہ تراشنے کی کوشش کی، مگر ہر مرتبہ سکندر مرزا کا بھیانک انجام اسے خوف زدہ کر گیا۔

پھر کچھ دن بعد قتلغ خانم کو اپنے باپ یونس خان کے انتقال کی خبر ملی اور ملکہ فرغانہ کا ذہن اندیشوں میں گھر گیا۔ اگرچہ وہ اپنے جابر اور خودغرض باپ کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی لیکن پھر بھی یونس خان کی موجودگی کے باعث اسے ایک ذہنی سکون اور قلبی پناہ حاصل تھی۔ یہ احساس ہمیشہ قتلغ خانم کو سرشار رکھتا تھا کہ وہ ایک طاقتور حکمران کی بیٹی ہے اور اسی احساس نے اسے مغرور و بد دماغ بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ آج جب ملکہ فرغانہ کو باپ کے مرنے کی اطلاع ملی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک نیم جاں ملکہ ہے۔ اس کے دست و بازو کاٹ دیئے گئے ہیں یا پھر فالج کی بیماری نے اس کے آدھے جسم کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ عمر شیخ مرزا نے رسم دنیا نبھانے کے لئے پورے فرغانہ میں یونس خان کی موت کا سوگ منانے کے احکامات جاری کر دیئے اور اپنی بیوی کے ذاتی غم میں بھرپور شرکت کی مگر وہ دلی طور پر یونس خان سے خوش نہیں تھا۔ یونس خان نے کئی بار فرغانہ اندجان پر قبضہ کرنے کی سازشیں کی تھیں۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ بہت دن پہلے اپنے داماد کو کفن اور اپنی بیٹی کو بیوگی کا لباس پہنا چکا ہوتا۔ اس کے برعکس عمر شیخ مرزا نے ہمیشہ رواداری سے کام لیا اور نازک رشتوں کی آبرو برقرار رکھی۔ اگرچہ اس سفر میں عمر شیخ مرزا کی جان کو شدید خطرہ لاحق تھا لیکن پھر بھی قتلغ خانم کے ہمراہ مغولستان (ترکستان) پہنچا...... اور اپنے برادر نسبتی سلطان محمد مرزا اور دیگر خسرالی رشتے داروں کو تعزیت پیش کی۔

واپسی میں قتلغ خانم کو کئی بار احمد جمال یاد آیا اور ہر مرتبہ اس کے جسم میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ وہ وہم پرست اور بد دماغ عورت اپنے باپ یونس خان کی موت کو احمد جمال کی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھ رہی تھی۔ جب احمد جمال نے یونس خان کی انتقال کی خبر سنی تھی تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر قتلغ خانم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے پرسوز لہجے میں اس نے تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ملکہ عالیہ! میں کن لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کروں یہ ایسا نازک مقام ہے کہ جہاں سارا علم بے دست و پا نظر آتی ہے۔ ہزار خواہش کے باوجود کوئی کسی کا غم نہیں بانٹ سکتا۔ گو والدین کی محبت و شفقت سے تو واقف نہیں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یتیمی کسے کہتے ہیں اور سر سے باپ کا سایہ اٹھ جانے کا کیا مفہوم

ہے؟ کاش! یہ جان ناکارہ آپ کے کسی کام آسکتی۔"

بڑا عجیب جذبہ تھا مگر ایک حاسد اور تنگ نظر ملکہ احمد جمال کے اس جذبہ جاں نثاری کی قدر نہ کر سکی۔ اس نے انتہائی متکبرانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دے کر احمد جمال کی پیش کردہ تعزیت قبول کی تھی اور پھر عمر شیخ مرزا کے ہمراہ مغولستان چلی آئی تھی۔ اب فرغانہ کی طرف لوٹتے وقت بار بار اس کے خیالوں میں احمد جمال کا چہرہ ابھر رہا تھا اور وہ ایک انجانے سے خوف میں مبتلا تھی۔ شوہر کی مسلسل ہدایات کے باوجود قتلغ خانم کے ذہن و دل کا غبار صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ روز اول کی طرح آج بھی احمد جمال کو ایک منحوس انسان سمجھتی تھی لیکن سکندر مرزا اور یونس خان کی موت کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ کسی کے سامنے لب کشائی کر سکے۔

¤ ¤ ¤

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کے بابر مرزا کی عمر کے قافلے نے ایک اور منزل طے کر لی۔ اب وارث فرغانہ گیارہ سال کا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ عمر شیخ مرزا کی آخری تنبیہ کے بعد قتلغ خانم نے احمد جمال کے سلسلے میں مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی، مگر ابتدائی سالوں کی تربیت کے باعث بابر مرزا اور احمد جمال کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل ہو چکی تھی۔ امیر تیمور کا جواں سال وارث آج بھی احمد جمال کو اپنا ایک ادنیٰ خدمت گار سمجھ کر اس سے دور دور رہا کرتا تھا۔ اگرچہ بابر مرزا ایک انتہائی فراخ دل اور خوش مزاج شہزادہ تھا۔ لیکن ملکہ فرغانہ کی غلط تربیت نے اسے احمد جمال کی طرف سے انتہائی درجے تک بدگمان بنا دیا تھا۔ احمد جمال کو بابر مرزا کے اس تحقیر آمیز سلوک سے شدید اذیت پہنچتی تھی مگر وہ سید مہدیؒ سے کئے ہوئے عہد کے باعث نہ تو فرغانہ چھوڑ کر کہیں اور جا سکتا تھا اور نہ بابر مرزا سے بے تعلق رہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات رات بھر اس پیچیدہ اور پراسرار صورت حال پر غور کرتا رہتا مگر بالآخر اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا۔

اکثر اس کے ذہن میں مختلف سوالات گردش کرتے رہتے تھے۔ آخر بابا کی یہ خواہش کیوں تھی کہ میں وارث فرغانہ کے ساتھ ساتھ رہوں؟ اور کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دن وارث فرغانہ آفات و مصائب کے ہجوم میں گھر جائے گا؟ وہ کیسا وقت ہوگا؟ یہ سوچ کر احمد جمال لرز جاتا۔ کبھی اس کے جی میں آتی کہ وہ بے خبر اور نادان شہزادے کو سید مہدیؒ کی اس پیش گوئی سے آگاہ کر دے۔ کبھی سوچتا کہ عمر شیخ مرزا کو اشاروں اور کنایوں میں سمجھانے کی کوشش کرے کہ مستقبل میں کوئی خوف ناک طوفان آنے والا ہے۔ مگر پھر یہ خیال کر کے خاموش ہو جاتا کہ عمر شیخ مرزا جیسے حساس انسان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ غرض اس کشمکش میں اس کی بے سکون زندگی بسر ہو رہی تھی۔

اچانک ایک دن بھرے دربار میں عمر شیخ مرزا نے اپنے بڑے بیٹے بابر مرزا کی رسم بادہ نوشی کی تقریب کا اعلان کیا۔ زمانہ قدیم سے مغل حکمرانوں میں یہ بری رسم فروغ پا گئی تھی کہ ہر فرمانروا ولی عہد سلطنت کو اپنے ہاتھوں سے شراب پلایا کرتا تھا۔ بابر مرزا کی رسم کے سلسلے میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا پھر جب والئ فرغانہ عمر شیخ مرزا نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے ولی عہد سلطنت کی طرف بڑھایا اور بابر مرزا نے شراب کے رنگ سے اپنے ہونٹ تر کئے تو قصر شاہی کا سبزہ زار مبارک بادوں کے شور سے گونج اٹھا۔ فرغانہ کے تمام امراء بڑی پرجوش آوازوں میں عمر شیخ مرزا کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے۔

''صاحب عالم کو یہ جشن کیف ونشاط مبارک ہو اور نسل تیمور قیامت تک اسی طرح مسرت و کامرا
جام پیتی رہے۔''

عمر شیخ مرزا انتہائی سرشاری کے عالم میں اپنے دائیں ہاتھ کے اشارے سے امرائے فرغانہ کی مبار
کا جواب دیتا رہا۔ احمد جمال ولی عہد سلطنت کے بائیں ہاتھ پر قریب ہی بیٹھا تھا جیسے ہی بابر مرزا۔
ساغر اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔ احمد جمال کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے ......او
ولی عہد سلطنت نے شراب کا آخری گھونٹ اپنے حلق سے اتارا تھا تو احمد جمال کی حالت غیر ہو گئی تھی۔
تک احمد جمال شدید اذیت و کرب کے عالم میں اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ پھر جب اس کی قوت برداشت
دے گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

آئین شاہی کے مطابق احمد جمال کا یہ فعل گستاخی و بے ادبی کے مترادف تھا۔ عمر شیخ مرزا کے سا
امرائے سلطنت نے بھی احمد جمال کی اس حرکت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا' مگر بابر مرزا کو اپنے ایک
گار کا اس طرح مجلس شاہی سے اٹھ جانا بہت گراں گزرا تھا۔ اگر اسے والیٔ فرغانہ کی موجودگی کا لحاظ نہ
بھری محفل میں احمد جمال کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو اپنے حکم کی زنجیر پہنا دیتا۔

''جشن بادہ نوشی'' کے ختم ہونے کے بعد بابر مرزا نے انتہائی تند و تیز لہجے میں والیٔ فرغانہ سے احم
کے گستاخانہ رویے کی شکایت کی۔ عمر شیخ مرزا غضب ناک ولی عہد سلطنت کو پرسکون رہنے کی تلقین کرتا رہا

''وہ ایک مذہبی انسان کا بیٹا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اسے ہماری یہ شاہانہ رسم پسند نہیں آئی۔'' اگر
مرزا کا لہجہ نرم تھا' لیکن پھر بھی اس کی آواز میں ایک عجیب سی خلش پوشیدہ تھی۔

بابر مرزا باپ کے سامنے خاموش رہا' مگر دوسرے دن رات کے وقت اس نے احمد جمال کو اپنی خلو
طلب کرلیا۔ ''کل تم میری اجازت کے بغیر جشن کیف ونشاط سے اٹھ کر کیوں چلے گئے تھے؟'' آج بابر م
تیور بگڑے ہوئے تھے اور وارث فرغانہ احمد جمال سے اس طرح مخاطب تھا جیسے کوئی سخت گیر آقا اپنے مج
سے بات کررہا ہو۔

''میں اس محفل کے لائق نہیں تھا' اس لئے اٹھ کر چلا گیا۔'' احمد جمال نے انتہائی متانت سے ک
ہوئے بابر مرزا کے تلخ لہجے اور غضب ناک تیوروں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''اور تم نے ہمیں اس شاہانہ رسم کے ادا کرنے پر مبارکباد بھی نہیں دی۔'' ولی عہد فرغانہ کا لہجہ بدستو
اور آواز معمول سے بہت زیادہ بلند تھی۔

''میں جس رسم کا قائل ہی نہیں ہوں اس کی ادائیگی پر مبارکباد کس طرح دے سکتا ہوں؟'' احمد جما
انتہائی شائستہ تھا' لیکن اس میں طنز کی ہلکی سی آمیزش بھی تھی۔ ''معاف کیجئے شہزادہ عالم! مجھ سے منافقت
کا روبار نہیں ہوگا۔ میں اس چیز کو حلال نہیں ٹھہرا سکتا جسے میرے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔'' احمد جمال
بے باکی کے ساتھ کھلے لفظوں میں حکمرانوں کی ''رسم بادہ نوشی'' کی نفی کر دی تھی۔

بابر مرزا کچھ دیر کے لئے سناٹے میں آگیا۔ اسے احمد جمال سے اس صاف گوئی کی کوئی توقع نہ

''کیا تم ہماری مملکت میں تنہا شخص ہو جسے حلال و حرام کا فرق معلوم ہے؟''

''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' احمد جمال کے لہجے میں وہی استقامت اور بے باکی تھی

ہ سلطنت کے جاہ و جلال سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ ''ایک حاکم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی نشہ آور شے
غلام بن کر اپنی رعایا سے بے خبر ہو جائے۔ شہزادہ عالم! آپ کو تو بندگان خدا کے حقوق کی حفاظت کے لئے
اپنی ضروری نیندیں بھی قربان کر دینا ہیں' مگر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آپ وقت سے پہلے سونے کی
پامال کررہے ہیں۔ خدا کے لئے ہوش میں آیئے! ساغر وصراحی کی صحبتیں آپ کے منصب کے شایان شان
نہیں۔''

''خاموش ہو جاؤ احمد جمال اور اپنی آنکھیں بند کرلو۔'' بابر مرزا چیخ کر بولا۔ ''تمہیں اس دنیا کا ہر منظر
ہماری آنکھوں سے دیکھنا ہوگا اور تمہاری زبان وہی لفظ ادا کرے گی' جسے ہم پسندیدہ قرار دیں گے۔'' قتلغ خانم کی
تربیت آج رنگ لا رہی تھی اور بابر مرزا احمد جمال سے آمرانہ لہجے میں گفتگو کررہا تھا۔ ''ہم اپنے باپ دادا کی
رسموں کے پابند ہیں اور ایک دن سرعام تمہیں بھی اسی رسم پر عمل کرنا پڑے گا۔'' ولی عہد فرغانہ نے مبہم الفاظ میں
احمد جمال پر ظاہر کر دیا تھا کہ عنقریب اسے بھی شراب نوشی کے عمل سے گزرنا تھا۔

ابھی خلوت گاہ میں بابر مرزا کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ احمد جمال اسی آہنگ اور لہجے میں بول اٹھا جس کا
مظاہرہ ولی عہد سلطنت کررہا تھا۔ ''شہزادہ معظم! یہ تو ممکن ہے کہ میں اپنے جسم کا سارا لہو نچوڑ کر آپ کا ساغر
لبریز کردوں' مگر یہ ممکن نہیں کہ اس غلیظ پانی کا کوئی قطرہ میرے حلق سے اتر جائے۔'' احمد جمال نے اپنی
بات مکمل کی اور تیز رفتاری کے ساتھ مغل شہزادے کے کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

بابر مرزا کے دل میں احمد جمال کی طرف سے ایک اور گرہ پڑ گئی۔

⌘ ⌘ ⌘

اس ناخوشگوار واقعہ نے احمد جمال کی ذہنی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے اور بابر مرزا کے
درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں تھی اور فاصلوں کی یہ خلیج روز بہ روز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ احمد جمال رات رات
بھر جاگ کر اس مسئلے پر غور کرتا رہتا۔ مگر بظاہر اس کا کوئی حل موجود نہیں تھا۔ پھر جب سوچتے سوچتے اس کا دماغ
تھک گیا تو اس نے حالات کی اس سرکش لہر کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اب اگر کبھی بابر مرزا سے احمد جمال
کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ولی عہد سلطنت کے چہرے پر کشیدگی کے آثار نظر آنے لگتے۔ ایسے مواقع پر احمد جمال فوراً
اپنا رخ بدل لیتا یا پھر محفل سے اٹھ کر چلا جاتا۔ وہ دلوں کی فضاء کو مزید غبار آلود ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔ عمر شیخ
مرزا نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ مگر اس نے ابھی تک اس موضوع پر احمد جمال اور بابر مرزا سے کوئی
گفتگو نہیں کی تھی۔ دراصل والیٔ فرغانہ ایک مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ ایک طرف شاہزادہ تھا اور دوسری
طرف شیخ زادہ۔ وہ دونوں رشتوں میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

اسی دوران ایک اور سنگین واقعہ رونما ہوا۔ ایک رات جب احمد جمال' سید مہدیؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کر کے
واپس آیا تو اسے اپنے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ احمد جمال یہی سمجھا کہ عالیہ ایک بار پھر
شدت جذبات سے مجبور ہو کر چلی آئی ہوگی' مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو وہاں ایک اجنبی چہرہ موجود تھا۔ احمد
جمال نے رات کے اندھیرے میں آنے والی عورت کو بڑی حیرت سے دیکھا اور اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ وہ
قصر شاہی کی ایک کنیز تھی' جو احمد جمال کے لئے ایک مغل شہزادی کا خط لے کر آئی تھی۔

احمد جمال نے شدید ناگواری کے عالم میں خط پڑھا۔ خط کیا تھا' عشق کے والہانہ جذبات ایک جیتی جاگ تصویر تھی۔ احمد جمال نے خط کو تہہ کیا اور اسے کنیز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ناز آفرین بیگم کون ہیں؟''

''شہزادہ عالم کی قریبی عزیزہ ہیں اور کچھ دن پہلے ہی اپنے والد محترم بہرام مرزا کے ہمراہ سمرقند سے فرغا تشریف لائی ہیں۔'' کنیز نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بہرام مرزا کے نام پر احمد جمال چونک اٹھا۔ بہرام مرزا والیٔ سمرقند سلطان احمد مرزا کا رشتے کا بھائی تھا۔ کچھ دن پہلے ہی فرغانہ پہنچا تھا اور اس نے بڑے اثر انگیز لہجے میں عمر شیخ مرزا کو اپنی داستان الم سنائی تھی۔

''برادر عزیز! میں سلطان احمد مرزا کے وحشیانہ اقتدار کی نفی کرتا ہوں۔ اس کے دور حکومت میں نہ کسی ک جان و مال محفوظ ہیں اور نہ عزت و آبرو۔ اگر میں تنہا ہوتا تو شاید بے عزتی کی زندگی بھی قبول کر لیتا' لیکن مجھ اپنی بیٹی ناز آفرین بیگم کی آبرو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اکثر والیٔ سمرقند کی آنکھوں میں نا آفرین کے لئے بڑے ناپاک جذبے موجزن دیکھے ہیں۔ اس لئے میں سلطان احمد مرزا سے فرغانہ میں عارضہ قیام کا بہانہ کر کے تمہارے سایہ کرم میں پہنچا ہوں۔ میرے معزز و محترم بھائی! خدا کے لئے مجھے پناہ دو کہ م اس وقت بہت مجبور ہوں۔'' یہ کہتے کہتے بہرام مرزا ہچکیوں سے رونے لگا تھا۔

اپنے رشتے کے بھائی کی یہ حالت زار دیکھ کر عمر شیخ مرزا کو اپنے حقیقی بھائی کی ہوس پرستیوں اور سفاکیوں یقین آ گیا۔ پھر اس نے پورے عزت و احترام کے ساتھ یہ کہہ کر بہرام مرزا کو اپنی مملکت میں پناہ دے دی کہ یہاں ان دونوں باپ بیٹی کی زندگی بھی محفوظ ہے اور آبرو بھی۔

اور آج اسی مظلوم باپ کی معصوم و غیرت مند بیٹی اس سے انتہائی بیباکانہ انداز میں اظہار عشق کر رہی تھی احمد جمال کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور اسے اپنے گرد کوئی نئی سازش منڈلاتی ہوئی محسوس ہونے لگی قصر شاہی کی کنیز سوالیہ نظروں سے اسے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ احمد جمال نے چہرے کے تاثرات سے اپنی د کیفیات ظاہر ہونے نہیں دیں اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ناز آفرین بیگم کا خط کنیز کی طرف بڑھا۔ ہوئے بولا۔

''شہزادی سے کہنا کہ وہ اس قدر بے قراری کا مظاہرہ نہ کریں۔ میں ان کے جذبات کا بہت احترام کر ہوں۔ آئندہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں کہ اس طرح رسوائی کا اندیشہ ہے۔ بس کچھ دن انتظار کر لیں' میں مناسب موقع پر خود ہی ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔''

ناز آفرین بیگم کا محبت نامہ لانے والی کنیز خوش ہو کر چلی گئی اور احمد جمال گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

⌑ ⌑ ⌑

دوسرے دن احمد جمال قصر شاہی کی ایک اور کنیز گلنار سے ملا۔ گلنار فرغانہ کے محل کی خوبصورت ترین کنیز تھی جو کئی سال سے احمد جمال کے عشق میں مبتلا تھی۔ احمد جمال نے بڑی مشکل سے جوانی کے اس سرکش طوفان کو روکا تھا اور اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ زندگی صرف کیف و نشاط کا نام نہیں۔ گلنار احمد جمال کی بلند کرداری سے بہت متاثر تھی اور اسی تاثر نے محبت کے بجائے پرستش کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ بے قرار جذبے کسی حد تک پرسکون ہو گئے تھے' مگر آج بھی وہ دن رات میں کئی بار احمد جمال کو دیکھنے آتی تھی۔ گلنار کی پیاسی نظریں

ا ہر تک احمد جمال کے چہرے کا طواف کرتی رہتیں اور پھر وہ اپنے محبوب کو درازی عمر اور بلند اقبالی کی ائیں دے کر چلی جاتی۔

''گلنار! میں چاہتا ہوں کہ تم ناز آفرین بیگم کی حرکات پر مسلسل نظر رکھو۔'' احمد جمال نے بڑے رازدارانہ میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی آمد پر کسی نئے فتنے کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے۔''

چھ دن بعد گلنار نے احمد جمال کو ایک بڑی عجیب اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''ناز آفرین بیگم سائے کی شہزادہ عالم کے تعاقب میں ہے۔ وہ ولی عہد سلطنت کی قربت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ اکثر نے اسے شہزادے کو شراب پلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ناز آفرین بیگم کو ترکی اور فارسی زبان کے بہت عشقیہ اشعار یاد ہیں۔ وہ بابر مرزا کے شاعرانہ ذوق اور فطری رجحان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پناہ خوبصورت ہے' اس لئے ولی عہد سلطنت بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے ہیں۔''

گلنار کی زبانی یہ اطلاعات سن کر احمد جمال کچھ دیر کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ ناز آفرین بیگم کا کردار بہت پراسرار تھا۔ ایک طرف وہ اس کے عشق کا دعویٰ کر رہی تھی اور دوسری طرف وارث فرغانہ کو شکار کرنے کے اپنا ناز و ادا کا دام بچھا رہی تھی۔ احمد جمال خیالات کی دنیا سے نکل آیا اور گلنار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں شکر گزار ہوں گلنار! اگر تم اس مرحلے پر میری مدد نہ کرتیں تو میں بہت دنوں تک اندھیرے میں رہتا۔''

''شکریہ کس بات کا؟ آپ تو میرے جان و دل کے مالک ہیں۔'' گلنار نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا۔ اگر آپ کی خدمت گزاری میں میری زندگی میں کام آ جائے تو یہ ایک حقیر سی قربانی ہوگی۔'' انتہائی پر کشش لے کے باوجود گلنار اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔

احمد جمال نے ایک نظر اس جانباز کنیز کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ وہ اس کی محبت کا جواب کیسے دیتا اور مجبوریاں کس طرح سمجھاتا؟

⌑ ⌑ ⌑

اب احمد جمال فرغانہ کے محل میں محتاط زندگی گزار رہا تھا اور گلنار اسے مسلسل اس قسم کی خبریں دے رہی تھی ناز آفرین بیگم بابر مرزا سے بہت زیادہ بے تکلف ہوتی جا رہی ہے۔ احمد جمال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ ناز آفرین بیگم اور بابر مرزا کی عمروں میں نمایاں فرق تھا۔ اس وقت ولی عہد فرغانہ صرف بارہ سال کا تھا اور ناز آفرین بیگم سترہ اٹھارہ سال کی۔

غرض احمد جمال اسی ذہنی کشمکش کا شکار تھا کہ ایک رات ناز آفرین بیگم خود اس کی خواب گاہ تک چلی آ ئی۔ مغل شہزادی کو اس طرح اپنے کمرے میں دیکھ کر احمد جمال بری طرح گھبرا گیا...... ''آپ یہاں ...... اور اس وقت؟'' احمد جمال کی زبان سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ''خیر! میں تو قصر فرغانہ کا ادنیٰ خدمت گار ہوں۔ اس لئے مجھے اپنی رسوائی کی بھی زیادہ فکر نہیں۔ مگر آپ تو ایک اعلیٰ نسب شہزادی ہیں۔ اگر اس حالت میں کسی نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو ایک خوفناک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ تہمتوں کے طوفان اٹھیں گے۔ اس کا آپ کو اندازہ نہیں۔'' شدید اضطراب کے سبب احمد جمال کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔

''مجھے نہ کسی ہنگامے کی فکر ہے اور نہ میں کسی طوفان سے ڈرتی ہوں۔'' ناز آفرین بیگم کے لہجے میں بلا تمکنت تھی۔ ''تم مجھے اتنے دنوں تک جھوٹے وعدوں سے بہلاتے رہے اور میں ہر رات تمہاری آمد کا انتظار کرتی رہی۔''

''شہزادی! میں آپ کے لائق نہیں۔'' احمد جمال نے بظاہر اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا مگر پھر بھی اس کی بے چین نظریں اس خیال سے دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں کہ کہیں کوئی جاسوس ان دونوں کی گفتگو نہ سن رہا ہو۔ ''خدا کے لئے آپ اپنے مرتبہ و منصب کو پہچانیں اور مجھ جیسے کمزور ناتواں انسان کو کسی آزمائش میں نہ ڈالیں۔'' صورت حال اس قدر نازک تھی کہ احمد جمال جیسے آہنی اعصاب رکھنے والا نوجوان ایک دوشیزہ سے رحم کی درخواست کر رہا تھا۔ ''شہزادی محترمہ! ولی عہد فرغانہ تو آپ کا انتخاب ہو سکتے ہیں' یہ ادنیٰ خدمت گار نہیں۔'' احمد جمال نے بڑی ہوشیاری سے بابر مرزا کا ذکر کر کے ناز آفرین بیگم کی دلی کیفیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔

''یہ بابا جان کی خواہش ہے کہ ہم ولی عہد فرغانہ کا انتخاب کر لیں۔'' اگرچہ ناز آفرین بیگم انتہائی بیباک لہجے میں بول رہی تھی لیکن پھر بھی اس کی گفتگو سے جلال شاہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''ہم سمرقند سے تو اسی ارادے کے ساتھ آئے تھے مگر یہاں پہنچ کر ہمارا راستہ بدل گیا اور اس تبدیلی کی وجہ صرف تم ہو۔'' ناز آفرین بیگم نے ایک خاص انداز دلربائی کے ساتھ احمد جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

احمد جمال ایک بار پھر وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے خلاف سازش کی جا رہی ہے یا واقعتاً مغل شہزادی اس کے عشق بلاخیز میں گرفتار ہو گئی ہے۔

''ذاتی طور پر بابر مرزا ہمیں پسند نہیں۔'' ناز آفرین بیگم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ہمارا مزاج بھی نہیں کہ ہم تاج و تخت کے بدلے اپنا دل فروخت کر ڈالیں۔'' یکایک مغل شہزادی کے ہونٹوں پر ایک توبہ شکن مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''مگر میں نے تو آپ کی محبت کا اقرار نہیں کیا۔'' احمد جمال یہ سوچ کر بہت آہستہ آہستہ لہجے میں بول رہا تھا کہ کہیں رات کے سناٹے میں اس آواز کی گونج کمرے کے باہر نہ سنائی دے۔ ''عزت مآب شہزادی کو معلوم ہونا چاہئے کہ دوسرے لوگ بھی اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں۔''

''تمہارا کیا مزاج ہے؟'' جواب میں ناز آفرین بیگم کا ہلکا سا قہقہہ ابھرا جیسے کسی شاخ پر کوئی غنچہ کھل گیا ہو یا انگڑائی لیتے وقت کسی دوشیزہ کے ہاتھوں کی چوڑیاں کھنک گئی ہوں۔

''میری مرضی بھی کوئی بازاری جنس نہیں کہ صاحبان اقتدار جب چاہیں اسے خرید لیں۔'' احمد جمال کی آواز مدھم تھی' مگر لہجہ بہت زیادہ تلخ ہو گیا تھا۔

''ہماری پسند کے سامنے تمہاری مرضی کی کوئی حیثیت نہیں احمد جمال!'' ناز آفرین بیگم کے چہرے سے شوق کی وارفتگی کا رنگ غائب ہو گیا تھا اور اب اس کے ہونٹوں اور آنکھوں کے ہر زاویے سے آمریت کی نمائش ہو رہی تھی۔ ''تم یقیناً خوش نصیب ہو کہ ہماری نگاہ انتخاب تمہارے چہرے پر ٹھہری۔ بے شک! اس وقت تم دنیا کے ہر شہنشاہ سے زیادہ باقوت اور محترم ہو کیونکہ ہم نے تمہیں حکمرانی کا اعزاز بخشا ہے۔ مگر جس لمحے ہماری چشم عنایت پھر جائے گی تم خدمت گاری کے اعزاز سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔'' آفرین بیگم نے آمریت کے مخصوص انداز میں

احمد جمال کو تنبیہ کی تھی۔

''یہ تمہاری محبت ہے یا سوداگری؟'' احمد جمال کے ہونٹوں پر شدید طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کچھ بھی سمجھو مگر اتنا ضرور یاد رکھنا کہ ہم حرف انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔'' ناز آفرین بیگم کے لہجے میں بڑا غرور تھا۔ ''ہم نے تمہارے ہوش و حواس اور دل و جان کے ساتھ تمہیں خرید لیا۔ اب تم کسی دوسرے کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔'' یہ کہہ کر ناز آفرین بیگم واپس جانے کے لئے مڑی۔ ''ہم کل پھر اسی وقت جلوہ افروز ہوں گے مگر اس شرط کے ساتھ کہ تمہاری گردن میں ہماری غلامی کا طوق صاف نظر آئے۔'' جیسے ہی ان الفاظ کی ادائیگی ختم ہوئی۔ مغل شہزادی ہوا کے تیز جھونکے کی مانند کمرے سے نکل کر چلی گئی۔

⌑ ⌑ ⌑

ناز آفرین بیگم اپنے غرور، ناز اور حاکمانہ اختیار کا بھرپور مظاہرہ کرکے واپس جا چکی تھی اور احمد جمال شدید اذیت و کرب میں مبتلا تھا۔ مملکت فرغانہ احمد جمال کے لئے مسائل کی سرزمین تھی۔ وہ جس روز سے آیا تھا۔ سنگین تر مسائل اس کے تعاقب میں تھے۔ کئی بار موت اسے چھوتی ہوئی گزر گئی تھی، لیکن اس کے جسم پر دشمنوں کی نوازشات کے گہرے نشانات ابھی تک موجود تھے۔ اور ان تمام کرم فرمائیوں سے بڑھ کر ملکہ فرغانہ کا وہ ذلت آمیز سلوک تھا جس نے انسانی رشتوں پر سے اس کا اعتبار ختم کر دیا تھا۔ پھر جب وہ یہ زہر پینے کا عادی ہوگیا تو بابر مرزا کے آمرانہ رویے نے اسے ایک نئی آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ اس کے اور ولی عہد فرغانہ کے درمیان فاصلوں کی خلیج روز بہ روز گہری ہوتی جا رہی تھی اور اب ناز آفرین بیگم کی وجہ سے اسے بدترین صورتحال کا سامنا تھا۔ احمد جمال ساری رات خواب گاہ میں اس طرح ٹہلتا رہا جیسے کسی سپاہی کو صبح ہوتے ہی اپنی زندگی کا سب سے سخت معرکہ درپیش ہو۔ ایک ایسا معرکہ جس میں اسے اپنی شکست یقینی نظر آ رہی ہو۔ وہ مغل شہزادی کا مطالبہ ہوس تسلیم کر سکتا تھا اور نہ اس کے ہاتھوں سے سلامتی کے ساتھ اپنا دامن چھڑا سکتا تھا۔ بڑی عجیب کشمکش تھی۔ احمد جمال کبھی زور زور سے فرش پر پاؤں مارتا، کبھی دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو جکڑ لیتا اور کبھی انتہائی مایوسی کے عالم میں دیوار سے سر ٹیک دیتا۔ پھر زیر لب ارض و سما کے مالک کو پکارنے لگتا۔ ''اے میرے ... کرنے والے! مجھے راستہ دکھا کہ میں کدھر جاؤں؟''

اسی درمیان قریب کی مسجد سے مؤذن کی صدا ابھری اور پھر یکایک احمد جمال کو قرار سا آ گیا۔ اس کا مضطرب ذہن ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ سکون کی ایک گہری سانس لے کر نماز کی ادائیگی میں مشغول ہو گیا۔ احمد جمال کو سورج نکلنے کا انتظار تھا۔ پھر جیسے ہی آفتاب کی کرنیں فرغانہ کی زمین پر اتریں۔ وہ قصر شاہی سے نکل کر اس فوجی تربیت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں بابر مرزا جنگی مشقوں میں مصروف رہتا تھا۔

احمد جمال کو اپنے روبرو پا کر بابر مرزا کے چہرے پر ناپسندیدگی کا ہلکا سا عکس ابھر آیا۔ احمد جمال نے ایک ہی نظر میں صورتحال کو سمجھ لیا کہ ولی عہد فرغانہ کو اس کی آمد ناگوار گزری ہے۔

''شہزادے! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' احمد جمال نے درباری آداب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''احمد جمال! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں آج کل کتنا مصروف ہوں۔'' اگرچہ بابر مرزا کا لہجہ بہت دھیما تھا۔ لیکن احمد جمال سے اس کی تلخی پوشیدہ نہیں تھی۔ ''اس وقت میں صرف شمشیر و سناں کی آواز سن رہا ہوں۔ جب یہ گفتگو ختم ہو جائے گی تو پھر میں تمہاری بات بھی سنوں گا۔'' ولی عہد فرغانہ کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی امیر کبیر شخص کسی سوالی کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہو۔

احمد جمال کو بابر مرزا کے غرور و بے نیازی کی یہ ادا پسند نہیں آئی تھی، لیکن وہ اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو پی گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ مجھے اذن کلام کب بخشا جائے گا؟'' بظاہر احمد جمال کی آواز ابھی پست تھی، مگر ولی عہد سلطنت محسوس کر سکتا تھا کہ مخاطب کے الفاظ کا آہنگ کس قدر بلند ہے؟

بابر مرزا نے احمد جمال پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور منہ پھیر کر آگے بڑھ گیا۔ پھر چند قدم چل کر دیوار پر آویزاں ایک شمشیر آبدار اتاری اور اس کی تیز دھار پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

''ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کہ شمشیر و سناں سے میرے مذاکرات کب ختم ہوں گے؟ ہو سکتا ہے کہ ایک ماہ، دو ماہ، چھ ماہ یا کچھ اس سے بھی زیادہ؟'' ولی عہد فرغانہ نے اپنے مخاطب کی طرف رخ کئے بغیر کہا۔

احمد جمال نے ولی مملکت کی بے رخی کا انداز دیکھ کر واضح طور پر سمجھ لیا تھا کہ بابر مرزا اس سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ احمد جمال فطرتاً ایک غیرت مند نوجوان تھا اور یہ بات اس کی زندگی کے آداب میں شامل نہیں تھی کہ وہ شاہوں کے سامنے اپنی زبان کو کشکول بنا لے یا اپنی غرض کی تکمیل کے لئے حاکم وقت کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔ فطرت کے اسی تقاضے نے اسے مجبور کیا کہ وہ بابر مرزا سے اپنے دل کی بات کہے بغیر واپس چلا جائے اور شاہی خاندان کی ایک سرکش دوشیزہ کی طرف سے اٹھائے جانے والے طوفان کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، مگر احمد جمال نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چند لمحوں تک بڑے صبر و تحمل کے ساتھ کھڑا رہا۔ پھر بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں ولی عہد فرغانہ سے مخاطب ہوا۔

''مجھے شہزادہ عالم کی مصروفیت سے کوئی گلہ نہیں، مگر اپنی بدنصیبی سے بڑی شکایت ہے۔'' احمد جمال کی آواز میں دل کی خلش شامل تھی۔ ''جب تک شمشیر و سناں سے مذاکرات ختم ہوں گے اس وقت تک تو قصر شاہی میں ایک خوفناک زلزلہ آ چکا ہوگا۔ پھر خالق ارض و سما ہی جانے کہ اس زلزلے کی تباہ کاریاں کہاں جا کر ٹھہریں گی۔ ہو سکتا ہے کہ عزت مآب کے پیرہن وقار پر رسوائی کی کوئی چھینٹ نہ پڑے۔ مگر یہ غلام یقیناً بے آبروئی کی آخری منزل سے گزر چکا ہوگا۔''

احمد جمال کا طرز کلام ہی بڑا عجیب تھا۔ بابر مرزا گھبرا کر پلٹا۔ ''کیسا زلزلہ؟ اور کس کی رسوائی؟'' ولی عہد فرغانہ کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔

''شمشیر و سناں سے آپ کے مذاکرات ختم ہوں تو یہ خادم کچھ عرض کرے۔'' اب احمد جمال کے لہجے سے بھی ہلکا سا طنز جھلکنے لگا تھا۔

بابر مرزا نے ناپسندیدہ نظروں سے احمد جمال کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔ ''جو کچھ تمہیں کہنا ہے بہت مختصر الفاظ میں روانی کے ساتھ کہہ ڈالو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

احمد جمال اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر ولی عہد فرغانہ تک پہنچا تھا۔ اس لئے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے اپنے دل کی بات بابر مرزا سے کہہ ڈالی۔ ''شہزادے! آپ اپنے فیصلوں میں مکمل طور پر با اختیار ہیں، مگر پھر بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ شہزادی ناز آفریں بیگم کو بلا تاخیر سرزمین فرغانہ سے رخصت کر دیا جائے۔'' احمد جمال نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس قدر نازک بات زبان پر لاتے وقت نہ اس کی آواز میں لرزش پیدا ہوئی تھی اور نہ چہرے پر خوف و ہراس کا کوئی ہلکا عکس ابھرا تھا۔

کئی ماہ کی ملاقاتوں اور قربتوں کے سبب بابر مرزا کے دل میں شہزادی ناز آفرین بیگم کے لئے نرم گوشے

پیدا ہو چلے تھے۔ اس لئے احمد جمال کے ہونٹوں پر مغل شہزادی کا نام آیا تو چند لمحوں کے لئے ولی عہد فرغا
بدحواس نظر آنے لگا۔ پھر اس نے فوراً ہی اپنی دحشت پر قابو پایا اور انتہائی تند و تیز لہجے میں بولا۔ ''احمد جمال ا
اپنی حیثیت کے دائرے سے باہر نکل گئے اور آئین شاہی میں یہ حرکت ایک سنگین جرم ہے۔'' بابر مرزا کی آنکھو
اور ہونٹوں سے بیک وقت نفرت و غضب کی بارش ہو رہی تھی۔

''شہزادہ عالم! اگر میں اپنی حیثیت کو فراموش کر دیتا تو وہ زلزلہ آ کر گزر بھی چکا ہوتا۔'' بابر مرزا کے تحق
آمیز سلوک نے اسے ایک اور نئے کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ''پھر غلام کو اس کی ضرورت پیش نہ آتی کہ وہ آ
دالے زلزلے کی خبر سنانے کے لئے حضور کے دروازے پر کھڑا ہوا التفات شاہی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔''

''ایک غلام کی زبان پر شہزادی ناز آفرین بیگم کا نام ہی کیوں آیا؟'' صورتحال کی نزاکت کا احساس ک
بغیر بابر مرزا کچھ اور مشتعل ہو گیا تھا۔

''بے شک! کسی غلام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک محترم شہزادی کا نام اپنی زبان پر لائے مگر میں کیا کر
کہ آنے والا زلزلہ ناز آفرین بیگم ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔'' یہ کہتے کہتے احمد جمال کی آواز کسی قدر بلن
ہو گئی تھی۔

''پھر تمہیں اس مشورے کا حق کس نے دیا کہ ہم اپنے مہمان خاص کو فرغانہ کی حدود سے باہر نکال دیں؟
بابر مرزا کے اشتعال اور غصے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

''میرے جذباتی شہزادے! اسی میں ہم سب کی عافیت ہے کہ شہزادی ناز آفرین بیگم کو انتہائی خاموشی او
راز داری کے ساتھ فرغانہ سے رخصت کر دیا جائے۔'' احمد جمال کے ایک ایک لفظ سے بابر مرزا کے لئے غی
معمولی محبت و شفقت کا اظہار ہو رہا تھا' مگر ولی عہد فرغانہ اس جذبے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''آخر کیوں؟'' بابر مرزا اس طرح چیخا جیسے کسی غلام سے نافرمانی کا جرم سرزد ہو گیا ہو۔

''ناز آفرین بیگم نسبی اعتبار سے کتنی ہی محترم کیوں نہ ہوں مگر وہ اس قابل نہیں کہ آپ کی مجلس خاص م
شریک ہو سکیں۔'' احمد جمال نے بہت شائستہ الفاظ میں بابر مرزا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی' مگر نوعمر اور ناراض
شہزادہ بات کی گہرائیوں تک پہنچنے سے عاجز رہا۔

''تم کون ہو کہ ہماری مجلس میں شریک ہونے والوں کا معیار قائم کرو؟'' ولی عہد فرغانہ کے لہجے میں و
برہمی تھی۔

''ہاں! میں اس لائق نہیں کہ شاہوں کی مجلس میں بیٹھنے والوں کی شخصیت کو اپنی کم نظری کے پیمانے س
ناپ سکوں' مگر اس گردش حال کو کیا نام دیا جائے کہ جس نے مجھے آپ کے سامنے لب کشائی پر مجبور کر دیا ہے۔
بابر مرزا کے مسلسل تحقیر آمیز سلوک کے باوجود احمد جمال کے لہجے میں احساس کمتری کا شائبہ تک نہ تھا۔ ''شہزا
عالم! اس اذیت ناک حقیقت سے باخبر نہیں کہ ناز آفرین بیگم کا طرز عمل سراسر منافقانہ ہے۔ ایک طرف وہ و
عہد فرغانہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں اور دوسری طرف ان کا دعویٰ ہے کہ وہ میری محب
میں اپنے ہوش و حواس کھو چکی ہیں۔ بس اسی صورتحال کے پیش نظر اس غلام نے عرض کیا تھا کہ وہ آپ کی مجلس
خاص میں شریک ہونے کی اہل نہیں ہیں۔''

احمد جمال کی زبان سے یہ انکشاف سن کر بابر مرزا کو کچھ دیر کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ فرط حیرت و غم س

ں آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا اور دلکش و شاداب چہرہ غبار آلود سا نظر آنے لگا۔ پھر جب یہ تکلیف دہ ساعت
ہی ہولناکیوں کے ساتھ گزر گئی تو بابر مرزا کی وہی کیفیت دوبارہ لوٹ آئی۔ اس کا بجھا بجھا چہرہ ایک بار پھر
ل غضب سے جل اٹھا تھا۔ ''احمد جمال! کیا نمک خواری کا حق اسی طرح ادا کیا جاتا ہے؟'' بظاہر بابر مرزا
الفاظ نہایت شائستہ تھے' مگر ان میں تحقیر و تذلیل کی ایک ایسی موج شعلہ رنگ پنہاں تھی جس نے احمد جمال
اپنی ذات کو خاکستر بنا ڈالا تھا۔

''شہزادے! یہ غلام حق نمک ہی تو ادا کر رہا ہے ورنہ رسوائیوں کا آتش فشاں کئی ماہ پہلے پھٹ چکا ہوتا اور
غلیظ لاوا اب تک فرغانہ کی گلیوں میں بہہ رہا ہوتا۔'' احمد جمال کے لہجے میں ناقابل بیان تپش تھی۔ لیکن بابر
اپنی کم سنی کے باعث اسے محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔

''کیا تم یہ جانتے ہو کہ ایک شہزادی پر بہتان تراشنے کی سزا کیسی عبرت ساماں اور دردناک ہوتی ہے؟''
ل جذبات میں بابر مرزا نے احمد جمال کی فرض شناسی کو جھٹلا دیا تھا اور اس کا رویہ پہلے سے زیادہ جارحانہ
ا تھا۔

''زنداں کا کوئی تاریک گوشہ' یا دار و رسن' یا مقتل' یا سنگساری...... فرغانہ کا قانون با اختیار ہے کہ میرے
اہ کی کوئی بھی سزا مقرر کرے۔'' یہ کہہ کر احمد جمال نے ناز آفریں بیگم کے حوالے سے اب تک پیش آنے
لے تمام واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بابر مرزا کے گوش گزار کر دیئے۔ ''آج رات شہزادی فرمان شاہی کی
یل کا منظر دیکھنے کے لئے میری خواب گاہ میں تشریف لائیں گی۔ اگر ولی عہد فرغانہ کو شمشیر و سناں کی گفتگو سننے
ے فرصت ملے تو ایک نظر اس محاذ جنگ کی طرف بھی دیکھ لیں جو رقص و موسیقی' ساغر و صراحی اور ادب شاعری
ے ریشمی پردوں میں لپٹا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر احمد جمال تیزی سے مڑا اور بابر مرزا سے اجازت لئے بغیر فوجی
ربیت گاہ کے ایک مخصوص کمرے سے نکل کر قصر شاہی کی طرف چلا گیا۔

⌑ ⌑ ⌑

وہ دن اہل فرغانہ کے لئے ایک عام سا دن تھا۔ نہ کوئی ہلچل' نہ اضطراب اور نہ کوئی ہنگامہ...... اس زمین پر
ہنے والے صرف تین افراد بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہے تھے۔ ایک ولی عہد سلطنت بابر مرزا' دوسرا احمد جمال
ور تیسری ناز آفرین بیگم۔ بابر مرزا کی بے چینی اذیت و کرب میں تبدیل ہو گئی تھی اس کا غم دہرا غم تھا کہ وہ جس
دوشیزہ کے لئے اپنے دل میں ایک لطیف سا جذبہ رکھتا تھا' آج اسی کی بے حجابی کے افسانے ایک نامحرم کی زبان
پر تھے۔ اگر بابر مرزا کے دل میں ناز آفرین بیگم کے لئے کوئی نرم گوشہ موجود نہ ہوتا تب بھی اس غم کی تپش اس
کے دل و دماغ کو جلانے کے لئے کافی تھی کہ ایک مغل شہزادی نے ایک ادنیٰ خدمت گار کے عشق میں گرفتار ہو کر
اپنی اعلیٰ نسبی کا بھرم کھو دیا تھا۔ قتلغ خانم کی غلط تربیت نے احمد جمال کی طرف سے ولی عہد سلطنت کے آئینہ دل کو
اس قدر مکدر بنا دیا تھا کہ بابر مرزا شیخ احمد غیاث کے بیٹے کو اپنا زر خرید غلام سمجھنے لگا تھا اور آج جب اسی غلام نے
مغل شہزادی کو خلوت گاہ دل میں چھپے ہوئے ایک جذباتی راز کو بے نقاب کیا تو بابر مرزا کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے
وقت کی بساط کی یک بیک الٹ گئی ہو اور وہ رسوائی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا فرغانہ کے چوراہے پر تنہا کھڑا ہے
اور مملکت کے سارے غلام انتہائی نفرت و حقارت کے ساتھ اس کے جسم پر سنگ باری کر رہے ہیں۔ انتہائی نو

عمری میں بابر مرزا کا یہ پہلا تجربہ تھا جب اسے ایک انسان کے دو چہرے نظر آئے تھے۔ پھر اسی تجربے کی اذ
ناک خلش اسے فوجی تربیت گاہ سے قصر شاہی تک لے گئی۔

محل پہنچ کر بابر مرزا نے احمد جمال کو تنہائی میں طلب کر لیا۔ ''تم نے جشن بادہ نوشی میں رسم شاہی کی تذ
کی اور پھر میری اس خواہش کو جھٹلایا جو اس مملکت میں فرمان اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔'' بابر مرزا انتہائی غضب ؛
لہجے میں احمد جمال سے مخاطب تھا۔ ''تمہارے یہ دو گناہ کافی تھے کہ جن کی سزا بھگتنے کے لئے تم پس دیوار زن
چلے جاتے یا پھر تمہیں کھینچ کر سر مقتل لے جایا جاتا۔ مگر اس وقت تمہاری موجودگی ثابت کر رہی ہے کہ تمہار
گناہوں سے چشم پوشی کی گئی اور یہ سب کچھ بابا جان کی نظر عنایت کا صدقہ ہے جو اپنے غلاموں کے لئے حد
زیادہ شفقت و مہربانی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تیسرا گناہ ثابت ہو گیا تو صاحب عالم کی رحم دلی
مہربانی بھی تمہیں نسل تیموری کے قہر سے محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔'' جوش غضب سے بابر مرزا کی رگوں میں ؛
جل رہا تھا۔ ''ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمہارے اندر کا شیطان ہے' جو اپنے نئے فریب کارانہ انداز سے ہمارے سا
ظاہر ہوا ہے۔ قصر شاہی کا ایک ایک مکین جانتا ہے کہ ناز آفرین بیگم دنیا کی خوبصورت ترین دوشیزہ ہے اور
کے اسی بے مثال حسن نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ تم نے اپنے دامن طلب کی دریدگی کی طرف ؛
دیکھا احمد جمال ! کہاں ایک غلام اور کہاں آقا زادی ؟ خدا کی قسم ! میں تمہیں بڑی عجیب سزا دوں گا۔'' یہ کہ
بابر مرزا آگے بڑھا اور اس نے پوری طاقت سے احمد جمال کے بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ''میں تمہیں قتل ن
کروں گا۔ تمہاری دونوں آنکھیں نکال دوں گا کہ انہی آنکھوں نے ایک عفت مآب دوشیزہ کو ہوس ناک زاو
سے دیکھا ہے۔''

''بس شہزادہ عالم بس !'' شدت کرب سے احمد جمال کا گلرنگ چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ اس نے آہستگی
ساتھ بابر مرزا کے دونوں ہاتھ اپنے بازوؤں سے الگ کئے۔ ''دنیا کا کوئی قانون عمل احتساب سے پہلے فی
نہیں سناتا۔ ہمارے درمیان طے ہو چکا ہے کہ آج رات میری خواب گاہ میں عدالت آراستہ ہو گی۔ ایسی عدا
کہ جہاں آپ ہی گواہ ہوں گے اور آپ ہی منصف۔ قانون بھی آپ کا ہے اور مملکت بھی۔ اگر میرے مقد
غلط فیصلہ بھی سنا دیا گیا تو آپ اطمینان رکھیں کہ میں عدالت عالیہ کے دروازے پر دستک نہیں دوں گا۔ چ
چاپ مقتل کی جانب چلا جاؤں گا اور مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی قتل ہو
میری خاندانی روایت ہے۔ کچھ سال پہلے میرے والد محترم نے بھی نسل تیموری سے انصاف مانگا تھا۔ حالانک
قند کے بام و در شیخ احمد غیاث کی معصومیت پر گواہی دے رہے تھے' لیکن آپ کے بزرگوں کی عدالت نے
کے قتل نامے پر دستخط کر دیئے۔ آپ کے تیور دیکھ کر یہی محسوس ہو رہا ہے کہ میں بھی کل صبح اپنی موت کا استق
کروں گا۔ خیر ! یونہی سہی۔ بس ایک رات کی تو بات ہے۔ یہ زحمت انتظار زیادہ طویل اور صبر آزما تو نہ
شہزادے ! زیادہ سے زیادہ چند گھڑیاں' دوپہر' شام اور پھر رات۔'' احمد جمال کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہ
ابھری۔ اس نے گہری نظروں سے بابر مرزا کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ولی عہد فرغانہ
خلوت گاہ سے نکل کر چلا گیا۔

☐ ☐ ☐

حقیقت حال جاننے کے لئے احمد جمال نے ولی عہد فرغانہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ رات۔

دالی حصے میں بابر مرزا اس کے کمرے میں چلا آئے اور خواب گاہ کے خفیہ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر
ر جمال اور ناز آفرین بیگم کے درمیان ہونے والی گفتگو اپنے کانوں سے سنے ...... مگر بابر مرزا نے خاندانی
رت و شرم کے باعث احمد جمال کی اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ وہ اپنی تسلی کے
لئے خود کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا۔

پھر رات آئی تو مملکت فرغانہ کے وہی تینوں افراد شدید اضطراب کا شکار نظر آنے لگے۔ ناز آفرین بیگم اس
لئے وحشت زدہ تھی کہ اسے احمد جمال کے اقرار محبت کا یقین نہیں تھا...... احمد جمال یہ سوچ کر پریشان تھا کہ اگر
ی وجہ سے ناز آفرین بیگم آج رات نہ آ سکی تو مغل شہزادی کے بجائے وہ خود بابر مرزا کی نظروں میں مجرم بن کر
و جائے گا...... احمد جمال کے ذہنی خلفشار میں اس اندیشے نے مزید اضافہ کر دیا تھا کہ کہیں بابر مرزا اسے گناہ گار
ابت کرنے کے لئے ساری باتیں ناز آفرین بیگم کو نہ بتا دے۔ آخر وہ دونوں ایک دوسرے کے عزیز تھے۔ پھر
کہیں یہ رشتے آپس میں مل کر اس کے خلاف کوئی نیا ہنگامہ کھڑا نہ کر دیں...... اور بابر مرزا اس لئے ناقابل بیان
ایت میں مبتلا تھا کہ مغل شہزادی نے خاندان تیمور کی عظمتوں کو ایک خدمت گار کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا
ر دوسری طرف ولی عہد فرغانہ پر احمد جمال کو ترجیح دے کر اس کی اپنی ذات کی بھی نفی کر دی تھی۔

پھر جب روشن قندیلوں کے ساتھ راگ اور رنگ کی محفلیں بھی بجھ گئیں اور قصر شاہی کے مکیں ریشمی
ستروں میں سو گئے تو بابر مرزا شمشیر بکف اپنی خواب گاہ سے باہر نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا طویل راہداری
طے کر کے اس سنگی ستون کے عقب میں پہنچ گیا جو احمد جمال کی خواب گاہ کے عین سامنے تھا۔ اس ستون کی
چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ اگر اس کے پیچھے بیک وقت دو آدمی بھی کھڑے ہو جاتے تو انسانی آنکھ سے اوجھل
رہتے۔ بابر مرزا تقریباً ایک گھنٹے تک دم سادھے کھڑا رہا مگر ناز آفرین بیگم کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ولی عہد
فرغانہ دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ کسی طرح مغل شہزادی پر عائد کردہ الزام غلط ثابت ہو جائے۔ جب
بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی تو بابر مرزا نے سکون کی
گہری سانس لی۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ احمد جمال جھوٹا ہے۔ بابر مرزا خیالوں ہی خیالوں میں اس سنگین
تہمت طرازی پر احمد جمال کے لئے سخت ترین سزا کا انتخاب کرنے لگا...... مگر ولی عہد کا یہ سکون بہت عارضی
تھا۔ یکایک راہداری کا سناٹا کسی کے قدموں کی چاپ سے مجروح ہو گیا اور بابر مرزا گھبرا کر تصورات کی دنیا
سے نکل آیا۔ قد و قامت اور رفتار کا انداز بتا رہا تھا کہ آنے والی عورت ناز آفرین بیگم کے سوا کوئی اور نہیں
ہو سکتی۔ اس خیال کے ساتھ ہی بابر مرزا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور اسے شدید سردی کے موسم میں بھی
تیز گرمی کا احساس ہونے لگا۔

پھر وہ نسوانی ہیولا احمد جمال کے کمرے کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ اگرچہ فاصلہ زیادہ تھا لیکن بابر مرزا کو مغل
شہزادی کے پہچاننے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ بازی الٹ گئی تھی اور وقت نے احمد جمال کو سچا ثابت کر دیا
تھا۔ احساس شکست نے بابر مرزا کے خون کی گردش تیز کر دی تھی اور اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔
آنے والی عورت نے ہلکی سی دستک دی' دروازہ کھلا اور وہ نسوانی ہیولا احمد جمال کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔
غیر ارادی انداز میں بابر مرزا کے دائیں ہاتھ کو حرکت ہوئی اور شمشیر کے قبضے پر اس کی انگلیوں کی گرفت مضبوط
ہو گئی۔ ولی عہد فرغانہ کا دل چاہا کہ وہ کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہو جائے اور احمد جمال اور ناز آفرین بیگم کے

ساتھ اس کمرے کا وجود بھی مٹا ڈالے...... مگر بابر مرزا کا یہ اشتعال لمحاتی تھا۔ اس نے نوعمری کے باوجود مثالی ضبط و ہوش سے کام لیا۔ ولی عہد فرغانہ مکمل طور پر اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ وہ ناز آفرین بیگم ہے یا شاہی کی کوئی کنیز؟ گہری تاریکی کے سبب قیاس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ سوچ کر بابر مرزا شمشیر کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

احمد جمال اور ناز آفرین بیگم کی ملاقات بہت مختصر تھی۔ خواب گاہ کا دروازہ دوبارہ کھلا' اس مرتبہ نسوانی ہیولے کے ہمراہ احمد جمال بھی باہر آگیا' بابر مرزا کو اپنی نبض ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ولی عہد فرغانہ قدموں کا توازن برقرار رکھنے کے لئے فوراً سنگی ستون کا سہارا لے لیا۔

''خدا حافظ شہزادی محترمہ!'' احمد جمال نے جان بوجھ کر کسی قدر بلند آواز میں ناز آفرین بیگم کو مخاطب کیا۔ اس کا خیال تھا کہ بابر مرزا یہیں کہیں قریب ہی موجود رہ کر ان دونوں کی نگرانی کر رہا ہے...... ''میں کل رات وقت بارگاہ ناز میں حاضری دے کر غلامی کا اعزاز حاصل کروں گا۔'' احمد جمال کی آواز اور بلند ہوگئی تھی۔

''خدا نے تمہیں حکمرانی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اپنے آپ کو غلام کہہ کر مجھے آزار نہ پہنچاؤ'' ناز آفرین کے لہجے میں بڑی وارفتگی تھی...... ''میں تمہارا انتظار کروں گی' آنے والی رات میری زندگی کی سب سے حسین یادگار رات ہوگی۔ ایسی رات کہ جس پر لاکھوں روشن و تابناک صبحیں قربان کی جاسکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر شہزادی عجیب سرشاری کے انداز میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

بابر مرزا کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس نے سنگی ستون سے سر ٹیک دیا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جمال کی طرف دیکھنے لگا' جو اس سے کچھ فاصلے پر اپنی خواب گاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اندھیرے کے باعث مرزا احمد جمال کے چہرے پر نمایاں ہونے والی دلی کیفیات کا مشاہدہ نہیں کرسکتا تھا' مگر پھر بھی اس کے متحرک سائے کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے اسے ولی عہد فرغانہ کا انتظار ہے۔ پھر یکایک احمد جمال اپنی خواب گاہ کے دائیں جانب طویل راہداری میں کچھ دور تک تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ بابر مرزا نے سنگی ستون کی اوٹ سے احمد جمال کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ احمد جمال کو کس کی تلاش ہے؟ بابر مرزا بے حس و حرکت کھڑا رہا اور احمد جمال کے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔ شاید وہ ولی عہد فرغانہ کی جستجو میں راہداری آخری موڑ تک چلا گیا تھا۔ وقت اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد احمد جمال کے قدموں کی آواز دوبارہ ابھری۔ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر واپس آرہا تھا۔ فاصلے ختم ہوئے اور احمد جمال اپنی خواب گاہ دروازے پر آکر ٹھہر گیا۔ اس کشمکش میں بہت دیر ہوچکی تھی۔ بالآخر ولی عہد فرغانہ نے اپنے شکستہ اعصاب کو اور زندگی کی انتہائی اذیت ناک حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے سنگی ستون کے عقب سے نکلا۔

''میں یہاں ہوں احمد جمال!'' بابر مرزا نے اپنی آواز کا رعب و جلال برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی مگر جب الفاظ فضا میں منتشر ہوئے تو لہجے کی شکستگی اور تھکن صاف محسوس ہو رہی تھی۔

احمد جمال تیزی سے آواز کی سمت بڑھا۔ بابر مرزا کے قدم بھی فاصلے طے کر رہے تھے مگر اس طرح کہ جیسے کوئی آبلہ پا مسافر اپنے جسم کے بارگراں کو بمشکل گھسیٹ رہا ہو۔

احمد جمال اپنی بے گناہی کی وضاحت کرنا چاہتا تھا' مگر بابر مرزا نے اس کے ہونٹوں پر بندش کر دی۔ ''میں اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ چکا ہوں۔ اب اس شرمناک کھیل کی تشریح سے کچھ حاصل نہیں' تم یقیناً

مگر پھر بھی جرم سے پاک نہیں ہو۔'' بابر مرزا جلال شاہی کا بھرپور مظاہرہ کرنا چاہتا تھا' لیکن احساس کے باعث اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش موجود تھی۔

''شہزادہ عالم! آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' احمد جمال ولی عہد فرغانہ کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر

''تمہارا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے حرم شاہی کے ناموس کو شدید خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔'' مرزا کے لہجے سے وہی نفرت و تلخی جھلک رہی تھی۔ ''اس گمراہی میں ناز آفرین بیگم کے جذبات سے زیادہ نے دلکش چہرے کا قصور ہے۔'' ولی عہد فرغانہ انتہائی کوشش کے باوجود احساس کمتری سے پیچھا نہیں چھڑا تھا اور وہ مغل شہزادی کی آڑ لے کر اپنے جذبہ حسد کی ترجمانی کر رہا تھا۔

بابر مرزا کی بات سن کر چند لمحوں کے لئے احمد جمال سناٹے میں آگیا۔ اہل دنیا کا قانون بھی عجیب ہے کہ چاہے کسی بے قصور کو مجرم اور گناہ گار کو بلند کردار ثابت کر دے۔ احمد جمال بھی اس تکلیف دہ صورت حال چار تھا۔ ''اگر ولی عہد سلطنت کا حکم ہو تو اپنے چہرے پر تیزاب ڈال کر یا اسے آگ میں جلا کر مسخ کر ہوں۔ اس کے بعد تو حرم شاہی کے ناموس کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا؟''

''بس تم اسی وقت' رات کے اندھیرے میں فرغانہ کی حدود سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ۔'' بابر مرزا نے تاخیر کے بغیر اپنا آمرانہ فیصلہ سنا دیا تھا۔ ''تمہیں اس بات کی اجازت ہوگی کہ صاحب عالم کے دیئے ہوئے بارے عطیات اور مال و اسباب اپنے ہمراہ لے جاسکتے ہو۔''

ولی عہد فرغانہ نے اپنے لفظوں کے تیز نشتر سے احمد جمال کی رگ حمیت کاٹ دی تھی۔ شیخ احمد غیاث کا فرزند اس سفاکی پر تڑپ اٹھا۔ ''میرا ذاتی سرمایہ بس وہی غلیظ اور بوسیدہ لباس تھا' جسے پہن کر میں سمرقند سے فرغانہ آیا تھا۔ کاش! میری غربت کا وہ پیرہن آج محفوظ ہوتا تو میں اسی کو دوبارہ اپنے جسم پر سجا کر سمرقند واپس جاتا۔'' انتہائی ضبط کے باوجود احمد جمال کے ہونٹوں سے ایک آہ سرد نکل گئی۔ ''خیر! زیر آسماں یوں بھی ہوتا ہے۔ آپ مطمئن رہیں شہزادے! میں اسی شب کی تاریکی میں کہیں اور چلا جاؤں گا' مگر آپ خدا کے لئے فرغانہ میں حاضر رہیں کہ آپ کی غیر حاضری سے صاحب عالم کا خواب بے تعبیر ہوجائے گا۔''

اگرچہ احمد جمال نے چند الفاظ میں سب کچھ کہہ دیا تھا' لیکن بابر مرزا اس کی گفتگو کا مفہوم سمجھے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ولی عہد فرغانہ کے جاتے ہی احمد جمال اپنی خواب گاہ میں داخل ہوا اور اس خط کو تلاش کرنے لگا جو مرنے سے پہلے سید مہدیؒ نے اسے دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ جب مصائب کا ہجوم وارث فرغانہ کو گھیر لے تو یہ خط اس کے حوالے کر دیا جائے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد سید مہدیؒ کا وہ خط مل گیا۔ احمد جمال نے اپنے روحانی باپ کی اس امانت کو چمڑے کے غلاف میں محفوظ کر لیا تھا۔ چند لمحوں تک احمد جمال سید مہدیؒ کے اس مکتوب کو بہت غور سے دیکھتا رہا جس میں نامعلوم عبارت درج تھی۔ پھر اس نے قیمتی ساز و سامان سے آراستہ اپنے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور یہ کہتا ہوا باہر آگیا۔

''اے دنیا! تیری خوشیاں اور تیری آسائشیں کتنی ناپائیدار ہیں؟''

پھر وہ تیز رفتاری کے ساتھ قلعے کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ مسلح محافظ اسے دیکھ کر چونکے مگر کچھ

پوچھے بغیر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

صبح صادق کے قریب احمد جمال سید مہدیؒ کی بارگاہ میں پہنچا اور بے اختیار قبر سے لپٹ کر رونے لگا۔" اب میں کدھر جاؤں؟ اپنا حکم واپس لے لیں کہ یہ ناتواں انسان زیادہ دیر تک آپ کی امانت کا بارگراں برداشت نہیں کرسکتا۔"

¤¤¤

دوسرے دن صبح حسب معمول فرغانہ کا دربار آراستہ ہوا۔ تمام امرائے سلطنت اپنی اپنی نشستوں پر موجود تھے۔ ولی عہد بابر مرزا اپنے باپ کے قریب بائیں ہاتھ پر ایک عجیب شان غرور کے ساتھ بیٹھا اس کرسی کی طرف دیکھ رہا تھا جو احمد جمال کے لئے مخصوص کردی گئی تھی۔ عمر شیخ مرزا نے اپنی عادت کے مطابق دربار کا جائزہ لیا پھر اس کی نظریں احمد جمال کی خالی کرسی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ والئ فرغانہ کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ پھر اس نے اپنی فکر اور تجسس کو ختم کرنے کے لئے ولی عہد سلطنت سے کہا۔"کیا بات ہے کہ آج شیخ زادہ ابھی تک نہیں آیا؟ حالانکہ وہ اپنی پابندی وقت کے لئے پوری ریاست میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے ..... اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے بابر مرزا؟" حاکم فرغانہ کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی۔

"صاحب عالم! احمد جمال اس دربار کے لائق نہیں تھا۔ میں نے گزشتہ رات اسے فرغانہ کی حدود سے جانے کا حکم دیا تھا۔ یقیناً وہ اس وقت تک ہماری مملکت سے بہت دور جا چکا ہوگا۔" بابر مرزا اپنے دائیں جانب جھک کر سرگوشی کے انداز میں باپ سے مخاطب ہوا۔

بیٹے کی زبانی یہ انکشاف سن کر چند ساعتوں کے لئے عمر شیخ مرزا کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں کی جنبش ہوئی۔"یہ تم نے ...... کیا کیا فرزند؟" عمر شیخ مرزا کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔"آخر اس کا ...... جرم کیا تھا؟"

"یہ میں تنہائی میں عرض کروں گا" بابر مرزا نے اس قدر بے نیازی کے ساتھ جواب دیا کہ جیسے احمد جمال کا شہر بدر ہو جانا کوئی معمولی واقعہ ہو۔"جب صاحب عالم اس واقعہ کی تمام تر تفصیلات سنیں گے تو عزت مآب کو یقین آجائے گا کہ وہ قصر شاہی میں پرورش پانے والا ایک خوف ناک مجرم تھا۔"

بابر مرزا کی غیر شائستہ اور جارحانہ گفتگو سن کر عمر شیخ مرزا کے چہرے پر اذیت و کرب کے سائے گہرے ہو گئے۔ پھر اس نے فوراً ہی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے دربار برخاست کر دیا اور بابر مرزا کو ہمراہ لے کر خلوت گاہ میں چلا گیا۔

¤¤¤

"اب مجھے بتاؤ کہ تم نے احمد جمال کو کس جرم کی اتنی بڑی سزا دی؟" تنہائی میں پہنچ کر عمر شیخ مرزا کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی اور چہرے پر بھی غصے کا رنگ نمایاں ہو چلا تھا۔

باپ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بابر مرزا کچھ سہم سا گیا تھا۔ پھر اس نے ناز آفرین بیگم کے حوالے سے سارا واقعہ پوری تفصیلات کے ساتھ سنا دیا۔

"اس سے احمد جمال کا جرم کب ثابت ہوتا ہے فرزند؟" یکایک عمر شیخ مرزا کا لہجہ غضب ناک ہو گیا۔ "ایک بے گناہ کو ریاست بدر کر دیا گیا اور گناہ گار پاکیزگی کی قباء پہن کر قصر شاہی میں آزادانہ گھوم رہا ہے۔

تمہارا انصاف ہے؟ اور کیا اسی انصاف کی بنیاد پر آئندہ تم اپنے اقتدار کی دیواریں اٹھاؤ گے؟ ایوان حکومت تو ایسی بنیادوں پر تو معمولی سا مکان بھی تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ بابر مرزا! اگر تم نے ایسا کیا تو یہ کھیل زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکے گا۔ بس چند دنوں کی بات ہوگی کہ تمہارا قصر جاہ و جلال تم ہی پر گر پڑے گا اور تم اس کے ملبے میں دب کر ہلاک ہو جاؤ گے۔"

باپ کی شعلہ بار نظریں دیکھ کر بابر مرزا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا' مگر پھر بھی اس نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی ناکام کی کوشش کی۔"صاحب عالم! میں نے احمد جمال کو شہر بدر کر کے شاہی حرم سرا کے عزت و ناموس کی حفاظت کی ہے۔ ملکہ عالیہ نے مجھے بتایا تھا کہ چند سال پہلے بھی قصر شاہی میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آچکا ہے جس میں ......"

ابھی بابر مرزا کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ والئ فرغانہ چیخ اٹھا۔"جھوٹ بولتی ہیں ملکہ عالیہ! وہ ایک تنگ نظر خاتون تمہیں احمد جمال کے بارے میں کیا بتائیں گی۔" یہ کہہ کر عمر شیخ مرزا نے ولی عہد سلطنت کو احمد جمال کی ذات سے وابستہ وہ دردناک کہانی سنا دی جس کا بظاہر کوئی انجام نہیں تھا۔"اگر احمد جمال امانت دار نہ ہوتا تو بہت پہلے فرغانہ کی تاریخ سیاست میں ذلت و رسوائی کی ایک ہولناک داستان رقم کی جا چکی ہوتی ...... اللہ اسے جزائے خیر دے کہ اس نے خاندان شاہی پر احسان عظیم کیا۔" عمر شیخ مرزا کی آواز لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔"اگر احمد جمال بدنظر اور خائن ہوتا تو ناز آفرین بیگم بہت پہلے اپنی آبرو گنوا چکی ہوتی ...... لیکن اس نے اپنے احسان کی روایت کو زندہ رکھا ...... اور ایک ہم ہیں کہ مسلسل احسان فراموشی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کل تمہارے دادا سلطان ابو سعید مرزا نے اس کے فرشتہ صفت باپ کو تہہ تیغ کر ڈالا تھا اور آج خود تم نے اس کی گردن پر شمشیر ستم کھینچ دی۔ اے خدا! ہمارے گناہوں کو معاف فرما کہ ہم تیرے بڑے ناشکر گزار بندے ہیں۔" یہ کہتے کہتے عمر شیخ مرزا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

والئ فرغانہ نے ماضی کی تاریخ کا ورق الٹا تو بابر مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ پھر احساس ندامت کا غلبہ ہوا تو ولی عہد سلطنت دست بستہ آگے بڑھا اور عمر شیخ مرزا کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔"صاحب عالم! مجھے بتایا گیا تھا کہ احمد جمال ہمارے خاندان کا بدترین دشمن ہے۔ پھر میں کس طرح اس کے ساتھ انصاف کرتا؟"

"ملکہ عالیہ نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ پندرہ سال تک اولاد کے لئے ترستی رہی ہیں؟" عمر شیخ مرزا نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔"اور تمہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ احمد جمال کے فرغانہ آنے کے بعد ہی تم پیدا ہوئے؟ تمہارا ظہور کس کی دعاؤں کا صدقہ ہے' تمہیں یہ بھی نہیں معلوم؟"

بابر مرزا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے ......"پھر میں کیا کروں صاحب عالم؟" احساس جرم کی شدت سے ولی عہد فرغانہ رو پڑا۔

"احمد جمال کو تلاش کرو۔ اگر وہ یہاں سے چلا گیا تو فرغانہ ویران ہو جائے گا۔"

¤¤¤

احمد جمال کی جستجو میں ہر طرف برق رفتار گھوڑے دوڑ پڑے تھے۔ مگر اس کا دور دور نام و نشان تک نہ تھا۔ بابر مرزا کا گھوڑا ابھی کئی گھنٹے تک ہوا سے باتیں کرتا رہا تھا' لیکن اسے جس چیز کی تلاش تھی ابھی تک اس کا

دھندلا سا سراغ بھی نہیں مل سکا تھا۔ پھر اچانک ولی عہد فرغانہ کو احمد جمال کے آخری الفاظ یاد آئے۔ "د
مملکت سے خالی ہاتھ جانا چاہتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی بابر مرزا شاہی اصطبل کی طرف پلٹا۔ حیرت انگیز
پر وہاں احمد جمال کا گھوڑا موجود تھا۔

"پھر وہ پیادہ پا اتنا طویل سفر طے کر کے فرغانہ کی حدود سے کس طرح باہر جا سکتا ہے؟" بابر مرزا کا
تک اس نکتے پر غور کرتا رہا اور پھر اس نے اپنے گھوڑے کا رخ قصر شاہی کی طرف موڑ دیا۔

"کیا احمد جمال کا کوئی سراغ ملا؟" عمر شیخ مرزا نے گھبرا کر ولی عہد سلطنت سے پوچھا۔ اس کے لہجے
بڑی حسرت پوشیدہ تھی۔

جب بابر مرزا نے اپنی اور دوسرے شہسواروں کی ناکامی کا ذکر کیا تو والیٔ فرغانہ کے چہرے پر گہری ا
چھا گئی۔

"اسے تو فرغانہ میں رہنے کے لئے پابند کر دیا گیا تھا' پھر وہ کس طرح چلا گیا؟" عمر شیخ مرزا کے لہجے
انتہائی شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

پھر جب بابر مرزا نے یہ راز منکشف کیا کہ احمد جمال کا گھوڑا شاہی اصطبل میں موجود ہے تو یکایک
فرغانہ کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا۔ پھر وہ بڑے پرجوش انداز میں اپنی نشست سے اٹھا اور با
سے یہ کہتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ "میرے ساتھ آؤ' میں جانتا ہوں کہ احمد جمال کہاں ہوگا؟"

اور پھر والیٔ فرغانہ کا اندازہ درست نکلا۔ احمد جمال سید مہدیؒ کی جھونپڑی میں موجود تھا۔

والیٔ فرغانہ کو دیکھ کر احمد جمال احتراماً کھڑا ہو گیا۔ "صاحب عالم! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا ک
تشریف لائیں تو یہ غلام اذن سفر لے کر اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔"

عمر شیخ مرزا کے چہرے پر شدید ندامت اور اذیت کا رنگ نمایاں تھا۔ "شیخ زادے! تم تو ایفائے عہ
مفہوم سے واقف ہو۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میری نظر میں آپ دونوں محترم ہیں۔" احمد جمال کا لہجہ جذبات سے یکسر عاری تھا۔ نہ اس میں کو
پوشیدہ تھا اور نہ کوئی شکایت۔ "میں نے ولی عہد سلطنت کے حکم پر قصر شاہی چھوڑ دیا' مگر اس کے باوجود فرغ
حدود سے باہر نہیں گیا کہ مجھے آپ کے حکم کا انتظار تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے بابا کے دوسرے
انتظار ہے۔ بابا ہی نے میرے پیروں میں یہ زنجیریں ڈالی تھیں اور بابا ہی ان زنجیروں کو کھولیں گے۔" ی
کہتے احمد جمال کی آواز سے دل کا درد جھلکنے لگا تھا۔

"سید تو ایک بار زنجیریں پہنا چکے۔" عمر شیخ مرزا نے آگے بڑھ کر احمد جمال کے کاندھے پر اپنا ہاتھ
دیا۔ "ہاں! اگر تم خود ہی چاہو تو یہ زنجیروں توڑ کر اپنے عہد وفا سے آزاد ہو سکتے ہو......"

"مجھے یہ زنجیریں دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں' مگر گردش حالات کو کیا کہوں کہ وہ میری غلامی
رضامند نہیں۔" احمد جمال کے ہونٹوں سے آہ سرد نکل گئی۔

"گردش وقت بدگمانیاں پیدا کر سکتی ہے' مگر تمہیں عہد شکن نہیں بنا سکتی۔" عمر شیخ مرزا کے لہجے میں
محبت و شفقت تھی جس سے احمد جمال بخوبی آشنا تھا۔ "وہ دیکھو! بابر مرزا دروازے کے باہر شرم و ندامت
جھکائے کھڑا ہے۔ وہ تم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے آیا ہے۔"

یہ سنتے ہی احمد جمال تیزی سے باہر آیا۔ واقعتاً جھونپڑی کے دروازے پر ولی عہد فرغانہ کسی مجرم کی مانند
ل لرزا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"بردار بزرگ! آپ کے سلسلے میں میرے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے......" احمد جمال کو دیکھتے ہی
رزا نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ چاہیں تو میرے ہر جرم کی علیحدہ سزا منتخب کر سکتے ہیں۔" ولی
رغانہ نے اسی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

"نہیں! میرے شہزادے! تم مجرم کیسے ہو سکتے ہو؟" احمد جمال بے اختیار بابر مرزا سے لپٹ گیا۔ "تم تو
ے بابا کی دعاؤں کا ثمر ہو۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم زمانے کے ہر فتنہ و شر سے محفوظ رہو۔ تمہاری طرف
ہ والی تمام آفتیں بیک وقت مجھ پر نازل ہو جائیں۔"

بابر مرزا' احمد جمال کے سینے پر سر رکھے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ پھر عمر شیخ مرزا نے ان دونوں کو اپنے
ان کے حصار میں لے لیا۔

جذبات کا یہ سیلاب ٹھہرا تو عمر شیخ مرزا نے سید مہدیؒ کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابر مرزا سے کہا۔
یہ اس مرد قلندر کی آخری آرام گاہ جس کی دعاؤں سے فرغانہ کے تخت کا وارث دنیا میں آیا۔"

بابر مرزا نے پہلی بار سید کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ ایصال ثواب کی اس رسم میں عمر شیخ مرزا اور احمد جمال بھی
ے تھے۔

سازشوں اور تہمتوں کا جو طوفان قصر شاہی سے اٹھا تھا وہ کسی تباہی کے بغیر چپ چاپ گزر گیا اور چند افراد
وا کسی کو بھی پتا نہ چل سکا کہ رات کے اندھیروں میں کیسے کیسے خوفناک واقعات پیش آئے تھے۔

⌑ ⌑ ⌑

ناز آفرین بیگم کئی دن تک احمد جمال کا انتظار کرتی رہی' مگر اسے نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا۔ پھر جب شہزادی نے حقیقت حال جاننے کی کوشش کی تو وقت کی رفتار کا زاویہ بدل چکا تھا۔ عمر شیخ مرزا نے بہرام مرزا اس کی رنگین مزاج بیٹی سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی بلکہ انتہائی خاموشی اور راز داری کے ساتھ شب کی تا میں ان دونوں کو فرغانہ سے رخصت کرنے کا وعدہ کر لیا پھر جب عمر شیخ مرزا نے بہرام مرزا کو اپنے فیصلے آگاہ کیا تو وہ ریاکار انسان بڑے گداگرانہ انداز میں والیٔ فرغانہ سے اس رحم کی بھیک مانگنے لگا۔

''میں اتنی عجلت میں کہاں جاؤں گا؟ مجھے کچھ دن اور اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیجئے۔''

عمر شیخ مرزا پر بہرام مرزا کی منافقانہ فریادوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا اور اسے مزید ایک دن کی مہلت د بغیر رات کے اندھیرے میں قصر شاہی سے رخصت کر دیا گیا۔ فرغانہ چھوڑنے سے پہلے ناز آفرین بیگم احمد سے ملنے کے لئے سخت بے قرار تھی' مگر اس کی یہ مراد پوری نہ ہو سکی...... اور وہ اپنے سینے پر حسرت وصال کا زخم لئے ہوئے کوچہ دلدار سے نکل کر چلی گئی۔

¤¤¤

اس کے کچھ دن بعد ہی عمر شیخ مرزا نے ریاست کے معمر سیاستداں اور سب سے بڑے دانشور مولانا قا کو خلوت خاص میں طلب کر کے کہا۔ ''مولانا! میں ریاست کا مستقبل آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ بابر مرا کو انتظامی امور کی تربیت دیجئے کہ اب وہ بڑا ہو چکا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی عمر شیخ مرزا نے اپنے بڑے بیٹے مرزا کو اندجان کا حاکم مقرر کر دیا۔

اس خوشی کے موقع پر کئی دن تک ہنگامہ خیز جشن جاری رہا۔ پھر بابر مرزا اور احمد جمال مولانا قاضی کے ہمراہ اندجان روانہ ہو گئے۔ ان لوگوں کی روانگی سے پہلے عمر شیخ مرزا نے عالیہ سے کہا تھا۔ ''بیٹی! اگر چاہو تو تم بھی جان جا سکتی ہو۔''

مگر عالیہ نے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ احمد جمال کو رخصت کرنے بھی نہیں آئی۔

¤¤¤

اس طرح تقریباً ایک سال گزر گیا۔ تقریباً ہر پندرہ دن بعد مولانا قاضی اپنے ایک معتبر قاصد کے ذر

والیٔ فرغانہ کو ایک خفیہ خط ارسال کرتے تھے جس میں تحریر ہوتا تھا کہ بابر مرزا اعلیٰ ترین انتظامی صلاحیتوں کا لک ہے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کے اوصاف نمایاں ہو رہے ہیں اور انشاء اللہ وہ جلد اپنے آپ کو یک باکمال حکمراں ثابت کر دے گا...... مولانا قاضی کا خط پڑھ کر عمر شیخ مرزا آبدیدہ ہو جاتا اور اپنے خالق کا شکر بجالاتا۔

پھر ایک دن وقت نے عجیب کروٹ لی۔ فرغانہ کا ایک قاصد گرد و غبار میں اٹا ہوا اندجان پہنچا۔ یہ قاصد عالیہ تھی۔ عالیہ نے لرزتے ہاتھوں سے وہ خفیہ خط بابر مرزا کے حوالے کیا۔ بابر مرزا بڑی وحشت و اضطراب کی حالت میں خط پڑھتا رہا۔ پھر یکایک حاکم اندجان کا پورا جسم کانپنے لگا اور کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

عمر شیخ مرزا کا انتقال ہو چکا تھا۔

¤¤¤

اگرچہ بابر مرزا ایک باہمت شہزادہ تھا' لیکن باپ کے انتقال کی خبر سن کر وہ کچھ دیر کے لئے اپنے ہوش و اس کھو بیٹھا تھا۔ ایک تو ولی عہد فرغانہ کی کم عمری اور دوسرے یہ صدمہ عظیم کہ جسے برداشت کرتے کرتے آہنی عصاب رکھنے والے انسان بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں...... اور پھر کیسا شفیق و مہربان باپ کہ جس کے ل و انصاف' رواداری اور رحم دلی کی قسمیں غیر بھی کھاتے تھے۔

''یہ کیا ہو گیا ہمشیرہ محترم!'' ناگہاں بابر مرزا چیخ اٹھا اور عالیہ تاجدار سے لپٹ گیا...... ''میں تو سوچ بھی نہیں تا تھا کہ بابا جان مجھے اس طرح تنہا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

''صبر کرو شہزادے!'' عالیہ تاجدار نے ولی عہد فرغانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ایک رسم ہے جسے ادا کرنے کے لئے دنیا کا ہر ذی روح مجبور ہے۔''

''کیا صاحب عالم نے مجھے اسی لئے اندجان بھیجا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں چپ چاپ دنیا چھوڑ کر لے جائیں؟'' بابر مرزا اس طرح رو رہا تھا جیسے وہ اس وقت عالیہ تاجدار کے بجائے اپنی ماں قتلغ خانم کے وؤں کے حصار میں ہے...... اور ولی عہد فرغانہ کا یہ تاثر کچھ غلط بھی نہیں تھا کہ عالیہ تاجدار نے بابر مرزا کو وں اپنی گود میں کھلایا تھا۔ رشتے کے اعتبار سے بابر مرزا اس کا پھوپھی زاد بھائی تھا' مگر عمر کے فرق نے اس شتے کو کم و بیش ماں اور بیٹے کے رشتے میں تبدیل کر دیا تھا۔

''صاحب عالم کیا دنیا کے کسی انسان کو بھی اپنی زندگی' موت اور تقدیر پر کوئی اختیار نہیں۔'' عالیہ تاجدار نے جذبوں کی سچائی کے ساتھ بابر مرزا کے غم میں شریک تھی اور اسی وجہ سے وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ ''یہ تو مجبوریوں کا سفر تھا شہزادے! تم تو بہت ذی فہم اور ہوش مند انسان ہو۔ اس لئے صاحب عالم کی مجبوریوں کو کی کوشش کرو۔'' عالیہ تاجدار انتہائی اثر انگیز اور منطقی لہجے میں تسلیاں دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں صاحب عالم کی اس مجبوری کو خوب سمجھتا ہوں ہمشیرہ معظمہ!'' بابر مرزا نے اس غمگسار خاتون کی وش محبت سے الگ ہوتے ہوئے کہا' جو اس جاں گداز ساعت میں ایک ماں کا کردار انجام دے رہی تھی۔

آخر صاحب عالم کو ایسی کون سی خوفناک بیماری لاحق تھی کہ وہ اتنی عجلت میں اپنے آخری سفر کے لئے مجبور

ہوگئے۔ ابھی چند روز پہلے فرغانہ کا قاصد صاحب عالم کی بہترین صحت کی خوشخبری لے کر میرے پاس حاضر ہوا تھا۔ پھر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟" بابر مرزا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور اس کی اضطرابی کیفیت میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"صاحب عالم کو کوئی بیماری لاحق نہیں تھی۔" شدت غم کے باعث عالیہ تاجدار کی آواز گھٹ جاتی تھی۔ "ان کا آخری سفر ایک حادثاتی سفر تھا۔ وہ یکایک کبوتر خانے کی چھت سے گرے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔"

عمر شیخ مرزا فرغانہ اور اندجان کا بااختیار حکمران ہوتے ہوئے بھی لہو و لعب کی زندگی سے ہمیشہ دور رہا تھا۔ قصر شاہی میں اکثر رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، مگر عمر شیخ مرزا نے ان تفریحات کو اپنی زندگی کے وظائف میں کبھی شامل نہیں کیا، وہ محض دنیاداری کی خاطر مغل بادشاہوں کی ان بے ہودہ رسموں پر عمل کرتا تھا ورنہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ایک شریف النفس اور باکردار انسان تھا۔ کیف و نشاط سے بے رغبتی کے باوجود عمر شیخ مرزا کو کبوتروں سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس کا یہ شوق بڑھتے بڑھتے جنون کا رنگ اختیار کر گیا تھا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے والیٔ فرغانہ نے دنیا بھر سے اعلیٰ نسل کے کبوتر منگائے تھے اور کبوتر خانے کے لئے محل کی ایک پرانی عمارت وقف کر دی تھی۔ عمر شیخ مرزا فرصت کے بیشتر لمحات اسی کبوتر خانے میں گزارتا تھا۔ ان معصوم اور خوبصورت پرندوں کو دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ پھر ایک دن یہی شوق اس کی ہلاکت کا سبب بن گیا۔ کبوتر خانے کی عمارت اندر ہی اندر کمزور ہو چکی تھی۔ ایک روز عمر شیخ مرزا، کبوتر خانے کی چھت پر ٹہلتے ہوئے کبوتروں کی اڑان سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یکایک چھت بیٹھ گئی اور والیٔ فرغانہ اس کے ملبے میں دب گیا۔ اس ہولناک حادثے کی اطلاع پاتے ہی قصر شاہی کے تمام خدمت گار دوڑ پڑے۔ عمر شیخ مرزا کو ملبے سے نکالا گیا تو اس کا پورا جسم لہولہان تھا۔ کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور سر بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ درباری حکیموں نے جان توڑ کوششیں کیں لیکن مسیحائی کا وقت گزر چکا تھا۔ بس ایک بار عمر شیخ مرزا کے ہونٹ کانپے اور اس کی زبان سے چند الفاظ ادا ہوئے۔ "میرا بیٹا بابر مرزا۔" اس کے بعد سانسوں کا شمار ختم ہوگیا۔

"شاید صاحب عالم کو وقت سے پہلے ہی اپنی موت کا احساس ہوگیا تھا۔" عالیہ تاجدار نے رک رک کر کہا۔

"وہ کس طرح؟" بابر مرزا نے چونک کر عالیہ کی طرف دیکھا۔ ولی عہد فرغانہ کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہوگئی تھیں۔

"صاحب عالم اپنی وفات سے چند روز قبل تواتر کے ساتھ ایک ہی خواب دیکھا کرتے تھے کہ قصر شاہی کی عمارت شدید زلزلے کی لپیٹ میں آ کر زمین بوس ہوگئی ہے اور پھر اس کی جگہ ہزاروں ہاتھ ایک نئی عمارت تعمیر کر رہے ہیں، جو پہلی عمارت سے زیادہ دلکش بھی ہے اور بلند تر بھی۔"

عالیہ تاجدار کی زبان سے یہ عجیب انکشاف سن کر بابر مرزا کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے تھے اور وہ ہمہ تن گوش ہوگیا تھا۔

"صاحب عالم نے درباری نجومی اور فرغانہ کے تمام بڑے علماء سے اپنے اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔" عالیہ تاجدار نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "درباری نجومی نے صاحب عالم کے کئی زائچے بنائے اور نہایت پرزور الفاظ میں پیش گوئی کی کہ یہ خواب بہتر مستقبل کی طرف نشاندہی کر رہا ہے۔ قصر نو کی تعمیر اس بات

کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے کہ عنقریب صاحب عالم نئی فتوحات حاصل کریں گے اور مملکت فرغانہ کی حدود میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ درباری علماء کی بیان کردہ تعبیر بھی کم و بیش اسی انداز کی تھی کہ صاحب عالم بہت جلد اپنی مملکت کو فروغ دیں گے اور ان کے دشمن مغلوب ہو جائیں گے۔" عالیہ تاجدار انتہائی رقت آمیز لہجے میں والیٔ فرغانہ کے آخری ایام کی کہانی سنا رہی تھی۔ "مگر کون جانتا تھا شہزادے کہ اس خواب کی تعبیر اس قدر بھیانک ہوگی۔ صاحب عالم اتنی عجلت میں چلے گئے کہ وہ امور مملکت کے سلسلے میں آپ کو آخری ہدایت بھی نہ دے سکے۔ ہاں! اپنی موت سے چند لمحے قبل انہوں نے آپ کا نام لیا تھا۔ اگرچہ صاحب عالم مکمل طور پر بے ہوش تھے لیکن ان کے ذہن پر صرف ایک نام نقش تھا بابر مرزا، پھر یہی نام ان کے ہونٹوں پر آیا اور والیٔ فرغانہ کی داستان حیات مکمل ہوگئی۔"

عالیہ تاجدار کے اس انکشاف نے بابر مرزا کو بے حال کر دیا اور وہ ایک بار پھر اپنے رشتے کی بہن سے لپٹ کر رونے لگا۔

"نہیں شہزادے! تم اس طرح صاحب عالم کی موت کا ماتم نہیں کرو گے۔" عالیہ تاجدار نے فوراً ہی بابر مرزا کو اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے آنسو سلطنت فرغانہ کی بنیادوں کو کمزور کر دیں گے اور دشمن یہی تو چاہتے ہیں کہ تمہارا اقتدار اشکوں کے سیلاب میں بہہ جائے۔" کہنے کو عالیہ تاجدار کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں، مگر اس کے لہجے میں بڑی استقامت تھی، بڑا تحکم تھا۔ "اگر کوئی چیخ تمہارے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی تو دشمن یہی سمجھیں گے کہ عزم و ہمت کی چٹان میں زلزلے نے شگاف ڈال دیئے ہیں۔ پھر وہ اپنے نفرت و انتقام کے تیشے لے کر فرغانہ کی طرف دوڑ پڑیں گے اور تمہارے قصر اقتدار کو مسمار کر ڈالیں گے۔"

عالیہ تاجدار کے لہجے میں مزید ٹھہراؤ تھا۔ "میری طرف غور سے دیکھو شہزادے! میں اور میرے ساتھی سپاہی خانہ بدوشوں کے لباس میں تم تک پہنچے ہیں...... اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ کوئی دشمن ہم پر شک نہ کر سکے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فرغانہ کی سرحدوں پر خصوصی فوجی دستے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت ایک عام شہری کو بھی فرغانہ کی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں...... اور یہ احتیاطی تدبیر محض اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ آپ کے دشمن صاحب عالم کی موت سے باخبر نہ ہو سکیں۔ اگر انہیں کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوگیا کہ والیٔ فرغانہ آسودہ خاک ہو چکے تو وہ اس سیاسی انتشار سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔ اس لئے آپ اپنے چہرے، اپنی آنکھوں اور اپنے ہونٹوں پر ضبط کے پہرے بٹھا دیں...... اور آج رات ہی انتہائی رازداری کے ساتھ فرغانہ کی طرف لوٹ چلیں۔ اگر میرے اس اندازے کو آپ اپنے خاندانی معاملات میں مداخلت تصور نہ کریں تو میں ایک اور نازک موضوع زیر بحث لاؤں۔" عالیہ تاجدار نے رک رک کر کہا۔

عالیہ کی غمگساری کا انداز بڑا عجیب تھا۔ جذبۂ خلوص و وفا سے لبریز اس کے تسکین آمیز کلمات نے بابر مرزا کو بڑا حوصلہ بخشا تھا۔ "جو کچھ کہنا ہے بے جھجک ہو کر کہو، میری محترم ہمشیرہ! میں تمہیں غیر نہیں سمجھتا۔"

"مجھے آپ کے برادر خورد جہانگیر مرزا کے تیور بھی کچھ بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔" عالیہ تاجدار نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر خدانخواستہ کچھ طالع آزما لوگوں نے جہانگیر مرزا کی پشت پناہی کی تو وہ فرغانہ کی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہوگا۔ اس سے پہلے کہ صاحب عالم کی روشن نشانی سازشوں کے اندھیروں

میں غرق ہوجائے' آپ فرغانہ کی خبر لیں۔"

بابر مرزا نے اسی وقت اپنے مشیر خاص مولانا قاضی اور دست راست احمد جمال کو خلوت گاہ میں طلب کرلیا۔ ان دونوں نے بابر مرزا کی سرخ آنکھیں دیکھیں تو پریشان نظر آنے لگے۔ پھر جب انہوں نے عالیہ تاجدار کو ایک خانہ بدوش عورت کے لباس میں اپنے روبرو پایا تو ان کی بدحواسی کچھ اور بڑھ گئی۔

"خیر تو ہے شہزادہ عالم!" بیک وقت مولانا قاضی اور احمد جمال کی زبان سے ایک ہی جیسے الفاظ ادا ہوئے۔

جواب میں بابر مرزا کی آنکھوں سے دوبارہ اشکوں کا سیلاب جاری ہوگیا۔ ولی عہد فرغانہ نے الفاظ کے سہارے اپنے غم کا اظہار کرنا چاہا' مگر زبان نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

مجبوراً عالیہ تاجدار نے مغل شہزادے کے جذبات کی ترجمانی کی۔

عمر شیخ کے انتقال کی خبر سن کر مولانا قاضی اور احمد جمال کو سکتہ سا ہوگیا۔ پھر سلطنت فرغانہ کے دونوں معتمد بھی اشک باری کے ساتھ بابر مرزا کے غم میں شریک ہوگئے۔

مولانا قاضی کچھ دیر تک عمر شیخ مرزا کے اوصاف بیان کرتے رہے کہ مرنے والا ایک عادل حکمران تھا اور اس کی سوچ بہت زیادہ تعمیری تھی۔

احمد جمال نے بابر مرزا کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ "شہزادے! اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تم یتیم ہوگئے ہو' مگر ایک نظر میری طرف بھی دیکھو کہ میں نے بھی تمہارے ساتھ سینے پر یہی زخم کھایا ہے...... اور آج میں تیسری بار یتیم ہوا ہوں۔ اب اس زمین پر میرا درد سمجھنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ صاحب عالم اپنی رعایا کے لئے حکمران سے زیادہ ایک شفیق باپ کا درجہ رکھتے تھے۔ اس طرح تو فرغانہ کا ایک ایک باشندہ ہی یتیم ہوگیا۔" شدت غم سے احمد جمال کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں اور زبان اس بچے کی طرح لڑکھڑا رہی تھی جس نے ابھی پوری طرح بولنا نہیں سیکھا تھا۔ احمد جمال کی تعزیت کا انداز اس قدر جاں گداز تھا کہ بابر مرزا بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔

"میرے بھائی! میں صاحب عالم کو کہاں ڈھونڈوں؟"

"صاحب عالم ہمارے دلوں میں ہیں۔" احمد جمال نے نوعمر شہزادے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہماری آنکھوں پر ان کی رفتار و گفتار کا ہر زاویہ نقش ہے' ہماری سماعتوں میں ان کی ہر تقریر' ان کا ہر پیغام محفوظ ہے...... اور ہمارے ذہنوں پر ان کی یادوں کی حکمرانی ہے۔ پھر وہ کہاں جائیں گے؟ صاحب عالم یہیں ہمارے قریب ہی موجود ہیں اور جب تک ہم لوگ احساس ذمہ داری اور عہد وفا کی پاسداری کے ساتھ زندہ رہیں گے' وہ قدم بہ قدم ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔ رسم دنیا کچھ بھی سہی مگر میرے نزدیک ابھی منزل فراق نہیں آئی۔ ہاں! اس روز صاحب عالم یقیناً ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائیں گے جب ہم عہد وفا توڑ دیں گے' ان کے ذوق تعمیر کی نفی کردیں گے اور ان کی مسند انصاف کو اپنے گمراہ قدموں سے روند ڈالیں گے۔"

مولانا قاضی اور عالیہ تاجدار نے چونک کر احمد جمال کی طرف دیکھا۔ اس نوجوان نے زندگی اور موت کے فلسفے کو بڑے عجیب پیرائے میں بیان کیا تھا۔

یہ احمد جمال کے پرخلوص لہجے ہی کا اثر تھا کہ بابر مرزا بہت جلد سنبھل گیا اور ماتمی فضا کے غبار سے باہر نکل آیا۔

مولانا قاضی نے عالیہ تاجدار کی اس بات سے اختلاف کیا کہ رات کے اندھیرے میں فرغانہ کی جانب سفر کا آغاز کیا جائے۔ اس ذیل میں مولانا کی دلیل یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو رازداری برقرار نہ رہ سکے گی اور عام لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ یقیناً فرغانہ میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آگیا ہے۔

بابر مرزا' احمد جمال اور عالیہ تاجدار تینوں مولانا کی رائے سے متفق تھے۔

مولانا قاضی نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اندجان کے سپہ سالار طغا شیرم کو صاحب عالم کے انتقال کی خبر نہیں ملنی چاہئے۔

غرض بابر مرزا کی وہ رات بڑے کرب میں گزری۔

⌑ ⌑ ⌑

پھر صبح ہوتے ہی بابر مرزا قاضی' احمد جمال' عالیہ تاجدار اور چند معتمد سپاہیوں کے ہمراہ فرغانہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اندجان کے قلعے سے نکلتے وقت بابر مرزا نے اپنے سالار امیر شیرم سے صرف اتنا کہا کہ صاحب عالم نے کسی خاص مشورے کے لئے اسے فرغانہ طلب کیا ہے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ بہت جلد اندجان لوٹ آئے گا۔ امیر شیرم نے حیرت سے ولی عہد فرغانہ کی طرف دیکھا اور سر اطاعت خم کردیا۔

فرغانہ پہنچتے ہی بابر مرزا اپنی سوگوار ماں قتلغ خانم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر اس نے عمر شیخ مرزا کی قبر پر حاضری دی اور اپنے مرحوم باپ کے حق میں اس طرح دعائے خیر کی۔

"اے روز جزا کے مالک! ایک دن ہم سب کو تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میرے والد محترم تیرے ہی حکم سے تیری بارگاہ قدرت و جلال میں حاضر ہوچکے۔ ان پر اپنے بے پناہ اور بے مثال فضل کے دروازے کھول دے کہ تیرے کرم کے بغیر انہیں نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔"

پھر اسی ماتمی فضا میں بابر مرزا کی تخت نشینی اور تاج پوشی کی رسم ادا ہوئی۔ وہ 901ھ کا زمانہ تھا۔ بابر مرزا نے "ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ" کا لقب اختیار کیا اور اپنے باپ عمر شیخ مرزا کا جانشین قرار پایا۔

⌑ ⌑ ⌑

پھر جب عمر شیخ مرزا کے انتقال اور بابر کی تخت نشینی کی خبر عام ہوئی تو سلطنت کے تمام وارثوں میں کھلبلی مچ گئی اور ہر شخص جائز و ناجائز طریقے سے اپنا حق مانگنے کے لئے فرغانہ کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت شہنشاہ بابر کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ نوعمر بادشاہ اتنی جلد مصائب کے ہجوم میں گھر جائے گا۔ بابر کے حقیقی ماموں سلطان محمود مرزا اور حقیقی چچا سلطان احمد مرزا نے آپس میں ساز باز کی اور پھر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دونوں اپنی فوجیں لے کر فرغانہ کی طرف بڑھے۔ اس وقت سلطان محمود مرزا کے تصرف میں حصار کا علاقہ تھا اور سلطان احمد مرزا سمرقند کا حکمران تھا۔ ان دونوں اقتدار پرستوں نے چند گز زمین کی محبت میں تمام خونی رشتوں کو فراموش کرکے نوعمر شہنشاہ بابر کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اس نازک موقع پر سلطنت فرغانہ کے کچھ پرانے نمک خواروں نے بھی بابر سے غداری کی اور سلطان احمد مرزا سے جا کر مل گئے اور نئے نئے انداز

سے فتنہ انگیزی کرنے لگے۔

فرغانہ کا محاصرہ روز بہ روز تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اگر کچھ دن اور یہی صورتحال جاری رہتی تو فرغانہ کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ بابر کی جان کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جاتا۔ یہاں تک کہ نوعمر شہنشاہ قیدی بنا لیا جاتا پھر اسے ایک خوں ریز معرکے کے بعد قتل کر دیا جاتا۔ دونوں صورتوں میں بابر کی شکست یقینی نظر آ رہی تھی۔ سالار امیر شیرم چاہتا تھا کہ وہ بابر کو لے کر "آوار کند" کے پہاڑوں میں چلا جائے اور پھر موسم کے سازگار ہونے تک یہیں روپوش رہے۔ مگر مولانا قاضی نے امیر شیرم کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مثالی جرأت کا مظاہرہ کیا۔

پھر مولانا قاضی رات کے اندھیرے میں بابر کو لے کر اندجان چلے گئے۔

بابر کے ماموں سلطان محمود مرزا اور چچا سلطان احمد مرزا کو فرغانہ پر مکمل غلبہ حاصل ہو چکا تھا' مگر وہ دونوں بابر کی تلاش میں تھے تاکہ اس نوعمر بادشاہ کا قصہ پاک کر کے اس کے نام کو تیمور کے وارثوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ اسی حریصانہ اور ظالمانہ سوچ نے ان دونوں کو بابر کے تعاقب پر مجبور کیا۔ اب سلطان محمود مرزا' فوجیں اندجان کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ بظاہر بابر کے اقتدار کی ساعتیں شمار کی جا چکی تھیں' مگر انسانی اندازوں کے برخلاف یکایک اس کے سر پر خوش قسمتی سایہ فگن ہو گئی۔ اس دوران بابر کے دو لائق سپہ سالار حسین یعقوب اور امیر قاسم بھی اندجان پہنچ گئے۔ ان دونوں سالاروں کو "قرغستان" فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا پھر جب وہ دونوں اپنی مہم سے واپس آئے تو انہوں نے بساط سیاست پر عجیب انتشار دیکھا۔ اگر ان کی جگہ دوسرے زمانہ ساز سپاہی ہوتے تو وہ بلاتاخیر احمد سلطان مرزا اور سلطان محمود مرزا کی اطاعت و فرمانبرداری کا اعلان کر دیتے کہ اس وقت طاقت کا توازن بابر کے حق میں نہیں تھا۔ مگر حسین یعقوب اور امیر قاسم طاقت کے غلام نہیں تھے' اپنے عہد وفا کے اسیر تھے۔ اس لئے بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انتہائی پرجوش لہجے میں بادشاہ کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔

ادھر سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کے لشکر اندجان کی طرف بڑھ رہے تھے اور ادھر بابر اپنے اراکین سلطنت کے مشوروں سے قلعے کے حصار کو مضبوط تر بنا رہا تھا۔ کیوں کہ یہی اس کی آخری پناہ گاہ تھی۔ اگر بابر سے یہ آخری پناہ گاہ بھی چھن جاتی تو پھر اس کے قدم زمین پر نہ جمتے' اسی صورتحال کے پیش نظر اندجان کے تمام سپاہی راتوں کو جاگ جاگ کر قلعے کے دفاع کو مضبوط تر بنانے کی کوششیں کر رہے تھے۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کے لشکر اندجان کے اطراف میں نمودار ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے طاقتور دشمنوں نے ایک کمزور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بابر کا خیال تھا کہ دشوار گزار سفر اور محاصرہ کے دوران پیش آنے والی سختیوں سے گھبرا کر دشمن بہت جلد اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جائیں گے' مگر جب محاصرہ طویل ہوتا چلا گیا تو بابر نے مولانا قاضی کو ایک خط دے کر اپنے حقیقی چچا سلطان احمد مرزا کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس وقت احمد جمال بھی مولانا قاضی کے ہمراہ تھا' بابر نے خونیں رشتوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے خط میں تحریر کیا تھا۔

"محترم چچا! میری طرف غور سے دیکھئے! نہ میں آپ کے لئے غیر ہوں اور نہ کوئی دشمن' ساری دنیا جانتی ہے کہ میں آپ کے چھوٹے بھائی عمر شیخ مرزا کا بیٹا بابر مرزا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ حضور والا بہ نفس نفیس

اندجان میں رہ کر حکمرانی نہیں کریں گے۔ لہٰذا اگر اس علاقے کا انتظام میرے ہی پاس رہنے دیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ آخر میں بھی آپ کے بیٹے کی مانند ہوں اور وہی بیٹا آپ کو یقین دلاتا ہے کہ وہ ساری عمر آپ کا اطاعت گزار و فرمانبردار رہے گا۔"

سلطان احمد مرزا بابر کا خط پڑھ کر بہت خوش ہوا' وہ اپنے بھتیجے کی درخواست کو مکمل طور پر قبول کرنا چاہتا تھا' مگر اراکین سلطنت اور امراء نے اس کی شدید مخالفت کی۔

"پھر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" سلطان احمد مرزا نے نرم لہجہ اختیار کیا' وہ اپنے امرائے سلطنت کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"ہم اندجان کے قلعے کو بہ زور شمشیر فتح کریں گے۔" سمرقند کے کئی سرداروں نے بیک زبان کہا۔ "وہ آپ کا بھتیجا نہیں' صرف عمر شیخ مرزا کا بیٹا ہے۔" سرداروں کے چہروں پر ناگواری کا رنگ صاف نمایاں تھا اور ان کے لہجے بہت زیادہ تلخ ہو گئے تھے۔ "اور کیا آپ عمر شیخ مرزا کو بھول گئے جس نے اپنی عیاریوں سے آپ کے توسیع پسندانہ عزائم کو کئی بار خاک میں ملایا۔ یہ اسی عمر شیخ مرزا کے بیٹے کی عاجزانہ درخواست ہے جو وقت پڑنے پر آپ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر وہ دوبارہ آپ کے سامنے سر اٹھائے کھڑا ہو گا...... اور اسی انداز سے شاطرانہ چالیں چلے گا' جو اس کے باپ کی فطرت ثانیہ تھی۔ ہماری گستاخی معاف! ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ ہم بابر سے اس کے باپ کی ایک ایک حرکت کا انتقام لیں گے۔"

سلطان احمد مرزا نے اپنے معزز اراکین سلطنت کا جواب سنا اور پھر مولانا قاضی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہم نے چاہا تھا کہ ہم اپنے سرکش و نافرمان بھائی کے بیٹے کی درخواست کو قبولیت کا شرف بخش دیں' مگر ہمارے محترم اراکین سلطنت ایسا نہیں چاہتے۔ دراصل یہ لوگ حکومت کے کارندے نہیں' ہمارے دست و بازو ہیں...... اور ہم بابر مرزا کی خواہش کی تکمیل کے لئے اپنے دست و بازو نہیں کاٹ سکتے' اس لئے واپس جاؤ اور بابر مرزا سے کہہ دو کہ وقت کا انتظار کرے۔ اب وقت ہی ہمارے اور اس کے درمیان فیصلہ کرے گا۔"

مولانا قاضی نے سلطان احمد مرزا کے سامنے اسی کروفر کا مظاہرہ کیا' جو ایک مرد آزاد کا شیوہ ہوتا ہے' مگر جب وہ دشمن کی خیمہ گاہ سے باہر نکلے تو کسی شکست خوردہ انسان کی طرح بہت زیادہ نڈھال نظر آ رہے تھے...... اور احمد جمال کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

اس کی سماعت میں بار بار سید مہدیؒ کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"جب وارث فرغانہ آفات و مصائب کے ہجوم میں گھر جائے تو میرا یہ خط اس کے حوالے کر دینا۔"

آج سے پہلے احمد جمال کو سید مہدیؒ کے یہ الفاظ کچھ عجیب سے لگے تھے اور وہ سوچا کرتا تھا کہ کیا ایک خوش بخت شہزادے پر اتنے برے دن بھی آ سکتے ہیں؟ پھر جب وہ سلطان احمد مرزا کے خیمے سے ناکام و نامراد لوٹا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ شاید بابر کی گردش کا وہی دور شروع ہو چکا ہے' جس کی پیش گوئی سید مہدیؒ نے اس وقت کی تھی جب فرغانہ کا وارث پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

جیسے ہی مولانا قاضی قلعے کے صدر دروازے میں داخل ہوئے انہوں نے بابر کو اپنا منتظر پایا۔ مولانا کو دیکھتے ہی بابر نے انتہائی مضطرب لہجے میں اپنے مشیر خاص سے پوچھا۔

"کیا ہوا مولانا؟ عم محترم نے میری تجویز مان لی؟"

''نہیں شہنشاہ!'' مولانا قاضی کے لہجے کی شگفتگی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ ''آپ کے عم محترم تو صلح پر آ
ہو چلے تھے مگر ان کے بدخواہ اور فتنہ جو سرداروں نے امن و عافیت کے مسودے کو چاک کر کے اس کے پرزے
میں اڑا دیئے۔''

اپنے صلح نامے کا حشر دیکھ کر بابر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ لوگ
قدر بے رحمی کے ساتھ خاندانی رشتوں کو پامال کر ڈالیں گے۔ کیا وہ حرص کی نیلام گاہ میں میری مجبوریاں خر
چاہتے ہیں؟''

''ہاں! میرے شہنشاہ ان کی یہی مرضی ہے۔'' مولانا قاضی کے لہجے سے بھی شدید تلخی جھلک رہی تھی۔ ''
اسی انداز کے تاجر ہیں' انسانوں سے ان کی مجبوریاں خریدتے ہیں اور نفرت و قہر فروخت کرتے ہیں۔ ان
نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں' وہ صرف زمین کے سوداگر ہیں اور انہیں ہر حال میں اندجان کی ز
چاہیئے۔''

''پھر میں بھی اتنی آسانی سے یہ زمین ان کے ہاتھ نہیں بیچوں گا۔'' ایسے سنگین لمحات میں بھی بابر
چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

''آفرین! صد ہزار آفرین!'' مولانا قاضی کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''جب شہنشا
لقب اختیار کیا ہے تو پھر اس لفظ کی آبرو رکھنا۔ یہی ادا شہنشاہوں کی شایان شان ہوتی ہے کہ وہ نہ کسی
مجبوریاں خریدتے ہیں اور نہ وہ کسی مجبور پر اپنی حیوانی مرضی مسلط کرتے ہیں۔''

⌑ ⌑ ⌑

قلعہ اندجان کا محاصرہ جاری رہا۔ سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کا خیال تھا کہ بابر بہت جلد اسیر
جیسی زندگی سے گھبرا کر ایک دن خود ہی قلعے کا دروازہ کھول دے گا اور پھر خود ہی ان لوگوں کی مرضی کے مطا
غلامی کی زنجیریں پہن لے گا۔ مگر بابر کی استقامت کے باعث دشمنوں کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے
نوعمر بادشاہ اپنی محدود فوجی طاقت کے باوجود سلطان احمد مرزا کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

پھر ایک رات بابر نے ایک روشن چہرہ بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ وہ بزرگ بابر کو ہاتھ کے اشارے
صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ صبح بیدار ہو کر بابر نے اپنا یہ خواب مولانا قاضی اور احمد جمال کے روبرو بیان کیا۔ مولا
قاضی امور سیاست کے ماہر ہونے کے علاوہ ایک بڑے مذہبی عالم بھی تھے۔ خواب کے ہر پہلو پر غور کرنے
بعد مولانا نے یہی تعبیر دی کہ کسی بزرگ کو خواب میں دیکھنا ایک مبارک فال ہے۔

''شہنشاہ! ان بزرگ کا چہرہ کیسا تھا؟'' جب مولانا قاضی خواب کی تعبیر بیان کر چکے تو احمد جمال نے با
سے پوچھا۔

بابر نے اپنے ذہن پر زور دے کر ان بزرگ کے نقش و نگار کے بارے میں بتایا تو احمد جمال بے ساختہ
پکار اٹھا۔ ''یہ تو میرے بابا کا چہرہ ہے۔ سید مہدیؒ کا روشن و تابناک چہرہ۔'' احمد جمال کے لہجے سے عجیب احسا
مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

مولانا قاری نے بھی احمد جمال کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! وہ سید مہدیؒ ہی ہو سکتے ہیں

اور ایک یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ بے شک! آپ نے انہیں نہیں دیکھا' مگر پھر بھی آپ کے اور سید
کے درمیان ایک غائبانہ رشتہ موجود تھا۔ جب صاحب عالم ولی عہد سلطنت کا انتظار کرتے کرتے مایوس
تھے تو اسی مرد قلندر نے بارگاہ رب ذوالجلال میں وارث فرغانہ کی پیدائش کے لئے دن رات دعائیں کی
۔ اب یہ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جب صاحب عالم آپ کی ولادت کی خوشخبری لے کر اس مرد قلندر کی
گاہ میں پہنچے تو سید مہدیؒ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔''

سید مہدیؒ کے ذکر نے کچھ دیر کے لئے فضا کو سوگوار بنا دیا تھا' مگر پھر بھی یہ تینوں افراد اپنی اپنی جگہ عجیب
طمانیت کا احساس کر رہے تھے۔

پھر کچھ دن بعد ہی بابر کو اپنے خواب کی تعبیر کھلی آنکھوں سے نظر آنے لگی' کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
سلطان احمد مرزا کا لشکر جرار یکایک ایک عجیب سی آفت کا شکار ہو جائے گا۔ سمرقند اور حصار کے فوجی معمول
مطابق سکون و عافیت کی گہری نیند سوئے تھے' مگر جب وہ بیدار ہوئے تو ایک بہت بری خبر ان کے جاگنے کا
انتظار کر رہی تھی۔ راتوں رات سمرقندیوں کے پچاسوں گھوڑے اپنے اپنے تھانوں پر مردہ پائے گئے تھے۔
سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا نے اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا...... مگر جب دو تین دن کے
مختصر سے عرصے میں ہزاروں گھوڑے ہلاک ہو گئے تو سمرقند اور حصار کے حکمران بدحواس نظر آنے لگے۔ اب
سلطان احمد مرزا اور سلطان محمود مرزا کو احساس ہوا کہ یہ گھوڑوں میں پھیلنے والی ایک وبائی بیماری ہے جس کا بظاہر
کوئی علاج ممکن نہیں تھا۔ بس احتیاطی تدبیر کے طور پر تمام گھوڑوں کو ان کے طویلوں سے نکال کر کھلے میدان میں
دور باندھ دیا گیا۔ اس طرح گھوڑوں کی موت کی شرح تو کم ہو گئی لیکن پھر بھی جانوروں کی ہلاکت کا سلسلہ
جاری رہا۔ اس اچانک ناگہانی نے سمرقند اور حصار کے سپاہیوں کو بابر سے جنگ کرنے کے بجائے نئی فکر میں
مبتلا کر دیا تھا کہ وہ سواری کے بغیر اپنے اپنے علاقوں کو کس طرح واپس جائیں گے۔

بالآخر سلطان احمد مرزا مجبور ہو گیا کہ وہ بابر سے دوبارہ صلح کے مذاکرات شروع کرے' نتیجتاً سمرقند کی
طرف سے امیر درویش محمد اور اندجان کی طرف سے سپہ سالار یعقوب نے نمائندگی کی' پھر یہ دونوں امراء عیدگاہ
کے میدان میں جمع ہوئے اور مختصر سے وقت میں صلح کے تمام معاملات طے پا گئے۔

جب دشمن کی فوجیں ناکام واپس جا رہی تھیں تو اندجان کے اکثر باشندے بآواز بلند کہہ رہے تھے کہ یہ کھلی
کھلی تائید غیبی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

بابر' مولانا قاضی' احمد جمال اور دیگر امرائے سلطنت نے قلعے کی فصیل سے اپنے سیاسی حریفوں اور طاقتور
دشمنوں کی نامرادی کا یہ منظر دیکھا تو اسی بلندی پر نماز شکر ادا کی۔

پھر کچھ دن بعد ہی بابر کو سلطان احمد مرزا کے انتقال کی خبر ملی۔ سیاسی اعتبار سے یہ ایک اچھی خبر تھی۔ بتانے
والوں نے بتایا کہ دوران سفر ہی سلطان احمد مرزا کو کسی خوفناک بیماری نے گھیر لیا تھا۔ سمرقند کے شاہی طبیبوں نے
بہت کوشش کی کہ ان کا حکمران کسی نہ کسی طرح دارالحکومت پہنچ جائے' مگر غریب الوطنی کی موت سلطان احمد مرزا
کا مقدر بن چکی تھی۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ فرشتہ اجل نے اس کی سانسیں غصب کر لیں۔

اگرچہ سلطان احمد مرزا بابر کا حقیقی چچا تھا' مگر اس کی موت کی خبر سن کر نہ بھتیجے کی آنکھیں نم ہوئیں اور نہ
فرغانہ و اندجان کے کسی باشندے کے چہرے پر رنج و الم کی کوئی علامت ابھری' بلکہ اکثر امرائے سلطنت نے

تمتماتے چہروں اور پرجوش لہجوں کے ساتھ بابر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔
''شہنشاہ کو مبارک ہو کہ دستِ قدرت نے ان کے راستے کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا۔''

¤ ¤ ¤

بابر نے اس غیبی اشارے کا مفہوم سمجھ لیا اور وقت کی دی ہوئی مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ابھی سمرقند اپنے فرمانروا سلطان احمد مرزا کی موت کا ماتم ہی کر رہے تھے کہ بابر نے علی دوست طغائی کو اندجان کا دار مقرر کر کے سمرقند پر حملہ کر دیا۔ مقامی لشکر نے معمولی سی مزاحمت کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سمرقند پر قبضہ ہو گیا۔ جن لوگوں نے سمرقند پر قبضہ کرنے میں بابر کی مدد کی تھی وہ شاہانہ عنایات سے سرفراز کئے گئے۔ ازبکوں کی ایک کثیر جماعت بابر سے اس بات پر ناراض تھی کہ اہلِ سمرقند سے صلح کے مذاکرات کیوں کئے ان لوگوں کے خیال میں ایک خونریز جنگ کے بعد انہیں مالِ غنیمت لوٹنے کا پورا موقع ملنا چاہئے تھا۔ بابر نے ازبکوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ قزاقی اور قتل و غارت ہمارا مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی حریف صلح کے لئے بڑھاتا ہے اور اس عمل سے ہمارے سیاسی مفادات کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں کشت و خون اور انسانی ا کی بربادی سے گریز اختیار کرنا چاہئے۔ مگر ازبکوں کے دل حرص و ہوس سے بھرے ہوئے تھے۔ انہیں صرف و اسباب کی تمنا تھی۔ پھر جب وہ سیم و زر کے انبار حاصل نہ کر سکے تو بابر کے قافلۂ شجاعت سے کٹ گئے اور حسن سے جا ملے۔ اوزن حسن سمرقند کے بعض تعلقوں کا حاکم تھا اور اپنے دل میں بابر کے لئے نفرت کے جذبات رکھتا تھا۔

بابر سے بچھڑ جانے والوں میں کئی نامور امراء بھی شامل تھے۔ احمد تنبل پر بابر نے اپنی نوازشات کی کی تھیں‘ مگر اس احسان فراموش نے ماضی کے ایک ایک حوالے کو جھٹلا دیا اور ابراہیم بیگ جیسے بااثر امیروں کر اوزن حسن سے جا ملا‘ پھر ان باغیوں نے بابر کے چھوٹے بھائی جہانگیر کو خوب ورغلایا اور ''تاج و تخت سنہرے خواب دکھائے۔

جہانگیر مرزا پہلے ہی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا‘ مگر کسی فوجی گروہ کی حمایت حاصل نہ ہونے کے اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ پھر جیسے ہی اسے باغیوں کی شہ ملی تو وہ جامے سے باہر ہو گیا نے باغی امراء اور ازبک سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت کے اصرار پر بابر کو خط لکھا۔

''میں جہانگیر مرزا آپ کو اس حقیقت سے باخبر کرتا ہوں کہ عمر شیخ مرزا کی چھوڑی ہوئی موروثی جائ میرا بھی برابر کا حق ہے۔ اب جبکہ سمرقند آپ کے قبضے میں آ چکا ہے تو کسی تاخیر کے بغیر اندجان کی میرے حوالے کر دی جائے۔

بابر نے اپنے چھوٹے بھائی کے اس خط کو ایک طفلانہ حرکت سے تعبیر کیا اور فوری طور پر کوئی جواب مناسب نہیں سمجھا۔ باغیوں نے بابر کی اس مصلحت آمیز خاموشی کو غلط رنگ دے کر بغاوت کا اعلان کر د باغیوں کی یہ فوج جہانگیر مرزا کی قیادت میں اندجان پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔

بابر نے اپنے معتمد امیر التون خواجہ کو باغیوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں سمجھا بجھا کر راہِ راست آئے۔ پھر جب التون خواجہ باغیوں سے طویل مذاکرات کرنے کے بعد سمرقند واپس لوٹا تو بابر نے اسے

شہنشاہ کو گفتگو کے دوران التون خواجہ پر شک ہو گیا تھا کہ وہ باغیوں سے ساز باز کر چکا ہے اور اس کے گھر کا ی بن کر قصرِ شاہی کو ڈھانا چاہتا ہے۔ سیاست کے کاروبار میں ایسے گھر کے بھیدیوں کو برداشت نہیں کیا ا۔ نتیجتاً بابر نے بے دریغ التون خواجہ کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

¤ ¤ ¤

باغیوں کی فوج پورے جوش و خروش کے ساتھ اندجان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قلعہ دار علی دوست طغائی اور انا قاضی کو باغیوں کے حملوں کی خبر ملی تو ان دونوں نے اپنے دفاعی نظام کو مضبوط کیا اور پھر ایک برق رفتار مد سمرقند بھیج کر بابر سے مزید فوجی کمک طلب کی۔ گردشِ وقت نے ابھی بابر کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ قاصد کے سے پہلے ہی اس پر شدید بیماری کا حملہ ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بیماری کا اثر اتنا بڑھا کہ بابر اپنے بستر پر ٹ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ مجبوراً طبیبوں نے بادشاہ کی غذا بند کر دی تھی کہ غذا کا ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے نے کے قابل نہیں تھا۔ پھر بابر کی ناتوانی اس درجے تک پہنچ گئی کہ اس کے لئے پانی پینا بھی محال ہو گیا۔ جان کے قاصد نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ بابر پر غشی کی کیفیت طاری تھی اور درباری طبیب روئی بھاہے سے اس کے ہونٹوں پر پانی کا ایک ایک قطرہ ٹپکا رہے تھے۔

بڑی مایوس کن صورتحال تھی۔ تمام درباری طبیب بابر کی زندگی سے ناامید ہو چکے تھے۔ قاصد نے ڈرتے نے چند ذمہ دار فوجی افسروں کو جہانگیر مرزا کے حملے کی خبر سنائی اور مولانا قاضی کا خفیہ پیغام منتقل کیا۔ یہ خبر سن مرقند کے نگہبانوں کے ہوش اڑ گئے۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' فوجی افسروں نے کفِ افسوس ملتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں کے ساتھ کہا ''ہم حالت میں بادشاہ کو تنہا چھوڑ کر جا بھی تو نہیں سکتے۔ مولانا سے کہو کہ وہ کسی نہ کسی طرح اندجان کا دفاع تے رہیں۔ بادشاہ کی صحت یابی سے پہلے کسی فوجی کمک کا بھیجنا ممکن نہیں۔ خود سمرقند کے اندرونی حالات بھی دو اطمینان بخش نہیں۔ ہر طرف دشمن کمین گاہوں میں گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور کب ہمارے اقتدار کا خاتمہ کر ڈالیں۔''

جب قاصد نے اندجان پہنچ کر یہ صورتحال بیان کی تو مولانا قاضی اور علی دوست طغائی کے ہوش اڑ گئے۔

''بادشاہ کی صحت کے بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟'' شدتِ جذبات سے مولانا قاضی کی آواز کانپ رہی تھی۔

''خدا وہ وقت نہ لائے‘ مگر آثار و قرائن یہی کہتے ہیں کہ بادشاہ کا دمِ آخر ہے۔ اب قدرت کا کوئی کرشمہ انہیں بچا سکتا ہے۔'' قاصد نے لرزتے لہجے اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ کہا۔

اب باغیوں سے جنگ کرنا فضول تھا۔ مختصر سی فوج کو بچانے اور قتل و غارت کے طوفان کو روکنے کے لئے دوست طغائی اور مولانا قاضی نے آپس میں طویل مشورے کئے...... اور پھر اندجان کا قلعہ جہانگیر مرزا کے حوالے کر دیا گیا۔

قلعے پر قابض ہوتے ہی جہانگیر مرزا نے باغیوں کے مشورے سے مولانا قاضی کو قتل کر دیا۔ بابر سے غیر معمولی وفاداری اور بے پناہ ذہانت مولانا قاضی کے قتل کا سبب بن گئی۔ علی دوست طغائی ایک زمانہ ساز انسان

تھا۔ اس نے جہانگیر مرزا کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی جان بچائی اور پھر موقع ملتے ہی اندر جان سے فر
مرغاب کے قلعے میں پناہ گزین ہوگیا۔

⌑ ⌑ ⌑

پھر کوئی ایک ماہ بعد بابر کو درغیب سے دوسری زندگی عطا ہوئی اور وہ حیرت انگیز طور پر صحت یاب
بیماری سے نجات پاتے ہی بابر کو اندجان پر جہانگیر مرزا کے حملے کی اطلاع دی گئی اور اسے یہ بھی بتایا گیا
سلسلے میں مولانا قاضی نے فوجی کمک کی درخواست کی تھی' مگر شہنشاہ کی بیماری کے باعث اس درخواست
عمل نہیں کیا گیا تھا۔ بابر یہ پریشان کن اطلاعات سن کر بہت زیادہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ پھر دوسرے دن ا
تمام فوج لے کر اندجان کی طرف بڑھا۔ بس چند سپاہی قلعہ سمرقند کی نگہبانی کے لئے چھوڑ دیئے گئے تھے۔

اپنے جنگی سفر کی پہلی ہی منزل پر بابر کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ اندجان پر جہانگیر مرزا کا قبضہ ہوگیا او
قاضی جیسے جاں نثار رسم وفا نبھاتے اپنے خون میں نہا گئے۔

بابر گھوڑے کی پشت سے اترا اور پھر ایک کھلے میدان میں مولانا قاضی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی
''مولانا! آپ نے فرض شناسی کا حق ادا کر دیا۔'' بابر اشکبار آنکھوں کے ساتھ اپنے اتالیق اور مشی
کے حق میں دعائے خیر کر رہا تھا۔ ''آپ خلوص و وفا کی ایک ایسی روشن نشانی تھے کہ جس کے بجھنے کے بعد
ہر طرف گہری تاریکی پھیل گئی ہے' مگر ہمیں اب بھی اپنے دل و دماغ میں ایک ایسی جلتی ہوئی قندیل کا ا
ہوتا ہے کہ جس نے آپ کے خون سے روشنی حاصل کی ہے۔ وقت کی کیسی ہی خون خوار آندھیاں چلیں
ہمیں یقین ہے کہ یہ قندیل کبھی نہیں بجھے گی۔ اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔''

اندجان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ بابر نے نوشتہ تقدیر کو بغور پڑھا اور اپنا رخ سمرقند کی طرف موڑا
قلعہ سمرقند کی نگہبانی کے لئے محض چند سپاہی چھوڑ کر آیا تھا اور فوجیوں کی یہ تعداد حفاظتی امور کے لئے سخت
تھی۔ بابر کو یکایک ایک نئے خطرے کا احساس ہونے لگا تھا اور اسی خطرے کے پیش نظر بابر تیز رفتاری
ساتھ سمرقند کی جانب بڑھا...... مگر جب وہ سمرقند کے قریب پہنچا تو ایک اور خوفناک حقیقت اس کا انتظار ک
تھی۔ سلطان احمد مرزا کی بیوہ اور اس کے بیٹے سلطان علی کی تحریک پر شیبانی خان نے حملہ کر کے سمرقند پ
کرلیا تھا۔

بابر کچھ عرصے تک اپنی مختصر سی فوج لئے ادھر ادھر حیران و پریشان پھرتا رہا۔ اس دوران اس کے چ
بھائی ناصر مرزا نے اس قدر فتنہ انگیز سازشیں کیں کہ بابر کے تمام سپاہی اس سے بچھڑ گئے۔ بس دو سو جا
باقی رہ گئے تھے جو برہنہ شمشیروں پر ہاتھ رکھ کر متاع حیات لٹا دینے کا عہد کر رہے تھے۔ اب وہ ایک ایسا
تھا کہ جس کے قبضے میں ایک گز زمین بھی نہیں تھی۔

پھر اسی بے چارگی کے عالم میں بابر اپنے دو سو سپاہیوں کو لے کر ''خجند'' کی طرف بڑھا۔

ایک رات بابر کے مختصر ترین لشکر کا پڑاؤ جنگل میں تھا اور احمد جمال کے ذہن میں آندھیاں سی چل
تھیں۔ پھر ان آندھیوں کا شور اس قدر بڑھا کہ احمد جمال بیقرار ہو کر اپنے خیمے سے نکلا اور خانہ بدوش شہنشا
خواب گاہ میں داخل ہوگیا۔ اس وقت بابر علم نجوم کی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انسانی قدموں کی چاپ
چونکا اور احمد جمال کو اپنے روبرو پا کر مسکرانے لگا۔

''خلوت شاہی میں بے وقت خلل انداز ہونے کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔'' احمد جمال نے انتہائی
مؤدب لہجے میں کہا۔

''ایک جاں نثار بھائی کو اس قسم کے تکلفات کا اسیر نہیں ہونا چاہئے۔'' بدترین موسم میں بھی بابر کے لہجے
میں شگفتگی اور زندہ دلی جھلک رہی تھی۔

''میں بھی کیا کروں شہنشاہ کہ اپنے فرض سے مجبور ہوں۔'' یہ کہہ کر احمد جمال نے چمڑے کا ایک لفافہ بابر
کی طرف بڑھا دیا۔ اس لفافے میں سید مہدیؒ کا وہی خط موجود تھا جس کے بارے میں انہوں نے احمد جمال کو
ہدایت کی تھی کہ جب فرغانہ کا وارث آفات و مصائب کے ہجوم میں گھر جائے تو ان کا یہ خط اس کے حوالے کر دیا
جائے۔

⌑ ⌑ ⌑

بابر نے حیرت سے اس لفافے کی طرف دیکھا' جو بظاہر چمڑے کا ایک چھوٹا سا تھیلا نظر آ رہا تھا۔"
یہ احمد جمال؟"

"شہنشاہ کی امانت ہے۔" احمد جمال نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"کیسی امانت؟" بابر نے ہاتھ بڑھا کر وہ چمڑے کا لفافہ لے لیا' مگر اس کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

"یہ ایک ایسی امانت ہے کہ جس کا بوجھ اٹھائے اٹھائے چودہ سال گزر چکے ہیں۔" احمد جمال کی آواز سے شکستگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "یہ آپ کے نام سید مہدیؒ کا خط ہے۔"

"پھر آج اتنے زمانے کے بعد تم مجھے یہ خط دے رہے ہو؟" بابر کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری کی جھلک تھی۔

"یہ خط آپ کی پیدائش سے پہلے میرے حوالے کیا گیا تھا۔" احمد جمال نے مختصراً سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے آپ اس خط کو ملاحظہ کر لیجئے۔ پھر اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے امانت کو منتقل کرنے میں تاخیر سے کام کیوں لیا؟"

بابر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شدید حیرت کے عالم میں اپنے خنجر کی نوک سے اس مضبوط دھاگے کو کاٹ دیا۔ جو لفافے کے چاروں طرف کی گئی تھی۔ پھر سید مہدیؒ کا خط نکال کر پڑھنے لگا۔ احمد جمال نے بابر کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھا۔ خانہ بدوش شہنشاہ کا سرخ و سفید چہرہ دھواں دھواں سا نظر آ رہا تھا۔ احمد جمال نے یہ بھی دیکھا کہ بابر کے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی لرزش موجود تھی۔ یہ سید مہدیؒ کے جلال روحانی کا اثر تھا یا اس خط کے نفس مضمون کا کہ جسے پڑھ کر بابر کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔

پھر جب سید کا خط تمام ہوا تو بابر نے اداس چہرے اور تھکی تھکی نظروں کے ساتھ احمد جمال کی طرف دیکھا۔

"شہنشاہ! مجھے اس کا حق تو نہیں کہ میں دو افراد کے درمیان ہونے والی رازدارانہ گفتگو کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔" احمد جمال نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں احمد جمال! تم سے کوئی پردہ نہیں ہے۔" بابر کے لہجے کی شکستگی کچھ اور بڑھ گئی تھی...... "تم سید کے رشتے سے میرے لئے بہت زیادہ لائق احترام ہو...... ویسے میری ذات پر بھی تمہارے کئی احسانات ہیں۔ میں تم سے......"

"شہنشاہ! میں اس قطع کلامی پر معافی کا خواستگار ہوں۔" احمد جمال نے بابر کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

ابھی کے احسانات شمار کرنے کا وقت نہیں۔ میں تو اس عبارت کا مفہوم جاننے کے لئے بے چین ہوں جو بابا نے آپ کے نام تحریر کی ہے...... آخر انہیں یہ خط لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" احمد جمال کا اضطراب اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔

"سید مہدیؒ بہت روشن ضمیر انسان تھے"...... بابر کے لہجے سے سید کے لئے عجیب عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔ "کاش! میں بھی انہیں دیکھ سکتا۔"

سید کے ذکر پر احمد جمال کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"عام انسان اس راز کو نہیں سمجھ سکتا کہ سید مہدیؒ کو مستقبل بینی کی یہ صلاحیت کس طرح حاصل ہوئی تھی۔ بابر اداس اور حیرت زدہ لہجے میں بول رہا تھا۔ "جو تحریر چودہ سال پہلے لکھی گئی تھی اسے پڑھ کر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سید مہدیؒ ہمارے قریب ہی موجود ہیں اور جو کچھ ہم لوگوں پر گزر رہی ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر بابر نے سید مہدیؒ کا خط بآواز بلند پڑھنا شروع کر دیا۔ "فرغانہ کے وارث! تجھ پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ آسمان و زمین کا اقتدار صرف اللہ ہی کی ملکیت ہے' مگر انسان اپنی جہالت کے سبب چند روزہ امارات کے نشے میں غرق ہو کر زمین اور زندگی کو اپنی دائمی وراثت سمجھنے لگتا ہے۔ پھر زر و مال اور طاقت کے عمل کی کثرت اُسے اس حد تک گمراہ بنا دیتی ہے کہ وہ ذات وحدہ لاشریک کو بھول جاتا ہے یہاں تک کہ اسے موت آ جاتی ہے اور وہ ایک مردود و مقہور بندے کی حیثیت سے اس مالک بے نیاز کی بارگاہ جلال میں پیش کر دیا جاتا ہے' جس کی قدرت کو کبھی زوال نہیں اور جس کے اختیارات لامحدود ہیں' تیرا دادا سلطان ابو سعید مرزا بھی سمجھتا تھا کہ اسے کبھی موت نہیں آئے گی...... مگر وہ اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوا کہ دیکھنے والوں نے اس کا انجام دیکھ کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور اللہ کے قہر سے پناہ مانگنے لگے۔ عمر شیخ مرزا ایک شریف النفس انسان ہے۔ اگر وہ اپنے باپ کے گناہ کا کفارہ ادا نہ کرتا تو نسل تیمور بے نشان ہو کر رہ جاتی۔ اب تجھ پر لازم ہے کہ اپنے خالق کا شکر ادا کر اور انصاف و رواداری سے کام لے۔ اگر کبھی تجھ پر تیری ہی زمین تنگ ہو جائے تو پھر رخ ہندوستان کی طرف موڑ لینا...... وہاں "اجودھیا" کے مقام پر میرے ایک دینی بھائی موسیٰ عاشقان رہتے ہیں' ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرنا۔ وہ ایک مرد کامل ہیں' انہیں عام آدمی ہرگز نہ سمجھنا' موسیٰ عاشقان اپنی ذات پر ایک گہرا پردہ ڈالے رہتے ہیں۔ وہ لاکھ انکار کریں مگر تو ان کے دامن سے لپٹ جانا...... پھر اس وقت تک دامن نہ چھوڑنا جب تک وہ تیرے حق میں دعا کے لئے اپنے ہاتھ نہ اٹھا دیں۔" سید مہدیؒ کا خط سناتے سناتے بابر کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں...... "میں احمد جمال کی شکل میں تیرے پاس اپنی ایک نشانی چھوڑے جا رہا ہوں' میری اس نشانی کو غرور شاہی کی خونیں ہواؤں سے بچا کے رکھنا۔ اگر تیرے عمل نے اس نشانی کو بجھا دیا تو پھر کوئی نہیں جانتا کہ چاروں طرف کیسی تاریکی پھیل جائے گی۔" یہاں پہنچ کر سید مہدیؒ کا خط تمام ہو گیا تھا۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں احمد جمال!" بابر نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جسے سید مہدیؒ نے اپنی نشانی کہہ کر پکارا تھا...... "والدہ محترمہ اور قصر شاہی کے دوسرے مکینوں نے جس جس طرح تمہاری دل آزاریاں کی ہیں......"

ابھی بابر کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ احمد جمال مضطرب ہو کر درمیان ہی میں بول اٹھا۔

''شہنشاہ! آپ بھی ماضی کو فراموش کردیں۔ میں تو بہت دیر ہوئی' عہد رفتہ پر خاک ڈال چکا۔ ہما
پاس اپنے حال پر ماتم کے لئے وقت نہیں تو گزرے زمانے کو کس طرح یاد کریں؟ صرف اپنے آگے کی ط
دیکھئے۔ پیچھے کی تمام چیزیں روز و شب کے غبار میں گم ہوچکی ہیں۔ راستہ چلتے چلتے بس ایک لمحے کے لئے
عقب کا جائزہ لیجئے۔ کہیں کسی دوست کے ہاتھ میں زہر آلود خنجر تو نہیں...... کسی عزیز نے کمان تو نہیں کھینچ لی
اور کسی مہربان کا نیزہ شہ رگ کے قریب تو نہیں پہنچ چکا۔''

خانہ بدوش شہنشاہ بہت دیر تک اس شمع کو دیکھتا رہا جو باہر کی ہواؤں کی سرکشی کے سبب خیمے کے اند
رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بابر شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

احمد جمال خاموش کھڑا بابر کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ سید مہدیؒ کا خط ابھی تک شہنشاہ کے ہاتھ
موجود تھا...... ''کیا ہندوستان کی طرف رخ کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے؟'' احمد جمال نے آہستہ سے کہا

''احمد جمال! تم مجھے مشورہ دو۔'' بابر نے بڑے احترام سے سید مہدیؒ کا خط تہہ کرکے اسے چمڑ۔
لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

احمد جمال نے سوالیہ نظروں سے بابر کی طرف دیکھا۔

''اب مجھے یقین آگیا ہے کہ خالق کائنات نے سید مہدیؒ کو بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت عطا کی
بابر رک رک کر بول رہا تھا۔ ''بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ ایک دن ہمیں ہندوستان کا سفر اختیار کرنا پڑے گا
مہدیؒ کی پیش گوئی کے عین مطابق میری اپنی ہی زمین مجھ پر تنگ ہوچکی۔ اب اس بات میں کسی شک کی
باقی نہیں رہی کہ سید نے میری اسی گردش حال کی طرف کھلا اشارہ کیا ہے...... لیکن اگر ہم کچھ دنوں کے لئے
نئے سفر کا ارادہ ملتوی کردیں تو ہمارا یہ فعل کہیں کسی گستاخی کے مترادف تو نہیں ہوگا؟'' بابر کے لہجے
عجیب سی جھجک کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیسی گستاخی شہنشاہ؟'' احمد جمال نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ وہ بابر کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قا
تھا۔

''سید کا حکم ہے کہ میں اپنے گھوڑے کا رخ ہندوستان کی طرف موڑوں اور میرا علم کہتا ہے کہ میں
اور یہیں ٹھہر کر اچھے وقت کا انتظار کروں۔'' یہ کہتے ہوئے بابر نے علم نجوم کی اس بوسیدہ کتاب پر ایک اچٹ
نظر ڈالی' جس کا وہ کچھ دیر پہلے تنہائی میں مطالعہ کر رہا تھا۔

''یہ سید کا حکم نہیں' ایک مشورہ ہے۔'' یکایک احمد جمال کے لہجے سے بے دلی کا تاثر نمایاں ہوچلا
اس حقیقت سے باخبر تھا کہ بابر بچپن ہی سے شعر و شاعری کے علاوہ ستاروں کے علم سے بھی گہری دلچ
ہے۔ پھر بھی اس نے اپنی بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابر سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔ ''آپ کس علم کی
رہے ہیں شہنشاہ؟ کیا وہ علم سید مہدیؒ کے علم سے زیادہ معتبر ہے؟''

بابر احمد جمال کا یہ سوال سن کر چونک اٹھا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پراعتماد لہجے میں بولا
اپنے یا کسی دوسرے کے علم کا مقابلہ سید مہدیؒ کے علم سے نہیں کر رہا ہوں۔ میرا اشارہ علم نجوم کی طرف ہے
بڑے اطمینان کے ساتھ ستاروں کے علم کی وکالت کر رہا تھا۔

[illegible] ''شہنشاہ! اسلام میں ستا

ہے۔''

''ستارے میرے خدا نہیں ہیں اور میں ان کی پرستش بھی نہیں کرتا ہوں۔'' یکایک بابر کے ماتھے پر کئی
لکیریں ابھر آئیں' اس کے لہجے سے ناگواری ظاہر ہونے لگی تھی۔

''حضور والا! یہ بھی ایک انداز کی پرستش ہے کہ ہم ستاروں کے کہنے پر اپنا راستہ بدل ڈالیں اور اللہ کے اس
پیغام مقدس کو فراموش کردیں کہ جب وہ کسی کو سربلند کرنا چاہتا ہے تو پھر سارے جن و انس مل کر بھی اسے پست
نہیں کرسکتے...... اور اسی طرح جب وہ کسی کے مقدر میں ذلت و رسوائی لکھ دے تو پھر اس کائنات کی تمام مادی
و غیر مادی طاقتیں مل کر بھی اس غیبی تحریر کو نہیں مٹا سکتیں۔ کیا ستاروں نے اس گردش حال کی طرف اشارہ کیا
تھا جس سے آج کل آپ دوچار ہیں۔''

''تم علم نجوم سے واقف نہیں احمد جمال! اس لئے میری بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔'' بابر کی آواز سے کسی قدر
جھلاہٹ ظاہر ہونے لگی تھی۔ ''مجھے اس گردش وقت کا پتا تھا...... مگر اب جلد ہی ستاروں کی رفتار بدلنے والی ہے
اور یہ رفتار مکمل طور پر میرے حق میں ہوگی۔'' بابر بہت زیادہ پرجوش نظر آنے لگا تھا۔

احمد جمال خاموش ہوگیا' اس نے گردش وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بابر کو یہ راز سمجھانے کی کوشش نہ کی
تھی کہ ستاروں کا علم ایک گمراہ کردینے والا علم ہے۔ جب یہ کسی انسان کو قسمت آزمائی کا اشارہ دیتا ہے تو نتائج
اس کی توقعات کے خلاف برآمد ہوتے ہیں اور وہ رسوائی و بربادی کے تاریک غار میں جا گرتا ہے...... اور جب
ستارے اچھے وقت کا انتظار کرنے کے لئے کہتے ہیں تو بعد میں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ کسی انسان نے جو وقت ہاتھ
پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے میں گزار دیا' وہی اس کا اچھا وقت تھا...... اور اب وہ وقت پلٹ کر نہیں آئے گا۔ کبھی
کبھی علم نجوم کے اندازے بالکل درست ثابت ہوتے ہیں...... اور اسی ایک واقعے سے متاثر ہوکر کم علم انسان
نجوم کی پیش گوئیوں پر تکیہ کرلیتے ہیں اور پھر ساری زندگی بھٹکتے رہتے ہیں۔ بابر بھی آج کل اسی کیفیت سے
دوچار تھا۔ اس کی اکثر راتیں ویران جنگل میں آسمان کو تکتے ہوئے گزرتی تھیں۔ احمد جمال جانتا تھا کہ شہنشاہ
ستاروں کی رفتار کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ احمد جمال کو ذاتی طور پر علم نجوم میں بابر کی یہ غیر معمولی دلچسپیاں پسند نہیں
تھیں۔ اس لئے آج اس نے شہنشاہ کو دبے لفظوں میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ علم نجوم ایک قیاسی علم
ہے جس کے سہارے کوئی انسان اپنے حال اور مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کرسکتا...... مگر جب بابر نے اس کے
لفظوں کو غور سے نہیں سنا تو وہ مایوس ہوکر واپس جانے لگا۔

''میں سید مہدیؒ کے علم سے اپنے علم کا مقابلہ نہیں کر رہا ہوں۔'' بابر کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوگیا تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

احمد جمال جاتے جاتے رک گیا اور پلٹ کر بابر کی طرف دیکھنے لگا۔

''پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ سید مہدیؒ ستاروں کا علم نہیں جانتے تھے۔'' بابر نے اپنا سلسلہ کلام جاری
رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم کچھ دن یہاں ٹھہر کر ستاروں کی چال کا اندازہ کرلیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے؟
علم نجوم کو ترتیب دینے میں بھی تو بڑے بڑے ماہرین نے عمریں صرف کی ہیں اور اپنی جانیں کھپا ڈالی ہیں۔''
بابر ایک ستاروں کے علم کی پرجوش وکالت کر رہا تھا۔

''اب اس راز سے تو اللہ ہی باخبر ہے کہ سید مہدیؒ کیا جانتے تھے اور کیا نہیں جانتے تھے؟'' احمد جمال
لہجے سے بھی ناگواری کا رنگ نمایاں ہوگیا تھا...... ''شہنشاہ اس شخص کے علم کو جھٹلا رہے ہیں جس نے چودہ م
پہلے ہماری اس بے سروسامانی کی خبر دے دی تھی۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آج ہمارے قدموں کے نیچے اپنی ایک
زمین بھی موجود نہیں ہے۔ شہنشاہ! خدا کے لئے اپنا وقت برباد نہ کیجئے۔ ستارے جھوٹ بولتے ہیں اور آئندہ
جھوٹ ہی بولتے رہیں گے۔''

''میں سید مہدیؒ کے علم کی نفی نہیں کر رہا ہوں احمد جمال!'' بابر نے آہستہ سے کہا۔ شاید اسے اپنے لہ
گرانی کا احساس ہو چلا تھا۔ ''میں تو کچھ دن یہاں قیام کر کے سیاست کی بساط پر آخری بازی کھیلنا چاہتا ہوا
بہت ممکن ہے کہ میں اگلی بازی جیت جاؤں...... اور اگر خدانخواستہ انسانی اندازوں کے برخلاف بساط ہی الٹ
تو پھر ہماری آئندہ منزل ہندوستان کے سوا کوئی اور نہیں ہوگی۔''

احمد جمال جانتا تھا کہ بابر آخری کوشش کا نام لے کر بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ دربدر ہونے کے باوجو
ابھی تک ستاروں کے طلسم سے باہر نہیں نکلا ہے۔ اگرچہ بابر کوئی سرکش نوجوان نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کی فط
میں کسی قدر ضد کا عنصر شامل تھا اور اس وقت یہی ضد اسے حیلہ سازی پر مجبور کر رہی تھی۔ دراصل شہنشاہ کو علم
کی اس پیش گوئی پر یقین کامل تھا کہ بہت جلد اس کا اچھا وقت آنے والا ہے...... اور یہی وجہ تھی کہ اس نے
مہدیؒ کی ہدایت کو غور سے نہیں سنا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' احمد جمال بابر کی دلیلوں اور بہانہ سازی کی شدت دیکھ کر اس بات سے ما
ہو چکا تھا کہ خانہ بدوش حکمران فوری طور پر اپنا ارادہ بدل دے گا۔ ''شہنشاہ کسی بھی عالم میں بے اختیار
ہوتے۔ آپ امور مملکت کے رازوں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ سیاست اور ستاروں کا علم کیا
ہے...... مگر جہاں تک سید مہدیؒ کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو میں اپنی آخری سانس تک خوش عقیدہ رہوں
آپ ایک نہیں' ہزار کوششیں کرلیں۔ مجھے سائے کی طرح ہر قدم پر اپنے ساتھ ساتھ پائیں گے...... لیکن میر
بات یاد رکھئے گا کہ آپ کی آخری منزل صرف ہندوستان ہوگی۔ آپ نے سید مہدیؒ کو نہیں دیکھا' اس لئے
کی عادتوں سے بھی واقف نہیں...... مگر اہل فرغانہ خوب جانتے ہیں کہ سید بولتے ہی کب تھے۔ یہ تو میری
آپ کی خوش نصیبی ہے کہ مرنے کے بعد بھی سید ہم لوگوں سے مخاطب ہیں۔'' اتنا کہہ کر احمد جمال بابر کے
سے باہر چلا گیا۔

اور وہ بے تاج بادشاہ رات بھر نجوم کی ایک طویل کتاب کا مطالعہ کرتا رہا۔

⌑ ⌑ ⌑

سردیوں کا زمانہ قریب تھا' اس لئے بابر نے اپنے گھوڑے کی رفتار تیز تر کر دی۔ وہ جلد از جلد ''خجند'
جانا چاہتا تھا۔ اگر بابر ایسا نہ کرتا تو جاڑے کے موسم کی سختیاں اس خانہ ویرانی کے عالم میں بڑی تباہ کار ث
ہوتیں۔ اسی صورتحال کے پیش نظر یہ دشوار گزار اور طویل سفر تقریباً نصف مدت میں طے پا گیا۔ پھر جب با
پہنچا تو وہاں کے حاکم محمد حسین کاشغری نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس دربدری کی حالت میں محمد حسین
مخلصانہ سلوک سے بابر کو بڑا حوصلہ ملا' پھر اس نے جاڑوں کا ناخوشگوار موسم خجند میں گزارا اور مستقبل کی مـ

ل کرتا رہا۔

بابر نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے بکھرے ہوئے آدمیوں کو جمع کر کے اچھی خاصی جمعیت فراہم کرلی
اس نے جلد ہی ایک نئے انداز سے قسمت آزمائی کی۔ اس سلسلے میں محمد حسین کاشغری کا فوجی تعاون
اس کے شامل حال تھا۔ آخر ایک دن بابر خجند کی سرحدوں سے باہر نکلا اور گرم سیر علاقے کے دو قلعوں پر حملہ
یہاں کے کمزور حاکموں نے معمولی مزاحمت کی اور پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ فتح بابر کے لئے ایک فال
تھی۔ اب وہ بے زمین بادشاہ نہیں رہا تھا۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے ان دونوں قلعوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں
لیکن پھر بھی یہ سوچ کر بابر کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار اس کے حق میں پلٹتی جا
رہی ہے۔

ابھی ان دونوں قلعوں پر قبضہ کئے ہوئے بہ مشکل دو تین مہینے ہی گزرے ہوں گے کہ بابر کو ایک اور مشکل
صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ نئی فتح کے ابتدائی دنوں کی خوشی میں وہ اندازہ ہی نہ کر سکا تھا کہ ان قلعوں کا انتظام
اس کے لئے ایک دردِ سر بن کر رہ جائے گا۔ یہاں آمدنی کے وسائل کم تھے اور اخراجات بہت زیادہ۔ کچھ دن
کے بعد وہ اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر سکے۔ پھر جب اس ذیل میں بابر نے احمد
جمال سے مشورہ کیا تو وہ جاں نثار خاص اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکا۔

''شہنشاہ! میں تو عرض کر چکا کہ اب آپ کے لئے ہندوستان ہی عافیت کی منزل ہے۔ خدارا اس بات کو
میری طنز سمجھ کر میری وفاداریوں پر شک نہ کیجئے گا۔ میں تو آپ کا ایک ایسا خدمت گزار ہوں کہ جو بھوکے پیٹ
رہ کر بھی آپ کے دشمنوں سے مسلسل جنگ کر سکتا ہے۔''

''ایک تمہارے بھوکے رہنے سے کیا ہوگا احمد جمال!'' بابر اپنے چہرے سے بہت زیادہ پریشان نظر آرہا
تھا۔ ''سوال تو ان سینکڑوں سپاہیوں کا ہے جو زیادہ دن تک بھوک اور غربت کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے' مجھے
صاف نظر آرہا ہے کہ یہ سب لوگ بہت جلد میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ پھر کوئی امیر و کبیر حکمران ان کی
شمشیریں خرید لے گا۔ جب سیاست کی نیلام گاہ میں میری وفادار شمشیریں ہی فروخت ہو جائیں گی تو میں اپنے
دشمنوں کا مقابلہ کس طرح کروں گا؟''

''پھر خجند کی طرف لوٹ چلئے۔'' احمد جمال نے بابر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دن اور محمد حسین
کاشغری کے محلات میں گزار دیجئے۔''

''اس کے احسانات کے بوجھ سے پہلے ہی میرے کاندھے جھکے جاتے ہیں۔''...... بابر نے انتہائی سخت
لہجے میں احمد جمال کے مشورے کو جھٹلا دیا۔ ''اس کی طرف جانے سے تو بہتر ہے کہ تمام سپاہی میرا ساتھ چھوڑ
دیں اور میں اس ویرانۂ ہستی میں تنہا رہ جاؤں۔''

''مجھے اپنے شہنشاہ سے اسی جواب کی توقع تھی۔'' احمد جمال کے ہونٹوں پر ایک جانفزا مسکراہٹ ابھر
آئی...... ''پھر آپ پر لازم ہے کہ کچھ دن اور صبر کریں۔ جسے جانا ہے وہ چلا جائے کہ اس کا جانا ہی آپ کے حق
میں بہتر ہے...... اور جو نہیں جانا چاہتا اسے اپنی پریشانیوں کا احساس نہ دلائیں کہ اس عمل سے انسانی حوصلے
پست ہو جاتے ہیں۔''

احمد جمال سے طویل گفتگو کے بعد بابر کی وحشتوں میں کمی آ گئی تھی' مگر وہ اس پریشانی کے احساس سے

نجات حاصل نہیں کر سکا تھا کہ اس کے سپاہیوں کے چہرے بجھے بجھے رہتے ہیں اور ان کی آنکھیں ایک ہی
کرتی رہتی ہیں کہ ”ہماری ضرورتوں کی تکمیل کس طرح ہوگی اور بے چارگی کا یہ زمانہ کب ختم ہوگا؟“

بابر کی زندگی کے وہ دن بڑے کرب کے عالم میں گزر رہے تھے کہ اچانک تقدیر نے ایک اور کروٹ
خانہ بدوش شہنشاہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مایوسیوں کے اندھیرے اتنی تیزی سے چھٹ جائیں گے اور امید
نیا سورج نکل آئے گا۔ ایک دن بابر کے سپاہیوں نے ایک ایسے شہسوار کو اپنی طرف آتے دیکھا جو راستے
گردوغبار میں اٹا ہوا تھا۔ پھر جب وہ اجنبی بابری لشکر کے قریب پہنچا اور اس سے باز پرس کی گئی تو اس
آواز میں کہا۔

”مجھ پر شک کر کے وقت برباد نہ کرو۔ میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں مجھے فوراً شہنشاہ بابر کے پاس
چلو کہ میں ان کے لئے ایک دوست کا نہایت ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔“

سپاہیوں نے پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد اجنبی شہسوار کو بابر کی خدمت میں پیش کر دیا۔

”شہنشاہ! میں علی دوست طغائی کا قاصد ہوں۔“ اجنبی احتراماً نصف قد تک جھک گیا تھا۔

علی دوست طغائی کا نام سن کر بابر کے دل و دماغ میں آگ سی لگ گئی۔ ”وہ نمک حرام ابھی زندہ ہے؟“
بابر نے شرربار لہجے میں قاصد سے سوال کیا۔

جلال شاہی کے اثر سے قاصد کانپنے لگا' پھر اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنی دستار کھولی اور ایک سر
لفافہ نکال کر بابر کے حضور پیش کر دیا۔

بابر نے شدید طیش کے عالم میں لفافہ چاک کیا اور علی دوست طغائی کا خط پڑھنے لگا۔

”آقائے نعمت! غلام اپنے اس گناہ پر آخری سانس تک نادم رہے گا کہ وہ آپ کی امانت کی حفاظت
کر سکا۔ ممکن ہے کہ شہنشاہ کے آئین میں یہ گناہ ناقابل معافی ہو' مگر پھر بھی غلام کی یہ درخواست ہے کہ ا
صفائی کا ایک موقع ضرور عنایت کریں' قلعہ مرغاب اس ساعت سعید کے انتظار میں ہے جب وہ حضور والا کی
بوسی کا شرف حاصل کرے گا۔“

علی دوست طغائی کے اس مخلصانہ اور جاں نثارانہ انداز نے بابر کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کی طرف
شہنشاہ کے دل میں جو کدورت تھی اسے علی دوست کی تحریر نے دھو دیا۔ فی الواقع یہ ایک تائید غیبی تھی جس
کسمپرسی کے عالم میں بابر کو بڑا سہارا دیا تھا' وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنا مختصر سا لشکر لے کر مرغاب کی طرف بڑ
علی دوست طغائی نے قلعے سے نکل کر بابر کا والہانہ استقبال اس طرح کیا کہ تین بار شہنشاہ کی رکاب کو بو
دئیے اور بہت دور تک گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے پیادہ پا چلتا رہا۔

قلعے میں داخل ہو کر علی دوست طغائی نے اندجان کے دفاع کی ناکامی کے سلسلے میں عذر پیش کرتے ہو
کہا۔ ”شہنشاہ! یہ غلام بہت مجبور تھا۔ دشمنوں نے یہ خبر عام کر دی تھی کہ صاحب عالم دنیا سے رخصت ہو
ہیں۔ پھر اپنے سالار کے بغیر یہ مختصر سی فوج اپنے طاقتور دشمنوں سے کس طرح جنگ کرتی؟“

بابر نے علی دوست طغائی کی معذرت قبول کر لی تھی اور اب وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی
لئے نئے انداز سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

پھر کچھ دن بعد ہی بابر نے مرغاب کی سرحدوں سے نکل کر دوسرے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ

کا کچھ علاقہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔

جب جہانگیر مرزا کو یہ خبر ملی کہ اس کا بڑا بھائی شکست کے زخموں سے جانبر ہو گیا ہے اور نئی زندگی حاصل
کر کے اپنی مملکت میں اضافہ کر رہا ہے تو وہ اوزن حسن اور احمد تنبل کو اپنے ہمراہ لے کر مرغاب کی طرف بڑھا
اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بابر کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ قلعے میں
داخل نہیں ہو سکا تھا...... اور جس قدر سپاہی قلعے کے اندر موجود تھے وہ جہانگیر مرزا کی یلغار کو روکنے کی طاقت نہیں
رکھتے تھے۔ بابر نے جان توڑ کوشش کی کہ وہ کسی طرح اپنے اس لشکر تک پہنچ جائے جو قلعے میں محصور ہو چکا
تھا۔ مگر جہانگیر مرزا نے اپنی جنگی حکمت عملی سے بابر کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ
وہ زیادہ دن تک اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار پھر خانہ بدوش شہنشاہ کے دل و دماغ پر مایوسیوں کے گہرے اندھیرے چھا گئے۔ غرض اسی بے
چارگی کے عالم میں بابر سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے باقی ماندہ سپاہیوں کو لے کر کسی نامعلوم منزل کی طرف نکل جائے
کہ یکایک اس کی تقدیر نے ایک اور خوشگوار کروٹ لی' جب بابر کے حقیقی ماموں سلطان محمود مرزا کو اس کی
پریشانیوں کا علم ہوا تو حیرت انگیز طور پر والئ حصار کے دل میں اپنے بھانجے کے لئے کچھ نرم گوشے پیدا ہو گئے۔
سلطان محمود مرزا نے فوری طور پر ایک برق رفتار قاصد کو بابر کے لئے یہ پیغام دے کر روانہ کیا کہ وہ کچھ دن اور
مزاحمت جاری رکھے۔ حصار کی فوجیں عنقریب اس کی مدد کو پہنچنے والی ہیں۔

سلطان محمود مرزا کا یہ خط اس مریض کے لئے مژدہ جانفزا سے کم نہیں تھا جو اپنی آخری گھڑیاں گن رہا ہو۔
بابر کے اکھڑتے ہوئے قدم ایک بار پھر مضبوطی کے ساتھ میدان کارزار میں جم گئے۔ وہ کسی نہ کسی طرح جہانگیر
مرزا کے حملوں کو روکتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک راستوں سے غبار اٹھا اور سلطان محمود مرزا کا لشکر نمودار ہوا۔
دیکھتے ہی دیکھتے جھکے ہوئے بازو برق کی طرح لہرانے لگے اور پھر بابر نے اپنی حمایتی فوج کے ساتھ مل کر جہانگیر
مرزا کے اس خصوصی دستے کا قلع قمع کر دیا جو اس کے راستے کا بھاری پتھر بنا ہوا تھا۔ یہ دشمن کی بدترین شکست
تھی۔ جہانگیر مرزا کے صرف سات یا آٹھ سپاہی بمشکل اپنی جانیں بچا کر میدان جنگ سے فرار ہو سکے۔ باقی
سارے کے سارے خاک و خون میں نہا کر لقمہ اجل بن گئے۔ اس شکست نے جہانگیر مرزا کے اس فوجی دستے پر
بھی بڑا اثر ڈالا جو قلعہ مرغاب کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ نتیجتاً جہانگیر مرزا کے کچھ سپاہی اس سے کٹ کر بابر کے
ساتھ جا ملے۔

سلطان محمود مرزا کی تازہ دم فوجی کمک' سینکڑوں سپاہیوں کی ہلاکت اور باقی ماندہ لشکر میں شدید انتشار' یہی
وہ اسباب تھے کہ جن کے زیر اثر جہانگیر مرزا زیادہ عرصے تک قلعے کا محاصرہ برقرار نہیں رکھ سکتا تھا' مجبوراً وہ قلعہ
مرغاب کا محاصرہ اٹھا کر اندجان کی طرف بڑھا۔ گردش حال کے سبب وہ اسی ایک علاقے پر قناعت کرنا چاہتا تھا'
مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ قدرت درپردہ اس کے ساتھ کیسا سنگین مذاق کرنے والی ہے......؟

جب جہانگیر مرزا اندجان کے گردونواح میں پہنچا تو اس سے وہی سلوک کیا گیا جو اس نے کچھ دن پہلے
اپنے قابل احترام بھائی بابر کے ساتھ روا رکھا تھا۔ جہانگیر مرزا نے مرغاب پر لشکر کشی کرتے وقت اپنے ایک معتمد
سالار ناصر بیگ کو اندجان کا قلعہ دار مقرر کیا تھا۔ جب ناصر بیگ نے جہانگیر مرزا کے ناکام لوٹنے کی خبر سنی تو
آقا پر قلعے کے دروازے بند کر دیئے اور بلاتاخیر بابر کے پاس اس پیغام کے ساتھ ایک قاصد بھیج دیا کہ

شہنشاہ جب بھی اندجان کا رخ کریں گے تو قلعے کے دروازے کھلے پائیں گے۔

بابر نے ناصر بیگ کی اس پیشکش کو ایک نئی تائید غیبی سمجھا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اندجان کی طرف بڑھ پھر جب وہ قلعے کے قریب پہنچا تو اسے ناصر بیگ کے بیان کی سچائی پر یقین آ گیا۔ واقعتاً قلعے کے درواز کھلے ہوئے تھے اور ناصر بیگ اپنے ایک خصوصی فوجی دستے کے ساتھ بابر کے استقبال کے لئے صدر درواز پر موجود تھا۔ باغیوں نے بابر کے اقبال کے ڈوبے ہوئے سورج کو دوبارہ طلوع ہوتے دیکھا تو راہ فرار اختیار اور پھر جس کا جدھر منہ اٹھا' بھاگ کھڑا ہوا۔ بابر نے ناصر بیگ اور اس کے حامی سپاہیوں پر اپنے لطف و کرم بارش کردی۔

پھر کچھ دن بعد ہی فرغانہ پر بھی بابر کا قبضہ ہوگیا' منافقت اور بغاوت جیسے فتنوں کی بنیاد اخسی کا حاکم اوزا حسن تھا' چنانچہ اس بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے بابر نے اخسی پر فوج کشی کردی۔ اوزن حسن ایک کم ہمت ا عسکری طاقت کے اعتبار سے ایک کمزور حاکم تھا' نتیجتاً وہ محاصرہ کے دوران پیش آنے والی سختیاں برداشت کرسکا اور کچھ دن بعد ہی اماں طلب کر کے قلعے سے نکل گیا۔ اوزن حسن کے حامی سپاہی بابر سے معافی طلبگار ہوئے اور اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کے ساتھ خدمت شاہی میں حاضر ہوگئے۔

بظاہر اوزن حسن کا یہ فتنہ ختم ہو چکا تھا' مگر درپردہ ایک اور سیاسی فتنہ بابر کے انتظار میں تھا۔ باغیوں اپنے اقتدار کے دوران اندجان کے شرفاء اور امراء پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ ایک دن ان ہی امراء میں بعض نے بابر سے عرض کیا۔

''یہ باغی جو آج کل آپ کی بخشی ہوئی امان کے سائے لے رہے ہیں' کل تک اندجان کا کوئی باشندہ ا کے شر سے محفوظ نہیں تھا۔ شہنشاہ کو نہیں معلوم کہ ان ستمگروں نے قلعے پر قابض ہونے اور مولانا قاضی جیسی محتر ہستی کو قتل کرنے کے بعد ان تمام لوگوں کا مال و اسباب لوٹ لیا تھا جو حضور والا کے خیر خواہ اور حامی تھے۔ ا جبکہ آپ نے ان تمام فتنہ گروں کو معاف فرما دیا ہے تو کیا ان پر لازم نہیں ہے کہ یہ لوٹا ہوا سارا مال حقداروں واپس کردیں۔''

بابر نے اپنے امراء کی اس شکایت کو بغور سنا اور پھر فوری طور پر یہ حکم جاری کردیا۔

''جس شخص کو اپنا کوئی مال کسی کے قبضے میں نظر آئے وہ ثبوت فراہم کر کے اسے واپس لے لے۔'' بابر کا حکم مغلوں کے لئے ناقابل قبول تھا ان کی حریصانہ فطرت لوٹا ہوا مال واپس کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ انجام ک باغیوں کے گروہ نے دوبارہ سرکشی اختیار کی اور احمد تنبیل کو ساتھ لے کر جہانگیر مرزا کی رکاب میں چلے گئے' پ کچھ دن بعد یہ اطلاع ملی کہ باغیوں کی جماعت اندجان کو فتح کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

بابر نے اپنے ایک معتمد سالار قاسم قوچین کو ان سرکشوں کے مقابلے کے لئے بھیجا...... مگر جب دونو فریقوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی تو قاسم قوچین شکست کھا گیا۔ اس لڑائی میں بابر کے اکثر امراء اور سرد کام آگئے اور کچھ زخمی ہو کر دشمن کی قید میں چلے گئے' یہ بابر کے دل پر بڑا کاری زخم تھا' مگر نو عمر بادشاہ نے بڑ ہمت سے اس زخم کو برداشت کیا۔

اس فتح کے بعد احمد تنبیل کے ہاتھ بہت زیادہ مضبوط ہوگئے تھے' کامرانی کے نشے سے سرشار ہو کر اس اندجان کی تسخیر پر پوری طاقت صرف کردی' مگر اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ وہ ایک مہینے تک قلعے کا محاص

پڑا رہا' لیکن اس کی ہر کوشش بے نتیجہ ثابت ہو رہی تھی۔ وقت بھی رائیگاں گیا' آدمی بھی ضائع ہوئے اور قلعہ بھی فتح نہیں ہوسکا۔ مجبوراً وہ ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔

کچھ دن بعد احمد تنبیل دوبارہ اندجان کی طرف پلٹا' پھر اس کے اور بابر کے درمیان ایک خوں ریز جنگ ہوئی ...مگر اس جنگ سے بھی کسی فریق کو کوئی فائدہ نہ پہنچا' نہ کوئی غالب تھا اور نہ کوئی مغلوب۔ بس دونوں ا ل سے انسانی جانوں اور وقت کا زیاں ہو رہا تھا۔

ابھی شہنشاہ بابر اور احمد تنبیل کے درمیان معرکہ جاری تھا کہ ایک اور دہشت ناک خبر ملی۔ مخبروں نے خبر دی کہ جہانگیر مرزا کی کمک پر سلطان محمد مرزا نے سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کاشان کا محاصرہ کرلیا ہے۔ اس وقت موسم سرما کی شدت کا یہ عالم تھا کہ آسمان سے بارش کے قطرے بھی برف بن کر برس رہے تھے...... مگر بابر نے موسم کی اس ناسازگاری کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور وہ قلعہ کاشان کی حفاظت کے لئے اپنے جاں نثاروں کے ساتھ آگے بڑھا۔ بالآخر جہانگیر مرزا کی یہ سازش ناکام ہوئی اور سلطان محمد مرزا بھاگ کھڑا ہوا۔

اس معرکے کے بعد علی دوست طغائی اور قنبر علی نے دونوں فریقوں کے درمیان صلح کی بات چھیڑی۔ یہ دونوں بڑے زمانہ ساز لوگ تھے' بظاہر بابر کے خیر خواہ نظر آتے تھے لیکن درپردہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ انہوں نے بابر کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اندجان پر خود بابر قابض رہے اور دریائے خجند سے لے کر اخسی تک کا علاقہ جہانگیر مرزا کو دے دیا جائے۔ اس شرط کے جواب میں بابر نے یہ شرط پیش کی کہ فریق مخالف اپنے عہد و پیمان سے روگردانی نہیں کرے گا۔ بابر کی یہ شرط کسی پس و پیش کے بغیر مان لی گئی۔ اس معاہدے کے بعد جہانگیر مرزا اور احمد تنبیل بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شہنشاہ کو یقین دلایا کہ آئندہ ان کی طرف سے کوئی اختلافی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں دونوں طرف کے جنگی قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔

بابر خوش تھا کہ اس طرح ایک طویل خانہ جنگی کا خاتمہ ہوگیا ہے' مگر یہ اس فراخ دل حکمران کی خوش فہمی تھی' سیاسی ریشہ دوانیوں نے ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا' علی دوست طغائی کو اس کی خدمات کے سبب شہنشاہ کی بارگاہ میں مقرب خاص کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ فطرتاً ایک کم ظرف انسان تھا۔ اعلیٰ منصب پاتے ہی علی دوست طغائی نے بابر کے امراء کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک شروع کردیا۔ نتیجتاً ان معززین نے دربار میں آنا جانا چھوڑ دیا اور اپنے گھروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بابر کے لئے یہ صورتحال ناقابل برداشت تھی' نئے فتنہ و انتشار کے خیال سے بابر نے علی دوست طغائی کو معزول کردیا' مگر اس کی جائیداد و املاک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

دربار بابری سے نکل کر علی دوست طغائی دوبارہ احمد تنبیل سے جا ملا اور پھر جہانگیر مرزا کے حلقہ خاص میں شامل ہو کر نئی شرانگیزی کے بیج بونے لگا...... مگر ابھی وہ اپنی اس فتنہ گری کی فصل کاٹ نہیں پایا تھا کہ ایک دن ایک خدمت گار نے طیش میں آ کر اسے قتل کردیا۔

بابر نے علی دوست طغائی کی موت کی خبر سنی تو اس کے ہونٹوں پر اطمینان و آسودگی کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

☐ ☐ ☐

خانہ جنگی سے نجات پانے کے بعد بابر سمرقند کی طرف متوجہ ہوا' بابر اچھی طرح جانتا تھا کہ اہل سمرقند شیبانی خان اور ازبک قوم کی ماتحتی پر دل سے راضی نہیں ہوں گے۔ یہ سوچ کر بابر نے احمد جمال سے مشورہ کیا۔

''شہنشاہ! میری تو یہی خواہش ہے کہ سمرقند ہمیشہ آپ کے زیر نگیں رہے اور میں جب چاہوں آزادانہ طور پر اس شہر میں داخل ہو جاؤں کہ وہاں میرے والد محترم ''محو خواب ہیں'' میں انہیں ان کی زندگی میں تو نہ دیکھ سکا مگر اب قرار جاں کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ قبر پر حاضری دے کر اپنے ناآسودہ اور پیاسے جذبوں کو سیراب کروں۔''

''تم تو کئی بار شیخ احمد غیاث کی قبر پر جا چکے ہو'' بابر نے احمد جمال کو یاد دلاتے ہوئے کہا'' کچھ دن کے لئے سہی مگر سمرقند بھی ہمارے زیر تصرف رہ چکا ہے۔'' بابر نے حسرت زدہ لہجے میں اپنے ماضی کا ذکر کیا۔

''بس ایک دو بار ہی یہ سعادت میسر آئی تھی'' یکایک احمد جمال کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں'' پھر شہنشاہ بیمار ہو گئے۔ اس عالم میں حضور والا کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ جب آپ کا جشن صحت منایا گیا تو اندجان دشمنوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور مولانا قاضی قتل کئے جا چکے تھے' پھر گردش وقت نے سنبھلنے ہی کہاں دیا؟ میری ماں سارہ بیمار تھیں پتا نہیں' اب ان کا کیا حال ہے؟ سمرقند سے نکلتے وقت ان کی مزاج پرسی بھی نہ کر سکا تھا۔ کاش! انہوں نے میری مجبوریوں کو سمجھ لیا ہو'' یہ کہتے کہتے احمد جمال کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔

''مایوس نہ ہو احمد جمال!'' بابر نے بڑے والہانہ اور دوستانہ انداز میں احمد جمال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ''تم بہت جلد ایک فاتح کی حیثیت سے سمرقند میں داخل ہو گے' مطمئن رہو! تمہاری ماں اب تک صحت یاب ہو چکی ہوگی۔''

''شہنشاہ! میں کبھی اپنی ذات کا ماتم نہیں کرتا'' احمد جمال کے لہجے کی شکستگی بڑھتی جا رہی تھی ''مجھ پر دو لوگوں کے قرض تھے جنہیں میں ادا نہ کر سکا۔ ایک ماں اس بیٹے کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی' جو اسے شدید بیماری کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا' اگر میں اس کی تیمارداری کا قرض نہ اتار سکا تو ساری زندگی ایک مجرم کی طرح کوچہ در کوچہ پھرتا رہوں گا۔ بس یہی احساس راتوں کو سونے نہیں دیتا...... ورنہ اپنی ذاتی زندگی کیا؟ شمشیر و سناں' گھوڑے کی پشت' میدان جنگ' خاک و خون...... اور بس...... نہ کسی سے شکایت نہ کسی سے طمع۔''

عجیب شخص تھا رقص و موسیقی سے بیزار' کیف و سرور سے ناآشنا' ہجوم مہ وشاں سے دور' دشمنوں کو معاف کر دینے والا...... عہد وفا کا پاسدار اور دوستی کا امین......

''مجھے تم پر ناز ہے احمد جمال!'' جوش جذبات سے بابر کی آواز لرز رہی تھی ''میرے بھائی! میری کم گفتاری کو معاف کر دیا کرو کہ اس دربدری کے سفر میں تمہارے سوا میرا کوئی رازدار نہیں' کوئی غمگسار نہیں۔''

⌑ ⌑ ⌑

پھر کچھ دن بابر اپنے منتخب جاں نثاروں کا ایک دستہ لے کر ایک دشوار گزار راستے سے سمرقند کی طرف بڑھا۔ بابر نے اس دشوار گزار راستے کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ وہ دشمنوں کی نظر سے اوجھل رہے اور اس طرح سمرقند پہنچے جیسے موت کسی انسان پر یکایک نازل ہو جاتی ہے۔ اس جنگی حکمت عملی کا سب سے بڑا فائدہ یہ

کہ دشمن اپنی بے خبری کی وجہ سے سنبھلنے نہیں پاتا...... اور جب تک وہ سنبھل کر اپنی صفیں درست کرتا ہے اس وقت تک اس کی نصف طاقت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ بابر نے بہت سوچ سمجھ کر اپنا یہ جنگی منصوبہ ترتیب دیا تھا' مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ آنے والے دنوں کے پیچھے کیسے اندوہناک واقعات چھپے ہوئے ہیں۔

راستے کی ناہمواریوں کا علم رکھتے ہوئے بھی بابر نے اپنے سپاہیوں کو انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سفر جاری رکھنے کا حکم دیا تھا' جس کے نتیجے میں بہت سے گھوڑے اور فوجی ہلاک ہو گئے...... اور سمرقند ابھی دور تھا۔ اس سنگین صورتحال کے پیش نظر ایک سردار نے بابر کو مشورہ دیا کہ شہنشاہ واپس لوٹ چلیں' یہ جانبازی کا نہیں کھلی ہوئی ہلاکت کا سفر ہے۔

اپنے سردار کا یہ بزدلانہ مشورہ سن کر بابر کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا ''تجھے اپنی جان عزیز ہے تو اسی راستے سے لوٹ جا!'' بابر کے ہونٹوں سے آگ برس رہی تھی' اسے آج تک کسی نے اس قدر شدید حالت غضب میں نہیں دیکھا تھا ''تو نے غلط کہا کہ یہ ہلاکت خیزیوں کا سفر ہے' ریشمی بستر پر ایڑیاں رگڑ کر موت کی آرزو کرنے والے غور سے سن لے کہ یہ جاں فروشوں کا سفر ہے اور تو اس سفر میں ہمارا شریک نہیں ہو سکتا۔ اپنے آسائش کدے کی طرف واپس چلا جا' میں سمجھ لوں گا کہ تو راستے کا غبار تھا' تیز ہوا چلی تو بکھر گیا اور دیار غیر میں جا گرا۔'' یہ کہہ کر بابر اپنے دوسرے ساتھیوں سے مخاطب ہوا ''کیا تم لوگ بھی میرے اس سفر کو ہلاکت و بربادی کا سفر سمجھتے ہو......؟''

''شہنشاہ ہمارے دلوں کا حال تو نہیں جانتے' مگر چہرے ہمارے جذبوں کے گواہ ہیں'' کئی سرداروں نے یک زبان کہا ''حضور والا کو ہمارے چہروں پر کون سی تحریر نظر آتی ہے...... فرار کی کوئی علامت یا جاں نثاری کی کوئی نشانی؟''

''میں آج تمہاری زبانوں کو آزاد کرتا ہوں۔'' بابر نے اسی تند و تیز لہجے میں کہا ''کہہ ڈالو جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے۔''

''شہنشاہ! ہم نے زمین و زماں سے اپنے سارے رشتے توڑ دیئے ہیں' سرداروں کے لہجے میں وہی استقامت تھی۔ ''زندہ بچے تو ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے گھروں کو لوٹیں گے اور اگر اس معرکہ بلاخیز میں کام آ گئے تو آپ خود دیکھیں گے کہ ہم نے مرتے وقت نہ اپنی بیویوں کو پکارا اور نہ اپنے بچوں کو آوازیں دیں' بس یہی ہمارا عہد ہے۔''

بابر نے اپنے ساتھیوں کو تعریفی نظروں سے دیکھا' اس کی گردن میں کجی نمایاں ہو گئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے شہنشاہ اپنے سپاہیوں کے عہد جاں فروشی پر غرور کا مظاہرہ کر رہا ہو ''ہاں! تم میرے ہمراہ چل سکتے ہو۔ میں تمہاری شرکت سفر پر آخری سانس تک نازاں رہوں گا۔'' یہ کہہ کر جیسے ہی بابر اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار ہونے کے لئے بڑھا تو وہ سردار یکایک بول اٹھا جس نے شہنشاہ کو واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا۔

''عالی مرتبت! میں اپنی اس اضطراری حرکت پر بے حد نادم ہوں' میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا......''

بابر نے اپنے فوجی سردار کی بات کاٹ دی اور بادل کی طرح گرجنے لگا ''تو اپنا اعتبار کھو چکا' اس لئے واپس لوٹ جا اور میرے کسی دشمن کے حلقہ غلامی میں شامل ہو کر میری ہی پشت پر وار کر۔ میں برسوں یہی کھیل دیکھ رہا ہوں تو بھی اس کھیل میں شریک ہو جا۔''

بابر اس قدر غصے میں تھا کہ کوئی بھی شخص شہنشاہ کے حضور اس معتوب سردار کی سفارش نہ کر سکا' یہاں تک کہ بابر نے اسے ویران جنگل میں تنہا چھوڑ دیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔

راستے میں مزید کئی سپاہی اور گھوڑے موت کی خوراک بن گئے۔

پھر جب بابر قلعہ سمرقند کے قریب پہنچا تو اس کے ساتھ صرف دو سو چالیس جاں نثار رہ گئے تھے۔

☆☆☆

کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بابر اتنے کم مہروں کے ساتھ اپنی زندگی کی سب سے خوفناک بازی کھیلے گا۔ حوادث آشنا اور دوست گزیدہ بادشاہ نے رات کے ابتدائی حصے میں قلعے کی طرف پیش قدمی کی...... اور پھر آخر شب گہری تاریکی میں اس نے انہی جانبازوں کے ساتھ فصیل پر کمندیں ڈال دیں۔ قلعے کے قریب "پل عاشقاں" ایک مشہور جگہ تھی۔ بابر اسی مقام سے فصیل پر چڑھا اور "فیروزہ" دروازے سے قلعے کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے بعد شہنشاہ کے دوسرے جاں نثار بھی آگے پیچھے قلعے میں داخل ہوئے۔

فیروزہ دروازے کا نگہبان قاصد ترخان تھا...... بابر نے آن کی آن میں اسے اور اس کے مسلح ساتھیوں کو قتل کروا دیا۔ ازبک قوم کے بہت سے افراد گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ بابر اور اس کے سپاہیوں نے ازبکوں کا قتل عام شروع کیا تو قلعے میں آہ وزاری کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اسی طوفان میں لوگ اندھوں کی طرح ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھاگنے لگے۔

صبح ہوتے ہی اہل شہر کو بابر کی آمد کی خبر ملی تو وہ مغل شہنشاہ کی حمایت میں پرجوش نعرے لگاتے ہوئے قلعے کی طرف بڑھے اور "ازبکوں" کے قتل عام میں شریک ہوگئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہر سمرقند پر بابر کا قبضہ ہوگیا۔

شیبانی خان کی طرف سے خان وفا کو سمرقند کا قلعہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ جب اسے اس آفت ناگہانی کی اطلاع ملی تو وہ ازبکوں کی ایک جماعت کے ساتھ جان بچا کر قلعے سے نکل گیا اور شیبانی خان کی خدمت میں حاضر ہوا جو سمرقند کے قریب ہی کسی مقام پر خیمہ زن تھا۔ خان وفا کو ذلت و ناکامی کی حالت میں دیکھ کر شیبانی خان غصے سے بے قابو ہوگیا۔ ازبک قوم کے سردار نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے خان وفا کے لباس کو تار تار کر ڈالا اور پھر اس کے منہ پر تھوک کر اسے اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔

شیبانی خان فوری طور پر خان وفا کی شکست کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے سات' آٹھ ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر قلعہ سمرقند کی تسخیر کے لئے شہر کی طرف بڑھا اور محاصرہ کر لیا۔ ابھی اس محاصرے کو کچھ دن ہی گزرے تھے کہ شیبانی خان پر یہ راز فاش ہوگیا کہ اہل شہر کی تمام تر ہمدردیاں بابر کے ساتھ ہیں۔ جب حقائق کے آئینے میں شیبانی خان نے صورتحال کا جائزہ لیا تو اس کو اپنی ساری تگ و دو بے سود نظر آئی۔ نتیجتاً وہ محاصرہ اٹھا کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

شیبانی خان کے جاتے ہی معززین شہر قیمتی نذریں اور تحائف لے کر بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پرشور آوازوں میں مبارکباد دینے لگے۔

"شہنشاہ کو یہ بے مثال فتح مبارک ہو۔ آج تک کسی بادشاہ نے اس قدر نامساعد حالات میں اتنی محدود اور مختصر فوج کے ساتھ کوئی قلعہ فتح نہیں کیا ہوگا۔ رہتی دنیا تک شہنشاہ کے اس تاریخ ساز کارنامے کی گونج سنائی دیتی

رہے گی اور آنے والی نسلیں کہا کریں گی کہ اس زمین پر کیسا مرد شجاع آیا تھا' جس نے صرف اپنی قوت ارادی کے اظہار سے سمرقند کو تسخیر کر لیا۔"

امرائے دربار بھی معززین شہر کی آوازوں میں اپنی آوازیں ملا رہے تھے اور دربار سمرقند میں ایک عجیب سا شور برپا تھا۔

احمد جمال کی نظریں بابر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بہت غور سے دیکھ رہا تھا کہ نوعمر مغل شہنشاہ معززین شہر اور امرائے دربار کی تعریفی کلمات سے بہت زیادہ متاثر ہو چلا ہے۔ بابر کی آنکھوں میں احساس فخر کا نشہ تھا اور چہرے پر ناز و غرور کی علامت روشن تھی۔ اپنے فرمانروا کی بدلی ہوئی روش دیکھ کر احمد جمال کو مختلف اندیشوں نے گھیر لیا تھا' مگر صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر وہ شہنشاہ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکا۔

☆☆☆

سمرقند کی سیاسی فضا صاف ہوتے ہی احمد جمال تمام ضروری کاموں کو پس پشت ڈال کر قلعے سے باہر نکلا اور اپنی ماں سارہ کی خبر گیری کے لئے ان کے مکان پر پہنچا...... وہاں ایک المناک خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سارہ کے اہل خانہ نے احمد جمال کو بتایا کہ اس کی بیماری لحظہ بہ لحظہ بڑھتی رہی اور پھر چار ماہ قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ سارہ کے غیر ذمے دار شوہر پر بیوی کی موت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ البتہ سارہ کے جواں سال بیٹے گریہ وزاری کے ساتھ اپنی ماں کے آخری وقت کی جاں گداز کیفیات بیان کر رہے تھے...... سارہ نے مرنے سے کچھ دیر قبل کہا تھا۔

"اللہ نے مجھ گنہگار کو قناعت پسند دل عطا کیا تھا' جس کے سبب میں نے زندگی بھر دولت کے کسی ذخیرے کی آرزو نہیں کی اور نہ عیش و آسائش میں ڈوبے ہوئے اچھے دنوں کا انتظار کیا...... مگر آج مجھے اپنے بیٹے احمد جمال کا شدید انتظار ہے۔ کاش! وہ کچھ دیر کے لئے آ جائے اور اپنی ماں کو کاندھا دے کر اس دنیا سے رخصت کر دے۔"

دور یتیمی سے لے کر قصر فرغانہ میں داخل ہونے اور پھر بابر کے ساتھ کئی جنگوں میں کارنامے انجام دینے تک' احمد جمال نے اپنے دل پر اتنے زخم کھائے تھے کہ وہ بظاہر ایک پتھر کا انسان ہو کر رہ گیا تھا۔ جس شخص کو عالیہ تاجدار جیسی جاں نثار دوشیزہ کے آنسو متاثر نہ کر سکے تھے وہ اس عورت کے لئے زار و قطار رو رہا تھا جس کی دنیاوی حیثیت ایک خادمہ جیسی تھی۔

"بہت دیر ہوگئی......" روتے روتے احمد جمال کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ "میں نے بہت کوشش کی تھی کہ اپنی ماں کی زندگی میں سمرقند پہنچ جاؤں...... مگر کیسے پہنچتا کہ وقت نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں اور میں ان زنجیروں کو توڑنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا......" احمد جمال انتہائی رقت آمیز لہجے میں اپنی مجبوریاں بیان کرتا رہا۔

"جھونپڑیوں سے نکل کر محلوں میں جانے کے بعد سب یہی کرتے ہیں......" سارہ کے نکمے شوہر نے احمد جمال کے دل پر نشتر زنی کی...... "وہ نادان عورت تمہاری محبت میں اپنا سب کچھ ہار گئی۔ اس نے تمہاری خاطر اپنے دل کو روگ لگا لیا اور پھر قبر میں اتر گئی۔ تمہارے لئے اپنی حقیقی اولاد کو بھی نظر انداز کر دیا' مگر تم نے اسے کیا

دیا؟ غربت کی زندگی اور انتظار کا غم...... کیا بیٹے ایسے ہوتے ہیں کہ قصر شاہی میں گئے تو ماں کو ہی بھلا دیا؟ کر بھی نہیں دیکھا کہ اس بے چاری پر کیا گزر رہی ہے؟''

سارہ کے عیار شوہر کی باتوں نے احمد جمال کے دل کا کام تمام کردیا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑ۔ خون جل اٹھا' مگر پھر بھی اس نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیا۔ وہ سارہ کے خود غرض اور احسان فراموش سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اس نے دولت کے اس انبار کا کیا کیا جو اسے عمر شیخ مرزا نے بخشا تھا۔ گھ درودیوار کی شکستہ حالت بتا رہی تھی کہ سارہ کے شوہر نے وہ ساری رقم بھی اپنی بدمستیوں کی نذر کردی ہوگی. کے علاوہ سارہ کے بیٹوں کے لباسوں سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ احمد کے ذہن میں کئی سوال آتش فشاں کے لاوے کی طرح دہک رہے تھے' مگر سارہ سے ایک پاکیزہ اور نازک، کے احترام میں اس نے اپنے ہونٹوں کو جنبش تک نہ دی۔ وہ خاموشی سے اس بدکار انسان کی طعنہ زنی سنتار جب قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ سارہ کے ایک بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

''ایسے ہی ہوتے ہیں احسان فراموش لوگ۔'' دور تک سارہ کے شوہر کی آواز احمد جمال کا تعاقب رہی' مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانئے گا۔'' سارہ کے بیٹے نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کثرت شر نوشی نے ان کا دماغ خراب کردیا ہے۔ ہم آخری سانس تک آپ کے شکر گزار رہیں گے کہ اللہ نے ہمیں کی بدولت خوشحالی کا ایک سنہری موقع عطا کیا تھا' جسے ہمارے باپ نے گنوا دیا۔ ہم تعلیم حاصل کر سکے اور نہ ہنر سیکھ سکے۔ محنت و مزدوری ہمارا مقدر تھی۔ سو اسی کے مطابق زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ آخر باپ ہیں' ان کی زبان پر بندش بھی تو نہیں لگائی جا سکتی۔ بہت بوڑھے ہیں' انہیں چھوڑ کر کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔'' کہتے کہتے سارہ کا بیٹا آب دیدہ ہوگیا تھا اور شدت جذبات سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''سمرقند کے لوگو نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ کے والد بہت بڑے انسان تھے...... ہمارے ماں باپ پر ان کے بے شمار احسانات تھے۔ آپ خود بھی بہت بڑے انسان ہیں' آپ میں بہت حوصلہ ہے' بہت طاقت ہے' خدا کے لئے انہیں معاف کردیجئے کہ وہ بہت کمزور انسان ہیں۔''

احمد جمال نے سارہ کے بیٹے کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور بڑے والہانہ انداز میں ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... ''تم بہت لائق و سعید بیٹے ہو' مجھے تمہارے باپ سے کوئی شکایت نہیں ہے...... خدا ان پر رحم کرے۔''

احمد جمال راستے بھر سارہ کے شریف النفس بیٹے کے متعلق سوچتا رہا' جس نے اندھیرے میں پرورش پائی تھی' مگر پھر بھی اس کی اپنی ذات میں ایک سورج روشن تھا۔ آخر راستہ تمام ہوا اور احمد جمال اس قبرستان میں پہنچا جہاں سارہ کئی ماہ پہلے آسودہ خاک ہوچکی تھی۔

احمد جمال بہت دیر تک بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سارہ کی نجات و مغفرت کی دعائیں کرتا رہا۔

⌑ ⌑ ⌑

بابر نے احمد جمال کی زبانی سارہ کی موت کی خبر سنی تو وہ بھی اداس ہوگیا...... ''گردش وقت کو کیا کہیں کہ

...ی نہیں دیتی...... کیسے کیسے نازک اور حساس رشتے تھے' جو ٹوٹ گئے اور کیسے کیسے یاران وفا شعار تھے جو ...ا ہوس کی دوڑ میں چھوٹ گئے؟ کسے یاد کریں احمد جمال اور کسے فراموش کردیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجھے ...اس کا نہایت قلق ہے کہ تم میری وجہ سے اس عورت کی خبر گیری نہ کرسکے جو تم پر ماں کی طرح مہربان تھی۔'' ...ے لہجے سے گہری افسردگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''شہنشاہ! وقت کی رفتار کو پیچھے کی طرف تو نہیں لوٹایا جا سکتا' مگر پھر بھی......'' احمد جمال نے اپنی بات ...ی چھوڑ دی تھی۔

...ابر نے چونک کر احمد جمال کی طرف دیکھا۔ ''آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ اپنی بات مکمل کرو۔''

''شہنشاہ! یہ کوئی تاجرانہ گفتگو نہیں ہے۔ خدا کے لئے میری زبان سے ادا ہونے والے کسی لفظ کا غلط مفہوم ...ہ لیجئے گا۔'' احمد جمال رک رک کر بول رہا تھا۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے سلطنت فرغانہ کی کوئی ...ت انجام دی ہے تو مجھے اس کا صلہ عنایت کر دیجئے۔''

...ابر کچھ دیر تک شدید حیرت کے عالم میں احمد جمال کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا' جہاں اس وقت ...وں کے غبار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ''جہاں تک تمہاری خدمات کا تعلق ہے تو میں نے کبھی انہیں شمار کرنے کی ...ورت محسوس نہیں کی۔ بس میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ ایک ایسا دوست کہ جس نے کبھی میرے اعتماد کو ...وح نہیں کیا اور جو آفات و مصائب کی یلغار کے وقت ہمیشہ اسی طرح میرے آگے آگے رہا کہ دشمنوں کے ...ے نیزے اور تیر اسی دوست کے سینے کی طرف آئے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسے دوست کی خدمات کا کتنا ...اوضہ ہوسکتا ہے...... اور کیا معاوضے کا لفظ اس بے لوث جذبے کی توہین نہیں؟''

احمد جمال نے بابر کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مغل شہنشاہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ...ا کی آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا تھا...... احمد جمال کی یہی کیفیت ظاہر کر رہی تھی کہ اس کے سینے میں کوئی ...الان اٹھ رہا ہے۔

''احمد جمال! میں نے تمہیں الفاظ کے کھلونوں سے بہلانے کی کوشش نہیں کی ہے۔'' بابر کے لہجے میں محبت ...ر سچائی کی وہی خوشبو تھی' جسے ایک عام شخص بھی آسانی سے محسوس کرسکتا تھا۔ ''میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب ...مہارا ہے' جتنا چاہو لے لو' مگر میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آخر ایسی کون سی ضرورت آپڑی ہے جس نے تمہارے ...ہجے میں درخواست کا رنگ پیدا کردیا ہے۔ میں نے کبھی تمہیں اپنی ذات کے لئے التجا کرتے ہوئے نہیں دیکھا' ...ھر یہ تبدیلی کس لئے؟''

احمد جمال کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں...... ''شہنشاہ! میری ضرورتیں ...ی کیا؟ بس دو وقت کی روٹی...... ایک لباس...... ایک شمشیر اور ایک گھوڑا......'' اس کی آواز میں بڑی رقت تھی۔ ...میں نے اپنے لئے شہنشاہ سے کچھ نہیں مانگا' مگر مجھ سے اس گھر کی بے سروسامانی نہیں دیکھی جاتی جہاں میرا ...تیم و اسیر بچپن گزرا ہے۔ شہنشاہ جو کچھ مجھے دینا چاہتے ہیں وہ میرے ان بھائیوں کو بخش دیں جو بڑی عسرت کی ...ندگی بسر کر رہے ہیں۔'' احمد جمال کا اشارہ سارہ کے ان لائق بیٹوں کی طرف تھا جو برسوں سے اپنے نکمے باپ ...کو نہ صرف برداشت کر رہے تھے بلکہ اسی ایک شخص کی وجہ سے وہ تباہی کی اس حالت تک پہنچے تھے۔

بابر نے جوش جذبات میں احمد جمال کے دونوں بازو پکڑ لئے اور انہیں سپاہیانہ انداز میں دباتے ہوئے

کہا...... ''میں جانتا تھا کہ میرا لائق احترام بھائی اپنے نفس کے تقاضوں سے کبھی مغلوب نہیں ہوگا...... خدا
کے دل و دماغ کو ہمیشہ اسی طرح روشن رکھے ورنہ سمرقند سے فرغانہ تک بہت اندھیرا ہے۔''

اس کے بعد بابر نے بلاتاخیر سارہ کے بیٹوں کو سمرقند کے محل میں طلب کیا اور پھر انہیں قیمتی خلعتوں
ساتھ کثیر نقد رقم بھی دی اور کئی دیہاتوں کی جاگیر کا پروانہ بھی لکھ کر دے دیا۔

احمد جمال کے ذہن سے ایک بار گراں اتر گیا تھا اور وہ یہ سوچ کر کسی قدر پرسکون نظر آنے لگا تھا کہ
اس نے سارہ کی بیماری کے دوران اپنی غیر حاضری کا ازالہ کر دیا ہو۔ وہ پابندی سے اپنے باپ شیخ احمد غیاث
اپنی حقیقی ماں کی قبروں پر حاضر ہوتا اور گھنٹوں گریہ وزاری کے ساتھ ان کی بخشش ونجات کے لئے دعائیں
رہتا۔ پھر جب قبرستان سے واپس ہونے لگتا تو شیخ احمد غیاث کو اس طرح مخاطب کر کے کہتا' جیسے وہ زندہ حال
میں ہوں اور اس کی بات سن رہے ہوں۔

''بابا! میرا کہیں جی نہیں لگتا...... آپ کے دوست سید مہدیؒ نے میرے پیروں میں لفظوں کی زنجیر ڈال
اور ہاتھوں میں فولاد کی شمشیر دے دی۔ جس دن پیروں کی یہ زنجیریں کٹ جائیں گی اور شمشیر کا قرض
ہو جائے گا' میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آپ کے پاس واپس آؤں گا اور اس مدرسے کی تعمیر کروں گا' جسے
کے پرستاروں نے اپنے تیشہ اقتدار سے مسمار کر ڈالا۔''

⌑ ⌑ ⌑

اگرچہ سمرقند کے تمام امراء نے بابر کی حکمرانی کو تسلیم کرتے ہوئے نوعمر مغل شہنشاہ کی ملازمت اختیار کر
تھی اور تمام سیاسی مشیر بہ آواز بلند کہہ رہے تھے کہ اب بادشاہ کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں...... لیکن بابر ہر طرا
سکون و امن ہوتے ہوئے بھی اس صورتحال سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ اپنے مشیران سیاست کی قیاس آرائیوں
جواب میں ایک ہی بات کہتا۔

''میں نے شیبانی خان کے قول وقسم کا نہیں' اس کی آنکھوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس کی آنکھوں م
حصول اقتدار کے سوا کسی دوسرے جذبے کا عکس موجود نہیں۔ اگر اسے خاندانی رشتوں کا ذرا بھی لحاظ ہوتا تو
سیاست کی نیلام گاہ میں اس بے رحمی کے ساتھ میری مجبوریوں کی بولی نہ لگاتا۔ وہ صرف تاج وتخت کا سوداگر
اور میں ایسے تاجروں کی کسی روش کو قابل اعتبار نہیں سمجھتا۔'' بابر نوعمری کے باوجود ایسی ذہانت کی باتیں کرتا
سمرقند کے بڑے بڑے دانشمند حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگتے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ شیبانی خان سے متعلق بابر کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے۔ مغل شہنشاہ کے
جاسوسوں نے خبر دی کہ شیبانی خان نئی فوجی طاقت حاصل کرنے کے لئے مسلسل دوڑ دھوپ کر رہا ہے اور اس
ابھی تک اپنی شکست کو فراموش نہیں کیا ہے۔ آثار وقرائن بتا رہے ہیں کہ وہ عنقریب سمرقند پر حملہ کرے گا اور
سے اپنی ذلت و رسوائی کا شدید انتقام لے گا۔

اپنے جاسوسوں کی فراہم کردہ اطلاعات سن کر مسکرانے لگا۔ ''تم نے درست کہا۔ شیبانی خان ایسا ہی
خودغرض اور کینہ پرور انسان ہے۔''

شیبانی خان رشتے میں بابر کا حقیقی خالو تھا' اس نے چند سال پہلے قتلغ خانم کی چھوٹی بہن سے شادی کی تھ

اب اس رشتے کی نزاکت کو بھول کر بابر کے اقتدار کے درپے تھا۔ شیبانی خان کا خیال تھا کہ خونریز معرکے
پندرہ سولہ سالہ لڑکے کو تھکا کر ہمیشہ کے لئے سیاست کے افق سے غائب کر دیں گے...... مگر اسے یہ اندازہ
تھا کہ اس کا حریف جوانمردوں سے زیادہ سخت جان ہے اور جسے مسلسل حادثات نے بوڑھوں سے زیادہ
زیرکار بنا دیا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ بابر ایک لمحے کے لئے بھی شیبانی خان کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا
کہ اگر شیبانی خان کو بہت جلد ماوراء النہر سے بے دخل نہ کیا گیا تو اسے اپنے سیاسی مقاصد حاصل نہ ہو سکیں گے۔
لئے بابر اپنے منتشر لشکر کو تیزی سے جمع کرنے لگا...... اور پھر جب اطراف کی امدادی فوجیں بھی سمرقند میں
ہو گئیں تو بابر شیبانی خان سے مقابلے کے لئے قلعے سے باہر نکلا۔

شیبانی خان بھی بابر کی فوجی تیاریوں سے بے خبر نہیں تھا۔ نتیجتاً وہ بھی موسم سرما کے اوائل میں اپنے جنگجو لشکر
لے کر سمرقند کی تسخیر کے لئے آگے بڑھا...... اور پھر بہت تیز رفتاری کے ساتھ شہر کے نواح میں پہنچ گیا۔

بابر نے بڑی حقارت سے شیبانی خان کے لشکر جرار کو دیکھا...... اسے قلت سپاہ کے باوجود اپنے جاں
اروں کی شجاعت واستقامت پر غرور کی حد تک اعتماد تھا...... اور پھر یہی اعتماد نوعمر مغل شہنشاہ کو لے ڈوبا۔

جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو بابر کی امدادی فوجیں ثابت قدم نہ رہ سکیں اور معمولی سی مزاحمت کے بعد ہی
دان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ مفرور سپاہیوں کے اس بزدلانہ عمل نے بابر کی صفوں میں بڑے گہرے
ال ڈال دیئے تھے۔ مغل شہنشاہ چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ فتح ہمارا مقدر ہے۔ بس چند لمحوں کے لئے ٹھہر جاؤ کہ ہم
ن کی آخری صف تک پہنچنے ہی والے ہیں...... مگر کسی ایک سپاہی نے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ
وہ سب کے سب کرائے کے فوجی ہیں...... اور کرائے کے فوجی میدان جنگ میں داخل ہی اس لئے ہوتے
ہیں کہ آزمائش کے وقت پشت دکھا دیں اور اپنی جانیں بچانے کے لئے فرار ہو جائیں۔

امدادی فوجوں کے فرار نے مغل لشکر پر بہت برا اثر ڈالا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ مغل امراء ایک دوسرے پر اپنی
تری ثابت کرنے کے لئے آپس میں الجھ پڑے۔ بعض سرداروں نے زمانہ سازی سے کام لیا اور شیبانی خان کا
بھاری دیکھ کر اس امید پر دشمنوں کے سائے میں پناہ حاصل کر لی کہ ان کی جانیں بھی محفوظ رہیں گی اور ازبک
مران انہیں انعام واکرام سے بھی نوازے گا۔

یہ بڑے شدید اور جان لیوا لمحات تھے۔ بابر بڑی حسرت زدہ نظروں سے غداری اور عیاری کے یہ شرمناک
منظر دیکھتا رہا۔ فرار ہونے والے اپنے عہد توڑ کر فرار ہوتے رہے اور چند جانثار اپنے خون سے زمین پر وفا کا نیا
عہد نامہ تحریر کرتے رہے...... مگر بابر کو اس عہد نامے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ کبھی وہ شیبانی خان کے پیش قدمی
کرتے ہوئے لشکر کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنے ان جاں نثاروں کی کربناک چیخیں سنتا جو اسے آخری سلام پیش
کر رہے تھے۔

''اے ہمارے حوصلہ مند شہنشاہ الوداع...... اے ہمارے جانباز فرماں روا الفراق۔''

اپنے جانثاروں کی مثالی قربانیوں کو خاک میں ملتے دیکھ کر بابر کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ شکست اپنا خونی دہن
کھولے بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بابر نے گھبرا کر اپنے باقی ماندہ جانثاروں پر نظر ڈالی' وہ تعداد
میں پندرہ سولہ سے زیادہ نہ تھے۔ اس خونریز معرکے میں بابر کے سات امرائے خاص تہہ تیغ ہوئے اور سپاہیوں

کی ایک بہت بڑی تعداد لقمہ اجل بن گئی۔ میدان میں ہر طرف مغل فوجیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور سینکڑوں سپاہی شدید زخمی حالت میں اس طرح زمین پر پڑے تھے کہ ان کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ تک ٹپکانے والا کوئی نہ تھا۔ مجبوراً بابر اپنے پندرہ سولہ جاں نثاروں کے ساتھ قلعے کی طرف پلٹا۔ اگرچہ شیبانی خان کے مقابلے میں مغل شہنشاہ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا' لیکن پھر بھی وہ قلعے میں محصور ہو کر اپنی بقا کی آخری جنگ لڑنا چاہتا تھا۔

¤ ¤ ¤

شیبانی خان بڑی احتیاط سے آہستہ روی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اس دوران اس نے قلعہ شکنی کا ساز و سامان حاصل کیا اور پھر آگے بڑھ کر قلعہ سمرقند کا محاصرہ کر لیا۔ شیبانی خان جانتا تھا کہ بابر کی فوجی طاقت مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے۔ اس لئے ازبک حکمران نے فصیل پر کمندیں ڈال کر قلعے میں داخل ہونے سے گریز کیا۔ اب اس کی نئی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ رسد کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں۔ وہ اپنے حریف کو بھوک کے ہتھیار سے قتل کرنا چاہتا تھا' اپنے اسی منصوبے کے تحت شیبانی خان نے مکمل طور پر سمرقند کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اب ایسا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا کہ جس سے بابر کو کوئی بیرونی امداد یا غذائی رسد پہنچ سکے۔

قلعے کے محاصرے کو چار ماہ گزر گئے۔ اس دوران بابر اور اس کے سپاہیوں نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا۔ قلعے کے سارے مکیں ایک وقت آدھے پیٹ روٹی کھا کر اس امید پر زندگی کے دن گزار رہے تھے کہ شاید مہربان کی طرف سے فوجی کمک آ پہنچے اور انہیں شیبانی خان کے بدترین محاصرے سے نجات مل سکے۔

اس دوران بابر نے اپنے قاصدوں کو رات کی تاریکی میں خفیہ راستوں سے خراسان' قندز اور مغولستان کے حکمرانوں کے نام خطوط دے کر بھیجا۔ وہ تمام قاصد اپنی جانوں پر کھیل کر مذکورہ حکمرانوں تک پہنچ بھی گئے۔ گردش وقت کے سبب کسی فرمانروا نے بابر کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی۔

والیٔ خراسان نے بابر کے خط کے جواب میں لکھا۔ ''دوسروں کے جھگڑوں میں خود کو الجھا لینا ہماری روایت نہیں ہے۔''

''قندز کے حکمران نے بابر کی درخواست سے بڑا بے رحمانہ سلوک کرتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کئے کہ جنگ و جدل کا بیج بھی تم نے تنہا بویا ہے اس لئے اس کی فصل بھی تم اکیلے ہی کاٹو گے۔''

مغولستان کے فرمانروا نے سیاست سے کام لیتے ہوئے نیا عذر تراشا تھا۔ ''ساری دنیا جانتی ہے کہ شیبانی خان ایک خونخوار بھیڑیا ہے' اس لئے ہم تمہاری خاطر اس کی دشمنی نہیں خرید سکتے۔ یقیناً تم ہماری مجبوریوں کو کی کوشش کرو گے۔''

کشمکش انتظار میں بابر نے چار ماہ کا طویل صبر آزما وقت گزارا تھا۔ پھر یہ انتظار ختم ہوا تو کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے گہری دھند چھا گئی اور چہرے کا رنگ اتر گیا۔ پھر یکایک وہ سنبھلا اور اس نے خراسان قندز اور مغولستان کے حکمرانوں کے خطوط جلتی ہوئی شمع کی لو پر رکھ دیئے۔ ناگہاں ایک شعلہ بھڑکا اور دیکھتے ہی دیکھتے تین خودمختار فرمانرواؤں کی تحریریں جل کر راکھ ہو گئیں۔ بابر نے انتہائی ا مسکراہٹ کے ساتھ ان کاغذوں کو جلتے ہوئے دیکھا' پھر ایک تیز پھونک سے راکھ کے اس مختصر سے

منتشر کرتے ہوئے کہا۔

''ان خطوں کی طرح تمہارے رشتے بھی مصلحت کی آگ میں جل گئے۔ کاغذوں کی راکھ تو قلعہ کی فضا میں منتشر ہونے کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی اور اس منظر کو چند آنکھوں کے سوا کوئی محفوظ نہیں رکھ سکے گا..... مگر تمہاری دوستی کی خاک حشر تک ہوا میں اڑتی پھرے گی' جسے دیکھ کر آنے والی نسلیں کہا کریں گی کہ تم کیسے نامعتبر لوگ تھے۔''

بابر انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا' مگر اس کے لہجے کا کرب اور دل کی سوزش کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اپنے شہنشاہ کی یہ بے چارگی دیکھ کر احمد جمال رو پڑا۔

''تم کیوں روتے ہو احمد؟ ابھی تو تمہارا شہنشاہ زندہ ہے۔'' اگرچہ ایسی جاں گداز ساعتوں میں خود بابر کو اپنے رفیقوں کے تسکین آمیز کلمات کی ضرورت تھی لیکن وہ خود ایک شکستہ جاں نثار کو تسلیاں دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''بہت ممکن ہے کہ اگلا لمحہ بہت بری خبر لائے اور تمہارا شہنشاہ زنجیریں پہننے پر مجبور ہو جائے' مگر یاد رکھنا کہ میرا دل اور میرے ارادے شیبانی خان کی غلامی پر رضامند نہیں ہوں گے۔''

¤ ¤ ¤

پھر واقعتاً وہ لمحات قریب تر آ گئے جب شہنشاہ بابر اور قلعہ سمرقند کے مکینوں کو فضا میں ہر طرف بیڑیاں ہی بیڑیاں اور طوق ہی طوق نظر آنے لگے۔ ایک ایک کر کے غذا کے سارے ذخیرے خالی ہو چکے تھے۔ خاص طور پر گھوڑوں کی گھاس اور دانہ جو پہلے ہی قلعے میں بہت کم تھا بالکل ہی ختم ہو گیا...... اور ایسی تنگی ہوئی کہ زعفران کے ڈھیر کے بدلے میں گھاس کا ایک تنکا ملنا بھی محال ہو گیا۔ بابر کے باقی ماندہ سپاہی اور قلعے کے دوسرے مکین روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو محتاج ہو گئے۔ بڑا عجیب وقت تھا۔ مغل لشکری گھوڑے ذبح کر کے کھانے لگے۔ شکم کی آگ اتنی شدید تھی کہ اسے بجھانے کے لئے حلال و حرام کی تمیز تک اٹھ گئی تھی۔

اس حالت جبر میں بابر نے اہل قلعہ کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''اب میرے سامنے دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں کہ میں ہتھیار پھینک دوں اور ایک مفتوح کی حیثیت سے شیبانی خان کے روبرو حاضر ہو کر تمہاری غلامانہ زندگی کے لئے ہاتھ پھیلا دوں...... اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم سب خودکشی کر کے شیبانی خان کے تسلط سے نجات حاصل کر لیں۔''

یہ کہہ کر بابر نے اپنے مخاطبین کی طرف دیکھا۔ قلعے کے تمام مکین مجسموں کی طرح ایستادہ تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی روحیں پرواز کر چکی ہیں اور جسم قلعہ سمرقند میں پتھروں کی طرح کھڑے رہ گئے ہیں۔

''مگر ایک بات سن لو کہ میں خودکشی نہیں کروں گا۔ میرا مذہب مجھے اس فعل کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر اسلام میں خودکشی جائز ہوتی تو یقیناً شیبانی خان کو میری لاش کے سوا کچھ نہ ملتا۔'' بابر انتہائی پرجوش لہجے میں اہل قلعہ سے مخاطب تھا۔ اب اس کے چہرے پر نہ خوف و ہراس کی کوئی جھلک تھی اور نہ احساس ندامت کا کوئی عکس۔

''جب تک قدرت کے حساب داں نے میری سانسیں شمار نہیں کی ہیں میں اس وقت تک جذبوں کی تڑپ اور احساس کی توانائی کے ساتھ زندہ رہوں گا اور اپنے دشمنوں سے جنگ جاری رکھوں گا۔ تم سب اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم لوگ ہلاکت میں پڑ جاؤ اور پھر دربدر کہتے پھرو کہ بابر نے ہمیں اس

انجام تک پہنچا دیا۔ ابھی وقت ہے اگر تم کہو تو میں شیبانی خان سے تمہارے لئے امان طلب کرلوں اور اپنے اس چہرے کو اہل سمرقند کی نظروں سے گم کردوں' جس پر شکست کی سیاہی ملی ہوئی ہے۔''

بابر کا خیال تھا کہ رسماً ہی سہی' کچھ لوگ اس کے ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیمان ضرور کریں گے..... مگر چند سپاہیوں کو چھوڑ کر تمام اہل قلعہ کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ صرف زندگی چاہتے ہیں۔ ایسی زندگی جو آزادی سے مشروط ہو یا غلامی کی لعنت سے وابستہ ہو۔ انہیں ہر حال میں جینا تھا۔

اس کے بعد بابر نے اہل قلعہ سے کوئی سوال نہیں کیا اور فوراً ہی اپنے ایک قاصد کو صلح کا پیغام دے کر شیبانی خان کے لشکر کی طرف روانہ کردیا۔

¤¤¤

بابر نے شیبانی خان کو ایک مختصر خط کے ذریعے مطلع کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''تقدیر نے جنگ کا فیصلہ تیرے حق میں کردیا اور میں یہ بازی ہار چکا۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں آج ہی اپنے ہمنواؤں کو لے کر سمرقند کی سرحدوں سے بہت دور چلا جاؤں۔''

شیبانی خان نے بابر کا خط پڑھ کر ایک طویل اور فلک شگاف قہقہہ لگایا' پھر جب اس خونخوار قہقہے کی گونج ختم ہوئی تو اس نے بڑی حقارت سے بابر کے قاصد کی طرف دیکھا اور انتہائی متکبرانہ انداز میں مغل شہنشاہ کے خط کا جواب تحریر کرنے لگا۔ شیبانی خان کے غرور و غضب کا یہ حال تھا کہ چند الفاظ لکھنے کے دوران کئی بار اس کا قلم ٹوٹا اور اس نے ہر مرتبہ خدمت گار سے نیا قلم طلب کرکے اپنا خط مکمل کیا۔ بابر کی طرح شیبانی خان کا خط بھی چند سطروں پر مشتمل تھا۔

''دنیا کا کوئی مفتوح اس قابل نہیں رہتا کہ وہ فاتح کے سامنے اپنی شرائط پیش کرسکے۔ اس لئے تجھ پر لازم ہے کہ پہلے قلعے کے دروازے کھول دے' پھر ہم دیکھیں گے کہ تیری درخواست سماعت کے لائق ہے یا نہیں؟''

بابر نے شیبانی خان کا خط پڑھا جو قہر و تکبر کے قلم سے لکھا گیا تھا اور جس میں نفرت و حقارت کی تیز رنگ روشنائی استعمال کی گئی تھی۔ احساس ندامت سے بابر کا سرخ و سفید چہرہ مسخ ہوگیا۔ پھر اس نے بڑے شکستہ لہجے میں قلعے کے تمام دروازے کھول دینے کا حکم جاری کردیا۔

¤¤¤

شیبانی خان ایک پست فطرت انسان تھا۔ ازبک قوم کے کم ظرف حکمران نے بابر کے ساتھ اس کے شایان شان سلوک نہیں کیا۔ شیبانی خان ہر قدم پر بابر کو ذلیل کر رہا تھا۔ مغل شہنشاہ کا خیال تھا کہ سارے معاملات ایک بند کمرے میں طے پا جائیں گے..... مگر شیبانی خان نے قلعے کے وسیع و عریض میدان میں تمام جنگی اسیروں کو جمع کیا اور انتہائی ذلت آمیز لہجے میں بابر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''میں اس پر قادر ہوں کہ تجھے اور تیرے ساتھیوں کو پابہ زنجیر کرکے سمرقند کی شاہراہوں پر کھنچواؤں..... یا پس دیوار زنداں ڈال دوں یا تم سب کو تہ تیغ کرکے تمہاری لاشیں چوراہوں پر لٹکا دوں..... مگر.....''

''شیبانی خان!'' ازبک فرمانروا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بابر چیخ اٹھا۔ ''ہاں! تو اس وقت ہر بات

پر قادر ہے مگر میرے پاس تیری لاف زنی سننے کے لئے وقت نہیں ہے۔ اس لئے ہماری تقدیروں کے فیصلے میں عجلت سے کام لے۔'' اسیر ہوتے ہوئے بھی بابر اپنے تیوروں سے مکمل طور پر ایک مرد آزاد نظر آ رہا تھا۔

چند لمحوں تک شیبانی خان کا مکروہ قہقہہ گونجتا رہا۔ پھر وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا جیسے کوئی اژدھا سانسیں لے رہا ہو۔ ''نادان لڑکے! تو نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔'' شیبانی خان حکمرانوں کے آئین گفتگو کو نظر انداز کرکے بے ہودگی پر اتر آیا تھا۔ ''میں تمام تر قدرت رکھنے کے باوجود نہ تجھے زنجیریں پہناؤں گا اور نہ قتل کروں گا۔'' شیبانی خان رک رک کر اور لفظوں کو چبا چبا کر بول رہا تھا۔ اس کے اس طرز عمل سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ بابر کی بے چارگی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ ''میں کچھ دیر میں تجھے قلعے سے باہر نکلنے کی اجازت دے دوں گا۔ یہی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی کہ تو در بدر بھٹکتا رہے اور تجھ پر دنیا کا ہر لمحہ زمین تنگ ہوجائے۔ اپنے ارمانوں کی لاش اٹھائے ہوئے تو جدھر سے بھی گزرے تو دیکھنے والے بے ساختہ پکار اٹھیں کہ وہ جا رہا ہے خود ساختہ شہنشاہ بابر' جسے شہنشاہوں کے شہنشاہ شیبانی خان نے یہ لعنت زدہ زندگی بخشی ہے۔''

بابر اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ وہ شیبانی خان کی اس متکبرانہ گفتگو کا جواب دے بھی نہیں سکتا تھا۔

''مگر قلعے سے باہر جانے کے لئے بھی میری ایک خاص شرط ہے۔'' شیبانی خان نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے ہر حال میں اس شرط کی تکمیل کرنی ہوگی ورنہ میرا دل تیری طرف سے تنگ ہوجائے گا۔''

''اپنی شرط بیان کر!'' بابر نے اونچی آواز میں کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ تیری چھوٹی بہن بہت خوبصورت ہے اور میں خوبصورت چیزوں کا اس دنیا میں سب سے بڑا قدرداں ہوں'' شیبانی خان ایک بدکار اور عیاش حکمران کے لہجے میں بول رہا تھا۔

''اپنی زبان پر قابو رکھ شیبانی خان!''

شدت کرب سے بابر ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ وہ اس غلیظ ترین گالی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

''وہ رشتے کے اعتبار سے تیری بیٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔''

''میں اس سے شادی کروں گا اور یہ میرا تجھ پر دوسرا احسان ہوگا۔'' شیبانی خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''فتح کا نشہ خواہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو مگر انسان کو اپنے قدموں کا توازن برقرار رکھنا چاہئے۔'' شیبانی خان کے خونی ہاتھوں سے اپنی چھوٹی بہن کے دامن آبرو کو بچانے کے لئے بابر نے جبراً اپنے لہجے کو نرم کرلیا تھا۔ ''تو رشتوں کی کتاب کو تو پارہ پارہ کر ہی چکا اب آئین خداوندی کے ساتھ بھی یہ سنگین مذاق کر رہا ہے۔'' بابر نے کھلے لفظوں میں شیبانی خان کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی مسلمان مرد حقیقی خالہ سے رشتہ ازدواج قائم ہونے کی صورت میں اس عورت کی حقیقی بھانجی سے نکاح نہیں کرسکتا..... اور بابر کی چھوٹی بہن خانزادہ بیگم شیبانی خان کی بیوی کی حقیقی بھانجی تھی۔

بابر نے اسی شرعی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیبانی خان کو اس کے خوفناک ارادوں سے باز رکھنا چاہتا تھا' مگر وہ نہایت عیار اور سفاک انسان تھا۔ ایک ہی لمحے میں بابر کی بات کا مفہوم سمجھ گیا اور لہجہ بدل کر بولا۔

''میں تجھ سے بہتر انداز میں آئین خداوندی کو سمجھتا ہوں۔'' شیبانی خان کے ہونٹوں پر بڑی جا
مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''میں تیری خالہ کو طلاق دے دوں گا۔ پھر میرے اور خانہ زاد بیگم کے درمیان کوئی مذہبی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔''

بابر نے بہت کوشش کی کہ شیبانی خان کسی طرح اپنے اس ارادے سے باز آ جائے مگر ازبک حکمران خانہ زاد بیگم سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ پھر اس سلسلے میں گفتگو طویل ہوئی تو ایسے کئی مواقع آئے جب بابر کے لہجے نے گداگری کا رنگ اختیار کرلیا تھا..... مگر شیبانی خان پر مغل شہنشاہ کی التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک نئی شرط عائد کرتے ہوئے کہا۔

''تجھے یہ شرط قبول ہو یا نہ ہو مگر خانہ زاد بیگم تو میری شریک حیات بن چکی' بس ایک رسم باقی ہے جو آج کل میں ادا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ تیری محل سرا کی تمام خواتین بھی قلعہ سمرقند میں میری مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی پابند ہوں گی اور تیری ساری کنیزیں میری ملکیت ہوں گی' جن پر مجھے مکمل اختیار حاصل ہوگا۔''

بابر زندگی کی اس بازی میں اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ پھر وہ شیبانی خان سے اجازت لے کر محل کے اس وسیع و عریض کمرے میں پہنچا جہاں قتلغ خانم' خانہ زاد بیگم' عالیہ تاجدار اور دوسری مغل شہزادیاں جمع تھیں۔ بابر کے ہمراہ احمد جمال بھی تھا۔ وہ اس نازک وقت میں ملکہ فرغانہ اور دوسری خواتین کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ بابر کو دیکھتے ہی خانہ زاد بیگم اس سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

''میرے بھائی یہ کیا ہو گیا؟''

خانہ زاد بیگم ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

''اس سے تو بہتر ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی شہ رگ کاٹ دوں۔''

''نہیں میری حوصلہ مند بہن! تم خودکشی نہیں کرو گی۔''

بابر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ خانہ زاد بیگم کو تسلی دے رہا تھا۔ ''اپنے بھائی کا انتظار کرنا' وہ ایک دن ضرور واپس آئے گا۔''

پھر بابر قتلغ خانم کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آج وہ سنگدل عورت بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

''مادر گرامی! اپنے بیٹے کے سارے گناہ زندگی میں معاف کر دیجئے۔ پتا نہیں.....'' شدت جذبات سے بابر کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

''جاؤ! خدا تمہاری نگہبانی کرے۔'' قتلغ خانم نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ بابر کے سر پر رکھا اور منہ پھیر لیا۔

احمد جمال بھی ملکہ فرغانہ اور مغل شہزادیوں سے ملا۔ شکستہ الفاظ اور ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ انہیں تسلیاں دیں۔ پھر جب وہ عالیہ تاجدار کے قریب پہنچا اور اس کی نمناک آنکھوں کی طرف دیکھا تو پہلی بار احمد جمال کو محسوس ہوا کہ اسکے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔

پھر جب بابر اور احمد جمال کمرے سے باہر نکلے تو مغل خواتین کی چیخوں کا شور بلند ہوا۔

''تم لوگ ہمیں اس حال میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟''

شیبانی خان کے حکم پر قلعے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اگرچہ بابر کے سپاہیوں کی تعداد سینکڑوں کے

قریب تھی لیکن صرف سو سپاہی اپنے شہنشاہ کی خانہ بدوشی کے اس سفر میں خوش دلی کے ساتھ شریک ہو سکے' باقی لے شیبانی خان کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلا کر امان طلب کر لی تھی۔

بابر نے سمرقند کی سرحد پر پہنچ کر اداس نظروں سے قلعے کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ بابر اور اس کے ساتھی دو وقت کے فاقے سے تھے۔

پھر ستم رسیدہ انسانوں کا یہ قافلہ ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا۔ بابر نے کئی بار احمد جمال سے اپنی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کاش! میں نے کچھ دن پہلے سید مہدیؒ کی ہدایت پر عمل کیا ہوتا؟''

''شہنشاہ! گزرے زمانے کو یاد کرنے کا وقت نہیں ہے۔ جو کچھ پیچھے رہ گیا اسے بھول جایئے' بس آگے کی طرف دیکھئے'' احمد جمال بابر کو مشورے تو دے رہا تھا مگر خود اس کے دل و دماغ ماضی کی یادوں سے لپٹے ہوئے تھے۔

راستوں سے غبار اٹھ رہا تھا اور بابر کے کانوں میں اپنی بہن خانہ زاد بیگم اور مغل شہزادیوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ ''تم لوگ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟''

⌑ ⌑ ⌑

بابر اور اس کے ساتھیوں کا یہ سفر کئی ماہ تک جاری رہا۔ پھر ایک دن وہ شکستہ حال سپاہی ہندوستان کی حدا میں داخل ہوگئے۔ اس طویل سفر نے نہ صرف مغل شہنشاہ کو تھکا دیا تھا بلکہ اس کی ظاہری شکل وصورت بھی بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ کہاں سمرقند' اندجان اور فرغانہ کا سرد وخوشگوار موسم...... اور ...اں ہندوستان کی گرم و ناگوار آب و ہوا! پھر طویل دشوار گزار سفر کی بے شمار صعوبتیں' بھوک' پیاس' گرد وغبار' جنگلوں اور ویرانوں میں قیام...... دھوپ کی تیزی' بارش کی سختی اجنبی موسم سے پیدا ہونے والی عجیب عجیب بیماریاں......غرض وہ کون سی آفت تھی جو اس انقلاب گزیدہ کارواں کا مقدر نہ تھی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ بابر رات کے وقت کسی درخت کے نیچے گہری نیند سوتے سوتے اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتا اور وحشت زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا' وہ خواب میں اپنی بہن خانہ زاد بیگم اور دوسری مغل شہزادیوں کی کرب ناک چیخیں سنتا اور پھر اس کی آنکھ کھل جاتی' اس کے بعد مغل شہنشاہ کو اپنے دل میں درد کی تیز لہریں اٹھتی محسوس ہوتیں اور تاریک جنگل ایک ماتم کدہ بن کر رہ جاتا' بس ہر طرف ایک ہی شور سنائی دیتا۔

''تم لوگ ہمیں اس حالت میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟''

مغل خواتین کی چیخیں سوتے جاگتے' ہر وقت بابر کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شدت جذبات سے مغلوب ہوجاتا اور احمد جمال کو مخاطب کر کے کہنے لگتا۔

''واپس لوٹ چلو اور شیبانی خان سے لڑ کر اپنی جانیں گنوا دو' مجھ سے اس جفاپیشہ انسان کا یہ ذلت آمیز سلوک برداشت نہیں ہوتا۔ اہل دنیا کیا کہیں گے کہ بابر نے زندگی بچانے کے لئے اپنی عزت مآب خواتین کو شیبانی خان جیسے حیوان کے پاس رہن رکھ دیا۔''

''اہل دنیا کی طعنہ زنی کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت برباد نہ کیجئے شہنشاہ'' احمد جمال بابر کے جلتے ہوئے زخموں پر تسکین آمیز کلمات کا مرہم رکھنے کی کوشش کرتا۔ ''دنیا والوں کا کیا ہے؟ اگر دشنام طرازی کے لئے ان کے پاس یہ موضوع نہ ہوتا تو وہ شہنشاہ کی شخصیت کو داغ دار کرنے کے لئے کوئی اور بہانہ تراش لیتے۔''

احمد جمال کی منطقی گفتگو سن کر بابر کی آتش غضب آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی۔

''کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرے یا نہ کرے مگر میں یہ راز ضرور جانتا ہوں کہ شہنشاہ نے چند سانسوں کی خاطر شیبانی خان کے ہاتھوں اپنے عزت و ناموس کا سودا نہیں کیا ہے۔'' احمد جمال چاہتا تھا کہ بابر کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے اس تکلیف دہ اور تاریک ترین دور کو فراموش کردے یا پھر اس زخم کی سوزش اتنی کم ہوجائے کہ مغل شہنشاہ آسانی سے سانس لے سکے۔

''میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں احمد جمال کے تم نے ایسے نازک اور سنگین وقت میں میرا ساتھ نہیں وا۔'' بابر کے چٹختے ہوئے اعصاب پرسکون ہوجاتے اور اس کے دھواں دھواں چہرے پر ہلکی ہلکی شادابی جھلکنے لی۔ ''گردش کا یہ وہی وقت ہے میرے بھائی جب چاند اور سورج کو گہن لگ جاتا ہے اور روشنی بھی ان کا ساتھ ا جاتی ہے۔''

''شہنشاہ کی رفاقت میری زندگی کا بہت بڑا اعزاز ہے۔'' احمد جمال ایک نئے زاویے سے بابر کی دلجوئی کرتا۔ ''ہم سب ایک مقصد خاص کے لئے جنگ کر رہے ہیں تاکہ اللہ کے بندوں کو انسان نما درندوں سے نجات ل جائے۔ اس بے کسی کی حالت میں شیبانی خان سے الجھنا کوئی دانشمندی نہیں ہوگی۔ چند سرفروش ہیں۔ آخر کتنی ہر لڑیں گے؟ یہ ستمگر یہی تو چاہتے ہیں کہ ہم لوگ غصے سے بے قابو ہوجائیں اور پھر اپنی جانوں کو ہلاکت میں ال دیں۔ شیبانی خان سے دوسری محاذ آرائی ہم پر قرض ہے۔ بے شک! آج طاقت کا توازن اس کے حق میں ہے' مگر ہم اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں کہ مالک ومختار صرف اس کی ذات ہے۔ کل وہ یقیناً ہم ناتوانوں کو ں طاقت بخشے گا۔ پھر ہم اس شان سے شیبانی خان کا قرض ادا کریں گے کہ ساری دنیا اپنی آنکھوں سے یہ تماشا یکھے گی۔ اور ہم اس درندے کو بتائیں گے کہ انسانی گوشت کھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

احمد جمال کی ولولہ انگیز گفتگو سن کر بابر کی دھندلی آنکھوں میں امیدوں کا نیا آفتاب طلوع ہونے لگتا۔

پھر یہ مختصر سا قافلہ نئے عزائم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجاتا۔ دور دراز اور دشوار گزار سفر نے بابر اور اس کے سپاہیوں کے حلیے بدل دیئے تھے۔ ان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی ایک شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ خانہ بدوشوں کی یہ جماعت کچھ دن پہلے سمرقند' اندجان اور فرغانہ پر حکومت کر چکی ہے...... اور اس جماعت میں پندرہ سولہ سالہ ایک ایسا نوجوان بھی ہے' جسے چند ماہ قبل ہزاروں انسان ''شہنشاہ'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ قت نے کروٹ لی تو راتوں رات یہی حکمران جماعت خانہ بدوشوں کا ایک مختصر سا گروہ بن کر رہ گئی...... اور اب اس گروہ کی پہچان یہ تھی کہ دیکھنے والے بابر اور اس کے ساتھیوں کو ستم رسیدہ اور افلاس گزیدہ انسان سمجھ کر ان سے اظہار ہمدردی کرتے تھے۔ خود مغل شہنشاہ نے بھی مقامی آبادی کو یہی تاثر دیا تھا کہ وہ لوگ بھوک کی شدت سے تنگ آکر تلاش روزگار میں ہندوستان کی طرف آئے ہیں۔ بابر اور انکے سپاہی اگر اس مصلحت سے کام نہ لیتے تو ان کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ حکومت کے کارندے بڑی آسانی سے انہیں کسی بیرونی طاقت کا جاسوس قرار دیتے کہ پھر ان لوگوں کو یا تو حوالہ زنداں کردیا جاتا یا وہ غریب الوطنی کی حالت میں انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کردیئے جاتے۔

اس وقت ہندوستان کے شمالی علاقے پر افغانی النسل حکمران سلطان سکندر لودھی کی حکومت تھی اور بابر کو اسی خطے سے گزر کر ''اجودھیا'' پہنچنا تھا' مسلمانوں کے اقتدار کے بعد اس شہر کا نام بدل کر ''فیض آباد'' رکھ دیا گیا تھا۔ (آج یہ تاریخی شہر ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے اتر پردیش میں واقع ہے۔)

⌑ ⌑ ⌑

جب بابر اور اس کے ساتھی ایک طویل مسافت طے کر کے اجودھیا میں داخل ہوئے تو مقامی لوگوں نے انہیں بڑی حیرت سے دیکھا۔ مغل شہنشاہ اور اس کے سپاہیوں کے جسموں پر میلے اور بوسیدہ لباس تھے' جنہیں

دیکھ کر پہلی نظر میں یہی احساس ہوتا تھا کہ یہ گداگروں کی کوئی جماعت ہے...... مگر گھوڑوں کی موجودگی بتا رہی
کہ یہ لوگ گردش وقت کے ستائے ہوئے ہیں۔ اجودھیا میں بمشکل چند گھرانے مسلمانوں کے تھے ورنہ
آبادی کٹر قوم پرست ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بابر اور اس کے سپاہیوں نے پہلی بار ایک عجیب قوم کو دیکھا
منڈے ہوئے سر اور ان پر بڑی بڑی چوٹیاں' سانولے چہرے' ماتھوں پر سرخ اور زرد رنگ کے مخصوص نشا
(چھاپ اور تلک وغیرہ) دھوتی کی شکل میں مختصر لباس' اوپر کا جسم کپڑوں سے بے نیاز' گردن اور بائیں شا
کے درمیان پڑی ہوئی ایک ڈوری (ہندوؤں کی ایک خاص مذہبی علامت جسے "جنیئو" کہا جاتا ہے)

"یہ لوگ تو مسلمان نظر نہیں آتے۔" بابر نے احمد جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پھر ہم حضرت م
عاشقاںؒ کا پتہ کس سے پوچھیں گے؟ کہیں ہم غلط جگہ تو نہیں آ گئے؟"

"یہ ہندو بت پرست ہیں شہنشاہ!" احمد جمال نے اپنے فرمانروا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "
نے ان کے متعلق کتابوں میں پڑھا ہے۔ یہ پتھر کے مجسموں کی پرستش کرتے ہیں۔" اتنا کہہ کر احمد جمال گھوڑ
سے نیچے اتر آیا اور ایک ہندو پجاری سے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

ہندو پجاری احمد جمال کی زبان سے ناآشنا تھا' اس لئے کوئی جواب نہ دے سکا اور ایک مسلمان کو عجیب
نظروں سے دیکھتا ہوا مندر کی طرف بڑھ گیا۔

اس علاقے میں زیادہ تر برہمن آباد تھے۔ بابر اور اس کے ساتھیوں کے ظاہری حلیے دیکھ کر مقامی ہندو
سمجھ گئے تھے کہ آنے والے مسلمان ہیں اور اسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں' جو کئی صدیوں سے ان پر حکومت کر رہا
ہے۔ اس احساس نے اجودھیا کے برہمنوں کو بابر کے ساتھ بدسلوکی پر اکسایا تھا۔ بابر جس ہندو سے بھی حضر
موسیٰ عاشقاںؒ کا پتہ پوچھتا وہ حقارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ایک تو زبان
اجنبیت' دوسرے مقامی باشندوں کا مذہبی تعصب' غرض یہی وہ صورتحال تھی کہ جس کے باعث بابر کو اپنی منز
تک پہنچنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی' مگر کسی ہندو نے مسلمانوں کے اس خانماں بر
قافلے سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔

آخر مغرب سے ذرا پہلے بابر کو ایک شخص نظر آیا جو اپنی شکل وصورت سے مسلمان نظر آ رہا تھا۔ مغل شہنشا
کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری جیسے کسی شکستہ پا مسافر کو اچانک منزل کا کوئی سراغ مل گیا ہو۔ بابر
اسے اپنی زبان میں پکارا وہ شخص آواز دینے والے کی بات کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بھی ٹھہر گیا۔ اتفاق سے ا
جمال فارسی زبان جانتا تھا اور مقامی مسلمان بھی اس زبان سے واقف تھا' پھر جب دونوں کو رابطے کی زبان مل
تو احمد جمال نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں لوگوں نے بتایا ہے کہ یہاں کوئی بزرگ حضر
موسیٰ عاشقاںؒ رہتے ہیں۔"

"تو پھر آپ ہمیں ان بزرگ کے پاس لے چلیں۔" احمد جمال نے درخواست کے لہجے میں کہا۔ "
بہت ہی ضرورت مند اور پریشان حال ہیں۔ شاید ان بزرگ کی دعاؤں سے یہ گردش وقت ٹل جائے۔"

"اللہ آپ کی تمام مشکلوں کو آسان کرے۔" اس مقامی مسلمان نے اپنے ہم مذہبوں کی حالت زا
اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا "آپ لوگ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سے ضرور ملیں۔ اللہ نے ان کی زبان میں ب
تاثیر بخشی ہے۔"

"تو پھر ہمیں ان کے پاس لے چلیں' آخر آپ کو کس بات کا انتظار ہے؟" احمد جمال کے لہجے سے
اب بھی جھلک رہا تھا اور شوق دیدار بھی۔

"شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا ہے۔" مقامی مسلمان نے احمد جمال کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس تاریکی میں
حضرات کا ان بزرگ تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ ایک تو راستہ ناہموار ہے' دوسرے بیچ میں دریائے "سرجو"
ہے۔ یہ دریا بس ایک ہی مقام پر پایاب ہے۔ اور اسی مخصوص جگہ سے اس دریا کو عبور کیا جا سکتا ہے۔ اگر
ے کے باعث آپ کے گھوڑے گہرے پانی میں اتر گئے تو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا' اس لئے
ہے کہ صبح تک کے لئے اپنا یہ سفر ملتوی کر دیں۔"

"پھر ہم لوگ یہ رات کہاں اور کس طرح بسر کریں گے؟" احمد جمال کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا
"یہاں کے مقامی باشندے ہمیں مشکوک اور ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہم سے خوف زدہ تو
ہیں' مگر ان کی آنکھوں میں ہمارے لئے نفرت وکراہیت کے سوا کوئی دوسرا رنگ موجود نہیں ہے۔"

"یہاں کے بیشتر رہنے والے ہندو بت پرست ہیں' اس لئے وہ مسلمانوں کی جماعت کو دیکھ کر اپنی نفرتوں
اظہار نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے؟" یہ کہتے کہتے اجنبی کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔
آپ شب گزاری کے سلسلے میں ذرا بھی فکر مند نہ ہوں۔ سلطان سکندر لودھی کے حکم سے یہیں قریب ہی ایک
ویل وعریض سرائے تعمیر کی گئی ہے۔ اس سرائے میں بیک وقت سینکڑوں مسافر بہت آسانی کے ساتھ اپنے روز
شب گزار سکتے ہیں۔ آپ جب تک جی چاہے اس سرائے میں قیام کر سکتے ہیں۔ سلطان ایک نہایت ہمدرد اور
عادل حکمران ہیں۔ سلطان نے مذہب وملت کی تفریق کے بغیر اس سرائے کو تمام انسانوں کے لئے ایک پناہ گاہ
بنا دیا ہے۔ سلطان ہی کی طرف سے ہر مسافر کے لئے کھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ حکومت وقت نے اس
سلسلے میں کئی کارندے مقرر کئے ہیں۔ اور میں بھی ان ہی کارندوں میں سے ایک ہوں۔ اگر آپ لوگوں نے
یہاں ٹھہرنا پسند کیا تو مقامی آبادی کا آپ پر کوئی احسان نہیں ہوگا' اس ذیل میں سلطان کا واضح حکم موجود ہے کہ
یہاں ٹھہرنے والے تمام افراد سکندر لودھی کے "مہمان خاص" ہیں۔ اگر حکومت کے کارندوں نے کسی بھی مہمان
کے ساتھ بے توجہی برتی تو وہ سب کے سب سنگین سزا کے مستحق ہوں گے۔ اس لئے آپ بے خوف وخطر سرائے
میں تشریف لے چلئے۔ آپ کسی پر بوجھ نہیں' سلطان کے خصوصی مہمان ہیں۔"

مغل شہنشاہ کو فارسی زبان میں زیادہ مہارت نہیں تھی' پھر بھی وہ مقامی مسلمان کی گفتگو کا مفہوم سمجھ سکتا تھا۔
سلطان سکندر لودھی کے انتظامات کا ذکر سن کر بابر دم بخود رہ گیا اور اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش نے
کروٹ لی کہ کاش وہ بھی اس حکمران سے ملاقات کر سکتا جو اپنی رعایا کا ایسا نگہبان اور غمگسار ہے۔

احمد جمال بھی سلطان سکندر لودھی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔

پھر وقت گزیدہ لوگوں کا یہ مختصر سا قافلہ اس سرائے کی طرف روانہ ہو گیا جو مسافروں کے لئے کم وبیش ان
کے گھروں کی طرح آرام دہ اور مہربان تھی۔

⌑ ⌑ ⌑

سرائے کے منتظمین میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ سلطان سکندر لودھی کا یہ انتظام اس لئے تھا کہ کسی بھی

مذہب سے تعلق رکھنے والے مسافروں کو سرائے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ سرائے کو دو حصوں میں کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں مسلمان مسافر قیام کرتے تھے اور دوسرے میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے بت پرست مسافر۔ اسی طرح کھانے کے سلسلے میں بھی تفریق اور درجہ بندی کر دی گئی تھی۔ بابر سلطان سکندر لودھی کے اس حسن انتظام سے بھی بہت زیادہ متاثر ہوا۔

پھر جب بابر اور اس کے سپاہی کھانے سے فارغ ہو چکے تو مغل شہنشاہ حکومت کے اس کارندے کی طرف متوجہ ہوا' جس نے ان خانہ بدوشوں کی اس سرائے تک رہنمائی کی تھی۔ چونکہ احمد جمال بڑی آسانی کے ساتھ مقامی مسلمان سے گفتگو کر سکتا تھا' اس لئے بابر نے احمد جمال ہی کو اپنا ترجمان بنایا۔

''احمد! تم اس مہربان شخص سے یہاں کے کچھ اور حالات دریافت کرو۔'' خانہ بدوش حکمران نے احمد جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اور حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے بارے میں بھی پوچھو کہ وہ کون ہیں؟ میں اس وقت کچھ عجیب سی بے قراری محسوس کر رہا ہوں۔ میرے اعصاب پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہوتا جا رہا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

احمد جمال نے اپنے حکمران کی گفتگو بغور سنی اور پھر وہ اپنے میزبان سے مخاطب ہو گیا۔ ''خاندانی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے اور آپ کے درمیان ایک رشتہ موجود ہے۔ وہی سب سے پاکیزہ اور مستحکم رشتہ کہ ہم سب کلمہ گو ہیں...... اور وہی مقدس ترین کلمہ جو انتہائی اجنبیت کے باوجود ہمیں اس قدر قریب لے آیا ہے۔ کیا معزز میزبان اپنا تعارف کرانا پسند کریں گے۔''

اس عاجز انسان کا تعارف ہی کیا؟'' میزبان نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا...... ''میرا نام سید مبارک علی ہے۔

بزرگوں نے قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی کی سکونت اختیار کی تھی۔ پھر میں تبلیغ اسلام کے لئے اس دور دراز علاقے میں چلا آیا' جس کا ہر گوشہ کفر کی تاریکیوں میں لپٹا ہوا ہے۔'' سید مبارک علی کے لہجے سے شدید کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا آپ کے سوا یہاں اور کوئی مسلم خاندان موجود نہیں؟'' احمد جمال نے میزبان سے سوال کیا۔

''بس چند گھرانے ہیں۔'' سید مبارک علی نے افسردگی کے ساتھ کہا...... ''یہاں کے باشندے بہت تنگ دل اور کم نظر ہیں۔ نہ حق کی بات سنتے ہیں اور نہ ایمان کی روشنی کی طرف دیکھتے ہیں۔''

''سلطان سکندر لودھی نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا؟'' احمد جمال سفر میں ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی حالات جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سلطان کیا کر سکتے ہیں؟'' سید مبارک علی کے چہرے سے بدستور اداسی جھلک رہی تھی۔ ''اور ایک انسان کر بھی کیا سکتا ہے؟ یہ تو ہندوستان کے تمام مسلم حکمرانوں کا فریضہ ہے کہ وہ آپس کے اختلافات ختم کر کے توحید و رسالت کا پیغام گھر گھر پہنچائیں...... مگر انہیں نفس پرستی سے فرصت ہی کب ہے؟ علاؤ الدین کی [illegible] وسیع و عریض سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے...... سلاطین تغلق کی جاں فروشیوں کو خاک میں [illegible] خدائے واحد کے بندے اپنے تاج و تخت کو بچانے کے لئے بت پرستوں سے جا ملے...... اور کیا باقی رہ گیا ہے؟'' سید مبارک علی کے الفاظ سے ان کے دل کا درد جھلک رہا تھا...... سلطان سکندر لودھی تو پھر بھی

ہورد ہیں...... مگر انہیں بیرونی خطرات سے نجات تو ملے۔ ایک تنہا انسان سینکڑوں محاذوں پر کس طرح لڑ سکتا ہے؟''

احمد جمال سید مبارک علی کی باتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ وہ بظاہر بہت سیدھے سادے نظر آتے تھے' مگر ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ سید مبارک صرف نام کے مسلمان نہیں' وہ ایک عالم و فاضل انسان تھے اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔

''آپ کے کہنے کے مطابق یہاں کی اکثریت بت پرست ہے۔'' احمد جمال نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا...... ''کثرت کے نشے میں کہیں یہ لوگ مسلمانوں کو نقصان تو نہیں پہنچاتے؟''

''کفر کے بندے ہمیں کیا نقصان پہنچائیں گے صاحبزادے!'' یکایک سید مبارک علی مسکرانے لگے۔ ''زیادہ سے زیادہ قتل کر ڈالیں گے' ہمارے گھروں کو آگ لگا دیں گے۔''

بابر اور احمد جمال سید مبارک علی کی جرأت و بیباکی پر حیران رہ گئے۔

''ہم تو عشق کے سفیر ہیں...... اور عشق میں تو یہی سب کچھ ہوتا ہے...... خانہ بدوشی' زنجیر و سلاسل زنداں اور دار' مقتل۔'' سید مبارک علی کا سکون و اطمینان قابل دید تھا۔

''بزرگ! میں ایک سفیر عشق کے منصب کو سمجھتا ہوں۔'' احمد جمال کے لہجے میں سید مبارک علی کے لئے عقیدت کا رنگ شامل ہو گیا تھا...... ''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس قدر حسن سلوک کے باوجود اس علاقے کے ہندو مسلمانوں کے لئے شدید نفرت کے جذبات کیوں رکھتے ہیں؟ اگرچہ ہم نے یہاں راستہ چلتے بہت تھوڑا وقت گزارا ہے' مگر پھر بھی اکثریت پرستوں کے چہرے ہمارے سامنے بے نقاب ہو چکے ہیں۔ کسی چہرے پر نفرت کے سوا کوئی رنگ ہی نہیں اور کسی آنکھ میں غصے کے سوا کوئی تاثر ہی نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مذہبی اختلاف سہی' لاکھ دشمنی سہی' مگر مسافروں کے ساتھ تو کوئی قوم بھی ایسا سنگدلانہ سلوک روا نہیں رکھتی...... جبکہ مسلمانوں کے ایک حکمران سلطان سکندر لودھی کا طرز عمل بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیسی ناشکرگزار قوم ہے؟ اگر سلطان اشارہ کر دیں تو کیا مسلمانوں کے گھوڑوں کے سم ان کے جسموں کو روند ڈالیں گے؟ اور کیا اہل ایمان کی شمشیریں ان کے کاندھوں کا بوجھ ہلکا نہیں کر دیں گی؟ اور کیا اہل ایمان کے توانا بازو انہیں زنجیر غلامی پہنا کر شاہراہوں پر جانوروں کی طرح نہیں کھینچیں گے؟ اور کیا بااختیار حکمرانوں کے غضب کی آگ ان کے عافیت کدوں کو جلا کر راکھ نہیں کر دے گی؟'' یہ کہتے کہتے احمد جمال بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

بابر نے گھبرا کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... ''احمد! اس کا لحاظ رہے کہ ہم یہاں مسافر ہیں۔'' بابر نے ترکی زبان میں اپنے جاں نثار ساتھی کو سمجھایا۔

''سب کچھ ہو سکتا ہے' مگر ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔'' سید مبارک علی نے اپنے مہمان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مسلمانوں کی فاتحانہ زندگی کا اپنا الگ قانون ہے۔ وہ انسان تو انسان' سبزہ زاروں کو بھی نہیں کچلتے۔''

''کیا مقامی بت پرستوں کو مسلمانوں کی ان اعلیٰ روایات کا علم نہیں ہے؟'' احمد جمال نے ایک اور سوال

''علم کا کیا ذکر' مسلمان تو اپنے آئین پر عمل کر رہے ہیں۔'' سید مبارک علی کا لہجہ بھی پر جوش تھا۔

''پھر یہ نفرت کیوں...... اور یہ بیزاری کس لئے؟'' احمد جمال سید مبارک علی کے جواب سے مطمئن نہیں تھا...... ''یقیناً اس کے پس پردہ کچھ اور بھی ہے۔''

''تمہارا خیال درست ہے صاحب زادے! تم بہت ذہین نوجوان ہو۔'' سید مبارک علی نے ستائشی نظروں سے احمد جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مقامی ہندوؤں کی نفرت و بیزاری ایک الگ قصہ ہے مگر تم اس قصے کو سن کر کیا کرو گے؟ مسافر ہو' رات آرام و سکون سے گزارو اور صبح حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سے ملاقات کر کے اپنی منزل کی طرف چلے جاؤ۔''

اگر چہ سید مبارک علی کے لہجے سے اپنائیت کا اظہار ہو رہا تھا' لیکن احمد جمال نے ایک لمحے میں یہ بات محسوس کر لی کہ وہ اس خاص واقعے کی تفصیلات بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔ احمد جمال کا تجسس کچھ اور بڑھ گیا تھا اور اسی تجسس کے زیر اثر اس نے ایک بار پھر سید مبارک علی سے درخواست کرتے ہوئے کہا ''بزرگ! ہم مسافر بعد میں ہیں' مگر مسلمان پہلے ہیں۔ ہمارا سفر بھی جاری رہے گا اور انشاء اللہ ایک دن منزل بھی پا لیں گے' مگر دل میں یہ خلش ہمیشہ باقی رہے گی کہ......'' احمد جمال نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

سید مبارک علی کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ بولنے لگے...... ''یہ کوئی ایسا راز نہیں ہے کہ جسے فاش کرتے ہوئے کسی قسم کی جھجک محسوس ہو۔ اگر آپ لوگ کچھ دن یہاں قیام کریں گے تو خود ہی جان لیں گے کہ اس بستی میں ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ہے جس کے باعث مسلمانوں کے خلاف مقامی ہندوؤں کی نفرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ میں تو اس لئے دامن بچا رہا تھا کہ آپ حضرات سفر کی حالت میں ہیں اور گردش وقت کا شکار ہیں۔ اس صورت میں میرا پہلا فرض یہی ہے کہ اپنے دینی بھائیوں کو ذہنی الجھنوں سے بچانے کی کوشش کروں۔'' سید مبارک علی بڑے مشفقانہ لہجے میں بول رہے تھے۔ ''مگر اہل ایمان کے معاملات میں آپ لوگوں کی غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ میرے مہمان کوئی عام مسافر نہیں ہیں۔'' سید مبارک علی کا اشارہ بابر کی طرف تھا' جو پورے انہماک کے ساتھ اپنے میزبان کی گفتگو سن رہا تھا۔ مغل شہنشاہ کے سپاہی مہینوں بعد پیٹ بھر کھانا ملتے ہی گہری نیند سو چکے تھے۔ بس بابر اور احمد جمال جاگ رہے تھے اور ان دونوں کی نیندیں اجودھیا کے ہندوؤں نے اڑا دی تھیں۔

''اس سرائے میں ٹھہرنے والے مسافر تو عام ہیں لیکن اپنے سینوں میں ایک دردمند اور حساس دل رکھتے ہیں۔'' چند لمحوں کے لئے احمد جمال کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں سید مبارک علی کی جہاندیدہ اور گہری نظریں ان کی فقیرانہ حالت کے پیچھے جھانک کر مغل شہنشاہ کی شخصیت کے حقیقی خدوخال تک نہ پہنچ جائیں۔ اس لئے وہ فوراً بول اٹھا اور اپنے ساتھ بابر کو بھی عام مسافروں کی صف میں کھڑا کر دیا تاکہ اگر سید مبارک علی کو ان کے بارے میں کوئی شبہ ہو تو وہ چند لمحوں میں زائل ہو جائے۔

سید مبارک علی نے ایک بار پھر شہنشاہ بابر اور احمد جمال کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھا...... ''اللہ تمہارے ان جذبات کو برقرار رکھے ورنہ عام مسلمانوں کے دل تو ملت اسلامیہ کا مدفن بن چکے ہیں۔''

احمد جمال بڑی بے قراری کے عالم میں پہلو بدل رہا تھا۔ سید مبارک علی کا خلوص اپنی جگہ لیکن احمد

جمال تو اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لئے بے چین تھا' جس کی طرف ان کے میزبان نے ایک مبہم سا اشارہ کیا تھا۔

آخر ایک مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد سید مبارک علی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی...... ''اس علاقے میں برہمنوں کی اکثریت ہے اور برہمن وہ قوم ہے جو اپنے سوا کسی دوسرے انسان کو آدم زاد ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے اقتدار نے ان برہمنوں کو شدید اذیت پہنچی ہے اور یہ کوئی غیر فطری بات نہیں' مسلمان بھی کسی دوسری قوم کا غلبہ برداشت نہیں کریں گے...... مگر جس واقعے نے اجودھیا کے بت پرستوں کو پاگل بنا دیا ہے وہ بڑا عجیب اور ناقابل یقین ہے......'' اچانک سید مبارک علی کا لہجہ انتہائی پر سوز ہو گیا تھا اور چہرے پر ایک فاتحانہ رنگ ابھر آیا تھا...... ''یہاں کا سب سے بڑا پجاری پنڈت رگھوناتھ ہے' انتہائی خودغرض کینہ پرور اور اوباش...... مگر سادہ دل ہندوؤں کو کیا کہا جائے کہ دور دراز کے علاقوں سے ہزاروں صعوبتیں برداشت کر کے اجودھیا پہنچتے ہیں اور اپنا سب کچھ پنڈت رگھوناتھ کے ایک اشارے پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس سیاہ کار برہمن نے بندگان خدا کے پسینے کی کمائی سے اپنی محل نما حویلی تعمیر کی ہے اور وہ جاگیرداروں سے بھی زیادہ پر تعیش زندگی بسر کر رہا ہے۔ پنڈت رگھوناتھ کا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کا نام امرناتھ ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا ایک دن اجودھیا کے بت خانے میں زلزلہ آ جائے گا اور امرناتھ اپنے ماتھے سے قشقہ کھرچ ڈالے گا اور خدائے واحد کی بارگاہ جلال میں سجدہ ریز ہو جائے گا۔''

''وہ کس طرح؟'' ابھی سید مبارک علی اپنی بات ختم کرنے بھی نہیں پائے تھے کہ احمد جمال درمیان میں بول اٹھا۔ فرط حیرت کے باعث وہ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

''حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی ایک نظر نے امرناتھ سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔'' یکایک سید مبارک علی کے لہجے سے رقت سی جھلکنے لگی تھی...... ''آباؤ اجداد کی رسموں کا سرمایہ...... بے شمار خداؤں کی بندگی کا اقرار...... قشقہ و زنار' بتوں سے پیار' غرض کچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔ موسیٰ عاشقاں نے برہمن زادے کا سب کچھ چھین لیا......'' سید مبارک کی آواز سے عجیب وارفتگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''اجودھیا کے باشندے کہتے ہیں کہ ایک مسلمان نے اس شخص کے گھر شب خون مارا جو ہندو دھرم کا سب سے بڑا محافظ تھا...... مگر وہ کیا جانیں کہ موسیٰ عاشقاں کون ہیں؟ انہوں نے کسی گھر میں چوری نہیں کی۔ وہ تو جو کچھ کرتے ہیں دن کے اجالے میں کرتے ہیں۔ موسیٰ عاشقاں کبھی کسی بت کدے کی طرف نہیں گئے۔ اب خود ہی کوئی ان کی نظر کا شکار ہو جائے تو اس کا کیا علاج ہے؟''

''بزرگ! یہ سب کچھ کیونکر ہوا؟'' احمد جمال کا اضطراب اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ اگر چہ بابر بھی برہمن زادے کی تبدیلی مذہب کے بارے میں تمام تر تفصیلات جاننے کے لئے بے چین نظر آ رہا تھا۔

''ہونا کیا تھا؟'' سید مبارک علی بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ ''بس پنڈت رگھوناتھ کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت اس کا حسین و جمیل بیٹا امرناتھ دریائے ''سرجو'' پر غسل کرنے کے لئے جا رہا تھا کہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اسے دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچی۔

''اے اللہ! کیا تو اتنے دلکش چہرے کو بھی جہنم کی آگ میں جلا دے گا؟ رحم کر میرے معبود! رحم کر!''

موسیٰ عاشقاں کے الفاظ کیا تھے' معرفت کا ایک سیلاب تھا جو آن کی آن میں باطل کی چٹانوں کو بہا کر لے گیا۔ موسیٰ عاشقاں کی صدائے حق کیا تھی' ایک زلزلہ تھا جس نے امرناتھ کے دل کی دنیا زیر و زبر کر دی۔ اس

کے ہاتھ سے پانی کا برتن چھوٹ کر دریا کے کنارے گر گیا اور وہ خود موسیٰ عاشقاںؒ کے سامنے ماہی بے آب طرح تڑپنے لگا۔

''یہ کیا کردیا آپ نے؟'' امرناتھ دیوانہ وار چیخ رہا تھا...... ''یہ میرے جسم میں کیسی آگ پھونک دی؟ د و دماغ بھن رہے ہیں' روح سوکھے تنکوں کی طرح جل رہی ہے۔ بھگوان کے لئے اس ''جوالا'' کو ٹھنڈا کرو' نہ تو میں راکھ ہو کر بکھر جاؤں گا۔''

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کچھ دیر تک امرناتھ کو زمین پر تڑپتا دیکھتے رہے۔ پھر جب برہمن زادے کی شگاف چیخیں حد سے گزر گئیں تو موسیٰ عاشقاں آگے بڑھے اور اپنا دست مبارک امرناتھ کے دل پر رکھ دیا' لمحوں کی بات تھی۔ برہمن زادے کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ بجھ گئی اور پھر وہ ایک مردِ مومن کے قدموں لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے برہمن زادے کو اٹھا کر اس طرح گلے سے لگا لیا جیسے کوئی مہربان باپ برسو کے طویل انتظار کے بعد اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے سے مل رہا ہو...... ''بس اے جانِ بے قرار! بس!'' حضر موسیٰ عاشقاںؒ خود بھی آبدیدہ ہو گئے تھے اور بڑے والہانہ انداز میں امرناتھ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ا تسلیاں دے رہے تھے۔ ''کب تک درندوں کی بستی میں بھٹکے گا؟ بس اب آسودہ منزل ہو جا اور اپنے گھر طرف لوٹ آ۔''

''میں واپس آ تو گیا۔'' امرناتھ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے سینے پر سر رکھے زار و قطار رو رہا تھا۔

''ہاں! میں دیکھ رہا ہوں تو واپس آ چکا ہے' مگر کیا دوبارہ تو اسی کوچہ ہلاکت کی طرف نہیں لوٹ جائے گا' شدت جذبات کے سبب حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی آواز سے ارتعاش نمایاں تھا۔

''نہیں! اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر امرناتھ نے سر اٹھایا اور حضرت مو عاشقاںؒ کے روشن چہرے کی طرف دیکھنے لگا...... ''یہی آنکھیں میرا سورگ ہیں اور یہی میرا ٹھکانا ہیں...... کچھ دنوں کے لئے راستہ بھول گیا تھا۔''

دریائے سرجو کے کنارے غسل کرنے والے سینکڑوں بت پرستوں نے یہ عجیب تماشا اپنی آنکھوں دیکھا...... پھر کچھ دیر بعد ہی ایسا محسوس ہوا جیسے اجودھیا پر قیامت نازل ہو گئی ہو' رگھوناتھ کے پرستاروں نے ا اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''مہاتما! اپنے گھر کی خبر لے' ایک مسلمان بیراگی نے تیرے ہی گھر میں آگ لگا دی۔''

یہ خبر سن کر پنڈت رگھوناتھ پاگلوں کی طرح اس ٹیلے کی جانب بھاگا جہاں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی خا ہے۔ ''جادوگر! میرے بیٹے کو چھوڑ دے ورنہ تیرا انجام بہت بھیانک ہوگا......'' شدید حالت غضب میں پنڈ رگھوناتھ کے منہ سے کف اڑ رہا تھا...... اور وہ امرناتھ کی تبدیلی مذہب کو حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی جادوگری کا سمجھ رہا تھا۔

''اسے ابھی لے جا!'' موسیٰ عاشقاں نے امرناتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ان کے قریب چٹائی پر بیٹھا تھا۔ ''غور سے دیکھ لے کہ میں نے اسے کوئی زنجیر نہیں پہنائی ہے' اگر یہ جانا چاہے تو شوق سے جائے۔ میں اسے کسی بھی حال میں نہیں روکوں گا۔''

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی بات سن کر پنڈت رگھوناتھ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا...... ''اے برہمنوں کی عظیم نسل کے وارث! اپنے دیوتاؤں کی پناہ میں واپس آ جا۔ یہ جادوگر تجھے ہلاک کر ڈالے گا۔''

امرناتھ پر اپنے باپ کی روایتی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا...... ''میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا' دھرم' دیوتا' ...من' ماتا' پتا' کچھ بھی میرا نہیں ہے۔''

پنڈت رگھوناتھ نے بڑے غضب ناک انداز میں بیٹے کو تنبیہ کی' لیکن امرناتھ باپ کی ان دھمکیوں سے بھی ...اثر نہیں ہوا۔ ''جسے جو کچھ کرنا ہے کر لے...... میں اپنے ماضی کو اتنا پیچھے چھوڑ آیا ہوں کہ اب مجھے اس کا کوئی ...والہ یاد نہیں آتا۔''

آخر پنڈت رگھوناتھ مایوس ہو کر لوٹ گیا' مگر جاتے جاتے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کو متنبہ کر گیا

''مسلمان جادوگر! تو نے میرے بیٹے کا دھرم نشٹ کیا ہے۔ اس لئے میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔''

یہ درپردہ قتل کی دھمکی تھی۔ جس کے جواب میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ مسکرانے لگے...... ''ہر شے کو ایک دن اپنے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اگر میری موت تیرے ہاتھوں لکھی ہے تو میں خوشدلی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کروں گا۔ اللہ بس اس گھڑی سے محفوظ رکھے' جب کسی مسلمان کا دامن میرے خون سے رنگین ہو۔''

اجودھیا میں ہر طرف ہنگامہ برپا تھا اور پنڈت رگھوناتھ مسلسل حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے خلاف سازشیں کر رہا تھا۔ اس نے کئی راجپوت فتنہ گروں کو قیمتی انعامات کا لالچ دے کر موسیٰ عاشقاں کے قتل پر اکسایا' مگر وہ سب کے سب خوف زدہ ہو کر ناکام لوٹ آئے۔ پھر رگھوناتھ اس علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار سمیر سنگھ سے ملا۔ سمیر سنگھ رشتے میں رگھوناتھ کا ہونے والا سمدھی تھا۔ حریص برہمن نے دولت کی ہوس میں اپنے اکلوتے بیٹے امرناتھ کا رشتہ سمیر سنگھ کی بیٹی شکنتلا سے طے کر دیا تھا۔ شکنتلا اجودھیا کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔ اس راجپوت لڑکی نے ایک دن پوجا کے دوران مندر میں چھوٹے پجاری امرناتھ کو دیکھا اور اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ امرناتھ بھی شکنتلا کے آنچ دیتے ہوئے حسن سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ جب دونوں کے دلوں میں محبت کے گہرے زخم لگ گئے اور ان کی روحیں فگار ہو گئیں تو پنڈت رگھوناتھ نے اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا' اس کی نظر سمیر سنگھ کی دولت پر تھی اور سمیر سنگھ پنڈت رگھوناتھ کے مذہبی اقتدار کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر دونوں مفاد پرستوں کے درمیان ایک تاجرانہ سودا طے پا گیا...... اور دسہرے کے تیوہار کے موقع پر امرناتھ اور شکنتلا کے لگن کا اعلان کر دیا گیا۔ شادی میں ایک ماہ باقی تھا کہ یہ ناقابل یقین حادثہ پیش آ گیا۔ شکنتلا نے اپنے ہونے والے شوہر کی تبدیلی مذہب کے بارے میں سنا تو وہ شدت غم سے بے ہوش ہو گئی۔

جاگیردار سمیر سنگھ کو سکتہ ہو گیا۔ پھر اس کے ہوش و حواس درست ہوئے تو وہ اجودھیا کے بڑے مندر پہنچا۔ اس وقت وہاں ہزاروں پجاری جمع تھے اور پنڈت رگھوناتھ سے مطالبہ کر رہے تھے۔

''مہاراج! ہم نے آپ پر اپنا سب کچھ بلیدان کر دیا اور آپ کے گھر والوں کو اتنی عزت دی کہ اسے دیوتاؤں کا پریوار سمجھتے رہے۔ پھر یہ کیسا گھور پاپ ہے؟ ہم یہ سب کچھ سن نہیں سکتے یا تو چھوٹے پنڈت کو دیوی کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے گناہ کی معافی مانگنی ہوگی...... یا پھر آپ کو بڑے پجاری کے منصب سے دستبردار ہونا ہوگا۔''

اجودھیا کے پجاریوں کا بڑا عجیب مطالبہ تھا' جسے سن کر پنڈت رگھوناتھ کے چہرے پر وحشت برسنے لگی

تھی۔ اتنے میں جاگیردار سمیر سنگھ وہاں پہنچا۔

سمیر سنگھ نسلاً راجپوت تھا۔ اجودھیا اور قرب و جوار کے علاقوں کا سب سے بڑا زمیندار ہونے کے سبب سینکڑوں مسلح سپاہی اس کی حفاظت پر مامور رہتے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے برسراقتدار آتے ہی سمیر سنگھ نے مسلمان حکمران کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ جس کے جواب میں سلطان نے سمیر سنگھ کو اس شرط کے ساتھ مختصر فوج رکھنے کی اجازت دے دی تھی کہ دشمن سے مقابلے کے وقت راجپوت زمیندار افغان حکومت کا ساتھ دے گا۔ سلطان سکندر لودھی کی حمایت کے بعد سمیر سنگھ کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

جیسے ہی سمیر سنگھ اپنے مخصوص مسلح دستے کے ساتھ مندر میں داخل ہوا' چیختے ہوئے پجاری اس طرح خاموش ہوگئے جیسے وہ پیدائشی گونگے ہیں۔ سمیر سنگھ کو دیکھ کر پنڈت رگھوناتھ کے کانپتے ہوئے بوڑھے جسم میں نئی جان آ گئی اور وہ عیار برہمن راجپوت زمیندار کو لے کر اپنے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔

''سمیر سنگھ! مجھے ان دیوانوں کی بھیڑ سے بچاؤ۔'' پنڈت رگھوناتھ اپنے سمدھی کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ ''تم نے سنا کہ یہ نیچ پجاری اپنے دیوتا سے کیا مطالبہ کر رہے ہیں؟ وہ میری پگڑی مانگتے ہیں تاکہ اسے اپنے پیروں سے روند ڈالیں یا اس کی دھجیاں کر کے ہوا میں اڑا دیں۔ کیا سمے آ گیا ٹھاکر؟''

جاگیردار سمیر سنگھ نے رگھوناتھ کی باتیں غور سے سنیں اور پھر اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ ''دھیرج رکھ پنڈت! دھیرج رکھ' ٹھاکر کے ہوتے ہوئے تیرا کچھ نہیں بگڑے گا۔'' سمیر سنگھ بڑے متکبرانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''کیسی پوجا اور کیسے پجاری؟ اجودھیا میں صرف دو ہستیوں کا وجود ہے' ایک ٹھاکر سمیر سنگھ اور دوسری ٹھاکر کی خوں آشام تلوار...... یہاں تیسرا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔'' یہ کہہ کر سمیر سنگھ نے پنڈت رگھوناتھ کو کمرے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد سمیر سنگھ پجاریوں کے ہجوم کے سامنے اپنی برہنہ شمشیر کے ساتھ نمودار ہوا۔

''تم مہاراج سے کس بات کا مطالبہ کر رہے تھے؟ میں بھی تو سنوں!'' جاگیردار سمیر سنگھ انتہائی غضب ناک لہجے میں پجاریوں سے مخاطب تھا۔

انسانی ہجوم پر موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ بس کچھ مردہ سی آوازیں ابھریں۔ ''کچھ نہیں ٹھاکر' کچھ نہیں۔''

''پنڈتوں اور راجپوتوں سے کبھی کوئی مطالبہ کرنا بھی نہیں۔'' پورے مندر میں ٹھاکر سمیر سنگھ کی آواز گونج رہی تھی۔ ''پنڈت اپنی دن رات کی تپسیا سے تمہارے ان گنت پاپ دھوتے ہیں...... اور ٹھاکروں کی تلواریں تمہارے کمزور جسموں اور کچے گھروں کی حفاظت کرتی ہیں' اگر پنڈت تم سے منہ موڑ لیں تو تمہارا دھرم نشٹ ہوجائے...... اور اگر ٹھاکر تمہاری طرف پیٹھ کرلیں تو باہر سے آنے والے بھیڑیے تمہارا مانس نوچ کر کھا جائیں۔''

''سچ کہا ٹھاکر! تم نے سچ کہا۔'' سمیر سنگھ کے دعوے کی تائید میں بیک وقت سینکڑوں آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر کچھ دیر مندر کے در و دیوار پر گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ ٹھاکر سمیر سنگھ سمجھا کہ اس کی بے نیام شمشیر نے سارا مسئلہ حل کر دیا ہے...... مگر اچانک ایک تیز آواز نے خاموشی کا جگر چاک کر دیا۔

''پھر بھی کچھ تو انصاف کرو ٹھاکر!'' گونگوں کے ہجوم میں صرف ایک ہی شخص بول رہا تھا' جاگیردار سمیر سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک نوجوان برہمن تھا۔ ''اگر پنڈت گھرانے کے افراد ہی دیوتاؤں سے

...ی کریں گے تو عام پجاریوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ آج امرناتھ اپنے باپ دادا کی صدیوں پرانی رسموں ...بغاوت کر کے غیروں کے حلقے میں جا پہنچا ہے' کل کوئی دوسرا برہمن زادہ دشمنوں سے جا ملے گا...... اور پھر ...کے بعد جانے والوں کا یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا' کوئی نہیں جانتا؟ آپ خود ہی سوچئے ٹھاکر! جب راجہ ہی ہتھیار ...ل دے تو پھر سینک (سپاہی) کس طرح لڑیں گے؟ میں عمر میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں ٹھاکر' مگر میری یہ ...یاد رکھئے گا کہ اگر آج امرناتھ کو نہیں روکا گیا تو کل پورا مندر پجاریوں سے خالی ہوجائے گا۔ پھر یہاں ...ل دیوتا ہوں گے' آراستہ کمرے ہوں گے' گھنٹیاں ہوں گی' کتابیں ہوں گی مگر کوئی پوجا کرنے والا نہیں ...... اور کون جانے دیوتا بھی رہتے ہیں یا نہیں؟''

نوجوان برہمن نے بڑے اثر انگیز لہجے میں آنے والے انقلاب کا نقشہ کھینچا تھا' اس مختصر سی تقریر کو سن کر ...پجاری تو رونے لگے مگر ٹھاکر سمیر سنگھ جیسا سخت دل انسان بھی لرز کر رہ گیا۔

''برہمن زادے! تو ٹھیک کہتا ہے۔'' نوجوان پنڈت کے سوال کے جواب میں ٹھاکر سمیر سنگھ کی بارعب ...گونجی۔ ''میں تجھے اور درگا کے ان تمام پجاریوں کو یقین دلاتا ہوں کہ امرناتھ کل تک اپنے ٹھکانے کی طرف ...آئے گا۔ وہ ایک معصوم بچہ ہے اور اس کے اسی بھولے پن سے ایک جادوگر فائدہ اٹھا رہا ہے۔'' ٹھاکر سمیر ...کا اشارہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی طرف تھا...... ''تم لوگ صبر و سکون کے ساتھ اپنے گھروں کی طرف لوٹ ...۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کل تک سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اگر یہ معاملہ ہم سب کی مرضی کے مطابق ...نہیں ہوا تو آئندہ تمہارے سارے مطالبات کا جواب میں خود دوں گا۔ پنڈت رگھوناتھ کیا کریں؟ وہ بے ...ے بہت مجبور ہیں۔''

ٹھاکر کی پرجوش باتیں سن کر پجاریوں کا بے قرار مجمع چپ چاپ لوٹ گیا۔ جاتے وقت تمام بت پرست ...ر سمیر سنگھ کی جے جے کار کر رہے تھے۔

پجاریوں کے برگشتہ ہجوم پر قابو پانے کے بعد ٹھاکر سمیر سنگھ پنڈت رگھوناتھ کو لے کر اس کے گھر پہنچا...... ...طویل گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ پنڈت رگھوناتھ کی بیوی اپنے روٹھے ہوئے بیٹے کو منانے کے لئے حضرت ...ٰ عاشقاںؒ کے پاس جائے۔ امرناتھ اپنی ماں سمترا سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اسی لئے ٹھاکر اور پنڈت دونوں ...خیال تھا کہ وہ کسی بھی حال میں سمترا کی بات نہ ٹال سکے گا...... پھر جب سمترا گریہ و زاری کرتی ہوئی اپنے ...ے ملی تو امرناتھ بے قرار ہوگیا۔

''ماں! مجھ سے تیری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی...... اپنے ان آنسوؤں کو روک لے نہیں تو تیرے بیٹے کا ...وان آنسوؤں میں ڈوب جائے گا۔'' یہ کہتے کہتے امرناتھ خود بھی رونے لگا تھا۔

''اگر میرے آنسوؤں کا اتنا ہی خیال تھا تو پھر تو نے اپنے دیوتاؤں سے بدعہدی کیوں کی؟'' سمترا کے ...میں امرناتھ کے لئے شدید محبت بھی جھلک رہی تھی اور دبی دبی تلخی بھی۔

''میرا عقیدہ میری روح کا مسئلہ ہے اور تیری محبت میرے دل کا معاملہ ہے۔'' امرناتھ نے انتہائی پرسوز ...میں اپنی ماں سمترا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں امرناتھ نہیں!'' بیٹے کی طرف سے مہذبانہ انکار سن کر سمترا شدت کرب سے چیخ اٹھی۔ ''تجھے اپنا نیا ...رم چھوڑنا ہوگا یا پھر اپنی ماں کی محبت' ایک دل میں یہ دونوں چیزیں نہیں رہ سکتیں۔''

''نہ میں اپنا نیا عقیدہ ترک کروں گا اور نہ تیری محبت سے باز آؤں گا۔'' امرناتھ نے ایک ایک لفظ پر دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر غور سے سن لے کہ میں نے تجھے چھوڑ دیا۔'' اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرنے والی ماں کا اچانک غضب ناک ہوگیا تھا...... ''اب میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گی۔ تجھے میرے ساتھ گھر واپس چلنا ہوگا تو نے ایسا نہیں کیا تو پھر سمجھ لے کہ تو میرے لئے مر گیا۔'' یہ کہہ کر سمترا نے اپنے بیٹے کی طرف سے منہ پھ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔

''رک جا ماں کہ تیرے قدم نرک کی طرف اٹھ رہے ہیں......'' امرناتھ نے بڑے کرب کے ساتھ ما پکارا...... ''میں تیرا بیٹا ہوں' اس لئے تجھے آگ میں جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔''

''میں ایک بار کہہ چکی کہ تو میرے لئے مر گیا۔''...... سمترا نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

''مگر تو میرے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔'' امرناتھ اشکبار آنکھوں کے ساتھ اپنی ماں کو جاتے ہو دیکھ رہا تھا۔

سمترا کا دھواں دھواں چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھ کر ٹھاکر سمیر سنگھ اور پنڈت رگھوناتھ سمجھ گئے کہ ایک اپنے باغی بیٹے کو واپس لانے میں ناکام ہو چکی ہے۔

ایک تو بیٹے سے زندگی بھر کے لئے محرومی' دوسرے پوری قوم کے سامنے شدید رسوائی کا خوف' پنڈ رگھوناتھ دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر رہ گیا۔ ''اب کیا ہوگا ٹھاکر؟'' گھن گرج کے ساتھ لمبی لمبی تقریریں کر والے پنڈت کی آواز اس طرح لرز رہی تھی جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہو اور وہ کسی دید یا حکیم سے اپنی زن کی بھیک مانگ رہا ہو۔

''مت گھبرا پنڈت! ابھی میرے پاس آخری اپائے باقی ہے۔'' جاگیردار سمیر سنگھ نے رگھوناتھ کو تسلی د ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر اپنے دماغ کی کمان میں ایک ایسا تیر رکھتا ہے کہ جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔''

اس کے بعد سمیر سنگھ نے اپنی بیٹی شکنتلا کو امرناتھ کے پاس بھیجا۔ ٹھاکر اسی جذباتی ذریعے کو اپنی کما آخری تیر کہہ رہا تھا۔

شکنتلا بڑے ناز و غرور کے ساتھ امرناتھ سے ملی اور ایک خاص ادائے دلبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ا ہونے والے شوہر سے بولی۔ ''ناتھ! گھر واپس لوٹ چلو' میں تمہیں لینے آئی ہوں۔'' اگرچہ شکنتلا کی آواز مدھم لیکن اس کے لہجے سے تحکم کا گہرا رنگ جھلک رہا تھا۔

''تم میرا ساتھ کیوں نہیں دیتیں شکنتلا؟'' امرناتھ نے جواب دینے کے بجائے اپنی ہونے والی شر حیات سے خود ہی ایک سوال کر ڈالا۔ ''تم نے تو ہزاروں بار ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ آج تمہیں وہ اپنے عہد و پیمان یاد نہیں؟''

''مجھے سب کچھ یاد ہے ناتھ!'' شکنتلا لمبے گھونگھٹ میں سر جھکائے گفتگو کر رہی تھی۔

''پھر میرے ساتھ نئی منزل کی طرف چلو۔'' امرناتھ نے محبت سے سرشار لہجے میں کہا۔

اچانک شکنتلا کے جسم کو ایک تیز جھٹکا لگا اور اس نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ شکنتلا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو تھا۔ ''میں نے پجاری امرناتھ کے ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں کھائی تھیں' تو تو دیوتاؤں کے در سے ٹھکرایا

لعنت زدہ انسان ہے' میں نے تیری خاطر راجپوتوں کی آن کو خاک میں ملا دیا اور تو مجھے اس طرح حالات منجدھار میں چھوڑ کر چلا گیا کہ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا' فریب کار! میں تجھ سے اتنی نفرت کرتی ہوں کہ آج تک ایسی نفرت ایک انسان نے کسی دوسرے انسان سے نہیں کی ہوگی۔ شکنتلا کی رگوں میں دوڑنے والا راجپوتی خون جل اٹھا تھا۔ پھر وہ شدت جذبات سے مغلوب ہوگئی اور اس نے اپنی نفرت کا عملی مظاہرہ کرنے کے لئے امرناتھ کے منہ پر تھوک دیا۔

''رک جاؤ شکنتلا! خدا کے لئے رک جاؤ۔'' امرناتھ چیخ رہا تھا اور شکنتلا آندھی کے سرکش جھونکے کی طرح اپنے گھر کی طرف بڑھی جا رہی تھی...... ''کوئی تو ٹھہر جائے اور کوئی تو مجھ سے میرے دل کا حال پوچھے'' امرناتھ انتہائی شکستہ لہجے میں شکنتلا کو پکار رہا تھا اور وہ راجپوت زادی اپنے نرم و نازک قدموں سے زمین کو پامال کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

دونوں حربے ناکام ہو جانے کے بعد اپنے وعدے کے مطابق ٹھاکر سمیر سنگھ دوسرے دن پجاریوں کے ہجوم کے سامنے نمودار ہوا۔

تمام پجاری سوالیہ نظروں سے جاگیردار سمیر سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''امرناتھ بچہ ہے اور اس پر خوفناک جادو کیا گیا ہے۔'' مندر میں ٹھاکر کی بارعب آواز گونجنے لگی...... ''اب یہی ایک ترکیب ہے کہ میں اس مسلمان جادوگر کو قتل کر کے اپنی قوم کے دوسرے بچوں کو ہلاک ہونے سے بچالوں۔''

''ہم یہی چاہتے ہیں ٹھاکر!'' پجاری جوش جذبات میں چیخنے لگے۔

''تو پھر تم کل صبح کی پوجا میں اس جادوگر کا کٹا ہوا سر اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔'' ٹھاکر سمیر سنگھ کے ہونٹوں سے نفرت و غضب کی آگ برس رہی تھی۔

یہ خوشخبری سن کر بہت سے پجاری دارفتگی کے عالم میں ناچنے لگے۔

پھر جب یہ ہیجان انگیز شور کچھ کم ہوا تو اسی نوجوان برہمن کی آواز ابھری' جس نے پہلے دن جاگیردار سمیر سنگھ کی بات سے اختلاف کیا تھا...... ''اگر ایسا نہیں ہوا ٹھاکر تو؟''

''ہوگا کیسے نہیں؟'' سمیر سنگھ کسی زخمی درندے کی طرح دھاڑا۔ ''زمین و آسمان اپنے محور سے ہٹ سکتے ہیں مگر سمیر سنگھ کا وچن نہیں ٹل سکتا۔ پھر بھی اگر ایسا نہیں ہوا تو ٹھاکر خود اپنا سر دیوی درگا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دے گا......''

⌑ ⌑ ⌑

ٹھاکر سمیر سنگھ نے ہزاروں پجاریوں کے سامنے ایسا خوفناک دعویٰ کیا تھا کہ جس کی گونج پوری اجو
میں سنائی دے رہی تھی۔ پنڈت رگھوناتھ اور اس کے ابلہانہ خوش تھے کہ بہت جلد مسلمان جادوگر کا قصہ
ہوجائے گا اور ان کا باغی بیٹا امرناتھ مسلمانوں کی قید سے آ ـ ڈ ہوکر اپنے گھر لوٹ آئے گا۔ پنڈت رگھوناتھ
اس کے دوسرے ہم نوا برہمن ابھی تک امرناتھ کی تبدیلی مذہب کو حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے ساحرانہ عمل کا نتیجہ
رہے تھے ان کم نظروں اور بے خبروں کو پتا ہی نہیں تھا کہ امرناتھ نے پہلی بار ایمان کی تیز روشنی دیکھی تھی اور
وہ صدیوں پرانے کفرستان کے تاریک زنداں کے دروازے توڑ کر اہل حرم کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس ا
انقلاب کے بعد تمام طاقتور مذہبی اور خونی رشتوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن امرناتھ نے ایک لمحے کے لئے
پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ماں جیسی شفیق و مہربان ہستی نے اپنے دودھ کا واسطہ دیا' مگر امرناتھ نے اس حوالے کو
جھٹلا دیا' نوجوان برہمن زادہ اب بھی اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا تھا' لیکن ایمان کا جذبہ اس خونی رشتے
غالب آ گیا اور امرناتھ نے ماں کی شدید گریہ و زاری کے باوجود بت پرستوں کی طرف لوٹنے سے انکار کر د
اکثر انسانوں کی سب سے بڑی کمزوری خوبصورت عورت ہوتی ہے...... مگر امرناتھ نے اپنی اس کمزوری پر بھی
پالیا۔ شکنتلا جیسی توبہ شکن حسن رکھنے والی دوشیزہ کی قربت سے گریز کوئی آسان کام نہیں تھا' لیکن امرناتھ ا
دشوار ترین منزل سے بھی آسانی کے ساتھ گزر گیا۔ پنڈت رگھوناتھ نے اسے اپنی دولت سے محروم کرنے
دھمکیاں دیں مگر برہمن زادے نے سیم و زر کے انبار کو بھی ٹھوکر مار دی۔ وہ برہموں کے معزز ترین قبیلے سے تعا
رکھتا تھا۔ تبدیلی مذہب کے جرم کی پاداش میں اجودھیا کے رہنے والوں نے اسے ایک اچھوت سے بھی زیادہ حا
بنا دیا تھا' لیکن امرناتھ نے ذلت و رسوائی بھی برداشت کی' کیونکہ اب اس کی نظر میں حقیقی عزت کا مفہوم کچھ ا
تھا۔ ماں باپ جیسے نازک اور جذباتی رشتوں سے ہمیشہ کے لئے ترک تعلق...... محبت کی قربانی اور محبوبہ کا اح
تحقیر آمیز سلوک...... دولت کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے محرومی...... اور اس مسند جاہ و جلال سے علیحد
جہاں بیٹھ کر وہ خود بھی ایک دیوتا بن سکتا تھا۔

اتنی بڑی قربانیاں دینے کے بعد بھی امرناتھ اپنے باپ اور مقامی برہمنوں کی نظر میں ایک سحرزدہ انسان ا
اپنی ایسی کوتاہ نظری کے سبب ٹھاکر سمیر سنگھ اور اجودھیا کے دوسرے پنڈت سمجھ رہے تھے کہ اگر موسیٰ عاشقاں
کام تمام کر دیا جائے تو امرناتھ مسلمانوں کی جادوگری کے اثرات سے آزاد ہو جائے گا...... اور ایسی پراگندہ خیا
کے زیر اثر ٹھاکر سمیر سنگھ نے بھرے مندر میں اعلان کیا تھا کہ کل تک اجودھیا کے باشندوں کو مسلمان جادوگر ؒ
فتنے سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دے گا۔

سمیر سنگھ کا اعلان سن کر بت پرستوں کا ہجوم رقص کر رہا تھا' مگر کچھ پجاری ایسے بھی تھے جو گہری سوچ میں
اے ہوئے تھے' انہیں ٹھاکر کی دولت اور طاقت کا احساس تھا لیکن پھر بھی ان کے ذہنوں میں کچھ اندیشے ابھر
ہے تھے۔ آخر امرناتھ نے موسیٰ عاشقاں کی آنکھوں میں کون سی عجیب بات دیکھی تھی کہ نظر ملتے ہی ہوش د
واس کھو بیٹھا اور پھر ایک دشمن کے ہاتھوں باپ دادا کا دھرم تک بیچ ڈالا۔ اب اگر ٹھاکر سمیر سنگھ نے بھی اپنی تلوار
ی شخص کے پاس رہن رکھ دی تو پھر کیا ہوگا......؟ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے نجات پانے کے
لے بس یہی ایک آخری تدبیر باقی رہ گئی تھی۔ اگر یہ تدبیر بھی خود ہندو دھرم کے رکھوالوں کے منہ پر الٹ گئی تو
ر کیا ہوگا؟ یہی سوچ کر کچھ عمر رسیدہ اور سنجیدہ برہمن شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھے...... اور ٹھاکر سمیر سنگھ کی
امیابی کے لئے اپنے دیوتاؤں سے پرارتھنا کر رہے تھے۔

اور جاگیردار سمیر سنگھ کا یہ حال تھا کہ وہ شمشیر بے نیام لے کر مندر سے باہر نکلا' دروازے پر سینکڑوں مسلح
لانو اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان سب کا رخ ''دریائے سرجو'' کے پار اس پہاڑی ٹیلے کی طرف تھا
س پر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اپنی خانقاہ تعمیر کی تھی۔

ایک مرد خدا کی خانقاہ کیا تھی' گھاس پھونس کی ایک طویل و عریض جھونپڑی تھی' جسے کئی حصوں میں تقسیم
کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا حجرہ تھا اور باقی حصے میں کچھ درویش رہا کرتے تھے۔ خانقاہ
سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے ستون بانسوں پر مشتمل تھے اور جس کی چھت چٹائیوں سے تیار کی گئی تھی۔
گرمی اور سردی کے موسم تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتے تھے لیکن برسات کے زمانے میں درویشوں کی اس
جماعت کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چٹائیوں کی کمزور چھت تیز بارش کو روکنے سے قاصر رہتی تھی۔ نتیجتاً
پوری مسجد میں پانی بھر جاتا تھا' پھر اہل ایمان اس حالت میں نماز ادا کرتے تھے کہ ان کے ہاتھ' پیشانیاں اور
کپڑے کیچڑ سے آلودہ ہو جاتے تھے۔ اگرچہ سلطان سکندر لودھی ایک دیندار حکمران تھا' لیکن حضرت موسیٰ
عاشقاںؒ نے کبھی اس سے درخواست نہیں کی کہ وہ اس پہاڑی ٹیلے پر ایک پختہ مسجد تعمیر کرا دے۔ سید مبارک علی
اور چند دوسرے مقامی مسلمانوں نے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سے کئی بار درخواست کی کہ وہ کسی سرکاری کارندے
کے ذریعے سلطان سکندر لودھی کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں۔ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اس درخواست کے
جواب میں مسکرانے لگتے۔

''سجدہ ہی تو کرنا ہے' سنگ مرمر پر نہیں تو گیلی مٹی پر سہی۔ ویسے ہم بندگان عاجز بھی تو خاک ہی سے
بنائے گئے ہیں۔'' موسیٰ عاشقاں ایک خاص جذب و انکسار کے عالم میں جواب دیتے۔

''حضرت! ہمیں آپ کی تکلیف کا بہت احساس ہے۔'' سید مبارک علی شدت جذبات سے بے قرار
ہو جاتے۔

''کیسی تکلیف؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے ہونٹوں پر وہی دلنواز تبسم ابھر آتا جس کے لئے وہ بت
پرستوں کے ہجوم میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ''ہم برساتی کیچڑ پر سجدہ کرتے ہیں جو ایک نہایت آسان عمل
ہے کیا تم نے اللہ کے ان بندوں کو نہیں دیکھا جو سر مقتل اپنے ہی خون کی دلدل پر پیشانیاں رکھ دیتے ہیں۔''
سید مبارک علی التجائیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتے۔

''تمہیں اتنی جلدی کیا ہے سید؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سید مبارک علی سے سوال کرتے۔ ''کیا تم نہیں

جانتے کہ اللہ کے یہاں ہر شے کا ایک وقت مقرر ہے' جب وہ وقت معلوم آئے گا تو یہ خس و خاشاک رنگارنگ پتھروں میں تبدیل ہوجائیں گے۔''

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اور ان کے مریدوں نے سلطان سکندر لودھی کی تعمیر کردہ سرائے میں ایک وقت کھانا بھی نہیں کھایا۔ سید مبارک علی اصرار کرتے تو موسیٰ عاشقاں پرجلال لہجے میں فرماتے۔

''سید! یہ مسافروں کا حق ہے۔ ہم تو اپنے اپنے گھروں میں مقیم ہیں' پھر کیوں ہمیں حق تلفی کی تلقین کرتے ہو؟''

موسیٰ عاشقاں کا جواب سن کر سید مبارک علی گھبرا جاتے۔ ''حضرت! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ آپ لوگ مذہبی امور کی تبلیغ میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ ذاتی کاموں کے لئے تھوڑا سا وقت بھی پس انداز نہیں کر سکتے۔'' سید مبارک علی نہایت شائستہ اور مبہم انداز میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اور دوسرے درویشوں کی فاقہ کشی کی طرف اشارہ کرتے۔'' اس لئے سلطان سکندر لودھی کے لنگرخانے پر آپ کا بھی حق ہے۔''

''نہیں سید! ہمارا اس سرائے پر کوئی حق نہیں۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے لہجے سے بے نیازی کا رنگ جھلکتا' مگر غرور کا شائبہ تک نہ ہوتا۔'' ہم اللہ کے کارندے ہیں تو اہل دنیا سے اپنی مزدوری کیوں طلب کریں؟ یہ تو بھکاریوں کا شیوہ ہے۔''

اور آج ٹھاکر سمیر سنگھ دولت و اقتدار کے نشے میں اپنی شمشیر کی نوک سے اسی مرد قلندر کی داستان حیات کا آخری باب رقم کرنے جارہا تھا۔ اجودھیا کے اکثر باشندوں کا خیال تھا کہ یہ جابر و سفاک ٹھاکر اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائے گا اور حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی جھونپڑی نما خانقاہ خود ان ہی کے خون سے سرخ ہوجائے گی۔

¤¤¤

چند درویشوں نے ٹیلے پر سے ٹھاکر سمیر سنگھ اور اس کے مسلح سپاہیوں کو خانقاہ کی طرف آتے دیکھا۔ آج سے پہلے ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ سینکڑوں راجپوتوں نے بے نیام شمشیروں کے ساتھ پہاڑی کا رخ کیا ہو' یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ خدمت گار درویشوں نے فوراً ہی حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کو مطلع کیا۔

''انہیں تو آنا ہی چاہئے تھا۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے نہایت مطمئن لہجے میں فرمایا ''اور وہ کیوں نہ آئیں کہ ہم لوگوں نے ان کا سب سے قیمتی سرمایہ چرالیا ہے۔'' شیخ نے پنڈت امرناتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا نام بدل کر امیرالدین رکھ دیا گیا تھا۔

ٹھاکر سمیر سنگھ پہاڑی ٹیلے کے قریب پہنچ کر رک گیا' پھر اپنے محافظوں سے مخاطب ہوکر بولا ''تم یہیں ٹھہرو! ہمارے دشمنوں کی تعداد بھی کم ہے اور وہ نہتے بھی ہیں۔ میں اکیلا ہی یہاں آتا' مگر یہ سوچ کر تمہیں اپنے ہمراہ لے آیا کہ ان مٹھی بھر جادوگروں کو دیوتاؤں کے پجاریوں کی طاقت کا اندازہ ہوجائے۔ تم بے فکر رہو کہ میری تنہا تلوار ہی ان سب کی قسمتوں کا فیصلہ کردے گی۔''

ٹھاکر سمیر سنگھ کے لہجے میں بڑا غرور تھا' اس نے چند لمحوں کے لئے سر اٹھا کر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی خانقاہ کی طرف دیکھا اور پھر تیز قدموں کے ساتھ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔

موسیٰ عاشقاں کے خدمت گار موت سے خوفزدہ نہیں تھے' مگر انہیں یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں سرپھرے راجپوت ان کے شیخ کو کوئی جسمانی تکلیف نہ پہنچائیں۔ اسی خیال سے تمام درویش باہر نکل آئے تھے اور ٹھاکر سمیر سنگھ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''کہاں ہے تمہارا سردار؟'' ٹھاکر سمیر سنگھ کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور انتہائی غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا۔

''وہ اپنے حجرے میں تشریف فرما ہیں۔'' ایک درویش نے سمیر سنگھ کی بے نیام شمشیر اور قہر آلود لہجے کا کوئی تاثر قبول کئے بغیر کہا۔

''اور پنڈت امرناتھ کہاں ہے؟'' ٹھاکر نے اسی غضب ناک انداز میں دوسرا سوال کیا۔

''وہ بھی اس وقت حضرت شیخ کے حجرے میں موجود ہیں۔'' درویش کے لہجے سے خوف و ہراس کے بجائے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ''مگر ٹھاکر! آج تم نے ادھر آنے کی زحمت کیوں گوارہ کی؟'' درویش کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور اس کا انداز گفتگو نہایت شائستہ تھا' جیسے کوئی میزبان اپنے آنے والے مہمان کا استقبال کر رہا ہو۔

''میں تمہارے سردار کا سر لینے آیا ہوں تاکہ اسے ماتا درگا کے قدموں میں بھینٹ چڑھا کر اپنے وچن کا پالن کرسکوں۔'' شدت نفرت و غضب کے باعث ٹھاکر سمیر سنگھ کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

راجپوت جاگیردار کے خوفناک ارادے دیکھ کر درویشوں کے چہرے فق ہوگئے۔ انہیں اپنی جانوں سے زیادہ حضرت شیخ کی زندگی عزیز تھی۔ ''ٹھاکر! اگر تجھے اپنی وحشیانہ رسم ادا ہی کرنا ہے تو پھر ہم سب کے سر کاٹ کر لے جا' مگر ہمارے شیخ کے قتل سے باز آ کہ ان کا خون اس بستی کو ہلاک و برباد کرڈالے گا۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے خدمت گار شیخ کو بچانے کے لئے اپنی جانوں سے گزر جانے پر آمادہ تھے۔

''میں تمہارے ناکارہ سروں کا کیا کروں گا؟'' ٹھاکر سمیر سنگھ کے غصے کی آگ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ''میں تو اس شخص کی زندگی کا خاتمہ چاہتا ہوں جو اجودھیا میں اس ہنگامہ خیزی کی بنیاد ہے۔'' یہ کہہ کر ٹھاکر سمیر سنگھ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے حجرے کی طرف بڑھا۔

اس سفاک انسان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر چند درویش بھی آگے بڑھے اور حجرے کے دروازے پر اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے وہ اندر آنے والوں کو روکنے کے لئے پوری طرح مستعد ہوں۔ ٹھاکر سمیر سنگھ ان درویشوں کے قریب پہنچ کر کسی درندے کی مانند دھاڑا۔

''میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ سب کے سب بے موت مارے جاؤ گے۔''

''ہماری زندگی میں پیرومرشد کے جسم پر خراش بھی نہیں آسکتی۔'' بے ضرر درویشوں کے لہجے سے بھی اچانک شدید جارحیت جھلکنے لگی تھی۔ ''اگر غلاموں کی موجودگی میں شیخ کو کوئی گزند پہنچ جائے تو پھر غلاموں کی زندگی پر ہزار بار لعنت۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے خدمت گار جاں نثاری کی رسم ادا کرنے کے لئے تیار ہوچکے تھے۔

''میں تمہیں آخری بار حکم دیتا ہوں کہ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' ٹھاکر سمیر سنگھ طاقت کے نشے میں اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا اور وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا۔

"تو کیا اور تیرا حکم کیا؟" ان درویشوں نے بیک زبان کہا جو حجرے کے دروازے پر کسی سنگی ستون کی طرح کھڑے تھے۔ "اگر تجھے اندر ہی جانا ہے تو پھر ہماری لاشوں سے گزر کر چلا جا۔"

اس سے پہلے کہ ٹھاکر سمیر سنگھ مزید کوئی حرکت کرتا' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی بارعب آواز سنائی دی۔" لوگ درمیان سے ہٹ جاؤ اور اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دو۔" حضرت شیخ نے حجرے کے اندر سے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

درویش حکم شیخ کے آگے بے بس تھے۔ مجبوراً دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔

ٹھاکر سمیر سنگھ چند قدم آگے بڑھا اور ایک جھٹکے کے ساتھ حجرے کا دروازہ کھول دیا' جسے بانسوں اور چٹائیوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔

راجپوت جاگیردار نے خون آشام نظروں سے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی طرف دیکھا جو ایک شکستہ چٹائی کی مسند پر تشریف فرما تھے اور امیر الدین آپ کے بائیں جانب کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔

"امرناتھ! تیری گستاخیاں تو حد سے گزر گئی ہیں' مگر میں تجھے اس لئے معاف کرتا ہوں کہ تو میری بیٹی کا ہونے والا شوہر ہے۔" ٹھاکر سمیر سنگھ نوجوان برہمن زادے سے مخاطب ہوا...... "تو خاموشی سے گھر واپس چلا جا۔ دیوتا تیرے گناہوں کو معاف کر دیں گے اور تیری قوم تجھے دوبارہ اپنے سر پر بٹھا لے گی...... اجودھیا میں ایسا کوئی شخص نہیں جو میرے حکم سے انحراف کر سکے۔"

"ٹھاکر! تم مجھے پہچاننے میں غلطی کر رہے ہو۔" امیر الدین نے انتہائی پرسکون لہجے میں کہا اور سمیر سنگھ کی شمشیر آب دار کو اس طرح نظر انداز کر دیا' جیسے راجپوت جاگیردار کے ہاتھوں میں فولادی ہتھیار کے بجائے کسی درخت کی کوئی کمزور سی شاخ ہو۔ "کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ امر تو کئی دن پہلے مر چکا۔ اس وقت جو شخص تمہارے سامنے کھڑا ہے وہ امر نہیں امیر ہے۔ ہزاروں دیوتاؤں کا منکر اور ایک خدا کا پرستار' پھر میرا پتھر کے پجاریوں سے کیا رشتہ؟ بہتر یہی ہے ٹھاکر کہ تم یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ کیوں اپنے آپ کو شکست و ناکامی کی اذیت میں مبتلا کرتے ہو؟ مجھے تمہاری دولت اور فوجی طاقت کا خوب اندازہ ہے' مگر یاد رکھو کہ مجھ پر تمہارے دونوں ہتھیار کارگر نہیں ہوں گے۔"

"کہنے والوں نے مجھ سے ٹھیک ہی کہا تھا۔" یکایک ٹھاکر سمیر سنگھ کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ "اس مسلمان جادوگر نے تجھ سے تیری عقل چھین لی ہے۔"

"مجھ سے میری عقل چھینی نہیں بلکہ بخشی گئی ہے۔" امیر الدین نے اسی بیباکانہ لہجے میں جواب دیا۔ "کل تک میں بغیر دماغ کا ایک جانور تھا جو پتھروں سے سر ٹکراتا پھرتا تھا۔ یہ میرے مرشد کا احسان عظیم ہے کہ ان کی دعاؤں سے میں نے انسانیت کی قبا پہنی۔ تم بھی اپنے بدن سے جہالت کا لباس اتار پھینکو ٹھاکر!"

"میں نہیں جانتا تھا کہ تو اس حد تک پاگل ہو چکا ہے۔" ٹھاکر سمیر سنگھ کی آنکھوں' چہرے اور زبان سے نفرت کی آگ برس رہی تھی۔ "گھبرا نہیں کہ تیرا پاگل پن بہت جلد اتر جائے گا۔" یہ کہہ کر ٹھاکر سمیر سنگھ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی طرف متوجہ ہوا' مگر جیسے ہی اس کی نظریں شیخ کی نظروں سے چار ہوئیں' راجپوت زمیندار کے جسم پر شدید لرزہ طاری ہو گیا اور پھر ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر پڑی۔

"نادان تو مجھے قتل کرنے آیا تھا؟" ایک باطل پرست کے لئے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے ہونٹوں پر

استہزائیہ تبسم ابھر آیا تھا۔ "ٹھاکر! آج تو پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لے کہ مسلمان بس ایک بار ہی قتل ہوتا ہے اور وہ بھی تسلیم و رضا کے خنجر سے۔ دنیا پرستوں کا کوئی ہتھیار ایک مرد مومن کو دوسری مرتبہ قتل نہیں کر سکتا۔ یہ فقیر بھی ایک بار قتل ہو چکا سمیر سنگھ پھر کیوں مجھ پر خنجر آزمائی کر کے اپنا وقت برباد کرتا ہے؟"

ٹھاکر سمیر سنگھ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی باتوں کا جواب دینا چاہتا تھا' مگر جب اس نے اپنی زبان کھولنی چاہی تو اسے یک بیک محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ہونٹ پتھر کے ہو گئے ہیں۔

"اور اگر بالفرض میں تیرے ہاتھوں قتل ہو بھی گیا تو کیا تو سمجھتا ہے کہ میرے بعد پیغام حق سنانے والا یہاں کوئی دوسرا نہیں آئے گا؟ نہیں ٹھاکر تیرا اور تیری قوم کا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ اس ذات وحدہ لاشریک کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے' منزل حق کے مسافروں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ بت خانہ ہند کی طرف بڑے بڑے جانباز آئیں گے اور وہ سب کے سب سر بکف ہوں گے تو اور تیرے قبیلے والے کس کس کو قتل کریں گے؟ پتھر کے پجاریوں کے دلوں' دماغوں اور سماعتوں پر لاکھوں پہرے بٹھا دے' مگر اہل حق کی آوازیں ان تک پہنچ کر رہیں گی۔ پھر جس کی قسمت میں ہدایت ہوگی وہ ہدایت پا جائے گا اور جس تیرہ بخت کے لئے دوزخ کی دائمی آگ لکھی جا چکی ہے وہ اس آگ میں جل کر رہے گا۔"

ٹھاکر سمیر سنگھ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے بہت چاہا کہ تو کبھی ایمان کے شمع خانے کی طرف آ جائے' مگر میری چاہت سے کیا ہوتا ہے؟ کفر کی تاریکی جس کا مقدر ہو اسے اسلام کی روشنی سے کیا نسبت؟ یہاں سے واپس جا اور گمراہی کے اسی اندھیرے میں سسک سسک کر دم توڑ دے۔"

ٹھاکر سمیر سنگھ کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور اس کا پورا بدن شدت خوف سے کانپ رہا تھا۔ راجپوت زمیندار فرش کی طرف جھکا اور لرزتے ہاتھوں سے اپنی تلوار اٹھانے لگا۔ پھر جب وہ سیدھا ہوا تو حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے انتہائی پرجلال لہجے میں فرمایا۔

"اسے اپنی گردن پر پھیر لے۔ تیری دیوی بہت بھوکی ہے۔ جا اسی کی خوراک بن جا۔"

⌑ ⌑ ⌑

ٹھاکر سمیر سنگھ بمشکل ٹیلے سے اتر کر نیچے آیا۔ اس کے مسلح محافظ بڑی بے چینی کے ساتھ اس لمحے کے منتظر تھے کہ جب ان کا سردار واپس آئے گا تو اس کے ہاتھ میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا کٹا ہوا سر ہوگا اور پھر وہ اپنی قوم کے سامنے بطور فخر چیخ چیخ کر کہیں گے کہ ان کے سردار نے ہندو دھرم کے سب سے بڑے دشمن کا خاتمہ کر دیا۔ مگر جب مسلح راجپوتوں نے سمیر سنگھ کی جھکی ہوئی گردن' پسینے میں نہایا ہوا جسم اور کانپتے ہوئے خالی ہاتھ دیکھے تو ان کی شکلوں پر بھی وحشت برسنے لگی۔

"کیا ہوا ٹھاکر؟" ایک سپاہی نے لرزتی ہوئی آواز میں سمیر سنگھ سے پوچھا۔

سمیر سنگھ نے سپاہی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے مکان کی طرف بڑھتا رہا۔

"ٹھاکر! اگر آپ حکم دیں تو ہم ان جادوگروں کی جھونپڑیوں کو ان ہی کے خون سے رنگین کر دیں۔" اسی

سپاہی نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

''کیا تو اپنے سردار سے بڑا مرد ہے؟'' سمیر سنگھ اپنے محافظ پر برس پڑا۔ ''اور کیا تو شمشیر زنی کے میدان میں ٹھاکر سے بڑا ہنر مند ہے؟''

''نہیں سردار! ہرگز نہیں۔'' سپاہی سمیر سنگھ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر بدحواس ہوگیا۔

''پھر کیوں ایسا جاہلانہ باتیں کرتا ہے؟'' سمیر سنگھ کی آواز کسی قدر نرم ہوگئی تھی۔ ''اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو پھر تیر اٹھا کر خالی ہاتھ کیوں واپس آتا؟''

اپنے سردار کا اعتراف شکست دیکھ کر دوسرے سپاہی بھی خوفزدہ نظر آنے لگے تھے۔

پھر اجودھیا کے بت پرستوں میں ایک کہرام سا برپا ہوگیا۔ مسلمان درویشوں سے مستقل نجات حاصل کرنے کے لئے برہموں کے پاس ٹھاکر سمیر سنگھ کا اقتدار آخری ذریعہ تھا۔ مگر آج طاقت کا وہ ذریعہ بھی ریت کا ایک ڈھیر ثابت ہوا۔

ٹھاکر سمیر سنگھ کی ناکامی کے بعد پنڈت رگھوناتھ کو بھی اپنے مذہبی اقتدار کا سنگھاسن (تخت) ڈولتا نظر آرہا تھا۔ مخالف برہمن خاندان نے جو برسوں سے رگھوناتھ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس موقع کو غنیمت جانا اور پھر اس کے ماننے والوں نے اتنا شور مچایا کہ رگھوناتھ کے پرستاروں کے ذہن بھی متزلزل نظر آنے لگے۔ آخر اسی عذاب میں مبتلا رگھوناتھ ٹھاکر سمیر سنگھ کے یہاں پہنچا۔

''اب کیا ہوگا ٹھاکر؟'' شدت غم سے رگھوناتھ کی آواز لرز رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اگر راجپوت زمیندار نے اسے تسلی نہیں دی تو وہ رو پڑے گا۔

ٹھاکر سمیر سنگھ اس وقت شراب پی رہا تھا۔ وہ سرخ آنکھوں سے رگھوناتھ کی طرف دیکھتا رہا اور بدحواس پنڈت کی فریاد سنتا رہا۔ رگھوناتھ اب گریہ وزاری کرنے لگا تھا۔

''میری عزت بچالے ٹھاکر! نہیں تو پوری قوم مجھے اچھوت بنا ڈالے گی۔''

''دیوتاؤں کے نام پر بھیک کی روٹیاں کھانے والے پنڈت! تجھے اپنی عزت کی پڑی ہے۔'' آخر سمیر سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ جلتے ہوئے کوئلے کی طرح چیخ اٹھا۔ ''ٹھاکر کی طرف نہیں دیکھتا کہ اس کے چہرے پر کیسی گاڑھی سیاہی مل دی گئی ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ سمیر سنگھ جیسا عزت دار شخص صرف تیری وجہ سے تماشا بن کر رہ گیا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ تیرا ہی سر کاٹ کر دیوی کے قدموں پر رکھ دوں۔'' ٹھاکر نے کسی بھوکے شکاری درندے کی طرح پنڈت رگھوناتھ کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

اور سمیر سنگھ رات بھر شراب پیتا رہا۔ اس نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ ٹھاکر کے بیوی بچے اور مسلح محافظ بہت زیادہ پریشان تھے' مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی دروازے پر دستک دے سکتا یا سمیر سنگھ سے اس کا حال پوچھ سکتا۔

⌑ ⌑ ⌑

پھر جب سورج طلوع ہوا تو دیکھنے والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ پورا مندر پجاریوں سے بھرا ہوا تھا اور دور تک سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ آج بوڑھے' بچے' عورتیں' برہمن' راجپوت' شودر' غرض اجودھیا کے

تمام باشندے مندر اور اس سے ملحق میدان میں جمع ہوگئے تھے۔ اتنا بڑا انسانی ہجوم تو کسی تیوہار کے موقع پر بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا..... اور یہ بھیڑ محض اس لئے تھی کہ صبح کی پوجا کے بعد ٹھاکر سمیر سنگھ کو ایک مسلمان درویش کا سر دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھانا تھا۔ اگرچہ اجودھیا کے باثر حلقے اس راز سے آگاہ ہوچکے تھے کہ ٹھاکر اپنے دعوے کا ثبوت فراہم کرنے میں ناکام ہوگیا ہے لیکن مقامی باشندوں کی اکثریت اپنی بے خبری کے باعث سمیر سنگھ کا انتظار کررہی تھی کہ اچانک کسی سمت سے ٹھاکر نمودار ہوگا اور ان کے دیرینہ خواب کی جیتی جاگتی تعبیر پیش کردے گا۔

واقف کار لوگوں میں سے اکثر کا خیال تھا کہ شرم وندامت کے باعث ٹھاکر سمیر سنگھ دوبارہ مندر کی طرف نہیں آئے گا' کیونکہ ناکامی کی صورت میں خود اسے اپنا سر دیوی کی نذر کردینا تھا اور جان کی قربانی اتنی آسان بھی نہیں ہوتی۔ اگر ٹھاکر اپنے وعدے سے مکر جاتا تو پورے اجودھیا میں اس سے باز پرس کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سمیر سنگھ کی طاقت سے سبھی لوگ خوفزدہ رہتے تھے' اس لئے باخبر حلقے یہی سوچ رہے تھے کہ ٹھاکر بڑی آسانی سے اپنی جان بچالے گا اور کسی میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوگی کہ کوئی اسے اس کا وعدہ یاد دلا سکے۔

مگر اس وقت پورے مجمع پر موت کا سناٹا طاری ہوگیا' جب ٹھاکر کا گھوڑا میدان کے قریب آکر رکا' سمیر سنگھ آہستہ سے نیچے اترا۔ شب بیداری اور کثرت شراب نوشی سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ ٹھاکر کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی' لیکن وہ اپنے قدموں کو مضبوطی سے جماتا ہوا اس مقام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں درگا دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ سمیر سنگھ کی گردن تنی ہوئی تھی اور وہ بار بار اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ ٹھاکر کے چہرے پر احساس شکست کا ہلکا سا عکس تک نہ تھا۔ وہ انسانی ہجوم کو فاتحانہ نظروں سے دیکھتا ہوا مندر کی طرف جارہا تھا۔

پھر ٹھاکر اجودھیا کے بت پرستوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ میں اس طرح داخل ہوا جیسے وہ خود ہی دیوتا ہے اور اس کے درشن کے لئے ہزاروں پجاری صف بستہ کھڑے ہیں۔

ٹھاکر سمیر سنگھ کو خالی ہاتھ دیکھ کر ہجوم کی بے چینی بڑھ گئی تھی اور درگا کا ہر پجاری اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ مسلمان درویش کا سر کہاں ہے...... مگر ٹھاکر کی طاقت اور اس کے غصے نے ہر شخص کو خاموش رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ سمیر سنگھ سے اس کی مرضی کے خلاف سوال کرنے کا مطلب یہی تھا کہ راجپوت زمیندار کے قہر وغضب کی بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل ڈال دیا جائے۔ ماضی میں ایسا کئی بار ہوچکا تھا کہ کچھ مظلوموں نے ٹھاکر کے سامنے حرف احتجاج بلند کیا تو ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی یا فریادیوں کی زبانیں کاٹ دی گئیں۔ یا ان کے سر تن سے جدا کردیئے گئے۔ معمولی معمولی باتوں پر ظلم کی آخری حد سے گزر جانا' ٹھاکر کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ نتیجتاً اجودھیا اور اس کے گردونواح کی کئی بستیاں سمیر سنگھ کے تصور ہی سے سہمی رہتی تھیں اور خوف ودہشت ہی ٹھاکر کے ہتھیار تھے' جن کے ذریعے وہ برسوں سے اس علاقے پر حکومت کررہا تھا۔

آج بھی ٹھاکر کا وہی جاہ وجلال اپنا اثر دکھا رہا تھا اور مندر کی حدود میں موجود ہر شخص اپنی شہ رگ پر سمیر سنگھ کی شمشیر کا دباؤ محسوس کررہا تھا۔ باخبر لوگوں کا خیال تھا کہ ٹھاکر ایک بار پھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے گا اور حسب عادت کمزور لوگوں کو شرربار لہجے میں موت کی دھمکیاں دے گا اور اپنے بھاری قدموں سے زمین کے

کو روندتا ہوا واپس چلا جائے گا' مگر یہ صرف قیاس آرائی تھی اور ایک واہمہ تھا۔ ٹھاکر درگا کے مجسمے کے قریب پہنچ کر مڑا اور ان پجاریوں سے مخاطب ہوا جو کشمکش انتظار کا شکار تھے اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اس سے پہلے کہ تم مجھ سے کوئی سوال کرو' میں خود تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ وہ مسلمان جادوگر میری شمشیر کی خوراک نہ بن سکا۔'' یہ کہہ کر بمیر سنگھ نے اپنی تلوار نکالی اور اسے فضا میں بلند کر دیا۔ ''تم خوب جانتے ہو کہ اس شمشیر نے بہت سے لوگوں کے خون کا ذائقہ چکھا ہے' مگر یہ پھر بھی پیاسی ہی رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ دیوتاؤں کے دشمن کے خون سے اس کی پیاس ہمیشہ کے لئے بجھا دوں' مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا۔''

ٹھاکر کی زبان سے اس کی شکست کا حال سن کر درگا کے پجاریوں کے چہرے اتر گئے۔ مجمع کا سکوت کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

پھر چند لمحوں بعد ہی ایک نوجوان برہمن کی آواز نے اس سکوت کو توڑ دیا۔ ''جو گزر گئی سو گزر گئی ٹھاکر! ہمیں تو یہ بتا کہ اب کیا ہوگا؟'' یہ وہی نوجوان برہمن زادہ تھا جس نے امرناتھ کی تبدیلی مذہب کے بعد پہلی بار پنڈت رگھوناتھ کے خلاف آواز بلند کی تھی اور ٹھاکر بمیر سنگھ سے شکایتاً کہا تھا کہ اگر برہمن ہی دیوتاؤں سے بغاوت کر بیٹھے تو پھر عام پجاریوں کا کیا حشر ہوگا؟

''ہوگا کیا پنڈت؟'' بمیر سنگھ نے اپنی شمشیر کو فضا میں لہرایا۔ ''کل تک وہی ہوا ہے جو ٹھاکر نے چاہا ہے اور آج بھی وہی ہوگا جو ٹھاکر چاہے گا۔'' یہ کہہ کر بمیر سنگھ مسکرایا اور بڑی عجیب نظروں سے نوجوان برہمن زادے کی طرف دیکھنے لگا۔

مندر کے صحن میں موجود پجاریوں کا خیال تھا کہ عنقریب برہمن زادے پر بمیر سنگھ کا قہر نازل ہوگا' مگر ان کا یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس دھرتی پر برہمنوں کے پوجا پاٹھ باقی رہیں گے یا مٹ جائیں گے...... مگر مجھے اتنی خبر ضرور ہے کہ ٹھاکر کے وچن کی آبرو ہمیشہ برقرار رہے گی۔'' بمیر سنگھ کی گردن میں وہی ٹیڑھ تھی اور لہجے میں وہی غرور تھا۔ ''مجھے اپنا وچن یاد ہے اور میں اپنی زبان کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں' میں نے کہا تھا کہ اگر اس مسلمان کا سر کاٹ کر نہ لا سکا تو دیوی کے حضور میں اپنا سر پیش کر دوں گا۔ کیا اس کے سوا میں نے کچھ کہا تھا؟'' بمیر سنگھ ساون بھادوں کے بادل کی طرح گرجا۔

''نہیں ٹھاکر! اس کے سوا تم نے کچھ نہیں کہا تھا۔'' بیک وقت بہت سی آوازیں مندر میں گونج اٹھیں۔

''تو پھر اپنی آنکھوں سے یہ منظر بھی دیکھو کہ ٹھاکر اپنا وچن کس طرح پورا کرتے ہیں؟'' بمیر سنگھ کا لہجہ بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ تھا۔

انسانی ہجوم کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہونے لگیں۔ دیوی کے پرستاروں کے سارے وسوسے اور اندیشے ثابت ہوئے۔ سارے کے سارے برہمن یہی سوچ رہے تھے کہ بمیر سنگھ کو اس کا احساس شکست ریزہ ریزہ کر دے گا' مگر وہ ایسے خوفناک زلزلے کے دوران بھی ایک چٹان کی طرح مضبوط نظر آ رہا تھا۔

''اے اجودھیا کے باسیو! سنو!'' بمیر سنگھ اپنی پوری طاقت سے بول رہا تھا تاکہ اس کی آواز زیادہ ... تک پہنچ جائے۔ ''ٹھاکر کا وقت پورا ہو چکا' اس لئے وہ تمہارے درمیان سے اٹھ کر جا رہا ہے۔''

ابھی بمیر سنگھ کی آواز کی بازگشت باقی تھی کہ رگھوناتھ بول اٹھا۔ ''ٹھاکر! تم اپنی جان کیوں دیتے ہو؟ اجودھیا کے باسیوں کو تمہارے دم سے بڑی ڈھارس ہے۔ تم چلے گئے تو ہندو دھرم کے سارے رکھشک اناتھ (یتیم) ہو جائیں گے۔''

''چپ ہو جا پنڈت!'' بمیر سنگھ رگھوناتھ پر برس پڑا۔ ''مجھے فریب دیتا ہے تاکہ میں اپنا وچن پورا نہ کر سکوں اور پھر میرے ہی غلام اجودھیا کی گلیوں میں چیختے پھریں کہ ٹھاکر جھوٹا تھا۔''

پنڈت رگھوناتھ واقعتاً بمیر سنگھ کے ساتھ ایک سیاسی چال چل رہا تھا' مگر ٹھاکر نے اسے بھرے مجمع میں ترک دیا۔ ''میں اس سنسار میں کچھ دیر کا مہمان ہوں' مگر جانے سے پہلے میری ایک بات بہت غور سے سن لو۔'' اگر بمیر سنگھ پجاریوں کے ہجوم سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''میرے جانے کے بعد تم لوگ اپنی آنکھوں' کانوں' دلوں' دماغوں اور گھروں کے دروازے سختی سے بند کر لینا۔ اگر تم نے کوئی روزن کھلا چھوڑ دیا تو وہ جادوگر اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہارے عقائد کی پناہ گاہوں میں داخل ہو جائے گا اور سب کچھ لوٹ کر لے جائے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بڑی تباہ کار بجلیاں تڑپتے دیکھی ہیں۔ آج اس نے صرف ایک امرناتھ کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ اگر تم نے اپنی آتماؤں کے چاروں طرف مضبوط حفاظتی بند نہیں باندھے تو کل تمہیں ہزاروں امرناتھ راہ چلتے اور پھر راکھ کا ڈھیر ہوتے نظر آئیں گے۔''

یہ کہہ کر بمیر سنگھ آگے بڑھا اور درگا ماتا کے قدموں میں جھک گیا۔ ''دیوی! تیرا داس' تیرا ٹھاکر تجھ سے بہت شرمندہ ہے۔ اسے شما کر دے اور اس کے سر کا بلیدان سویکار کر لے۔''

جن پجاریوں تک بمیر سنگھ کی آواز پہنچ رہی تھی' ان پر شدت خوف سے سکتہ طاری تھا۔

یکایک ٹھاکر سیدھا ہوا اور اس نے کھڑے ہو کر ایک جگر شگاف نعرہ بلند کیا۔ ''جے ماتا کی۔''

پھر بمیر سنگھ نے اپنی شہ رگ کاٹ ڈالی اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ٹھاکر چند لمحوں تک درگا کے قد آور مجسمے کو دیکھتا رہا۔ پھر لہرا کر دیوی کے قدموں میں گر پڑا۔

ٹھاکر کی بھینٹ کا منظر دیکھنے والے پجاریوں کو اپنی نبضیں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھیں۔ آج تک برہمنوں نے صرف بلیدان کے قصے سنے تھے یا پھر انہوں نے اچھوتوں اور شودروں کو دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ آج جب ہندو قوم کے ایک سورما نے اپنی قربانی پیش کی تو دھرم کے رکھوالوں کے ہوش اڑ گئے۔ بمیر سنگھ نے آخری ہچکی لی اور اس کا توانا جسم ساکت ہو گیا۔

انسانی خون نے ایک پتھر کو رنگین کر دیا تھا۔ برہمنوں کے نزدیک یہ بڑا کارنامہ تھا اور پھر اسی کارنامے کو سراہتے ہوئے اجودھیا کے تمام پنڈت زور زور سے چیخ رہے تھے۔

''ٹھاکر مہمان تھا اور سدا مہمان رہے گا۔''

توہم پرستوں کے دل و دماغ پر حکومت کرنے کے لئے برہمنوں کو راجپوتوں کی حمایت درکار تھی اور اسی وجہ سے وہ بمیر سنگھ کی ''جے جے کار'' کر رہے تھے۔

اسی شور میں ایک گھٹی گھٹی آواز پنڈت رگھوناتھ کی بھی تھی۔ وہ اپنے سر کے بال نوچ رہا تھا اور بمیر سنگھ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھ کر بار بار چیخ رہا تھا۔ ''تو نے یہ کیا کر ڈالا ٹھاکر؟ جاتے جاتے مجھے بھی زندہ درگور کر گیا۔''

....

اجودھیا اور گردونواح کی بستیوں میں ٹھاکر سمیر سنگھ کی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ برہمن طبقہ اس لئے اداس تھا کہ ان کی پشت پناہی کرنے اور ان کے مذہبی اقتدار کو سہارا دینے والا ایک طاقتور انسان دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ یہ ایک تاجرانہ رسم تھی جسے پنڈتوں کا گروہ مجبوراً ادا کر رہا تھا۔ حقیقی سوگوار تو بس راجپوت قوم ہی تھی جس پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور رہے شودر تو وہ انتہائی حالت جبر میں ٹھاکر سمیر سنگھ کی ارتھی پر بین کر رہے تھے ورنہ دلی طور پر وہ نہایت خوش تھے کہ انہیں ایک جابر و سفاک انسان سے نجات مل گئی تھی' مگر ان جاہل لوگوں کو یہ بات کون سمجھاتا کہ ایک ٹھاکر کے جانے سے ظلم و ستم کا باب بند نہیں ہوتا۔ سمیر سنگھ نہیں تو کوئی دوسرا ٹھاکر آ جائے گا اور جبر و تشدد کے سلسلے کو وہیں سے دوبارہ جوڑ دے گا' جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

جب تک سمیر سنگھ کا سوگ جاری رہا' اس وقت تک اجودھیا کی مذہبی سیاست بھی بظاہر پرسکون رہی' مگر جیسے جیسے ٹھاکر کی یادوں کے زخم بھرتے گئے' رگھوناتھ کے دشمن برہمن گھرانے کی ریشہ دوانیاں بڑھتی گئیں۔ پھر ایک دن یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ پنڈت رگھوناتھ بڑے پجاری کے منصب سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو جائے ورنہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی اور اسے ایک مجرم کی حیثیت سے ہندو قوم کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ رگھوناتھ نے عام ہندوؤں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ اس کا امرناتھ سے کوئی تعلق نہیں ہے' مگر اجودھیا کے باشندوں نے پنڈت کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا۔ آخر رگھوناتھ نے سمیر سنگھ کے بیٹے ہمیر سنگھ سے مدد کی درخواست کی کہ وہ اپنے آنجہانی باپ کی طرح ان بےعقل لوگوں کی ابھرتی ہوئی آوازوں کو طاقت کے ذریعے دبا دے' مگر ہمیر سنگھ نے یہ کہہ کر اس کی حمایت سے انکار کر دیا کہ اگر امرناتھ مسلمان نہ ہوتا تو ٹھاکر سمیر سنگھ کبھی اپنی زندگی کا بلیدان نہ دیتے۔ ہمیر سنگھ پنڈت امرناتھ کو اپنے باپ کی موت کا ذمے دار قرار دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے نوجوان راجپوت سردار کے سامنے بھیک کے لئے دامن پھیلایا تو ہمیر سنگھ نے پنڈت کے ساتھ غیر مستحق بھکاریوں جیسا ہی سلوک کیا اور اس نے اپنے دروازے سے ناکام و نامراد لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

کہاں وہ دیوتا کی سی حیثیت' اور کہاں یہ تحقیر آمیز سلوک؟ آخر پنڈت رگھوناتھ اپنی قوم کے اس دباؤ کو برداشت نہ کر سکا اور ایک دن اس نے شدید مایوسی کے عالم میں زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ امیر الدین (امرناتھ) کو باپ کے عبرت ناک انجام کی خبر ملی تو اس کی آنکھیں اشکوں سے بھر گئیں اور اپنی غمزدہ ماں کو تسلی دینے کے لئے گھر پہنچا۔ ماں نے بھی بیٹے کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔ امیر الدین نے اپنی فطری محبت سے مجبور ہو کر اتمام حجت کے طور پر خدائے واحد کا پیغام سنایا اور قبول اسلام کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں خاندان کے دوسرے افراد نے امیر الدین کو زدوکوب کر کے گھر سے نکال دیا۔

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اس کے زخموں سے بہتا ہوا خون دیکھا تو بےقرار ہو گئے۔ ''امیر! یہ کیا ہے؟''

جب امیر الدین نے اپنے شیخ کو سارا واقعہ سنایا تو حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے آثار ابھر آئے۔ ''صبر کر میرے بیٹے! صبر کر۔''

''صبر ہی تو کر رہا ہوں بابا'' امیر الدین سخت تکلیف کے باوجود مسکرانے لگا۔ اس کا تبسم بڑا معصومانہ تھا۔

''تیرا یہ خون رائیگاں نہیں جائے گا'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے بے اختیار ہو کر کہا ''تیرے بہنے والے خون سے گلستان معرفت کی آبیاری ہوگی۔ اس بنجر زمین کی کوکھ سے ایمان کے درخت پھوٹیں گے۔ پھر تیرا ہر زخم گلاب بن جائے گا' جس کی خوشبو سے دماغ بھی مہکیں گے اور روحیں بھی معطر ہو جائیں گی۔ تو نقیب بہار ہے میرے بیٹے!'' یہ کہتے کہتے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ''خزاں کے تاجروں کی اس بیدادگری کا کبھی شکوہ نہ کرنا کہ یہ شور و غل اہل یقین کے شایان شان نہیں ہوتا۔''

''بابا! میں تو بس آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔''

امیر الدین نے کسی بچے کی طرح حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ''میری کوتاہیوں کے سبب کہیں مجھے اپنے حلقہ دعا سے خارج نہ کر دیجئے گا' پھر تو میں مر ہی جاؤں گا۔ بہت کمزور انسان ہوں۔ میری طاقت کے لئے دعا کیجئے بابا! دعا کیجئے'' امیر الدین ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا۔

''تو ہی تو میری دعاؤں کا مرکز ہے جان آرزو!'' امیر الدین کا اضطراب دیکھ کر شیخ کی آنکھوں میں طغیانی آ جاتی۔ ''تیرے سوا یہاں موسیٰ عاشقاں کا کون ہے؟ تو کیوں آزردہ ہوتا ہے میرے بچے! اگر کبھی وقت آیا تو اس بوڑھے پر اپنی جان بھی قربان کر دے گا؟''

اس نوعمری میں امیر الدین نے جسم اور روح دونوں پر بڑے زخم کھائے تھے' مگر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی پہلی نے اسے کسی مقام پر بھی تھک کر گرنے نہیں دیا۔

ایک دن امیر الدین کو خبر ملی کہ اس کی ماں دق کے مرض میں مبتلا ہو کر خون تھوک رہی ہے۔ امیر الدین کے سینے کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ وہ شدید بےچینی کے عالم میں ماں سے ملنے کے لئے گیا' مگر رشتے داروں نے اسے گھر کے اندر تک جانے نہیں دیا۔ امیر الدین اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس لئے اس کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح وہ محترم ہستی کفر سے تائب ہو کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے۔ امیر الدین نے اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سے بھی دعاؤں کی درخواست کی تھی۔ شیخ نے مبہم اشاروں میں اسے سمجھایا تھا کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھے اور انتظار کرے کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ آخر مرنے سے پہلے اس برہمن عورت نے بیٹے کو اپنے پاس بلایا اور کلمہ پڑھ کر امیر الدین کی آغوش ہی میں دم توڑ دیا۔

ماں کی موت کے صدمے نے اسے نڈھال کر دیا تھا' مگر پھر بھی وہ خوش تھا کہ اس کی ماں ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئی ہے۔

امیر الدین کے دل کے زخم آہستہ آہستہ بھر رہے تھے کہ ایک اور زہر آلود نشتر اس کے سینے میں اتر گیا۔ ٹھاکر ہمیر سنگھ نے اپنی چھوٹی بہن شکنتلا کی شادی ایک مالدار راجپوت گھرانے میں کر دی تھی۔ امیر الدین نے یہ خبر سنی تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ اگرچہ شکنتلا نے اس سے بڑا ذلت آمیز سلوک کیا تھا لیکن پھر بھی وہ ہر روز انتظار کرتا رہتا تھا کہ شکنتلا دھرم اور سماج کے سارے بندھن توڑ کر اس کے پاس چلی آئے گی۔ پھر ایک دن یہ خواب ٹوٹا تو امیر الدین کو اندازہ ہوا کہ وہ اندر سے کتنا زخمی ہے؟ شکنتلا کے تصور نے اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ مگر آج اس کی محبوبہ بھی غیر کا دامن تھام کر دوسرے راستے پر چلی گئی تو اس نے پلٹ کر زندگی کی رہ گزر کو دیکھا۔ پوری شاہراہ کانٹوں اور پتھروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ہر طرف اذیت و کرب کا کثیف غبار اڑ رہا تھا۔

امیر الدین جیسا شیشہ دل انسان اکثر رات کی تنہائیوں میں چھپ چھپ کر اس عورت کے لئے روتا جو خود

پتھر کا ایک بت تھی۔ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سے اپنے روحانی بیٹے کی یہ حالت پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ بھی بھی اسے اشارات و کنایات میں سمجھانے کی کوشش کرتے۔

"دنیا کتنی خوبصورت سہی مگر دل لگانے کی جگہ نہیں ہے بیٹے! چہروں کے خول پر نہ جا' غور سے دیکھ! ہر طرف آگ ہی آگ ہے اور تجھے اس آگ سے اپنا دامن بچا کر گزرنا ہے۔"

"میں اپنے دل سے مجبور ہوں بابا!"

انتہائی ضبط کے باوجود امیرالدین بے قابو ہو جاتا اور پھر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے سامنے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔

شکنتلا ایک مغرور اور منتقم المزاج عورت تھی۔ اس نے امرناتھ کی تبدیلی مذہب کے جرم کو معاف نہیں کیا تھا۔ شادی کے بعد شکنتلا کے اشارے پر امیرالدین کو بڑے آزار پہنچائے گئے۔ وہ کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے بستی آتا تو دکاندار اس کا مذاق اڑاتے اور سامان بیچنے سے انکار کر دیتے۔ نتیجتاً اسے مطلوبہ اشیاء حاصل کرنے کے لئے دور دراز کے علاقوں میں جانا پڑتا۔ جب یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تو اس کے پیچھے اجودھیا کے اوباشوں کو لگا دیا گیا۔ وہ آوارہ اور بدمست انسان سرراہ اس کے کپڑوں پر شراب کے بھرے ہوئے برتن انڈیل دیتے۔ چہرے پر کیچڑ مل دیتے۔ نشے کی حالت میں پتھر برسانے لگتے۔

پھر جب امیرالدین ان بدکاروں سے اس اذیت رسانی کی وجہ پوچھتا تو وہ درندے وحشیانہ قہقہے لگانے لگتے۔

"تیرے ساتھ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تو دیوتاؤں کی شرن (پناہ) میں واپس نہیں آ جاتا اور راج کماری شکنتلا کے چرن چھو کر اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگ لیتا۔"

جب امیرالدین کو یہ معلوم ہوا کہ اس مشق ستم کے پس پردہ شکنتلا کا ہاتھ ہے تو اس پر ایک اور قیامت گزر گئی۔ وہ جس کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے نصف شب کے سناٹے میں دعائیں کیا کرتا تھا' وہی اس کی زندگی کے درپے ہو جائے گا؟ اس خیال نے امیرالدین کو اتنا رلایا کہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ بھی شدت کرب سے [illegible] اٹھے۔

"کیا تیرے دشمن کو اپنی زندگی عزیز نہیں؟"

امیرالدین نے پہلی بار اپنے شیخ کو اس قدر حالت جلال میں دیکھا تھا۔ "بابا! خدا کے لئے اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کیجئے ورنہ وہ جل کر راکھ ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر امیرالدین کسی غلام کی طرح حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے پیروں سے لپٹ گیا۔ "اسے شعلوں کی نہیں' پھولوں کی دعا دیجئے۔ اس کے آنگن میں ہمیشہ بہار رقصاں رہے۔ میں ہر حال میں اس کی زندگی کا سکون چاہتا ہوں۔"

"تیرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ بدستور اسی پرجلال لہجے میں بول رہے تھے۔ "وہ خود تو آگ مانگ رہی ہے اور اس کے لئے بہاروں کی دعا کرتا ہے۔"

"وہ نادان ہے بابا!"

امیرالدین ابھی تک حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔ "اسے معاف کر دیجئے۔"

"زبان سے معاف کر دوں تو کیا ہوگا؟"

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا لہجہ کسی قدر نرم ہو گیا تھا۔ "دل میں جو آگ لگی ہوئی ہے' اسے کون بجھائے گا؟"

⌘ ⌘ ⌘

امیرالدین کو اجودھیا کے اوباشوں کی سنگدلانہ حرکتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے چند درویشوں نے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ کسی دوسرے شخص کو شہر کی طرف بھیج دیا جائے۔ شیخ نے اس تجویز سے اتفاق کیا لیکن امیرالدین یہی درخواست کرتا رہا۔

"مجھے اس خدمت سے محروم نہ کیا جائے۔ آپ ہی نے فرمایا تھا کہ میں صبر کروں۔"

آخر موسیٰ عاشقاںؒ مجبور ہو گئے۔ اور امیرالدین حسب معمول شہر جا کر راجپوتوں کی ناشائستہ حرکتوں کا نشانہ بنتا رہا' پھر جب اس کے پائے استقامت میں کوئی لرزش پیدا نہیں ہوئی تو شکنتلا نے اپنے شوہر سے صاف صاف کہہ دیا کہ امرناتھ کو قتل کر دیا جائے۔

شکنتلا کا شوہر روپ سنگھ خود اسی لمحے کا منتظر تھا۔ دراصل اجودھیا کے راجپوتوں نے ٹھاکر سمیر سنگھ کی شکست اور اس کی موت کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے' مگر ٹھاکر کا انجام یاد کر کے ان کی ہمتیں پست ہو جاتی تھیں۔ پھر جب شکنتلا نے امرناتھ کے قتل کا ذکر چھیڑا تو روپ سنگھ فوراً آمادہ ہو گیا۔ وہ اس راز سے باخبر تھا کہ اس کی بیوی شکنتلا کچھ دن تک امرناتھ کی منگیتر بھی رہ چکی ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں تھی' مگر روپ سنگھ کی جہالت نے امرناتھ کو اس کا رقیب بنا دیا تھا۔ اور وہ تنگ نظر راجپوت اپنے فرضی رقیب کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

آخر یہ منصوبہ طے پا گیا کہ جب امیرالدین واپس جانے کے لئے دریائے سرجو پار کرے تو اسے پانی میں ڈبو کر ہلاک کر دیا جائے۔ اس طرح عام لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ دریائی لہروں کی خوراک بن گیا۔

⌘ ⌘ ⌘

امیر الدین اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق اشیائے ضرورت کی خریداری کے لئے خانقاہ سے نکلا اور پہاڑی ٹیلے سے اتر کر دریائے سرجو کی طرف بڑھا۔

روپ سنگھ کے وحشی کارندے دیہاتیوں کے لباس میں صبح ہی سے دریا کے کنارے بیٹھے امیر الدین کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جب سورج بلندی پر آ گیا اور ہر طرف تیز دھوپ پھیل گئی تو شکنتلا کا شوہر ٹھاکر روپ سنگھ امیر الدین کی موت کا تماشا دیکھنے کے لئے اپنے گھر سے گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کی طرف روانہ ہوا۔ روپ سنگھ اپنے رقیب کی متوقع موت کے تصور سے بہت زیادہ پرجوش ہو گیا تھا' اس لئے بار بار گھوڑے پر چابک برسا رہا تھا' جس کے نتیجے میں اعلیٰ نسل گھوڑے نے اس قدر رفتار پکڑ لی تھی کہ راستے میں چلنے والے لوگ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔ ٹھاکر روپ سنگھ کو اپنی طاقت اور شہسواری پر بہت ناز تھا اور اس وقت وہ گھوڑے کی رفتار بڑھا کر اپنے اسی غرور کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

روپ سنگھ نے اپنی عالیشان حویلی سے دریائے سرجو کا یہ فاصلہ بہت جلد طے کر لیا۔ اپنے کارندوں کو دریا کے کنارے بیٹھا دیکھ کر ٹھاکر نے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں۔ گھوڑا اپنی پوری رفتار میں تھا۔ مالک کا اشارہ پا کر اس نے رکنا چاہا تو اس کے اگلے پاؤں ایک گڑھے میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس طرح الٹ گیا جیسے کسی تناور درخت کی جڑیں کاٹ دی گئی ہوں۔ روپ سنگھ ذہنی طور پر اس حادثے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایک زوردار جھٹکا لگا تو گھوڑے کی باگیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور ٹھاکر کا سر قریب ہی پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرا گیا۔ روپ سنگھ کی دلدوز چیخ فضا میں ابھری جسے سن کر اس کے کارندے چونک اٹھے۔ امیر الدین کے قتل کے ارادے سے آنے والے اوباشوں نے پلٹ کر دیکھا' کچھ فاصلے پر ایک گھوڑا اور ایک سوار بری طرح تڑپ رہے تھے' روپ سنگھ کے کارندے امیر الدین کا انتظار کرنے کی بجائے اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے جہاں یہ خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔ زخمی سوار کے قریب پہنچتے ہی ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں' ٹھاکر روپ سنگھ کا سر دو نیم ہو گیا تھا اور اس کا بھیجا باہر نکل آیا تھا۔ چند لمحوں کی بات تھی ٹھاکر کی زندگی کا کھیل ختم ہو گیا۔ کسی قریب المرگ سانپ کی طرح روپ سنگھ کے جسم میں تشنج پیدا ہوا اور پھر اس کی سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

''یہ کیا ہو گیا؟'' روپ سنگھ کے ایک کارندے نے چیختے ہوئے کہا۔ ''جانا تو اس پاپی کو تھا مگر ٹھاکر چلا گیا'

بھگوان تو نے یہ کیا کر دیا؟'' اچانک اس راجپوت کے چہرے پر خوف و دہشت کی پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں۔

پھر دوسرے اوباشوں کی آنکھیں بھی شدت خوف سے پھیل گئیں اور ان کے چہرے بھی یرقان کے مریض کی طرح زرد نظر آنے لگے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شہر جا کر ٹھاکر امیر سنگھ اور شکنتلا کو روپ سنگھ کی موت کی خبر دے سکے۔ آخر بہت دیر بعد ان کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو ایک کارندہ بستی کی طرف روانہ ہوا۔

اسی دوران امیر الدین اپنے معمول کے مطابق دریائے سرجو پار کر کے کنارے پر آیا۔ کچھ لوگوں کو ایک دائرے کی شکل میں دیکھ کر چونکا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ قریب پہنچ کر امیر الدین نے اکثر چہروں کو پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو مسلسل کئی ماہ سے اسے عجیب عجیب انداز میں اذیتیں پہنچا رہے تھے۔

امیر الدین ان بدکاروں سے بچ کر گزر جانا چاہتا تھا' مگر جب اس نے تھوڑے فاصلے پر ایک زخمی گھوڑے کو دیکھا تو ٹھہر گیا۔ گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں ٹوٹ گئے تھے اور وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ امیر الدین سمجھ گیا کہ کوئی سوار حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ از راہ ہمدردی ان لوگوں کے قریب آیا جنہوں نے اس کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔

''یہ شخص ٹھیک تو ہے؟ اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' امیر الدین ٹھاکر روپ سنگھ کی طرف بڑھا' جس کی ٹانگیں صاف نظر آ رہی تھیں' مگر چہرہ ان لوگوں کے درمیان چھپ گیا تھا' جو مرنے والے کو گھیرے کھڑے ہوئے تھے۔

''جب شریر سے آتما ہی نکل گئی تو پھر کون ٹھیک رہ سکتا ہے؟'' ایک کارندے نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

بڑا عبرتناک منظر تھا۔ طاقتور راجپوت جس تنہا اور کمزور نوجوان کو قتل کرنے آئے تھے وہ ان کے قریب زندہ کھڑا تھا اور جس شخص نے ایک بے یارومددگار انسان کے قتل کا حکم جاری کیا تھا' وہ موت کے طویل و عریض دہن کا ایک حقیر سا لقمہ بن چکا تھا۔

''افسوس! انسانی زندگی کتنی ناپائیدار ہے؟'' یہ کہہ کر امیر الدین نے ایک کارندے کو ہٹاتے ہوئے مرنے والے کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

ٹھاکر روپ سنگھ کا لرزہ خیز انجام دیکھ کر امیر الدین کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ ''کون تھا یہ شخص؟ کیا تم لوگوں نے اس کے گھر والوں کو خبر کر دی؟''

''یہ ٹھاکر روپ سنگھ ہیں جو آفت ناگہانی کا شکار ہو گئے۔'' کہنے والے نے بمشکل کہا۔ وہ امیر الدین کی قربت سے بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

''ٹھاکر روپ سنگھ؟'' امیر الدین مرنے والے کا نام سن کر فرط حیرت سے چونک اٹھا۔ اس نے آج تک شکنتلا کے شوہر کی صورت نہیں دیکھی تھی' مگر بتانے والوں نے امیر الدین کو بتایا تھا کہ شکنتلا کی شادی ٹھاکر روپ سنگھ نام کے کسی مالدار راجپوت سے ہوئی ہے۔

امیر الدین کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ''شکنتلا بیوہ ہو گئی......'' بڑا جانگداز حادثہ تھا' شکستہ دل عاشق رو پڑا۔ آٹھ ماہ کی دلہن نے اچانک بیوگی کا جوڑا پہن لیا تھا۔ شکنتلا امیر الدین کی جان کے درپے تھی

اور وہ روزِ اول کی طرح ماضی کی رہ گزر پر بیٹھا بیتے دنوں کی یادوں کا ماتم کر رہا تھا۔

پھر امیر الدین بازار جانے کے بجائے الٹے قدم خانقاہ کی طرف لوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ عاشقانؒ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' شیخ کی آواز میں دل کا درد شامل تھا۔ ''کیا پھر کسی نے تجھے کوئی آزار پہنچایا؟ ستمگر ابھی تک باز نہیں آئے؟''

''بابا! شکنتلا بیوہ ہوگئی......'' امیر الدین کسی بچے کی طرح حضرت موسیٰ عاشقانؒ سے لپٹ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ ''اس کا شوہر روپ سنگھ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ ٹھاکر کی لاش دریا کے کنارے پڑی ہے۔'' امیر الدین اس طرح رو رہا تھا جیسے خود اس کا اپنا کوئی قریبی عزیز دنیا سے رخصت ہوگیا ہو۔

''اگر ٹھاکر نہ مرتا تو بڑے ہنگامے کھڑے ہوتے۔'' یکایک آتشِ جلال سے موسیٰ عاشقاںؒ کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ''روپ سنگھ کو موت نہ آتی تو کوئی اور مارا جاتا۔''

امیر الدین شیخ کے اس اشارے کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ ''آپ نے شکنتلا کو معاف نہیں کیا بابا؟'' وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی بددعاؤں سے ٹھاکر روپ سنگھ ہلاک ہوا ہے۔

''میری زبان نے اس مغرور اور جفا پرست لڑکی کو کبھی کوئی بددعا نہیں دی۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ ''مگر میرے دل میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔ میں اس آگ کو کیسے بجھاؤں؟ وہ تیرے لباس پر شراب چھینکتے رہیں' تیرے پھولوں جیسے جسم پر سنگ برساتے رہیں اور میرے دل میں آگ نہ لگے' روح پر زخم نہ آئیں یہ کیسے ممکن ہے بیٹے؟''

''آپ کے دل کی اسی آگ نے شکنتلا کے سہاگ کو جلا ڈالا۔'' امیر الدین اپنی ایک ایک تکلیف بھول کر محبوب کے غم کا ذکر کر رہا تھا۔

''میں کون ہوتا ہوں کسی کو بیوگی کا لباس پہنانے والا؟'' حضرت موسیٰ عاشقانؒ نے امیر الدین کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جب کوئی خود ہی شادی کا جوڑا اتار پھینکے تو دینے والا بھی کیا کرے؟ اس نادان لڑکی نے یہی تو مانگا تھا...... انگاروں کی سیج' اشکوں کا سیلاب...... دل کے زخم اور جانوروں سے بدتر زندگی......'' شیخ نے ایک ہندو بیوہ عورت کی حالت زار کی طرف اشارہ کیا تھا...... ''اللہ کا نظام انصاف کوئی مذاق نہیں ہے' میرے جذباتی بیٹے! اگر تیرے بابا کی دعاؤں میں اتنی ہی تاثیر ہوتی تو یہ سارے کے سارے بت پرست مسلمان نہ ہو جاتے۔ بس وہ اپنے رازوں کو خود ہی جانتا ہے جو کچھ ظاہر ہو رہا ہے اسے صبر اور شکر گزاری کے ساتھ برداشت کر۔ تو نے پتھر کے تمام بتوں سے رشتہ توڑ لیا' مگر ایک بت اب بھی تیرے سینے کی گہرائیوں میں زندہ ہے۔''

☐ ☐ ☐

پہلے ٹھاکر سمیر سنگھ اور پھر ٹھاکر روپ سنگھ کی موت نے اجودھیا کے راجپوتوں کو ناقابل بیان دہشت میں مبتلا کر دیا تھا...... اور اب ان لوگوں کو احساس ہو چلا تھا کہ امیر الدین کی زندگی کا خاتمہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ مجبوراً ہندو بدمستوں نے امیر الدین کا پیچھا چھوڑ دیا اور اب وہ اس نوجوان کو دیکھ کر اس طرح سہم جاتے تھے کہ جیسے

ان پر کوئی نیا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اسی خوف سے اوباشوں کے گروہ کا ایک ٹھاکر بھانو پرتاب سنگھ حضرت موسیٰ عاشقان سے معافی مانگ کر مسلمان ہوگیا تھا اور پھر اس نے امیر الدین کے خلاف کی جانے والی تمام سازشوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔

شکنتلا کی پرسکون زندگی کبھی نہ ختم ہونے والا عذاب بن کر رہ گئی تھی' شوہر کی موت کے دو ماہ بعد اس نے ایک خوبصورت لڑکے کو جنم دیا۔ بچے کی پیدائش تک اس کے بھائی ٹھاکر ہمیر سنگھ نے چھوٹی بہن کو اپنی حویلی میں رکھا' پھر اسے ایک چھوٹے سے گھر میں یہ کہہ کر منتقل کر دیا کہ وہ ایک منحوس عورت ہے۔ اگر زیادہ دنوں تک حویلی میں رہی تو یہ محل جیسا گھر بھی شمشان میں تبدیل ہو جائے گا۔ ٹھاکر ہمیر سنگھ نے خونی رشتے کا بس اتنا لحاظ رکھا کہ ایک بوڑھی نوکرانی شکنتلا اور اس کے نومولود بچے کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دی...... ورنہ جہاں تک شکنتلا کے سسرال والوں کا تعلق تھا تو وہ لوگ شکنتلا کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے' ان کے نزدیک شکنتلا کی بدبختی ہی روپ سنگھ کی موت کا سبب تھی۔

اور خود شکنتلا کا یہ حال تھا کہ وہ چھوٹے سے گھر میں ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کر رہی تھی۔ اذیت ناک تنہائی کے اس طویل دائرے میں بس چھوٹا ٹھاکر ہی اس کا شریکِ درد اور غمگسار تھا۔ شکنتلا نے اپنے بچے کا نام بلرام سنگھ رکھا تھا' وہ اسے محبت میں ''چھوٹے ٹھاکر'' کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ شکنتلا ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی توہین کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ اس کے خیال میں امرناتھ (امیر الدین) نے ہندو دھرم چھوڑ کر گناہ کیا تھا' مگر اس سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ اس کے حلقہ اثر سے بھی دور نکل آیا تھا۔ شکنتلا اپنی اس ذلت کو برداشت نہ کر سکی' اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ٹھاکر سمیر سنگھ نے اپنے آپ کو دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا' پہلا زخم اس کی توہینِ ذات کا تھا اور دوسرا باپ کی موت کا۔ ابھی یہ دونوں زخم سلگ ہی رہے تھے کہ تیسرے زخم نے اسے پاگل بنا دیا' اب وہ نہ راجپوت زادی تھی اور نہ کسی راجپوت مرد کی بیوی' محض ایک بیوہ تھی' بھیڑ اور بکری سے بھی حقیر تر اچھوتوں سے بھی زیادہ غلیظ اور شودروں سے بھی زیادہ ناپاک' حالانکہ شکنتلا کے ایک زخم کا ذمے دار امیر الدین تھا...... اور وہ بھی اس حد تک کہ اس نے صرف اپنا مذہب تبدیل کیا تھا' شکنتلا کی محبت سے توبہ نہیں کی تھی۔ باقی دونوں زخم اس کا اپنا مقدر تھے' مگر شکنتلا کی نفرتوں کا اندازہ کون کر سکتا تھا۔

بیوہ ہو جانے کے بعد جن لوگوں نے شکنتلا کو قریب سے دیکھا تھا' وہ اسے ایک غمزدہ عورت کے بجائے نفرت و انتقام کی دیوی سمجھنے لگے تھے۔ ایک ایسی دیوی جس کی زندگی کا دار و مدار انسانی خون پر ہو...... اور وہ بھی صرف امرناتھ (امیر الدین) کا خون۔ شکنتلا اپنے معصوم بچے بلرام سنگھ کو محبت کی میٹھی لوریاں سنانے کے بجائے نفرتوں کے زہر آلود گیت سنایا کرتی تھی...... ایک ماہ کا بے خبر بچہ اپنی ماں کی بات کس طرح سنتا اور زبان کیسے سمجھتا' مگر شکنتلا بہت دیر تک دیوانوں کی طرح بڑبڑاتی رہتی۔

''اگر میرا باپ دنیا سے چلا گیا تو کیا ہوا...... اور میرے شوہر کو موت آ گئی تو اس سے کیا فرق پڑا؟ ابھی تو زندہ ہے چھوٹے ٹھاکر! میں تیرے خون میں دودھ کے ذریعے اپنی نفرتوں کا زہر بھر دوں گی' پھر جب تو جوان ہو جائے گا تو اس راکشس (امرناتھ) سے میری بے عزتی کا بدلہ لے گا اور ساری دنیا کو بتا دے گا کہ راجپوت کا عہد کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ پران جائے پر وچن نہ جائے۔'' شکنتلا کے سینے میں امیر الدین کے خلاف نفرتوں کا طوفان بھرا ہوا تھا اور ہونٹوں سے انتقام کی آگ برس رہی تھی......

''دونوں بڑے ٹھاکر تو اس دنیا سے ناکام و نامراد چلے گئے' وہ دھوکے باز نہیں تھے' مگر پھر بھی انہوں نے مجھے دھوکا دیا۔ وہ اپنی بیٹی اور بیوہ کو سرعام رسوا کرنے والے سے بدلہ نہ لے سکے...... مگر اے میرے بیٹے! تو اپنی ماں کو مایوس نہ کرنا کہ تو ہی میرا آخری سہارا ہے۔ اس پاپی کا سر کاٹ کر اپنی ماں کے چرنوں میں چڑھا دینا کہ تیری ماں ہی تیرے لئے سب سے بڑی دیوی ہے۔''

شکنتلا کے لئے امیر الدین کی جان لینا اس کے مذہبی احکام سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ شکنتلا کی جنونی کیفیت دیکھ کر بوڑھی نوکرانی گھنٹوں اسے سمجھاتی رہتی۔

''راج کماری! تم نے اپنے دل کو یہ کیسا روگ لگا لیا ہے؟ جو گزر گئی سو گزر گئی بیٹی! اسے بھول جاؤ' دونوں ٹھاکر اپنی ضد پر قربان ہوگئے اور دوسرے راجپوت بھی ایک ایک کر کے اسی طرح جا رہے ہیں۔ تمہیں باہر کی دنیا کا کیا پتا؟ کہنے والے کہتے ہیں کہ تمہارے پتی ٹھاکر روپ سنگھ نے جن لوگوں کو امر ناتھ کے قتل پر مامور کیا تھا ان میں سے کئی راجپوتوں نے اپنا دھرم بدل ڈالا ہے اور اسی جادوگر کی شرن میں چلے گئے ہیں۔''

جذبہ انتقام کی تیز آگ نے شکنتلا کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا' اس کے ذہن میں مثبت فکر کے تمام دریچے بند ہو چکے تھے۔ نتیجتاً وہ اپنی مہربان اور جہاندیدہ نوکرانی پر بری طرح برس پڑتی۔

''مائی! تو نے مجھے جن راجپوتوں کی تبدیلی مذہب کی خبر دی ہے' وہ فطرتاً بزدل ہوں گے' اس لئے باپ دادا کے دھرم سے منہ موڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے' ان کے خون میں کھوٹ ہوگا اور اسی کھوٹ نے انہیں اس جادوگر کی پناہ میں جانے پر مجبور کر دیا ہے...... مگر یاد رکھ کہ میرے خون میں کوئی میل نہیں۔ میرا خون کھرا ہے...... اور کھرے خون والے مر جاتے ہیں' مگر کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتے۔''

شکنتلا اس طرح اپنا نسب نامہ بیان کر رہی تھی' جیسے اس کے سوا ہندوستان میں کوئی دوسرا راجپوت ہی نہ ہو۔

''بیٹی! اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر اور میری باتیں غور سے سن!'' بوڑھی نوکرانی ایک ماں کے لہجے میں شکنتلا کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''بڑے ٹھاکر تو کھرے راجپوت تھے روپ سنگھ کے خون میں تو کوئی کھوٹ نہیں تھا۔'' دراصل بوڑھی نوکرانی مبہم اشاروں میں شکنتلا کو اس کے باپ اور شوہر کا بھیانک انجام یاد دلا کر بتانا چاہتی تھی کہ حضرت موسیٰ عاشقان اور امیر الدین کی مخالفت کے سبب کہیں وہ اپنے بیٹے سے بھی محروم نہ ہو جائے۔

''تو مجھے موت سے ڈراتی ہے پشپا؟'' شکنتلا کا لہجہ کچھ اور غضبناک ہو گیا تھا...... ''دو ٹھاکر چلے گئے تو کیا ہوا؟ ابھی تیسرا ٹھاکر تو باقی ہے۔ میں اپنے عزت و وقار پر اسے بھی قربان کر دوں گی۔''

نوکرانی پشپا خاموش ہو جاتی کہ اس عالم میں شکنتلا کو کوئی نصیحت کرنا بے سود تھا۔ اگر شکنتلا بیوہ نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اس کے سینے میں بھڑکنے والی نفرت و انتقام کی آگ آہستہ آہستہ سرد ہو جاتی...... لیکن بیوگی کے مسلسل عذاب اور ہندو سماج کے بہیمانہ سلوک نے ہمیشہ کے لئے شکنتلا کے ذہن کو تاریک راستوں پر موڑ دیا تھا۔ اس لئے وہ ہر قسم کی روشنی سے یا تو خوف زدہ ہو جاتی تھی یا پھر اس سے نفرت کرنے لگتی تھی۔

¤ ¤ ¤

ایمان اور کفر' محبت اور نفرت' قربانی اور انتقام کی یہ عجیب داستان سنانے کے بعد سید مبارک علی نے بابر اور احمد جمال کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں خوشی کی جھلک بھی تھی اور اداسی کا ہلکا سا رنگ بھی۔

''یہ ہے مقامی ہندوؤں کی نفرت اور بیزاری کا سبب'' مختصر سے وقفہ سکوت کے بعد سید مبارک علی دوبارہ احمد جمال سے مخاطب ہوئے...... ''حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی وجہ سے اجودھیا کے بت خانے میں اتنا بڑا زلزلہ آگیا سب سے بڑے پجاری کا بیٹا مسلمان ہو گیا' دو بڑے ٹھاکر اپنی جان سے گئے' راجپوتوں کی صفوں میں شگاف پڑ گئے' پھر یہاں کے بت پرست اہل اسلام سے کس طرح خوش ہوں گے؟ پتھر کے پجاریوں نے تو سلطان سکندر لودھی کے جاہ و جلال کی بھی پروا نہ کی اور ایک ایسے درویش کے قتل کی منصوبہ بندی کرنے لگے جو سر سے پاؤں تک امن ہی امن اور سلامتی ہی سلامتی ہے۔'' سید مبارک علی کا اشارہ حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی طرف تھا...... ''اللہ شیخ کی عمر دراز کرے اور سالہا سال انہیں ہمارے درمیان موجود رکھے' اگر وہ نہ ہوتے تو اللہ ہی جانے کہ اس بستی میں اس کے نام لیواؤں پر کیا گزرتی؟''

بابر اور احمد جمال بہت دیر تک کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھے رہے' پھر جب سید مبارک علی خاموش ہو گئے تو خانہ بدوش شہنشاہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی ''بزرگ! وہ جانباز لڑکا امیر الدین کہاں ہے؟'' اگرچہ بابر خود بھی سولہ سترہ سال کا لڑکا ہی تھا لیکن حکمران ہونے کے باعث اس کے لہجے میں ایک عجیب سی بردباری آگئی تھی۔

''امیر الدین کہاں جائے گا؟'' سید مبارک علی کے لہجے میں وہی شگفتگی لوٹ آئی تھی...... ''شیخ کا منہ بولا بیٹا ہے' پھر اپنے باپ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے؟''

''وہ بہت بڑا انسان ہے۔ میں اسے دیکھ سکوں گا؟'' شہنشاہ بابر کے لہجے سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

''کیوں نہیں؟'' سید مبارک علی بابر کی بے چینی دیکھ کر مسکرانے لگے ''امیر الدین شیخ کے پاس ہی رہتا ہے کل صبح تم اس خوبصورت اور نرم و نازک لڑکے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے جس کا عزم چٹانوں جیسا ہے۔''

''مگر شیخ؟'' اچانک بابر کے چہرے پر گھبراہٹ سی نمایاں ہو گئی...... ''کیا حضرت موسیٰ عاشقانؒ ہم لوگوں کو شرف باریابی بخش دیں گے؟'' معزول شہنشاہ بابر نے شیخ کے جلال روحانی کے اتنے واقعات سنے تھے کہ اس کے ذہن پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو گیا تھا اور وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کہیں حضرت موسیٰ عاشقانؒ اسے اپنے آستانے سے واپس نہ لوٹا دیں۔

بابر کے اس خوف کی ایک ہی وجہ تھی کہ پہلی بار سمرقند سے نکلنے کے بعد جب احمد جمال نے سید مہدیؒ کا خط دیتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ شہنشاہ بابر ہندوستان کا سفر اختیار کریں...... مگر اس کے جواب میں بابر نے علم نجوم کا سہارا لے کر ہندوستان جانے کے بجائے دوبارہ اپنا رخ سمرقند کی طرف کر لیا تھا۔ دراصل مغل شہنشاہ کی پرورش مادہ پرست حکمرانوں کے درمیان ہوئی تھی' اس لئے وہ روحانیت کا کچھ زیادہ قائل نہیں تھا۔ سید مہدیؒ کا خط پڑھ کر اسے حیرت ضرور ہوئی تھی کہ ایک عام آدمی نے چودہ برس بعد پیش آنے والے واقعات کی تصویر کس طرح دیکھ لی تھی؟ وہ ستاروں کے علم کے مقابلے میں سید مہدیؒ کی روحانی طاقت کا معترف نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مغل فرمانروا نے دوبارہ سمرقند پر حملہ کیا اور اپنے منصوبے میں کامیاب رہا۔ فتح کا نشہ اس قدر تیز تھا کہ ستاروں کے اثرات پر اس کا اعتقاد کچھ اور بڑھ گیا...... لیکن بابر کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس فتح کے عقب میں کھڑی کوئی ذلت آمیز شکست اس کا انتظار کر رہی ہے' پھر جب وہ گداگروں کی حالت میں سمرقند سے نکالا گیا تو اسے اندازہ ہوا

کہ سید مہدیؒ کا علم کیا تھا اور ستارے کیا کہتے تھے؟ آج اجودھیا کی سرائے میں رات کے پچھلے پہر اپنی اس نادانی اور گستاخی کو یاد کر کے بابر لرز اٹھا تھا اور اسی خوف کے عالم میں اس نے سید مبارک علی سے سوال کیا تھا کہ کیا حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اسے اور احمد جمال کو شرف باریابی بخش دیں گے؟

''شیخ کے دروازے تو ان کے دشمنوں پر بھی بند نہیں ہوتے......'' سید مبارک علی نے اسی دل نواز لہجے میں جواب دیا...... ''آپ لوگ تو پھر بھی حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے کلمہ گو بھائی ہیں۔''

احمد جمال پہلے ہی حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سے نادیدہ عقیدت رکھتا تھا۔ سید مبارک علی کی زبانی شیخ کی سرفروشیوں کے واقعات سن کر اس کی عقیدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور وہ بڑی شدت سے اس بات کا منتظر تھا کہ کسی طرح صبح کے آثار پیدا ہوں اور وہ ایک مردِ مومن کے دیدار کی سعادت حاصل کرے جس کا چہرہ خورشید ضیا بار سے بھی زیادہ روشن و تابناک تھا۔

شہنشاہ بابر، احمد جمال اور سید مبارک علی ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکے۔ بابر اس لئے جاگ رہا تھا کہ سورج کی پہلی کرن نمودار ہو اور وہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی بارگاہ جلال میں حاضر ہو کر اپنے اقتدار کی واپسی کے لئے شیخ کی دعاؤں کا طلبگار ہو...... احمد جمال کے دل میں حسرت دید کے سوا کوئی آرزو نہ تھی...... اور سید مبارک علی اپنا گھر چھوڑ کر اس لئے سرائے میں مقیم تھے کہ وہ غریب الوطن مسلمانوں کی تواضع کر سکیں۔ آخر فجر کی اذان ہوئی اور ان تینوں نے اجودھیا شہر کے درمیان بنی ہوئی ایک چھوٹی سی پختہ مسجد میں نماز پڑھی اور دریائے سرجو پار کر کے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی خانقاہ تک پہنچ گئے۔ بابر نے اپنے باقی ساتھیوں کو ٹیلے کے نیچے ہی ٹھہر جانے کا حکم دیا تھا۔ صرف احمد جمال اس کے ہمراہ تھا۔

سید مبارک علی سے تمام درویش آشنا تھے اس لئے وہ شیخ کے خدمت گاروں کی مزاج پرسی کرتے ہوئے موسیٰ عاشقاںؒ کے حجرے کے قریب پہنچے اور اجازت لے کر اندر داخل ہو گئے۔ سید ہونے کے باعث شیخ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

''سید! آپ ٹھیک تو ہیں؟ کئی دن بعد تشریف لائے' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اپنے مصلے پر کھڑے ہوئے اور مبارک علی سے بغلگیر ہو گئے۔

''شیخ! بہت بوڑھا ہو گیا ہوں'' سید مبارک علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب اتنے بلند ٹیلے پر چڑھا نہیں جاتا اور آپ کی بے نیازی کا تو وہی عالم ہے کہ نیچے آنا پسند ہی نہیں کرتے۔'' سید مبارک علی نہایت لطیف پیرائے میں گفتگو کر رہے تھے۔

''سید! کیا بلندی اور کیا پستی؟'' شیخ بھی جواباً مسکرائے۔ ''ایک ویران گوشے میں آ پڑے ہیں' مگر اہل دنیا پھر بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔''

''آخر اہل دنیا کس کے پاس جائیں؟'' سید کا لہجہ محبت آمیز بھی تھا اور عقیدت مندانہ بھی۔ ''آپ کے سوا ان کی کوئی سنتا بھی تو نہیں۔''

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے سر جھکا لیا۔

''اچھا شیخ! اب میں چلوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے سید مبارک علی کھڑے ہو گئے۔

''اتنی جلدی؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ بھی اپنے دیرینہ دوست کو رخصت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

''رات بھر کا جاگا ہوا ہوں' زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔'' سید مبارک علی نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے کچھ مہمانوں کی خانقاہ تک رہنمائی کرنی تھی۔ اس بہانے نیاز بھی حاصل ہو گئے۔''

''کون مہمان؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے چونک کر کہا۔

''شکستہ حال مسافر ہیں۔ بہت دور سے آئے ہیں اور آپ کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔'' سید مبارک علی شیخ سے مصافحہ کر کے باہر نکل آئے۔

''میں نے شیخ کو آپ حضرات کی آمد کی خبر دی ہے۔'' سید مبارک علی بابر اور احمد جمال سے مخاطب ہوئے۔ ''امید ہے کہ بہت جلد باریابی کی اجازت مل جائے گی۔''

سید مبارک علی کے خلوص اور تواضع نے ان دونوں مسافروں کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ ''بزرگ! آپ نے ہماری خاطر بہت زحمت اٹھائی۔ اس عنایت کا بے حد شکریہ۔''

''بزرگ بھی کہتے ہو اور اس کے ساتھ ہی زحمت کا ذکر بھی کرتے ہو' کیسے نادان بچے ہو؟'' سید مبارک علی مسکراتے ہوئے بابر اور احمد جمال دونوں کے کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ''خوش رہو! مگر شیخ کے آستانے سے اس وقت تک نہ اٹھنا جب تک وہ دعا کے لئے ہاتھ نہ اٹھا دیں۔'' یہ کہہ کر سید مبارک علی واپس چلے گئے۔

☐ ☐ ☐

تھوڑی ہی دیر بعد حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے بابر اور احمد جمال کو اپنے حجرے میں طلب کر لیا اور خدمتگار کو ہدایت کر دی کہ کوئی کیسا بھی ضرورت مند ہو' مگر اسے ان کی اجازت کے بغیر اندر نہ بھیجا جائے۔ خادم نے بڑی حیرت سے شیخ کا حکم سنا۔ یہ غیر معمولی حکم تھا ورنہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی برسوں سے یہی عادت تھی کہ آپ نماز فجر سے دن کے گیارہ بجے تک ضرورت مندوں سے ملاقات کرتے تھے۔ اس ذیل میں کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ خانقاہ کا ایک خادم ہر شخص کو اس کی باری پر حجرے میں جانے کی اجازت دیتا تھا۔ اس دوران اگر کوئی صاحب حیثیت انسان آ جاتا تو اسے بھی قطار میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔ شیخ کی خانقاہ کا یہ نظام نہیں تھا کہ امیر و کبیر لوگوں کو دیکھ کر درویش فرش راہ ہو جاتے اور شکستہ حال انسانوں کو نظرانداز کر کے پیچھے دھکیل دیا جاتا۔ وہاں سب برابر تھے اور کوئی تفریق نہیں تھی' مگر آج پہلی بار شیخ نے اپنی اس روایت کو بدل ڈالا تھا۔

خدمت گار کچھ دیر تک انتہائی تجسس کی نظروں سے بابر اور احمد جمال کو دیکھتا رہا' لیکن اسے ان دونوں کے لباس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ وہ انہیں ایک بدحال مسافر ہی سمجھا۔

''شیخ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔'' خدمتگار کا لہجہ بہت شیریں اور متواضع تھا۔

خادم کی بات سن کر مغل شہنشاہ بابر اور احمد جمال نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ چند لمحوں تک ان کے دل کی دھڑکنیں غیر متوازن رہیں اور وہ خادم کی متلاشی نظروں کا یہی مفہوم سمجھتے رہے کہ شیخ نے انہیں اپنے آستانے سے واپس لوٹ جانے کا حکم دیا ہے' پھر جب درویش نے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا مژدہ سنایا تو ان کی جان میں جان آئی۔

بابر حفظ مراتب کے اعتبار سے آگے تھا اور احمد جمال اپنے شہنشاہ کے پیچھے چل رہا تھا۔

حجرے میں داخل ہوکر جیسے ہی بابر کی نظر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے چہرے پر پڑی' اس کے قدم جم کر گئے۔ خانہ بدوش شہنشاہ پر ایک مرد درویش کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اسے اپنا جسم پتھر کا محسوس ہونے لگا۔ وہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ احمد جمال نے بابر کی اوٹ سے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی طرف دیکھا۔ ایک روشن چہرے والے بزرگ انتہائی سادہ اور معمولی لباس میں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ تاج و اورنہ طبل و علم...... نہ شمشیر و سناں تھے اور نہ خدام و سپاہ...... پھر بھی موسیٰ عاشقاں کے جبروت کا یہ عالم تھا کہ کے حضور آنکھوں کے ساتھ دل بھی جھکے جاتے تھے۔ احمد جمال کو عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا جیسے ایک طویل عرصے کے بعد سید مہدیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا ہو۔ احمد جمال چاہتا تھا کہ وہ بے اختیار آگے بڑھے اور اس مرد بزرگ کی قربت کی سعادت حاصل کرے جس کے جلال روحانی سے اجودھیا کے بت خانے کے در و دیوار لرز رہے تھے...... مگر وہ اپنے والہانہ جذبات کے اظہار سے قاصر تھا کہ آداب شاہی کے مطابق اسے مغل شہنشاہ کے بعد ہی حجرے کے اندر داخل ہونا تھا۔

بابر کے حیرت و سکوت کی یہ کیفیت نہ جانے کب تک جاری رہتی کہ اچانک حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے استقبالیہ کلمات نے مغل فرمانروا کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔

''آؤ شہنشاہ! درویش کب سے تمہارا منتظر ہے؟''

بابر پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کہاں فرغانہ و سمرقند اور کہاں اجودھیا؟ پھر سید مہدیؒ اور حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے درمیان ایسا کون سا رابطہ تھا کہ کسی ظاہری تعارف کے بغیر مغل شہنشاہ کی پوری شخصیت بے نقاب ہوگئی تھی۔ گداگروں جیسا حلیہ مگر پکارنے والا اسے شہنشاہ کہہ کر پکار رہا تھا۔ آخر موسیٰ عاشقاں کے پاس وہ کون سا آئینہ تھا جس میں انہیں ایک غریب الوطن اور شکستہ حال انسان کے حقیقی خدوخال نظر آ گئے تھے؟ بابر یہی سوچتا ہوا آگے بڑھا۔ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اپنی نشست پر کھڑے ہوگئے۔ یہ کسی شہنشاہ کا خیر مقدم نہیں تھا' ایک درویش کی تواضع کا انداز تھا۔

بابر جیسا حوصلہ مند فرمانروا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے قریب جاتے ہوئے جھجک رہا تھا' شیخ سے مغل فرمانروا کی دلی کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ نتیجتاً حضرت موسیٰ عاشقاںؒ خود ایک قدم آگے بڑھے اور نہایت پرجوش انداز میں بابر سے مصافحہ کیا۔

''میرے مہمان پر اللہ کی سلامتی ہو۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے خانہ بدوش شہنشاہ کو دعا دی۔ بابر کو محسوس ہوا جیسے جلتے ہوئے موسم میں یکایک ابر چھا گیا ہو اور مشکبار ہوائیں اس کے بدن کو چھو کر گزرنے لگی ہوں۔

''شیخ! میں نے ایسی محبت اور تواضع کہیں نہیں دیکھی'' بابر رک رک کر بول رہا تھا۔

''شہنشاہ نے میرے بھائی سید مہدیؒ کو نہیں دیکھا'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کی محبت کا انداز ساری دنیا سے جداگانہ تھا' یہ ان کی محبت ہی تو ہے جس کے طفیل تم یہاں آ پہنچے ہو۔''

بابر پر ایک بار پھر شدید حیرت کا غلبہ ہوگیا تھا...... مگر حیرت کا یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹ گیا جب حضرت موسیٰ عاشقاںؒ مغل شہنشاہ کا ہاتھ چھوڑ کر احمد جمال کی طرف بڑھے۔

''آ میرے جانباز شہزادے!'' یہ کہہ کر شیخ نے بے اختیار احمد جمال کو گلے سے لگا لیا۔ ''تیرے سوا اس

سید کا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے تو ہی ان کا وارث ہے اور تجھی سے اپنے بھائی کی موت پر تعزیت کرتا ہوں۔''
حضرت موسیٰ عاشقاںؒ سید مہدیؒ کو اپنا بھائی کہا کرتے تھے۔ پھر جب شیخ کی زبان پر اپنے مرحوم بھائی کا ذکر آیا تو آنکھوں سے اشکوں کا آبشار ابل پڑا۔ موسیٰ عاشقاں نے گریہ وزاری تو نہیں کی' مگر اتنا رد ئے کہ ان کی داڑھی اور احمد جمال کا کاندھا بھیگ گیا۔

خود احمد جمال کا بھی یہی حال تھا۔ شیخ کو اپنے سینے پر اس نوجوان کے آنسوؤں کی نمی محسوس ہونے لگی' جو سید مہدیؒ کا وارث بھی تھا اور محبوب بھی۔

بہت دیر بعد اذیت و کرب کی اس طوفانی کیفیت میں اعتدال پیدا ہوا اور موسیٰ عاشقاں احمد جمال کا ہاتھ پکڑ کر اپنی نشست تک لائے۔ پھر شہنشاہ بابر کے لئے سامنے ایک چادر بچھائی اور احمد جمال کو اپنے قریب دائیں جانب بٹھایا۔

موسیٰ عاشقاں کی میزبانی کا مشفقانہ اور بے تکلفانہ انداز دیکھ کر بابر کا خوف زائل ہوگیا تھا اور اب وہ سکون و اطمینان کے ساتھ شیخ کے روبرو بیٹھا تھا۔

''شہنشاہ! آج کل تمہارے ستارے کیا کہتے ہیں؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے بڑے عجیب انداز سے گفتگو کا آغاز کیا۔

بابر ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ شیخ کا اشارہ کس طرف ہے' شرم و ندامت کے باعث مغل شہنشاہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

''ستارے بھی تو کسی کے حکم سے گردش کر رہے ہیں۔'' بابر کو خاموش پا کر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے کہا۔ ''ستاروں سے درخواست کی' آقا کو فراموش کر دیا۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلاموں کی بات مانی' مالک و مختار کو بھول گئے'' شیخ کے لہجے میں طنز کے بجائے ہدایت تھی۔ وہ مغل شہنشاہ کو ستاروں کی بے اثری اور کائنات کے اسرار و رموز سمجھا رہے تھے۔

بابر بدستور سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''تم نے سید مہدیؒ کے علم کی بہت توہین کی شہنشاہ!'' یکایک حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے لہجے سے ناگواری کا اظہار ہونے لگا۔ ''اگر تم سید کے علم کی قدر کرتے تو تمہارے مصائب میں بڑی حد تک کمی آ جاتی اور شاید ذلت و پامالی کی وہ داستان تحریر نہ ہوتی جو ہر وقت تمہارا تعاقب کرتی رہتی ہے۔''

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی بات سن کر بابر لرز اٹھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شیخ کا اشارہ کس طرف ہے؟ چند لمحوں کے لئے مغل شہنشاہ کی آنکھوں کے سامنے وہی اذیت ناک منظر ابھر آیا جب مغل شہزادیاں سمرقند کے محل میں کنیزوں اور باندیوں کی طرح کھڑی تھیں اور شیبانی خان اشیائے بازاری کی طرح ان پر اپنا حق ملکیت ثابت کر رہا تھا۔ شدت کرب سے بابر کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔

''شیخ! آپ کو اپنے بھائی سید مہدیؒ کا واسطہ! میرے کمزور ہاتھوں میں اپنی ساری روحانی طاقت بھر دیجئے'' یہ کہتے کہتے بابر رونے لگا۔

''اس طاقت کا کیا کرو گے شہنشاہ؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے مغل فرمانروا سے پوچھا۔

''شیبانی خان سے اپنی بے آبروئی کا انتقام لوں گا۔'' بابر کے چہرے پر آتش غضب دہک رہی تھی اور

آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

"اس نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے شیخ!"

"شیبانی خان کی اپنی ذاتی حیثیت کیا ہے؟" حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ شیبانی خان صرف ایک درندہ ہے اور اسے اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا خون پی لے جو اللہ کے نافرمان بندے ہیں۔ جب عذاب کا یہ عمل ختم ہوجائے تو موت شیبانی خان کا خون لے گی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔"

"میری پیاس کی شدت کا اندازہ کریں شیخ!" یکایک بابر چیخنے لگا۔ "اور یہ پیاس شیبانی خان کے لہو کے' کسی دوسرے سیال سے نہیں بجھے گی۔"

"صبر کرو شہنشاہ!" حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

بابر کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کہ اس وقت وہ اپنے خدمت گاروں کے درمیان نہیں' ایک بزرگ کی خانقاہ میں موجود ہے۔

"تمہاری زندگی کا مقصد ذاتی انتقام نہیں۔" موسیٰ عاشقاں نے بابر کی تالیف قلب کے لئے کہا۔ "زندہ لوگ مردوں سے نہیں الجھتے۔ شیبانی خان کیا ہے؟ وہ بھی ایک مردہ ہے۔"

"پھر میں کیا کروں شیخ؟"

بابر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"مظلوموں کی حمایت اور ظالموں سے جنگ۔" حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کہا۔

"پیروں کے نیچے ایک گز زمین نہیں اور......" حیرت کی زیادتی کے سبب بابر کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"زمین بھی مل جائے گی اور طاقت بھی۔ دینے والے کی بخشش و عطا کا کوئی ٹھکانا نہیں۔" موسیٰ عاشقاں بابر کو فتح و نصرت کی خوشخبری دے رہے تھے اور خانہ بدوش شہنشاہ آنکھیں پھاڑے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "جب تمہیں اقتدار مل جائے تو میری مزدوری مجھے دے دینا۔"

"کیسی مزدوری شیخ؟" بابر کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔

"آخر تمہارے لئے دعائیں کروں گا اور دعاؤں میں بڑی محنت ہوتی ہے۔ تو کیا تم مجھے میری محنت کی اجرت نہیں دو گے؟" حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی کتنی مزدوری ہوگی شیخ؟" بابر ابھی تک موسیٰ عاشقاں کے اشارے کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔ "میں اپنے دشمنوں پر غلبہ پا گیا تو آپ کے قدموں میں سیم و زر کے انبار لگا دوں گا۔"

"مال و دولت کے ڈھیر تمہیں مبارک ہوں شہنشاہ!"

موسیٰ عاشقاں کے ہونٹوں پر وہی تبسم تھا۔

"فقیر کی تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ اس ویران ٹیلے پر ایک مسجد تعمیر کر دینا۔ بہت خوبصورت بلند و بالا مسجد۔"

مزدوری کی وضاحت سن کر بابر حیران رہ گیا۔ "آپ اپنی اس خواہش کا اظہار تو سلطان سکندر لودھی کے سامنے بھی کر سکتے تھے' سید مبارک علی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ خدا پرست اور نیک دل حکمران ہیں۔"

"اللہ ان کی نیکیوں میں مزید اضافہ کرے' مگر میرا دل بھی تو کوئی چیز ہے۔"

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا لہجہ اچانک پرسوز ہوگیا تھا۔ "دل نے کہا کہ تم سے مزدوری طلب کروں۔ اگر نہیں دیتے تو اللہ تمہارا بھی بھلا کرے۔ میں تو مزدور ہوں۔ کوئی اور دروازہ دیکھ لوں گا۔"

"نہیں شیخ! میرے لئے اس سعادت کا دروازہ بند نہ کیجئے۔"

بابر نے گھبرا کر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے زانو پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

"میں گنہگار ہی آپ کی اس خواہش کی تکمیل کروں گا۔"

جواب میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر اس دعا میں بابر اور احمد جمال بھی شریک ہوگئے۔

دعا کے بعد حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ مہمانوں کے لئے کھانا لگا دے اور وہ مہمان نیچے کھڑے ہیں انہیں بھی اوپر بلا لے۔ اس دوران امیر الدین بھی ضرورت کی چیزیں خرید کر واپس آ گیا تھا۔ بابر اور احمد جمال اس خوبصورت نوجوان کو دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر اس طرح اس سے گلے ملے کہ جیسے وہ ان کا بھی عزیز ہو۔

بابر' احمد جمال اور امیر الدین ترکاری کے ساتھ تازہ پکی ہوئی روٹی کھا رہے تھے' مگر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا کھانا ان سب سے الگ تھا۔ شیخ نمک کے پانی میں خشک روٹی کو بار بار بھگوتے اور اسے حلق سے اتار لیتے۔

کھانا ختم ہوا تو حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے امیر الدین کو حکم دیا کہ وہ باورچی خانے میں رکھا ہوا خوان اٹھا لائے۔ امیر الدین واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک خوان تھا جس پر کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ شیخ نے کپڑا ہٹایا تو بابر کو سوکھی روٹیوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اپنے کاندھے پر پڑا ہوا رومال اتارا اور اسے فرش پر بچھا دیا۔ پھر گن گن کر رومال پر روٹیاں رکھنے لگے۔ یہاں تک کہ جب روٹیوں کی تعداد 33 ہوگئی تو شیخ نے رومال میں گرہ لگا دی اور اسے بابر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شہنشاہ! یہ تمہارے لئے فقیر کی طرف سے تحفہ ہے۔ ان تمام روٹیوں کو راستے میں کھا لینا۔ ایک ٹکڑا بھی زمین پر نہ گرے اور نہ اسے کوئی دوسرا کھائے۔ بس یہ تمہارا سامان رسد ہے۔"

بابر اور احمد جمال بڑی حیرت سے شیخ کے اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔ خود امیر الدین بھی متعجب تھا کہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے آج تک کسی ضرورت مند یا مسافر کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا تھا۔

اچانک ایک خادم گھبرایا ہوا حجرے میں داخل ہوا "شیخ! اجودھیا کے ہزاروں مسلح راجپوت خانقاہ کی طرف آرہے ہیں۔"

واقعہ یوں تھا کہ مقامی ہندوؤں نے بابر اور اس کے مسلح سپاہیوں کو شہر میں داخل ہوتے دیکھا تھا' لیکن مسافر سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا' مگر جب وہ لوگ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی خانقاہ میں پہنچے اور وہاں دیر تک قیام کیا تو بعض شرپسندوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ شیخ آہستہ آہستہ اپنے حامی جمع کر رہے ہیں اور پھر مناسب موقع ملتے ہی وہ ہندوؤں کی بستیوں پر حملہ کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیں گے۔ بت پرستوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرتیں تو پہلے ہی موجود تھیں۔ یہ خبر سنی تو پورا شہر پاگل ہوگیا اور ایک ایک راجپوت

مسلح ہو کر اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ٹھاکر ہمیر سنگھ اپنے فوجی دستے کے ساتھ آگے آگے تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''آج سو دشمن آئے ہیں۔ کل ہزار آئیں گے' اور پھر پورا اجودھیا دشمنوں سے بھر جائے گا۔ اس وقت تم کہاں رہو گے؟''

''اجودھیا صرف ہمارا ہے۔ ہم یہاں کسی غیر کا وجود برداشت نہیں کریں گے۔'' جواب میں دوسرے راجپوت فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی خانقاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

⌑ ⌑ ⌑

حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے بڑی حیرت سے یہ خبر سنی' ہزاروں مسلح راجپوتوں کا خانقاہ کی طرف آنا ایک ہر معمولی واقعہ تھا۔ بابر اور احمد جمال نے پریشان نظروں سے شیخ کی طرف دیکھا' مگر شیخ کے چہرے پر فکر کی ھندلی سی بھی کوئی علامت نہیں تھی۔ البتہ انہیں تعجب ضرور تھا۔

''آخر وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اپنے خدمت گار سے پوچھا۔

''شیخ! میں ان کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' خدمت گار نے بہت آہستہ سے کہا...... ''میں اور بابا اسحاق آپ کے حکم کے مطابق مسافروں کے گھوڑوں کی نگرانی کر رہے تھے کہ اچانک اجپوت سپاہیوں کا ایک غول دریا کے کنارے نمودار ہوا۔ پھر انہیں خانقاہ کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں اوپر چلا آیا اکہ شیخ کو بروقت اطلاع دے سکوں۔''

''بابا! تم دوبارہ نیچے جاؤ اور راجپوتوں سے دریافت کرو کہ وہ یہاں کس لئے آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ وہ اپنے ہر خدمت گار کو اسی طرح بابا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

خدمت گار واپس چلا گیا۔ اس دوران تمام مسلح راجپوت ٹیلے کے نیچے پہنچ گئے تھے اور انہوں نے بابر اور ں کے سپاہیوں کے گھوڑوں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' خدمت گار نے شیخ کے حکم کے مطابق حرف بہ حرف ہی الفاظ دہرا دیئے۔

''ان گھوڑوں کے مالک کہاں ہیں؟'' ایک راجپوت نے کرخت اور بلند آواز میں کہا جو ٹھاکر ہمیر سنگھ کا ست راست تھا۔ ''انہیں بے چوں و چرا ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ بس ہم یہی چاہتے ہیں۔'' راجپوت کے لہجے سے تحکم کا انداز صاف جھلک رہا تھا۔

''وہ لوگ مسافر ہیں اور اس وقت شیخ کے مہمان ہیں۔ پھر انہیں تمہارے حوالے کیسے کیا جا سکتا ہے؟'' ضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے خدمت گار نے بے خوف و خطر کہا۔ درویش کی نظروں میں راجپوتوں کی افرادی قوت اور ان کے تباہ کار ہتھیاروں کی کوئی حقیقت نہیں تھی...... ''شیخ کے مہمانوں سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ وہ جب تک ہیں کے یہاں رہیں گے اور جب چاہیں گے چلے جائیں گے۔''

''یہ ہمارا شہر ہے اور ہم اپنے شہر میں داخل ہونے والوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔'' راجپوت نے بدستور

درشت لہجے میں کہا۔ ''آج تک تمہارے شیخ کے یہاں اس انداز کے مہمان نہیں آئے۔ ان کے پاس سوے بھی ہیں اور ہتھیار بھی۔ یہ کیسے مہمان ہیں جو اپنی صورتوں سے لٹیرے لگتے ہیں۔ اپنے شیخ سے جا کر کہہ دو کہ وہ تمام مہمانوں کو نیچے بھیج دیں۔ ہم ان سے پوچھ گچھ کئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔''

خدمت گار خانقاہ کی طرف واپس جانے لگا تو ٹھاکر ہمیر سنگھ نے پکار کر کہا۔ ''ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

موسیٰ عاشقاںؒ کے خدمت گار نے ٹھاکر ہمیر سنگھ کی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھر راجپوت سردار اپنی شمشیر بے نیام کے ساتھ درویش کے پیچھے پیچھے ٹیلے پر چڑھا اور خانقاہ کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

خدمت گار نے موسیٰ عاشقاںؒ کے روبرو حاضر ہو کر مسلح ہندوؤں کی آمد کا مقصد بیان کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ٹھاکر ہمیر سنگھ جواب کے انتظار میں خانقاہ کے دروازے پر کھڑا ہے۔

''طاقت کے نشے میں وہ یہاں تک آ پہنچا ہے؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ خدمت گار کی بات سن کر مسکرائے۔

بابر پریشان تو نہیں تھا' مگر اسے یہ ندامت ضرور محسوس ہو رہی تھی کہ ان لوگوں کی وجہ سے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کو خواہ مخواہ ایک زحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ پھر جب مغل فرمانروا بابر نے شیخ کے حضور اپنے ان جذبات کا اظہار کیا تو حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے مضطرب ہو کر بابر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''شہنشاہ! مہمان کبھی زحمت نہیں ہوتے۔''

یہ کہہ کر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے خانقاہ کے دروازے پر پہنچے' جہاں ٹھاکر ہمیر سنگھ شدید پیچ و تاب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔

''کیا بات ہے ٹھاکر؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے اپنے روایتی شیریں لہجے کے ساتھ راجپوت سردار سے پوچھا۔

''کچھ نہیں' کچھ نہیں۔'' ٹھاکر موسیٰ عاشقاں کو اپنے قریب پا کر گھبرا گیا' بات کرنے میں اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ تمہیں میرے مہمانوں کی آمد پر اعتراض ہے۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا اور ان کی آواز سے جلال روحانی کا اظہار ہونے لگا تھا...... ''کیا تم لوگوں نے ایسا کوئی قانون بنایا ہے کہ میرے مہمان تم لوگوں سے اجازت لے کر خانقاہ میں داخل ہوں گے؟''

ٹھاکر ہمیر سنگھ شیخ کے سوال کا جواب دینا چاہتا تھا' مگر اسے اپنی قوت گویائی سلب ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی' اس لئے خاموش کھڑا رہا۔

''میں نے تو ایسا کوئی قانون نہیں بنایا کہ تمہارے مہمانوں کو تم تک پہنچنے کے لئے مجھ سے اجازت حاصل کرنی ہوگی'' ...... حضرت موسیٰ عاشقاںؒ بڑے منطقی انداز میں گفتگو کر رہے تھے...... ''اور مجھے تمہارے معاملات میں مداخلت کا حق بھی نہیں' پھر تم میرے کاموں میں رکاوٹیں کیوں ڈالتے ہو؟ ٹھاکر! زندہ رہنے کی باتیں کرو...... اور زندہ رہنے والوں کے یہ انداز نہیں ہوتے۔'' شیخ نے چند لفظوں میں ہمیر سنگھ کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

...یوں ہی چلا آیا تھا۔'' درندوں جیسی آواز میں بولنے والا ہمیر سنگھ گداگروں کے سے لہجے میں ...ت کر رہا تھا...... ''مجھ سے لوگوں نے کہا تھا کہ مشکوک حلیے کے کچھ اجنبی اس طرف آئے ہیں...... مجبوراً مجھے ...ہاں آنا پڑا۔ آخر بستی والوں کے جان و مال کی حفاظت میرا فرض ہے...... اور یہی فرض میرے قدموں کو ادھر ...ھینچ لایا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ تمہارے مہمان ہیں۔'' ہمیر سنگھ نظریں چرا کر بول رہا تھا...... ''سو میں جا رہا ...ں۔ مجھے تمہارے مہمانوں کی آمد پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' یہ ٹھاکر کے اپنے دل کی آواز نہیں تھی' مگر وہ ...ضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے سامنے مردہ لہجے میں بات کرنے پر مجبور تھا۔

''ہاں! وہ میرے مہمان ہیں۔'' شیخ نے اسی پر جلال آواز میں کہا...... ''اور میرے مہمانوں کا راستہ روکنے ...لا اس بستی میں کوئی موجود نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں' میرے مہمان بھی اسی طرح آزادانہ سر اٹھائے آتے ...ہیں گے...... اور جس دن ان کا راستہ روکنے کے لئے ظلم کی دیوار کھڑی کی گئی' وہ اس بستی کے رہنے والوں کی ...دگی کا آخری دن ہوگا۔''

ٹھاکر ہمیر سنگھ سر جھکائے لرزتے قدموں کے ساتھ واپس جانے لگا۔

اس دوران بابر' احمد جمال اور دوسرے درویش بھی حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے ...ے۔

کچھ دیر بعد ٹھاکر ہمیر سنگھ اپنے مسلح ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام بت پرست دریا ...طرف جانے لگا۔ راجپوت سردار نے اپنے سپاہیوں سے کہا تھا۔

''وہ لوگ اسی راستے سے واپس جائیں گے۔ ہمیں ان کا انتظار کرنا چاہئے۔ میں نے وہاں کشت و خون ...اسب نہیں سمجھا۔'' ٹھاکر ہمیر سنگھ نے بڑی ہوشیاری سے اپنی دہشت پر الفاظ کا پردہ ڈال دیا تھا...... ''مسلمانوں کی ...ادت گاہ پر حملہ کر دینا' عقل و ہوش کی بات نہیں' ایک نہ ایک دن سلطان سکندر لودھی کو اس واقعے کی خبر ...جائے گی اور پھر ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا' اس لئے تم ان لٹیروں کی گھات میں رہو۔ جیسے ہی وہ دریا پار ...ر کے ادھر آئیں' تم انہیں چاروں طرف سے گھیر لو۔ اس طرح دشمن بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے اور سلطان ...ے ٹھاکر کی وفاداری پر بھی کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

مسلح راجپوتوں نے اپنے سردار کی تجویز سے مکمل اتفاق کیا اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر گھنے ...نگلوں کی طرف بڑھنے لگے تاکہ بے خبری کے عالم میں بابر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہو سکیں۔

ادھر ٹھاکر ہمیر سنگھ کے سپاہی اور دوسرے مسلح ہندو اپنے لئے کمیں گاہیں تلاش کر رہے تھے...... اور ادھر ...ضرت موسیٰ عاشقاںؒ بابر سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے۔

''مجھے ٹھاکر کی نیت پر اعتبار نہیں' اس نے وقتی طور پر منافقانہ روش اختیار کر لی ہے' مگر موقع ملتے ہی وہ بار بار راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔''

''شیخ! ہمیں تو صرف آپ کا اور اجودھیا کے مسلمانوں کا لحاظ ہے ورنہ ہم اس بے سروسامانی کے عالم ...ں بھی ٹھاکر کے ایک ایک سوال کا جواب دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔'' بابر کا چہرہ تمتمانے لگا تھا جیسے دھوپ کی ...دت سے کوئی چٹان تپنے لگی ہو۔ ''گردش ایام تو وحشتوں کی اس داستان کو فراموش کر سکتی ہے' مگر میں آخری ...انس تک اس واقعے کو نہیں بھولوں گا کہ پتھروں کی بستی میں لالہ و گل کے سفیروں کو بہت ستایا گیا ہے۔ کبھی تو

خالق ارض وسما کمزور بازوؤں کو توانائی بخشنے گا' پھر میں طاقت کے پجاریوں سے پوچھوں گا کہ تم نے امن اور سلامتی کے نقیبوں سے اس قدر بہیمانہ سلوک کیوں کیا تھا؟'' بابر بہت زیادہ جذباتی نظر آ رہا تھا۔

''شہنشاہ! اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے انتہائی پرسوز لہجے میں کہا...... ''وہ تمہیں اتنا دے گا کہ تمہارا دامن تنگ ہو جائے گا۔ بتوں کے آگے سر جھکانے والے ازلی اندھے ہیں۔ انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا' تم اطمینان سے گزر جاؤ' موج دریا کی طرح' تیز ہوا کے جھونکوں کی طرح' اللہ تمہارا محافظ ہے اور اس کے سایہ کرم کے سوا دنیا میں کوئی پناہ گاہ نہیں۔'' یہ کہہ کر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے مغل شہنشاہ کو سینے سے لگایا اور کچھ دیر تک اسی حالت میں کھڑے رہے۔

پھر احمد جمال کی طرف دونوں بازو پھیلا دیئے۔ شیخ احمد غیاث کے بیٹے نے موسیٰ عاشقاں کے سینے پر سر رکھ دیا اور بے اختیار رونے لگا۔

''وصال اور فراق...... خوشی اور غم...... فتح اور شکست...... سب فانی ہیں' کسی کو بقا نہیں...... بس وہ ایک ذات اور اس ذات سے محبت' اس کے سوا کچھ نہیں...... ہاں! کچھ بھی نہیں......'' موسیٰ عاشقاں بھی احمد جمال کی جذباتی کیفیت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے تھے...... ''پہلے شمشیر' پھر قلم...... پہلے میدانِ کارزار' پھر مدرسہ و خانقاہ...... صبر اور اس کی رحمت کا انتظار' اس کے سوا کچھ نہیں۔'' احمد جمال نے چونک کر سر اٹھایا اور اشک بار آنکھوں سے شیخ کی طرف دیکھا۔ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے چند اشاروں میں اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

پھر احمد جمال امیر الدین سے بڑے والہانہ انداز میں گلے ملا...... ''میرے بھائی! تیری یادیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔ تو بھی میری طرح ہے' سینہ چاک' حسرت و ارمان کی خاک۔ اللہ تیرے زخموں کو اور گہرا کر دے کہ یہ زخم ہی لذت حیات ہے' سامان کیف و نشاط ہے۔ میں کہیں بھی رہوں مگر تجھ سے ملنے ایک بار ضرور آؤں گا کہ تو میری ہی ذات کا عکس ہے۔''

امیر الدین فارسی زبان سے ناآشنا تھا' اس لئے احمد جمال کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا...... مگر جب حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے مقامی زبان میں احمد جمال کے جذبات کی ترجمانی کی تو امیر الدین بھی رونے لگا' اگرچہ امیر الدین احمد جمال کے ذاتی حالات سے ناآشنا تھا' لیکن پھر بھی اسے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بھائی' کوئی دوست' کوئی غمگسار اس سے بچھڑ کر بہت دور جا رہا ہو۔

بابر اور اس کے سپاہی آہستہ آہستہ ٹیلے سے اترنے لگے' خانہ بدوش شہنشاہ نے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ ٹھاکر ہمیر سنگھ اور اس کے مسلح ساتھیوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا' بس اکیلے بابا اسحاق مغل فرمانروا کے گھوڑوں کی نگرانی کر رہے تھے۔

بابر کے نیچے پہنچتے ہی حضرت موسیٰ عاشقاںؒ نے مٹھی بھر کر کنکریاں اٹھائیں اور ان پر ''سورہ یٰسین'' کی یہ آیت دم کر دی۔

''ہم نے ان کی آنکھوں کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دی ہے' اس لئے وہ تمہیں دیکھ ہی نہیں سکتے۔''

شیخ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کر کے تمام کنکریاں فضا میں اچھال دیں۔

بابر اور اس کے سپاہی گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوئے' پھر مغل فرمانروا اور اس کے تمام ساتھیوں نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ غریب الوطن لشکر حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی خدمت میں آخری سلام پیش کر رہا تھا۔

جواب میں شیخ نے بھی دونوں ہاتھ اس طرح بلند کر دیئے' جیسے وہ اپنے بچوں کے لئے سلامتی کی دعا مانگ رہے ہوں۔

☆☆☆

بابر بے خوف و خطر آگے بڑھا اور اس نے پایاب راستے سے اپنا گھوڑا دریائے سرجو میں اتار دیا۔ کمیں گاہوں میں چھپے ہوئے راجپوتوں نے اجنبیوں کے دستے کو اپنی طرف آتے دیکھا' اس وقت ان کے سینوں میں دبا دبا ایسا ہی جوش تھا جیسے بہت دیر سے جنگل کے درمیان بھٹکتا ہوا شکاری کسی جانور کو اپنے قریب پا کر بے قابو ہو جاتا ہو۔

''ٹھاکر! وہ آ رہے ہیں۔'' ہمیر سنگھ کے دست راست بلبیر نے تیز سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''سب لوگ باہر نکل آؤ اور آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لو۔''...... ٹھاکر ہمیر سنگھ اس طرح چیخا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھپے ہوئے تمام مسلح ہندو اس کی آواز سن لیں۔

اور پھر آن کی آن میں سارے بت پرست اپنی کمیں گاہوں سے نکل کر میدان کی طرف بڑھے' مسلح راجپوتوں اور بابر کے سپاہیوں کے درمیان سو گز سے زیادہ فاصلہ حائل نہیں تھا...... مگر اس وقت ان لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں دور دور تک اجنبی دستے کا ایک سوار بھی نظر نہیں آیا' پتھر کے پجاری شدید بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' ٹھاکر نے گرج کر بلبیر سنگھ سے پوچھا' اس کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

''یہیں تھے ٹھاکر!'' بلبیر سنگھ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''سب کے سب یہیں تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں زمین نگل گئی۔''

''زمین اتنے آدمیوں کو کیسے نگل سکتی ہے؟ تیری آنکھوں نے تجھے دھوکہ دیا ہے'' ٹھاکر ہمیر سنگھ کے غصے کی آگ کچھ اور بھڑک گئی۔

''نہیں ٹھاکر! ہماری آنکھوں نے بھی انہیں اسی طرف آتے دیکھا تھا'' بیک وقت کئی راجپوت سپاہیوں نے بلبیر سنگھ کے دعوے کی تائید کی۔

''پھر وہ کہاں گئے؟'' ہمیر سنگھ کسی زخمی درندے کی طرح دھاڑ رہا تھا...... ''تلاش کرو انہیں۔''

ابھی فضا میں ٹھاکر کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ کئی راجپوت سواروں نے چاروں طرف اپنے گھوڑے دوڑا دیئے...... مگر وہ بابر اور اسکے سپاہیوں کو کہاں تلاش کرتے؟ مغل شہنشاہ اور اس کے ساتھی تو بت پرستوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ قدرت نے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھینچ دی تھی۔ راجپوت سوار بہت دیر تک اجنبیوں کو ڈھونڈتے رہے...... اور وہ اجنبی اجودھیا کی حدود سے نکل کر اپنے راستے پر گامزن ہو گئے۔

☆☆☆

اگرچہ ہندوستان سے واپسی میں دولت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی طاقتور لشکر بابر کے ہاتھ نہیں آیا تھا' لیکن پھر

بھی معزول شہنشاہ کو ایک عجیب سی تقویت حاصل تھی' حضرت موسیٰ عاشقانؒ کے فرمودات اور اشارات نے اسے بڑا حوصلہ بخشا تھا...... مگر ایک دنیا دار انسان ہونے کے باعث وہ شیخ کی بعض باتوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ جب بھی وہ راستے میں خیمہ زن ہوتا تو احمد جمال سے اس موضوع پر ضرور گفتگو کرتا۔

''میرا ہندوستان سے کیا تعلق ہے؟ ایک تو یہ بے کیف اور بے رنگ علاقہ ذاتی طور پر مجھے پسند نہیں۔'' بابر کو اس خانہ بدوشی کے دوران ہندوستان کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی...... ''دوسرے یہ کہ میں کس طرح ہندوستان واپس آؤں گا۔ بظاہر اس کے دھندلے سے آثار بھی نظر نہیں آتے...... اور پھر میرا علم نجوم بھی اس علاقے کی نشاندہی نہیں کرتا۔''

احمد جمال کو بابر کے اس طرز کلام سے شدید تکلیف پہنچی اور وہ انتہائی ضبط کے باوجود خاموش نہ رہ سکا۔ ''حضرت شیخ نے اس علم کے غیر معتبر ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر بھی شہنشاہ ستاروں کی رفتار کو اہمیت دے رہے ہیں۔''

''میں شیخ کے احترام میں علم نجوم کی افادیت بیان نہ کر سکا' مگر ستاروں کی چالیں بے حقیقت نہیں ہیں۔'' بابر ایک بار پھر علم نجوم کی پرزور وکالت کر رہا تھا۔

''تو پھر شیخ کی ذات کو بھی فراموش کر دیجئے اور اس عہد کو بھی بھول جایئے جو آپ نے ایک شکستہ جھونپڑی میں ایک فاقہ کش درویش سے کیا تھا۔'' احمد جمال کے لہجے میں تلخی کے بجائے بے نیازی تھی' جیسے اس نے خانہ بدوش شہنشاہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہو۔

بابر احمد جمال کے طرز گفتار پر چونک اٹھا...... ''نہیں احمد! میں عہد شکن نہیں ہوں' بس عقل کی روشنی میں حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''تو پھر سید مہدیؒ اور موسیٰ عاشقاں کے ہوش و خرد کو بھی اہمیت دیجئے۔'' احمد جمال کا لہجہ خالص ناصحانہ تھا...... ''ہم لوگ راجپوتوں کے ہجوم سے اس طرح نکل آئے کہ وہ نابینا انسانوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے ہی رہے۔ اس وقت ہماری عقل تو یہی کہہ رہی تھی کہ ہم لوگ دشمنوں کے نرغے میں گھر جائیں گے۔ پھر خون کی ندیاں بہیں گی' جس کے نتیجے میں کون زندہ بچے گا اور کون رزق خاک ہو جائے گا' یہ کسی کو خبر نہیں تھی۔''

بابر خاموش ہو گیا۔ دراصل اس نے مادہ پرستی کے ماحول میں پرورش پائی تھی' جہاں اللہ پر بھروسہ کرنے کے بجائے ستاروں کی رفتار سے ہدایت حاصل کی جاتی تھی' اگرچہ مولانا قاضی نے مذہبی خطوط پر اس کی تربیت کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن وہ آج بھی اپنے آباؤ اجداد کی رسموں کا اسیر تھا۔ سید مہدیؒ کے خط اور حضرت موسیٰ عاشقاں کی کرامات دیکھنے کے باوجود وہ روحانیت پر زیادہ یقین نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک ویران جنگل میں رات کے وقت احمد جمال سے ستاروں کی باتیں کر رہا تھا' سفر کے دوران ہی بابر نے کئی بار اپنے مستقبل کے سلسلے میں زائچے تیار کئے تھے' لیکن کوئی ایک ستارہ بھی اس طرف اشارہ نہیں کر رہا تھا کہ اس کی آئندہ منزل ہندوستان ہوگی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بابر دوبارہ احمد جمال سے مخاطب ہوا...... ''ہندوستان کی تسخیر اور اجودھیا میں مسجد کی تعمیر' یہ ایسی باتیں ہیں جو ماہ و سال کے پردے میں پوشیدہ ہیں۔ جب پردہ اٹھے گا تو انسانی آنکھ کچھ

سمجھنے کے قابل ہو سکے گی...... مگر شیخ کے اس عمل کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''کون سا عمل؟'' احمد جمال نے حیرت زدہ لہجے میں عرض کیا۔

''شیخ نے گن کر مجھے 33 روٹیاں دیں۔ آخر یہ مخصوص تعداد کیوں؟'' بابر نے انتہائی تعجب کے ساتھ کہا...... ''یہ روٹیاں بغیر شمار کے بھی دی جا سکتی تھیں۔''

احمد جمال کو شیخ کا یہ عمل کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اس لئے بابر کے سوال کا جواب دینے سے عاجز رہا...... ''شہنشاہ! اس راز کو پردے ہی میں رہنے دیجئے۔ درویشوں کی باتوں کو طشت از بام نہیں کرتے' مخصوص تعداد میں روٹیاں دینے کا مفہوم کچھ بھی ہو' مگر میرے نزدیک آپ ایک خوش نصیب انسان ہیں' وقت ثابت کر دے گا کہ شیخ کا عطیہ بڑی نعمت ہے۔ آپ اس کی قدر کیجئے اور اپنے ذہن کو اندیشوں کی زنجیر سے رہائی دیجئے۔''

ہندوستان کے تھکا دینے والے سفر اور حضرت موسیٰ عاشقانؒ سے لمحاتی ملاقات کے قصے ختم ہوئے تو بابر کو اپنی والدہ قتلغ خانم' چھوٹی بہن خانزاد بیگم اور دوسری مغل شہزادیوں کی یاد ستانے لگتی...... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے معزول شہنشاہ کو محسوس ہونے لگتا کہ دشت و بیاباں ایک ماتم کدہ بن گئے ہیں' ہر طرف نسوانی چیخیں گونج رہی ہیں۔ اذیت و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں۔

''تم لوگ ہمیں اس حال میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟''

یہ چیخیں بابر کے دل و جاں میں اتر گئی تھیں' پھر ان چیخوں کے شور سے گھبرا کر وہ خود بھی چیخنے لگتا۔

''انتظار کے دن ختم ہوئے۔ بس میں تم تک پہنچنے ہی والا ہوں۔''

بابر کی یہ چیخ اس قدر تیز ہوئی کہ احمد جمال بھی سوتے سے جاگ اٹھا۔ اور اپنے غمزدہ شہنشاہ کو تسلیاں دینے لگا۔

''احمد جمال! کیا کسی حکمران پر ایسے مصائب بھی نازل ہوئے ہیں؟'' بابر کی آواز شدت غم سے لرزنے لگتی اور آنکھوں سے بند ٹوٹ جاتے۔

احمد جمال انسانی تاریخ سے ایسے کئی حوالے پیش کرتا جو مغل شہزادیوں کی اسیری سے بھی زیادہ لرزہ خیز اور دردناک تھے۔ پھر شہنشاہ کے سلگتے ہوئے زخموں پر اس طرح الفاظ کا مرہم رکھتا۔

''اللہ کمزور انسانوں کو ایسی آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ وہ بنی نوع آدم کی قوت برداشت دیکھ کر غم عطا کرتا ہے۔ غم جتنا شدید ہوگا' آنے والی خوشی اتنی ہی لذت انگیز ہوگی۔'' احمد جمال بڑے حوصلے کی باتیں کرتا مگر کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ بابر کی طرح وہ بھی اندر سے زخمی ہے اور عالیہ تاجدار کی یادیں اسے بھی چین سے سونے نہیں دیتی ہیں۔

بابر فوراً ہی سنبھل جاتا اور اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھا دیتا...... مگر معزول شہنشاہ اس راز سے بے خبر تھا کہ وقت کی رفتار اس کے حق میں نہیں ہے۔

⌑ ⌑ ⌑

جب بابر' احمد جمال اور دوسرے مغل سپاہی اجودھیا کی طرف بڑھ رہے تھے' اسی وقت خانزاد بیگم اور عالیہ تاجدار کی قسمتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا' خانزاد بیگم نے دو چار دن آنسو بہائے' اس ظلم ناروا کے خلاف

احتجاج کیا' مگر شیبانی خان جیسا سفاک انسان عورتوں کے ان روایتی ہتھیاروں سے متاثر ہونے والا نہیں تھا آخر اس نے اسلامی شریعت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے خانہ زاد بیگم کی حقیقی خالہ کو طلاق دے دی۔ اس طرح شہنشاہ بابر کی پھوپی بہن شیبانی خان کے شبستان ہوس میں داخل ہوگئی۔ اگرچہ خانہ زاد بیگم از۔ سردار کی قانونی بیوی تھی لیکن شیبانی خان اسے ایک خوبصورت کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس ایسے بیشمار کھلونے جی بھر جانے کے بعد اپنے عشرت کدے سے اٹھا کر باہر پھینک دیئے تھے' شیبانی خان ... ست ہونے کے ساتھ انتہائی عیار انسان تھا۔ وہ اپنی قوم کو مطمئن کرنے کے لئے اسلامی قانون کی پناہ لیتا تھا تاکہ علماء اور سادہ دل لوگ اس پر قانون شکنی کا الزام عائد نہ کرسکیں۔ اپنی ہوس کی تسکین کے لئے ...ون سے یہی چال چل رہا تھا۔ شیبانی خان ایک وقت میں چار بیویاں رکھتا تھا۔ پھر جب اسے کوئی ...شیزہ پسند آجاتی تو وہ ایک بیوی کو طلاق دے دیتا' کبھی کبھی تو یوں ہوتا کہ کوئی عورت دو چار دن ہی شیبانی خان کے نکاح میں رہتی۔ پھر اسے مہر کی رقم ادا کرکے اس طرح محل سے نکال دیا جاتا جیسے وہ بیوی نہ ہو' زرخرید کنیز ہو۔

خانہ زاد بیگم اس حادثے کو نوشتہ تقدیر جان کر مطمئن ہوگئی تھی' مگر شہنشاہ بابر کی بہن کا یہ اطمینان اس ... غارت ہوگیا' جب شیبانی خان نے شب عروسی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آج کا دن میری زندگی کا یادگار دن ہے۔'' شیبانی خان کے لہجے میں بڑی شدت تھی۔

خانہ زاد بیگم نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ معصوم لڑکی سمجھ رہی تھی کہ شیبانی خان ایسے کیف لمحات میں اس کے حسن کی تعریف کرے گا...... مگر جب ازبک سردار نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا تو خانہ بیگم کی خوش فہمی کا محل آن کی آن میں زمیں بوس ہوگیا۔

''آج خاندان تیمور کی ایک سرکش دوشیزہ اس طرح میرے تصرف میں ہے کہ میں اسے ملکہ عالیہ کا خطاب عطا کردوں یا پھر ایک ادنیٰ کنیز بنا کر چھوڑ دوں۔''

اب خانہ زاد بیگم پر یہ حقیقت ظاہر ہوگئی تھی کہ شیبانی خان نے اس کے حسن سے متاثر ہوکر شادی نہیں ... ہے بلکہ وہ درندہ اس انداز سے آل تیمور کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے۔

ابھی اس شادی کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن شیبانی خان نے عالیہ تاجدار کو دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگرچہ عالیہ تاجدار عمر میں خانہ زاد بیگم سے بڑی تھی لیکن حسن و دلکشی کے اعتبار سے اس میں اور ... بہن میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ عالیہ کو دیکھتے ہی شیبانی خان کی ہوس ناک فطرت نے نئی کروٹ لی اور اس نے ... اختیار کہا۔

''میں بھی کیسا بے خبر انسان ہوں کہ ایک نادر و نایاب ہیرا میرے پہلو میں پڑا ہے اور میں پتھروں ... کھیل رہا ہوں۔''

پھر دوسرے دن ہی شیبانی خان نے اپنی ایک رازدار کنیز کے ذریعے عالیہ تاجدار کو شادی کا پیغام بھیجا ... ساتھ ہی یہ سیاسی رشوت بھی پیش کی۔

''اگر عالیہ نے دل کی گہرائیوں سے مجھے اپنا شوہر تسلیم کرلیا تو میں اسے ملکہ عالیہ کے منصب پر ... کردوں گا۔''

عالیہ تاجدار نے بڑے تحمل سے شیبانی خان کی پیشکش کو سنا' پھر بڑے باوقار انداز میں انکار کردیا۔

شیبانی خان خوں آشام بھیڑیا تھا۔ ایک کمزور شکار کی طرف سے صاف انکار کو برداشت نہ کرسکا۔ اس کا خیال تھا کہ عالیہ تاجدار کسی سہمے ہوئے خرگوش کی طرح اپنا پورا وجود شیبانی خان کے حوالے کردے گی۔ مگر رازدار کنیز نے اسے بتایا تھا کہ انکار کرتے وقت عالیہ تاجدار خوفزدہ ہرنی نہیں' زخمی شیرنی نظر آرہی تھی۔

شیبانی خان نے دوبارہ اسی کنیز کو اس تنبیہ کے ساتھ عالیہ تاجدار کے پاس بھیجا۔ ''شیبانی خان' اپنی حدود مملکت میں کسی ایسے شخص کا وجود برداشت نہیں کرتا جو دل و جان کے ساتھ اس کی بے پناہ طاقت پر ایمان نہیں رکھتا۔''

بڑے متکبرانہ الفاظ تھے آتش غضب سے عالیہ تاجدار کا دلکش چہرہ جل اٹھا۔ ''پھر اس سے کہو کہ وہ مجھے سمرقند کی حدود سے نکل جانے دے۔''

عالیہ تاجدار کا جواب سن کر شیبانی خان نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا' جس میں درندوں جیسی غراہٹ تھی۔ ''گرفت میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ دینا سب سے بڑی حماقت ہے اور ایسی کوئی حماقت کم سے کم شیبانی خان کے نام سے منسوب نہیں کی جاسکتی' اس نادان لڑکی سے کہو کہ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہماری بخشی ہوئی مراعات سے فائدہ اٹھائے کون جانے کہ کب ہمارا مزاج بدل جائے اور ہم اسے ایک زرخرید لونڈی کی طرح اپنے تصرف میں لے آئیں۔''

عالیہ تاجدار کو شیبانی خان سے اسی جواب کی توقع تھی۔ وہ درندہ انسانی گوشت اور خون کا اس قدر عادی ہوچکا تھا کہ اس کے نزدیک کسی ضابطہ اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ قتلغ خانم کی حقیقی بہن اور بیٹی خانہ زاد بیگم کا حشر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ مجبوراً عالیہ تاجدار نے شیبانی خان کی کنیز سے کچھ دن کی مہلت مانگی تاکہ وہ حالات کے نشیب و فراز پر یکسوئی کے ساتھ غور کرسکے۔

عالیہ کا جواب سن کر شیبانی خان مسرور و مطمئن ہوگیا' اسے اپنی کامیابی کی منزل قریب تر نظر آرہی تھی۔

اور پھر ایک دن عالیہ تاجدار نے شیبانی خان سے شادی کا اقرار کرلیا۔

عالیہ نے صرف اقرار کیا تھا' ایک خاموش زلزلہ تھا' جسے سن کر قتلغ خانم زاد بیگم اور دوسری مغل شہزادیوں کے چہرے شعلہ رنگ ہوگئے اور آنکھوں میں نفرتوں کا لاوا ابلنے لگا۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ میں پچیس سال سے ایک ناگن کی اپنی آستین میں پرورش کررہی ہوں۔'' قتلغ خانم عالیہ تاجدار پر برس پڑی۔ ''احسان فراموش! تو نے میری بیٹی ہی کو ڈس لیا۔'' قتلغ خانم عالیہ کے اقرار کا یہی مفہوم سمجھ رہی تھی کہ اس کی بھتیجی خانہ زاد بیگم کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہے اور خود اسی نے ناز و ادا دکھا کر شیبانی خان کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

عالیہ تاجدار نے اپنی پھوپھی کا یہ غیر انسانی رویہ دیکھا تو اسے دل و جگر کٹتے محسوس ہوئے' مگر پھر بھی وہ خاموش رہی۔

عالیہ کی خاموشی نے خانہ زاد بیگم کو بھی بدکلامی پر اکسایا اور اس کی زبان بے قابو ہوگئی۔ خانہ زاد بیگم نے اپنی بہن کو فاحشہ تک کہہ کر پکارا' مگر دشنام طرازیوں کے طوفان میں ایک بار بھی عالیہ کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوسکی' بس وہ عجیب کھوئی کھوئی نظروں سے قتلغ خانم اور خانہ زاد بیگم کو دیکھتی رہی۔ عالیہ کے غیر معمولی سلوک نے اسے

مجرم بنا ڈالا تھا۔ پھر مغل شہزادیوں کی زبانیں بھی دراز ہوگئیں اور عالیہ تاجدار پر ہر طرف سے لعنتوں کی بارش ہونے لگی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب عالیہ تاجدار کو دلہن بنایا گیا' پورا سمرقند روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ شیبانی خان کی پسند سے عالیہ کے لئے ایسے عروسی جوڑے کا انتخاب کیا گیا جو بہت زیادہ قیمتی تھا۔ ایسا لباس تو خود قتلغ خانم نے بھی اپنی شادی کے وقت زیب تن نہیں کیا تھا۔

نکاح کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں کہ عالیہ تاجدار نے تمام شاہی کنیزوں کو اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور عمر شیخ مرزا کی اس کنیز کو طلب کیا جس نے ماں کی طرح عالیہ کی پرورش کی تھی۔ بوڑھی کنیز اشک بار آنکھوں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں عالیہ تاجدار دلہن بنی بیٹھی تھی۔

''یہ آنسو بہانے کا وقت نہیں ہے۔'' عالیہ نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔ ''میں اعتراف کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے ماں کی طرح چاہا اور ماں کی آغوش کا نعم البدل دیا۔ بس ایک احسان اور کر دیجئے۔ پھر اس کے بعد آپ کو کوئی زحمت نہیں دوں گی۔''

بوڑھی کنیز کے آنسو کچھ اور تیز ہوگئے۔

عالیہ تاجدار نے سرخ مخملیں تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا اور اسے بوڑھی کنیز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا خط میری امانت ہے۔ اگر کبھی احمد جمال سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو یہ اس کے حوالے کر دینا۔''

بوڑھی کنیز کچھ اور باتیں کرنا چاہتی تھی' مگر عالیہ تاجدار نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''یہ قبرستان ہے۔ یہاں سے جلد از جلد نکل جاؤ اور اپنے آنسو خشک کر ڈالو۔ تمہارے بہتے ہوئے اشک میرا راز فاش کر دیں گے۔''

بوڑھی کنیز چلی گئی' خادمہ کے جاتے ہی ایک وکیل اور دو گواہ عالیہ تاجدار سے اس کے نفس کا اختیار حاصل کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوئے۔ شیبانی خان کی رشتے دار خواتین اور معتمد کنیزیں بھی ان لوگوں کے ہمراہ تھیں۔ عالیہ تاجدار سرخ شال میں لپٹی خاموش بیٹھی تھی۔

شیبانی خان کی ایک قریبی عزیزہ نے عالیہ تاجدار کے نزدیک پہنچ کر وکیل اور گواہوں کی آمد کا مقصد بیان کیا۔

عالیہ تاجدار کے جسم کو جنبش ہوئی اور اس نے شال کو پیشانی تک کھینچ لیا۔ شیبانی خان کی عزیزہ نے چونک کر عالیہ کی طرف دیکھا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔

''شیبانی خان سے کہو کہ وہ خود یہاں آ کر مجھ سے میرے نفس کا اختیار حاصل کرے۔'' عالیہ تاجدار نے وکیل سے مخاطب ہو کر کہا' اس کی آواز میں بھی ہلکی ہلکی لرزش موجود تھی۔

وکیل اور دونوں گواہ ناکامی کی حالت میں واپس جانے لگے' شیبانی خان کی عزیزہ بھاگتی ہوئی ازبک سردار کے پاس پہنچی اور اس سے سرگوشیوں میں کچھ کہنے لگی۔

شیبانی خان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا عالیہ تاجدار کے کمرے میں پہنچا۔

عالیہ کی شال سر سے ڈھلک کر بستر پر گر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ نیلگوں ہوگیا تھا اور ہونٹوں سے خون کی ایک

پتلی دھار بہہ کر گردن تک آ گئی تھی۔ عالیہ اپنے دونوں بازوؤں پر زور دے کر اس طرح آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی جیسے وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''یہ سب کچھ کیا ہے؟'' عالیہ تاجدار کی حالت دیکھ کر شیبانی خان گھبرا گیا۔ ازبک سردار نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ عالیہ زہر کھا چکی ہے اور زہر اپنا پورا پورا اثر کر چکا ہے۔

''تو آ گیا شیبانی خان!''

عالیہ تاجدار نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ازبک سردار کی طرف دیکھا' اس کے خشک نیلے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم رقصاں تھا!

''میں تیرا ہی انتظار کر رہی تھی تو میرے نفس کا اختیار لینے آیا ہوگا؟'' عالیہ کے لہجے میں ناقابل بیان حقارت پوشیدہ تھی۔

''میں تیری مملکت کی حدود سے بہت دور جا رہی ہوں' مجھے روک سکتا ہے تو روک لے اور میرے پیروں میں کوئی زنجیر ڈال سکتا ہے تو ڈال دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد مجھ پر تہمتیں تراشے اور اپنے ذلیل سپاہیوں کے سامنے کف افسوس ملے کہ یونس خان کے قبیلے کی لڑکی تجھے دھکا دے کر چلی گئی۔''

عالیہ تاجدار کو اپنے سامنے کی چیزیں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ اس لئے وہ سمرقند کے فرمانروا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

''شیبانی خان! تو میری رخصت کا منظر دیکھ رہا ہے؟'' عالیہ تاجدار نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں ہوگئے۔ ''غیرت مند اور عزت دار دوشیزائیں اسی انداز سے رخصت ہوتی ہیں۔ مگر تجھے کیا معلوم کہ عزت کسے کہتے ہیں اور غیرت کیا شے ہے؟''

عالیہ تاجدار نے ازبک سردار کو ذلیل کرنے کے لئے اپنے ہونٹوں کی کمان سے لفظوں کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا تھا۔

''تو نے اپنی شکست کا ذائقہ چکھا؟ کیسا کڑوا اور تلخ ہے۔''

یکایک عالیہ کی آواز لڑکھڑانے لگی اور آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا اندھیرا اتنا گہرا ہوگیا کہ شیبانی خان کی صورت بھی تاریک پردے میں چھپ گئی۔

''اور یہ بھی...... سن لے...... کہ...... ابھی...... تیری آخری...... شکست باقی ہے۔'' اب عالیہ کی زبان سے الفاظ بمشکل ادا ہو رہے تھے ''جس طرح...... میں اس...... چار دیواری...... میں...... مر رہی...... ہوں...... تو بھی...... اپنی قبر کے لئے...... ایسی ہی...... کسی جگہ کا انتخاب...... کر لے......'' یہ کہتے کہتے عالیہ تاجدار کے منہ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ''اے خدا!...... میرے خون...... کو بھی...... ان بے گناہوں کے...... خون میں...... شامل کر لے...... جو سر محشر...... تجھ سے...... تیری رحمت کی بھیک...... مانگیں گے۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی عالیہ تاجدار لہرائی اور بستر پر گر گئی۔

شیبانی خان نے شاہی حکیم کو طلب کیا' مگر اس کے آتے آتے عالیہ تاجدار سانسوں کی زنجیر سے آزاد ہو چکی تھی۔ ازبک سردار نے آج تک ایسی ذلت آمیز شکست نہیں کھائی تھی۔ اپنی ناکامی پر وہ اس قدر غضبناک ہو گیا تھا کہ اس نے ان تمام کنیزوں کو زندہ دفن کرا دیا جو عالیہ تاجدار کی نگرانی پر مامور تھیں اور جن کی موجودگی

میں عالیہ نے ہیرے کی کنی کھا کر شیبانی کی قید سے دائمی نجات حاصل کی تھی۔

عالیہ تاجدار کی موت پر سمرقند کے اکثر باشندے سوگوار تھے۔ قتلغ خانم' خانزاد بیگم اور دوسری مغل شہزا
جو کچھ دیر پہلے تک عالیہ کو غلیظ ترین کلمات سے نواز رہی تھیں' اب ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

⌑ ⌑ ⌑

بابر اور اس کے ساتھیوں کا سفر جاری رہا' کبھی وہ ستاروں کی رفتار میں اپنا مستقبل تلاش کرتا۔ اور کبھی ا
حضرت موسیٰ عاشقانؒ کے الفاظ یاد آتے۔

''تائید الٰہی سے جب تیری دلی مرادیں بر آئیں تو اس ویران ٹیلے پر ایک دلکش مسجد تعمیر کر دینا۔''

بظاہر بابر کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی' آخر احمد جمال اور اپنے دوسرے جاں نثاروں سے طویل مشو
کے بعد معزول شہنشاہ تاشقند کی طرف بڑھا' اس علاقے پر بابر کے حقیقی ماموں سلطان محمود خان کی حکومت تھ
درمیان میں اندجان کی سرحدیں حائل تھیں۔ مجبوراً بابر کو رات کی تاریکی کا انتخاب کرنا پڑا۔ وہ 907ھ کے آ
کا زمانہ تھا۔ انتہائی ناسازگار موسم کے باوجود مغل شہنشاہ نے ایک طوفانی رات میں اندجان کے مضافاتی علا
کو عبور کیا اور تاشقند پہنچ گیا۔

سلطان محمود خان نے پرجوش انداز میں اپنے بھانجے کا استقبال کیا اور ''اراپتہ'' کا شہر بابر کے حوالے کر
تاکہ وہ سردیوں کا سخت موسم سکون سے گزار سکے۔ جیسے ہی جہانگیر مرزا کو مغل شہنشاہ کی آمد کی خبر ملی' وہ احمد تم
سے الگ ہو کر بڑے بھائی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جہانگیر مرزا کی یہ حاضری اس کی مجبوریوں کے باعث
کیونکہ وہ برائے نام فرغانہ کا حکمران تھا ورنہ در پردہ احمد تنبل ہی اندجان اور فرغانہ پر حکومت کر رہا تھا۔

موسم بہار میں شیبانی خان ''اراپتہ'' کے گردونواح میں داخل ہوا اور اس نے لوٹ مار شروع کر دی
نتیجتاً بابر کو یہ علاقہ بھی چھوڑنا پڑا' آخر سلطان محمود خان اور اس کے چھوٹے بھائی احمد خان نے باہم مشو
کے بعد یہ طے کیا کہ بابر کی بھرپور مدد کی جائے اور فرغانہ و اندجان کو احمد تنبل کے چنگل سے نکالا جائے۔ ا
بابر اور احمد تنبل کے درمیان ایک مختصر سی جنگ ہوئی' احمد تنبل شکست کھا کر اوش کی طرف بھاگا' بابر اس
تعاقب کرتا ہوا اوش پہنچا۔ احمد تنبل اوش سے فرار ہو کر اپنی مملکت اندجان میں داخل ہو گیا۔ اوش اور فرغانہ
قبضہ کرنے کے بعد بابر اندجان کی طرف بڑھا اور دوسرے مغل سرداروں کے ساتھ اندجان کے مضافات م
ٹھہر گیا۔

اسی دوران اخسی کے باشندوں نے بابر کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ وہ اس علاقے کا انتظا
سنبھال لے۔ بابر اس پیشکش کو اپنے لئے نیک فال سمجھ رہا تھا اور تقدیر اس کے ساتھ کوئی اور چال چل رہ
تھی۔ اخسی کی حکومت ملتے ہی دوسرے مغل سردار بھی اندجان کے نواحی علاقے چھوڑ کر ایک محفوظ مقام پر
ہو گئے۔

شیبانی خان کو اس صورتحال کی خبر ہوئی تو وہ ایک لشکر جرار لے کر اخسی کی طرف بڑھا۔ بابر اپنے چھو
بھائی جہانگیر مرزا اور دوسرے مغل سرداروں کے ہمراہ شیبانی خان سے مقابلے کے لئے صف آرا ہوا' اس وقت
سپاہی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ ازبکوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ جنگ سے پہلے مغل فو

پرجوش نظر آ رہے تھے' مگر جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو بابر کے لشکری ثابت قدم نہ رہ سکے۔ انجام کار ایک
خونریزی کے بعد بابر کو شکست ہو گئی اور وہ مغولستان کی طرف چلا گیا۔

اس فتح کے بعد شیبانی خان اس علاقے کا ناقابل تسخیر حکمران بن گیا تھا۔ یونس خان کے دونوں بیٹے
محمود خان اور احمد خان گرفتار ہوئے۔ شیبانی خان اپنے ابتدائی زمانے میں ان دونوں بھائیوں کا ملازم رہ
تھا۔ ایک دن پرانے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے ازبک سردار نے سلطان محمود خان اور احمد خان کو نہ صرف
کر دیا بلکہ مفتوحہ علاقہ بھی انہیں واپس کر دیا۔

سلطان محمود خان اپنے گھر پہنچ کر عجیب عجیب بیماریوں میں مبتلا ہو گیا' شاہی طبیب نے امراض کی تشخیص
تے ہوئے کہا کہ شیبانی خان نے سلطان کو زہر دیا ہے۔ اس صورت میں تریاق کا استعمال ضروری ہے۔

طبیب کا مشورہ سن کر سلطان محمود خان بڑے تلخ انداز میں مسکرایا۔ ''بے شک! شیبانی خان نے مجھے زہر دیا
مگر دنیا کے کسی طبیب کے پاس اس زہر کا تریاق نہیں۔''

شاہی طبیب حیرت سے والیٔ تاشقند کی طرف دیکھنے لگا۔

''شیبانی خان نے مجھے ایسا خوفناک زہر دیا ہے کہ کسی طبیب نے اس کا نام بھی نہیں سنا ہو گا' یہ زہر کیا کم
کہ ازبک سردار جو کل تک میرا ملازم تھا' آج دیکھتے ہی دیکھتے کہاں پہنچ گیا۔ پہلے اس نے ہم دونوں بھائیوں
والہ زنداں کیا۔ پھر کسی دلیل اور حجت کے آزاد کر دیا۔ اب ہم اپنی گردنوں میں اس کے احسان کا طوق
لے ہوئے کوچہ بہ کوچہ گھوم رہے ہیں۔ یہی تو وہ زہر ہے جو میرے دل و دماغ میں سرایت کر گیا ہے اور روز بہ
نئے انداز سے مختلف بیماریوں کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اب اگر اس زہر کا کوئی تریاق ہے تو فوراً میرے
منے لاؤ' میں اسے شوق سے کھانے کے لئے تیار ہوں۔''

سلطان محمود خان کی حکیمانہ باتیں سن کر شاہی طبیب نے سر جھکا لیا' واقعتاً اس زہر کا کوئی تریاق نہیں تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

بابر مغولستان سے خضار آیا اور پھر شہر ترمذ کی طرف چلا گیا۔ امیر محمد باقی ''ترمذ'' کا حاکم تھا۔ وہ ازبکوں کی
یلغار اور غارت گری سے بہت پریشان رہتا تھا۔ امیر احمد نے مغل شہنشاہ کی آمد کو باعث برکت سمجھا اور بہت
قیمتی تحائف لے کر بابر کی خدمت میں حاضر ہوا۔

خانہ بدوش شہنشاہ نے امیر محمد باقی کو دوست سمجھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں اس سے کچھ سیاسی
ے طلب کئے۔

''گردش وقت نے مجھے انسانی ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا ہے۔'' بابر انتہائی کرب ناک لہجے میں اپنی
ت و ریخت کا ذکر کر رہا تھا۔

''دشمن میرے تعاقب میں ہیں اور میں ان سے چھپتا پھر رہا ہوں' نہ عزت محفوظ ہے نہ جان' بس ایک کھلونا
جس سے تقدیر عجیب عجیب انداز میں کھیل رہی ہے۔''

امیر محمد باقی نے نہایت مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے کہا ''شیبانی خان ماوراء النہر پر پوری طرح قابض ہو چکا
اور اس کے فتنہ و فساد کی آگ میں آپ کے دل و دماغ کا سکون جل کر رہ گیا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو آپ کی

والدہ' بہن اور دوسری مغل شہزادیوں کو آزاد کرسکتا تھا' مگر شیبانی خان ایک وحشی ہے وہ آپ کے ساتھ ا
خوفناک سرد جنگ لڑ رہا ہے۔ ازبک سردار آپ کے اعصاب کو تباہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ آفات و مصائب
تسلسل سے گھبرا کر آپ ایک دن اس کے سامنے سر جھکا دیں اور وہ نسل تیمور کی ذلت و رسوائی کے نظارے
لطف اندوز ہو سکے۔ اس صورتحال کی روشنی میں میری ناچیز رائے یہی ہے کہ آپ ازبکوں سے پیچھا چھڑائیں
کسی دوسرے علاقے میں جا کر قسمت آزمائی کریں۔''

بابر کو امیر محمد باقر کا مشورہ بہت پسند آیا اور وہ 910ھ میں کابل کی طرف روانہ ہوا۔

¤ ¤ ¤

سلطان ابوسعید مرزا کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق کابل کا شہر الغ بیگ مرزا کے حوالے
دیا گیا تھا۔ الغ بیگ مرزا عمر شیخ مرزا کا چھوٹا بھائی تھا۔ 907ھ میں الغ بیگ مرزا کا انتقال ہو گیا اور نوعمر لڑکا
الرزاق مرزا اس کا جانشین قرار پایا۔

عبدالرزاق مرزا کی کم سنی کے باعث مملکت کا سارا انتظام ایک مغل سردار ذکی کے ہاتھ میں آ گیا۔ ذکی
درشت مزاج انسان تھا۔ آخر اس کی زبان درازیوں اور بدسلوکیوں نے کابل کے تمام امراء کو ناراض
دیا...... اور پھر ان ہی امراء نے درپردہ اس کے خلاف ایک منصوبہ تیار کیا اور عین بقرعید کے روز سردار ذکی کو
کر ڈالا۔

سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''گرم سیر'' کے حاکم محمد مقیم نے قسمت آزمائی کی (گرم سیر
وہ افغانستان کا ایک جنوب مغربی ضلع ہے جو دریائے ہلمند کے شمالی کنارے پر واقع ہے) عبدالرزاق مرزا'
قیم کا مقابلہ نہ کرسکا اور میدان جنگ سے فرار ہو کر لمغان کے گردونواح میں پناہ گزین ہو گیا۔ محمد مقیم نے نہ
کابل پر قبضہ کر لیا بلکہ جبراً الغ بیگ کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

یہ نئی سیاسی صورتحال بابر کے حق میں تھی۔ نتیجتاً مغل شہنشاہ نے وقت کے اشارے کو سمجھا اور بے خوف و خطر
پر حملہ کر دیا۔ محمد مقیم چند گھنٹے بھی بابر کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکا اور بھاگ کر قلعہ بند ہو گیا۔ مغل شہنشاہ نے
رہ تنگ کیا تو چند روز بعد ہی محمد مقیم نے جان کی امان طلب کی اور قلعہ بابر کے حوالے کر کے کابل کی حدود
دور نکل گیا۔ بابر نے اپنی اس فتح کو تائید غیبی سمجھا۔ اب وہ ''بے زمین'' بادشاہ نہیں تھا۔ اس نے نئے سرے
کابل کی تعمیر کا آغاز کیا۔

ابھی مغل شہنشاہ اپنی نئی مملکت کے انتظامات میں مصروف تھا کہ اسے ایک جانگداز خبر ملی۔ وہ 911ھ
کا مہینہ تھا۔ شیبانی خان نے اپنے قاصد کے ذریعے بابر کو قتلغ خانم کے انتقال کی اطلاع بھیجی تھی۔ انتہائی صبر
کے باوجود مغل شہنشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر وہ شدید غصے کی حالت میں شیبانی خان کے قاصد پر
پڑا۔

''موت سے کسی انسان کو مفر نہیں۔ اگر والدہ محترمہ میرے پاس ہوتیں' تب بھی میں انہیں فرشتہ اجل سے
بچا سکتا تھا...... مگر شیبانی خان نے جس حیوانیت کا مظاہرہ کیا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ کیا میری
سے شادی کر کے اور میری ماں کو قبر تک پہنچا کے وہ یہ سمجھتا ہے کہ بابر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا یا زنجیر

غلامی پہن کر اس کے سامنے خم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں۔" مغل شہنشاہ کی آنکھوں سے بیک وقت آگ اور آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی...... "شیبانی خان سے کہہ دینا کہ عورتوں کو یرغمال بنا کر اپنے حریفوں کی قوت برداشت کو آزمانا مردوں کا شیوہ نہیں۔"

بابر نے شیبانی خان کے قاصد پر غصہ اتار کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی تھی...... مگر حقیقتاً اس تازہ صدمے کے بارگراں سے دبا جا رہا تھا۔ خلوت ہوئی تو مغل شہنشاہ نے احمد جمال کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

"مجھے اس غم نے تھکا ڈالا ہے احمد!" بابر کی آواز میں بڑا درد تھا...... "آخر وہ دن کب آئے گا کہ شیبانی خان سے اپنی ذلت و شکست کا انتقام لے سکوں گا؟"

"بہت جلد شہنشاہ! بہت جلد۔" احمد جمال کی آواز میں بھی رقت جھلک رہی تھی...... "شیبانی خان قہرا سے زیادہ دور نہیں ہے' اس کے وحشیانہ مظالم عنقریب اس پر زمین تنگ کر دیں گے اور وسیع و عریض سلطنت سمٹتے سمٹتے اس کی قبر کے برابر رہ جائے گی۔"

اگرچہ قتلغ خانم نے احمد جمال کو بہت آزار پہنچائے تھے' لیکن پھر بھی وہ اعلیٰ ظرف نوجوان اپنے اللہ سے ملکہ فرغانہ کی مغفرت اور نجات کا طالب تھا۔

¤ ¤ ¤

ماں کی موت کے زخم بھرے تو ایک اور آفت ناگہانی نے مغل شہنشاہ کو بدحواس کر دیا۔ قتلغ خانم کے انتقال کے کچھ دن بعد ہی خوفناک زلزلوں نے پورے کابل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ زلزلے پورے ایک ماہ تک علاقے کو زیر و زبر کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں کابل کے بے شمار مکانات زمین بوس ہو گئے اور بہت اونچی اونچی پختہ عمارتیں اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئیں۔

بابر تقریباً ایک سال تک کابل کی تعمیر نو میں الجھا رہا۔ مغل شہنشاہ نے نئے زاویوں سے نئی عمارتیں کرائیں۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ایک نیا کابل آباد ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ دلکش خوبصورت نظر آتا ہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر بابر نے 912ھ میں شادی کر لی۔ اس پر مسرت اور یادگار موقع پر بڑی دھوم دھام سے جشن منایا گیا' مگر شادی میں شریک ہونے والوں کو صاف محسوس ہوتا تھا کہ بابر کے چہرے پر رہ رہ کر اداسی کی ایک لہر ابھرتی ہے اور پھر ڈوب جاتی ہے۔ قتلغ خانم' خانزادہ بیگم اور دوسری مغل شہزادیوں کی یاد اس ہنگامہ خیز جشن میں بھی اس کا حصار کئے ہوئے تھیں اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود ان سے دامن نہیں چھڑا سکتا تھا۔

شادی کے بعد بابر نے "قشلاقات" اور "ہزارجات" کے قلعوں پر حملہ کیا اور وہاں کے باغیوں کو مکمل پر زیر کر کے دارالحکومت کو جی بھر کے لوٹا۔ ان جنگی مہمات سے فارغ ہو کر مغل شہنشاہ نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر مرزا کو غزنی کی حکومت دے دی۔

913ھ میں بابر خلجی افغانوں کے قبیلوں کی سرکوبی کے لئے کابل سے روانہ ہوا۔ مغل شہنشاہ نے

راہوں کو خوب خوب تباہ و برباد کیا اور ان کا مال و متاع بھی لوٹ لیا۔ اس حملہ میں ایک لاکھ بکریاں اور دوسری اشیاء بابر کے ہاتھ آئیں۔ اس کے بعد شہنشاہ کابل واپس آیا۔

اسی دوران ارغون کے امراء ازبکوں کے حملوں سے سخت پریشان تھے۔ نتیجتاً ارغون کے باشندوں نے بہت عاجزانہ لہجے میں بابر سے درخواست کی کہ اگر شہنشاہ ان کی مدد کے لئے آ جائیں تو وہ قندھار کی سلطنت نذر کے طور پر خدمت شاہی میں پیش کر دیں گے۔ بابر نے اس درخواست کو منظور کر لیا اور اہل ارغون کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔

پھر جب بابر قلات سے گزرا تو وہاں کا حاکم خان مرزا بڑے خلوص کے ساتھ حاضر خدمت ہوا اور اس نے ائی والہانہ انداز میں شہنشاہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ جواباً بابر نے بھی خان مرزا کے ساتھ خلوص و محبت کا سلوک کیا اپنا سفر جاری رکھا۔ قلات کی حدود سے نکل کر مغل شہنشاہ نے محمد مقیم ارغون اور شاہ بیگ وغیرہ کو اطلاع دی کہ ہم لوگوں کی دعوت پر یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ رسم میزبانی کو ہاتھ سے نہ جانے دو دوستوں کی طرح فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

ارغونی امراء اپنی اس حماقت پر سخت شرمندہ تھے کہ انہوں نے سوچے سمجھے بغیر حریف بادشاہ کو اپنے تے میں آنے کی دعوت دی...... اور ان سے دوسری یہ حماقت سرزد ہوئی کہ جب مہمان گھر کے قریب آ پہنچا وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ بابر نے بہت کوشش کی کہ ارغونی امراء قلعے سے باہر آئیں اور خلوص دل کے ساتھ پیشکش کو عملی جامہ پہنائیں...... مگر محمد مقیم اور شاہ بیگ کسی طرح بھی مغل شہنشاہ کا سامنا کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔

پھر جب محاصرہ طول پکڑ گیا تو مجبوراً ارغونی امراء قلعے کے دروازے کھول کر باہر آئے اور بابر کے سامنے آراء ہو گئے۔ یہ ایک مختصر جنگ تھی۔ ارغونی فوجیں مغل شہنشاہ بابر کے شدید حملوں کی تاب نہ لا سکیں۔ انجام محمد مقیم اور شاہ بیگ جو آپس میں بھائی تھے' مغل سپاہیوں سے شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے اگرچہ ں بھائیوں نے آخری دم تک دوبارہ قلعہ بند ہونے کی کوشش کی تھی لیکن بابر کے جانباز سواروں نے انہیں مہلت نہیں دی کہ وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کر سکیں' اس لئے محمد مقیم داور کی طرف بھاگ کھڑا ہوا...... اور شاہ نے "شادل" میں داخل ہو کر اپنی جان بچائی (شادل کوئٹہ کا پرانا نام ہے)

اب قندھار کا قلعہ بھی بابر کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس جنگ میں امیر ذوالنون کا بہت سا مال و متاع اور رے جواہرات بھی مغل شہنشاہ کے ہاتھ آئے' مگر بابر نے وہ ساری چیزیں اپنے جانثار امیروں میں تقسیم کر دیں اپنے سب سے چھوٹے بھائی ناصر مرزا کو قندھار اور داور کا حاکم بنا دیا اور خود ایک فاتح کی حیثیت سے کابل پس آ گیا۔

ابھی سکون و اطمینان کے چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ بابر کو ایک اور پریشان کن خبر ملی۔ محمد مقیم داور فرار ہو کر شیبانی خان کے پاس پہنچا اور اس کے پیروں پر سر رکھ کر گریہ و زاری کرنے لگا۔

"اے شہنشاہوں کے شہنشاہ! آپ کے ہوتے ہوئے بھی بابر نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور ہم دونوں بھائی در ہو گئے۔" محمد مقیم بڑے منافقانہ اور خوشامدانہ لہجے میں بول رہا تھا۔

شیبانی خان نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر محمد مقیم اور اس کے مختصر سے لشکر کو ہمراہ لے کر قندھار پر حملہ کر دیا۔

ناصر مرزا میں شیبانی خان کے مقابلے میں طاقت نہیں تھی۔ اس لئے وہ فوری طور پر قلعہ بند ہو گیا اور اس نے تمام حالات لکھ کر بڑے بھائی کی خدمت میں روانہ کر دیئے۔

بابر نے جواب میں ناصر مرزا کو تحریر کیا...... ''جہاں تک ممکن ہو قلعے کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے' اگر یہ علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو ایک بار پھر ہمارے قدم زمین سے اکھڑ جائیں گے اور خانہ بدوشی ہمارا مقدر بن کر رہ جائے گی......''

ناصر مرزا کے لئے زیادہ دن تک قلعہ بند رہنا مشکل تھا۔ اس نے جواباً بابر کو لکھا...... ''شیبانی خان کے تیور خطرناک ہیں' وہ اس جنگ کو فیصلہ کن مرحلے تک پہنچائے بغیر واپس نہیں جائے گا۔''

بابر نے اس سلسلے میں قاصد کو آخری حکم دے کر کابل سے قندھار روانہ کیا...... ''شیبانی خان سے صلح کر لو اور اپنے سپاہیوں کو لے کر میرے پاس چلے آؤ۔ اگرچہ یہ ایک ذلت آمیز معاہدہ ہوگا' لیکن گردش وقت کو ٹالنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بابر کو ہر حال میں زندہ سپاہیوں کی ضرورت تھی' اگر ناصر مرزا اور جاں نثاروں کا یہ مختصر سا لشکر بھی لقمہ اجل بن جاتا تو بابر کو نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی لئے مغل شہنشاہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو ازبک سردار کے ساتھ صلح کر لینے کی ہدایت کی تھی۔

شیبانی خان مسلسل فتوحات کے نشے سے سرشار تھا۔ اس نے فوراً ہی ناصر مرزا کی طرف سے پیش کی جانے والی صلح کی تجویز قبول کر لی تھی۔ ازبک سردار کی لذت انگیزی کے لئے یہی منظر کافی تھا کہ عمر شیخ مرزا کا سب سے چھوٹا بیٹا مجرموں کی طرح سر جھکائے قلعے سے باہر نکلا اور اپنے چہرے پر شکست و ذلت کی سیاہی ملے ہوئے ایک طرف روانہ ہو گیا' جب ناصر مرزا شیبانی خان کے قریب سے گزرا تو ازبک سردار نے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم چاہتے تو تیرا کٹا ہوا سر یا جسم کے مختلف ٹکڑے تیرے بھائی کے پاس بھیج دیتے...... مگر ہم اول و آخر سپاہی ہیں اور تجھے سلامتی کے ساتھ کابل کی طرف روانہ کر کے اپنی شجاعت کا ثبوت دے رہے ہیں۔''

شیبانی خان نے یہ بات بابر کی اس طعنہ زنی کے جواب میں کہی تھی' جب مغل شہنشاہ اپنی والدہ کے انتقال کی خبر سن کر ازبک سردار کے قاصد پر برس پڑا تھا۔

ناصر مرزا نے کابل پہنچ کر شیبانی خان کی تمام گفتگو بابر کے گوش گزار کر دی۔

مغل شہنشاہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ شدت غضب سے اس کے دل و دماغ جلنے لگے' ا ایک بار پھر غائبانہ طور پر شیبانی خان کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرنا چاہتا تھا' مگر اسے اپنے ایک دوست امیر محمد باقر حاکم ترمذ کے الفاظ یاد آ گئے۔

''شیبانی خان نفسیاتی جنگ کے ذریعے آپ کے اعصاب کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہتا ہے۔''

امیر محمد باقر کے الفاظ یاد آتے ہی بابر سنبھل گیا اور مستقبل کی منصوبہ سازی کے بارے میں اپنے امرائے خاص سے مشورے کرنے لگا...... ''بظاہر کابل کا علاقہ ہمیں اپنی پناہ گاہ نظر آتا ہے مگر شیبانی خان کے قندھار تک پہنچ جانے کے بعد یہاں بھی نئے خطرات کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔'' اتنا کہہ کر مغل شہنشاہ درباری امراء کے چہرے دیکھنے لگا۔ وہ ان سے اپنے سوال کا جواب طلب کر رہا تھا۔

تقریباً تمام امراء نے بابر کو ایک ہی رائے دی کہ اگر وہ ''بدخشاں'' کو فتح کر لے تو اسے سکون و عافیت

میسر آ سکتی ہے۔

اس طویل بحث و مباحثے کے دوران احمد جمال خاموش رہا تھا۔ بابر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے

احمد جمال شہنشاہ کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتا تھا۔ آخر اس نے بہت غور و فکر کے بعد لب کشائی کی...... ''اران سلطنت مجھ سے زیادہ ہوش مند بھی ہیں اور زمانہ آشنا بھی۔'' یہ کہہ کر احمد جمال نے سکوت اختیار ۔ وہ اس صورتحال سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم تمہاری رائے جاننا چاہتے ہیں احمد!'' بابر نے انتہائی اپنائیت کے لہجے میں کہا...... ''رات کی تاریکی سایہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ جاتا ہے...... مگر ایک تم ہو کہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ تیز دھوپ میں سائبان ہمارے ساتھ رہتے ہو اور خوفزدہ کر دینے والے اندھیروں میں روشنی اور ایفائے عہد کے ولولہ انگیز نغمے ہو۔''

''میں تو شاہ کا ایک ادنیٰ کارندہ ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔'' احمد جمال اس موضوع پر بات کرنے سے ان نظر آ رہا تھا۔

''اس معاملے میں تمہاری رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔'' بابر بضد تھا کہ احمد جمال اپنی تجویز پیش کرے۔

''شہنشاہ خوب جانتے ہیں کہ میں سیاست کے پیچ و خم سے آشنا نہیں۔'' احمد جمال نے ایک ایک نقطہ ردیتے ہوئے کہا...... ''اور نہ مجھے ستاروں کی رفتار کا اندازہ ہے...... مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کی منزل ہندوستان ہے۔ سید مہدیؒ نے اس طرف مبہم اشارہ کیا تھا لیکن حضرت موسیٰ عاشقانؒ نے تو آپ سے صاف کہہ دیا تھا۔ پھر یہ کشمکش اور تردد کیوں؟ اگر ایک مرد بزرگ کی بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تو آپ فیصلوں میں آزاد ہیں۔''

بابر اس طرح چونک اٹھا جیسے اسے کوئی بھولا ہوا خواب یاد آ گیا ہو' پھر شہنشاہ نے اپنے ان مشیروں کو سارا سنا دیا جو ہندوستان کے سفر میں اس کے شریک نہیں تھے۔

تمام مغل سرداروں نے اس واقعے کو بے دلی کے ساتھ سنا۔ جاہ پرست امراء روحانیت کے قائل نہیں تھے۔ لئے حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی خواہش کو تھکے ہوئے ذہن کی پیداوار سمجھتے رہے' ایک مغل امیر نے تو یہاں تک دیا۔

''اہل ہند ہمیں جانتے تک نہیں۔ پھر ہم کس بنیاد پر ہندوستان کا قصد کریں؟ اجنبی ملک' اجنبی قوم' ل کی کمی...... ان حالات میں ہندوستان کی تسخیر کا خواب وحشت و دیوانگی کے سوا اور کیا ہے؟ ان علاقوں کم سے کم شناسا چہرے تو ہیں' رشتے داریاں اور تعلقات تو ہیں۔ کسی دن کوئی رشتہ' کوئی حوالہ ضرور کام آئے ''

مغل امیر کی طویل گفتگو کا ایک ہی مقصد تھا کہ بابر کو ان گزرگاہوں پر چلنا چاہئے جن سے اس کے قدم اہوں۔

مغل شہنشاہ نے اپنے جہاں دیدہ امیر کی باتوں کو بہت غور سے سنا۔ احمد جمال کا خیال تھا کہ بابر ایک بار اس کے مشورے کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی طرف سے منہ موڑ لے گا۔ مگر اس مرتبہ مغل فرمانروا نے احمد ل کو مایوس نہیں کیا۔

''ستاروں نے مجھے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ وہ فتح کی نوید دیتے رہے اور میرے مقدر میں شکست لکھی جا
رہی۔'' بابر آج کچھ عجیب سے لہجے میں اپنے امراء سے مخاطب تھا...... ''مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ خاندا
حوالے' خونی قرابت داریاں اور علاقائی رشتے بھی سخت نامعتبر تھے۔ میں نے ان سے ہر بار فریب ہی کھایا
لوگ چاہتے ہو کہ میں کچھ دن اور فریب کی حالت میں زندہ رہوں؟''

مغل امراء اپنے حکمران کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے۔ علاقائی سیاست کے رازدار تھ
جانتے تھے کہ بابر کے حقیقی بھائی بھی اس کے ہم نوا اور ہمدرد و غمگسار نہیں۔ جب بھی کسی کو موقع ملتا ہے' وہ با
پشت پر وار کرتا ہے...... اور بابر کی فراخدلی کا یہ حال ہے کہ وہ ہر مرتبہ اپنے دشمنوں کو معاف کر کے ایک ا
سلطنت کے خواب دیکھنے لگتا ہے جہاں ہر طرف عدل و انصاف ہو' معاشرتی رواداری اور خوشحالی کا دور دورہ ہو

آخر طویل سکوت کے بعد کچھ مغل سرداروں نے بیک زبان کہا۔ ''ہم شہنشاہ کے تجربات و مشاہدات
حرف زنی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔''

''پھر میرے اشارے پر اپنے چہروں اور تلواروں کا رخ ہندوستان کی طرف کر لو۔'' شہنشاہ بابر نسبتاً ا
آواز میں بول رہا تھا۔ ''مگر اس طرح نہیں کہ تمہارے دل و دماغ پر ناگواری کا رنگ غالب ہو۔ آخر کب
اپنوں کا یہ ذلت آمیز سلوک برداشت کرتے رہو گے؟ بے شک! ہندوستان ہمارے لئے ایک اجنبی ملک ہ
وہاں کے باشندے نہ ہمارے چہروں سے آشنا ہیں اور نہ ہمارے ناموں سے۔ اگر دیار غیر میں شکست بھی ہ
تو ہم پر کون طعنہ زنی کرے گا؟ کوئی بھی نہیں۔''

اپنے فرمانروا کی بات سن کر مغل سرداروں نے گردنیں خم کر دیں۔ جیسے وہ بابر کے نقش قدم پر چلتے ہو
موت کے غار کی طرف بھی جانے کے لئے تیار تھے۔

اپنے امراء کا سر تسلیم خم دیکھ کر بابر کو عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ پھر اس نے انتہائی پرجوش لہجے میں
''ہماری آئندہ معرکہ آرائیوں کا مرکز ہندوستان ہوگا۔ میں اس سرزمین کے ایک باشندے کا مقروض ہوں
اور وہ حضرت موسیٰ عاشقانؒ ہیں' جن سے میں نے اجودھیا کے ویران ٹیلے پر ایک خوبصورت مسجد کی تعمیر کا
کیا ہے۔ یہی وہ قرض ہے جس کی ادائیگی میں میری طرف سے دیر ہوتی جا رہی ہے۔ خدا اپنے اس بندے
تمام کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور اس کے ناتواں بازوؤں کو اتنی طاقت بخش دے کہ وہ خانہ خدا کی تعمیر کا بار گر
اٹھا سکے۔''

پھر کچھ دن بعد ہی بابر اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا' لیکن اچانک گر
وقت نے اس کا راستہ روک لیا۔ انتہائی غیر متوقع طور پر کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مغل شہنشاہ کو تو
سنگھار ہی میں ٹھہر جانا پڑا (سنگھار جسے شنگھرو بھی کہتے ہیں' ڈیرہ اسماعیل خان سے ساٹھ ستر میل مغرب میں ملا
کے راستے پر واقع ہے) یہاں پہنچ کر مغل لشکر کے لئے بے سروسامانی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مجبوراً بابر کو کا
طرف واپس لوٹ جانا پڑا۔ واپسی کے وقت مغل شہنشاہ بہت اداس نظر آ رہا تھا۔

اس نازک موقع پر احمد جمال نے اپنے فرمانروا کی ہمت بندھائی۔

''شہنشاہ اداس نہ ہوں کہ اللہ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے۔ اگر ہمیں اپنے منصوبوں میں ہزار با
ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔ میں تو بس اس تصور سے ہی خوش ہوں کہ آپ برسوں بعد

ں کے حصار سے باہر نکلے اور مردان خدا کی باتوں کو پوری توجہ کے ساتھ سنا۔ جب تک آپ ارض
دستان کی طرف بڑھتے رہیں گے اس وقت تک سید مہدیؒ اور حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی دعاؤں کے حلقے میں
ل رہیں گے۔''

⌑ ⌑ ⌑

اسی سال ارک (کابل) کے قلعے میں بابر کے یہاں ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا۔ وہ چار ذیقعد 913ھ
کی تاریخ تھی اور منگل کی رات۔ لڑکے کا نام ہمایوں رکھا گیا اور فرزند کی ولادت کے سلسلے میں ایک یادگار
ن منایا گیا۔ درباری نجومی نے ہمایوں کی پیدائش کو فال نیک قرار دیتے ہوئے کہا۔ ''فرزند فیروز بخت ہوگا اور
دن شہنشاہی کے منصب تک پہنچے گا۔''

بابر ہمایوں کا چہرہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا کہ اس کا بیٹا مایوسیوں کے اندھیرے میں روشنی کی ایک تیز کرن
کر نمودار ہوا تھا۔

ہمایوں کی ولادت کے ایک سال بعد 914ھ میں بابر نے مہمندی افغانوں پر حملہ کر دیا اور اپنے مقصد میں
یاب رہا۔

اسی زمانے میں گردش وقت نے ایک نئی کروٹ لی اور سیاسی شاطروں نے مغل شہنشاہ کے خلاف ایک نئی
چلی۔ بابر ایک نئے جنگی محاذ پر الجھا ہوا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں کچھ مغل سردار الغ بیگ مرزا کے بیٹے
الرزاق مرزا سے مل گئے اور اسے تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ اس وقت عبدالرزاق مرزا کی فوج میں تقریباً چار
سپاہی تھے...... اور بابر کی فوجی طاقت کا یہ حال تھا کہ اس کے جانثاروں کی تعداد کسی بھی صورت میں پانچ سو
زیادہ نہیں تھی۔ اس طرح ملک میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا تھا اور مغل شہنشاہ کے بدخواہ اس فتنے سے بھرپور
اٹھانا چاہتے تھے۔

عبدالرزاق مرزا کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر تیز رفتاری کے ساتھ کابل کی
بڑھا۔ عبدالرزاق مرزا کو اپنا آلہ کار بنانے والے مغل سردار کابل پر قبضہ کر کے مغل شہنشاہ کو اس علاقے
بے دخل کر دینا چاہتے تھے۔ بابر نے یہ پریشان کن خبر سنی تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے دارالحکومت کی
بڑھا۔ وہ ہر حال میں کابل کا دفاع کرنا چاہتا تھا۔ مغل سرداروں کی غداری نے بابر کو اس قدر برافروختہ
یا تھا کہ آتش غضب سے اس کا چہرہ جل رہا تھا اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

بعض ہمدرد مشیروں نے دبے دبے لہجے میں بابر کو سمجھانے کی کوشش کی...... ''شہنشاہ کچھ دن انتظار کریں
حالات کس طرف کروٹ لیتے ہیں۔''

''تم یہی کہنا چاہتے ہو کہ میں کابل کو ہاتھ سے چلا جانے دوں اور ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر اپنے
نل کی بربادی کا تماشہ دیکھتا رہوں۔'' بابر نے مشیروں کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

یہ مشیر جو واقعتاً بابر کے جاں نثار تھے' شہنشاہ کے بدلے ہوئے لہجے پر حیرت زدہ رہ گئے۔ بابر ایک انتہائی
ں مزاج انسان تھا۔ وہ سخت ناخوشگوار حالات میں بھی اپنی زبان کو کسی قسم کی تلخی' یا بدگوئی سے آلودہ نہیں
ہونے دیتا تھا...... مگر آج تو مغل شہنشاہ کی یہ حالت تھی کہ وہ غصے سے بے قابو نظر آ رہا تھا...... ''تم مجھ سے انتظار

کرنے کے لئے کہتے ہو مگر یہ نہیں جانتے کہ جب کابل ہی چلا گیا تو زمین پر کون سا گوشہ عافیت باقی رہ
جہاں بیٹھ کر ہم اچھے دنوں اور خوشگوار موسم کا انتظار کرسکیں۔ پھر تو قبر کی برابر جگہ باقی رہ جائے گی جہاں م
کے سوا کسی دوسری شے کا انتظار نہیں کیا جاسکتا۔''

مشیر خاموش ہوگئے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ اس وقت بابر سے مصلحت کے لہجے میں بات نہیں ل
سکتی۔ وہ ایک ابلتا ہوا آتش فشاں تھا' جس پر پانی کے چند چھینٹے اسے مزید ہولناک بنا سکتے تھے' مجبوراً تمام ا
نثار گھوڑوں پر سوار ہوگئے اور انہوں نے اپنی شمشیریں بے نیام کرلیں۔

بابر نے برق رفتاری کے ساتھ یہ فاصلہ طے کیا اور کابل کے مضافات میں نمودار ہوا۔ پھر عبدالرزاق ا
اور اس کے حامیوں سے ایک خونریز جنگ چھڑ گئی۔ بابر نے اس معرکے میں شجاعت و مردانگی کے وہ کارنا
انجام دیئے کہ جن کے آگے افراسیاب' اسفندیار اور رستم کی بہادری کے افسانے بھی ماند پڑ گئے۔ مغل شہنشاہ
دست بہ دست جنگ میں پانچ نامور پہلوانوں علی بیگ شب کور' محمد علی شیبانی' نظر بہادر ازبک' یعقوب ا
شیر جنگ اور عبداللہ صف شکن کو اپنی تلوار سے قتل کیا۔ یہی پانچ آدمی فتنہ و فساد کی جڑ تھے۔ ان کے قتل ہوتے
عبدالرزاق مرزا کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ شکست کھانے کے بعد عبدالرزاق مرزا میدان جنگ سے فرار ہو
چاہتا تھا مگر بابر کے سپاہیوں نے اسے گرفتار کرکے اپنے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کردیا۔

بابر نے خاندانی رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے عبدالرزاق مرزا کو جانی نقصان پہنچانے کے بجائے قید کی
سزا دی اور ساتھ ہی زنداں کے پہرے داروں کو یہ ہدایت بھی کردی کہ اس کے ساتھ سختی کا سلوک نہ
جائے۔ بابر کی طرف سے یہ صلہ رحمی اور اعلیٰ ظرفی کا بہترین مظاہرہ تھا...... مگر عبدالرزاق مرزا نے مغل شہ
کی طرف سے دی جانے والی اس رعایت کی کوئی قدر نہیں کی اور وہ پس دیوار زنداں رہ کر بھی بابر کے خلا
سازشیں کرتا رہا۔ پھر جب بابر کو اس فتنہ انگیزیوں کی خبر ملی تو مغل شہنشاہ نے عبدالرزاق مرزا کے قتل کا حکم جا
کردیا۔

مغل شہنشاہ کے حکم کے مطابق عبدالرزاق مرزا کو صبح کاذب کے وقت' رات کے اندھیرے میں قتل کیا
تھا۔ بابر ابتدائی شب میں قید خانے پہنچا اور عبدالرزاق مرزا سے ملا۔ اس وقت عبدالرزاق مرزا گھٹنوں میں
چھپائے اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہا تھا۔ بابر کو دیکھتے ہی وہ کھڑا ہوگیا اور مغل شہنشاہ سے اپنی جان بخشی
درخواست کرنے لگا۔ عبدالرزاق مرزا کی رحم طلبی کا انداز اس گداگر جیسا تھا جو مسلسل فاقہ کشی کے با
تیز رفتاری کے ساتھ موت کی طرف بڑھ رہا ہو۔

''نہیں عبدالرزاق مرزا! اب تیری کوئی التجا قابل سماعت نہیں۔'' اس فتنہ پرداز کی گریہ وزاری سن کر
نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تجھے شاید خبر نہ ہو کہ ایک جانور کا خون بہاتے ہوئے بھی میرا دل دکھ جاتا ہے' گ
کردں کہ تیری شیطانیت اور منافقت نے مجھے اس فعل قبیح پر مجبور کردیا۔ کاش! تو اس فتنہ گری سے باز آجا:
خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا۔ افسوس! تو بڑا ہی ناشکرا ہے۔'' یہ کہہ کر شہنشاہ بابر تیز قدموں کے
زنداں سے باہر نکلا اور قصر شاہی کی طرف چلا گیا۔

پھر رات کے پچھلے پہر عبدالرزاق مرزا اپنے خون میں نہا گیا اور اسے رات کے اندھیرے می
سپرد خاک کردیا گیا۔ اس موقع پر بعض امراء نے بابر کو مشورہ دیا تھا کہ کابل کی گلیوں میں عبدالرزاق مرزا کی

لی تشہیر کی جائے۔ اس تجویز کے پس پردہ یہ حکمت عملی پوشیدہ تھی کہ ایک فتنہ گر کی لرزہ خیز موت سے دوسرے
دار اور باغی بھی عبرت حاصل کریں گے...... مگر بابر نے اس مشورے کو پسند نہیں کیا اور عبدالرزاق مرزا کی
استان حیات کا آخری ورق بڑی خاموشی و رازداری کے ساتھ رات کے اندھیرے میں تحریر کردیا گیا۔

¤ ¤ ¤

عبدالرزاق مرزا کی فتنہ انگیزیوں سے نجات پانے اور اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے باوجود بابر کو ہندوستان پر
لہ کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ وہ جب بھی اس طرف کا ارادہ کرتا' کوئی نہ کوئی سیاسی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا اور
ہ نئے مسائل میں الجھ کر ہندوستان کی مہم کو فراموش کرنے پر مجبور ہوجاتا۔ یہاں تک کہ اس کشمکش میں کئی سال
گزر گئے۔

وہ 917ھ کا زمانہ تھا۔ گردش ماہ و سال نے بڑے بڑے سرکشوں اور زور آوروں کو خاک میں ملا دیا
تھا...... مگر قسمت روز اول کی طرح شیبانی خان پر مہربان تھی۔ ازبک سردار روز بروز ترقی کی منازل طے کررہا تھا
ور اس کی سلطنت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔

پھر ایک دن یہ نوبت بھی آگئی کہ ازبک سپاہی قزلباشوں کے علاقے میں داخل ہوکر لوٹ مار کرنے لگے۔
شاہ ایران اسماعیل صفوی کچھ عرصے تک خاموشی سے اس ہنگامہ آرائی کو برداشت کرتا رہا۔ پھر مجبور ہوکر شاہ ایران
نے شیبانی خان کو ایک مختصر خط لکھا۔

''انسان کو لازم ہے کہ وہ ہر وقت اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے اور حکمرانی کے نشے میں اس قدر بے خود
نہ ہوجائے کہ اسے دوسروں کی عزت و آبرو اور حقوق کا لحاظ ہی نہ رہے۔ میں اب تک نہایت صبر و ضبط کے
ساتھ تیری مفسدانہ سرگرمیوں کو برداشت کرتا رہا' مگر اب تجھے تنبیہ کرتا ہوں کہ سرزمین عراق کو تباہ و برباد کرنے
سے باز آجا۔ اگر تو عقل سلیم رکھتا ہے تو تیرے لئے یہی ایک نصیحت کافی ہوگی۔''

شاہ ایران اسماعیل صفوی نے اپنے خط کے آخر میں فارسی کا ایک شعر لکھا' جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

''دوستی کے پودے کی پرورش کر کہ اس پر خوبصورت پھول کھلتے ہیں اور خوش ذائقہ پھل نمودار ہوتے ہیں۔
دشمنی کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے کہ وہ انسان کو ہمیشہ بیشمار رنج و الم کی فصل دیتا ہے۔''

شیبانی خان واقعتاً حکمرانی کے نشے سے سرشار ہو رہا تھا۔ ازبک سردار کو نظر ہی نہیں آیا کہ اس کا مخاطب
کون ہے؟ شیبانی خان نے بڑی حقارت سے شاہ اسماعیل صفوی کا خط پڑھا اور پھر اسے چاک کرکے اپنے پیروں
سے روند ڈالا۔

اس کے بعد ازبک سردار نے شاہ اسماعیل کے نام نفرت کے قلم اور غصے کی روشنائی سے ایک طویل خط
لکھا۔

''اسماعیل صفوی! تو نے ذاتی حیثیت کا اندازہ نہیں کیا اور اپنی حدود سے آگے بڑھ گیا۔ یاد رکھ کہ
بادشاہت کا دعویٰ کرنا اور حکمرانوں سے خط و کتابت کرنا اس شخص کو زیب دیتا ہے جس کے آباؤ اجداد بھی حکمران
رہے ہوں۔ تیری اپنی طاقت کیا ہے' کچھ بھی نہیں۔ تو محض ترکمانوں سے قرابت حاصل کرکے حکومت کا مدعی بن
بیٹھا ہے۔ ہاں تیرے اقتدار کا ڈنکا اس وقت سارے جہان میں بج رہا ہوتا' جب مجھ جیسا اقبال مند تیرے سر پر

۔۔۔ ہوتا۔"

شیبانی خان کا طرزِ تخاطب نہایت تحقیر آمیز تھا۔ اگر حالات سے بے خبر کوئی شخص اس تحریر کو پڑھتا تو ۔۔۔
۔۔۔ ازبک سردار شاہ ایران سے نہیں کسی معمولی جاگیردار سے مخاطب ہے۔ شیبانی خان نے اپنے خط ۔۔۔
۔۔۔ فارسی زبان کا یہ شعر بھی تحریر کیا۔

"اقتدار کی دلہن اس کی ہوتی ہے جو شمشیر آبدار کے ہونٹوں کو بوسہ دیتا ہے۔" (ترجمہ)

خط کے ساتھ ہی شیبانی خان نے ایک عصائے فقیری اور کاسہ گدائی بھی شاہ اسماعیل صفوی کی خدمت ۔۔۔
بطور نذرانہ پیش کئے اور اپنے قاصد کے ذریعے زبانی کہلا بھیجا کہ تیرا اور شاہ ادر باپ دادا کی جائیداد بس یہی ۔۔۔
اس لئے تو بھی گداگری کا پیشہ اختیار کر' اگر تو نے آئندہ اپنی حدود سے نکلنے کی کوشش کی تو پھر میری تلوار ہوگی ۔۔۔
۔۔۔ سر۔

شاہ اسماعیل صفوی نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ شیبانی خان کا ذلت آمیز خط پڑھا اور نہایت پرشکوہ ۔۔۔
۔۔۔ یہ جواب لکھا۔

"اگر سلطنت کسی کی میراث ہی ٹھہری ہے تو "پیش داویوں" سے "کیانیوں" تک اور کیانیوں سے گھر ۔۔۔
پھرتی ہوئی چنگیز کے دروازے تک نہ پہنچتی۔ اور خود تجھے بھی یہ شرف حاصل نہ ہوتا۔ یاد رکھ کہ میری زندگی ۔۔۔
وظیفہ بھی وہی شعر ہے جو تو نے اپنے خط میں تحریر کیا ہے۔ بے شک! اقتدار کی دلہن اسی کی ہوتی ہے جو ۔۔۔
آبدار کے ہونٹوں کو بوسہ دیتا ہے۔ میں تیرا سر قلم کرنے کے لئے آ رہا ہوں۔ اگر تو نے میدان جنگ میں ۔۔۔
سامنا کیا تو باقی باتوں کا جواب زبانی دوں گا۔ فی الحال "چرخہ اور سوت" بھیج رہا ہوں جو تجھے تیرے آبائی ۔۔۔
کی یاد دلاتے رہیں گے۔ میرے ارسال کردہ ان تحائف کو قبول کر اور اپنے باپ دادا کا پیشہ اختیار کر۔ کہیں ۔۔۔
نہ ہو کہ وقت تجھ سے اس کام کا اختیار بھی چھین لے۔ اس لئے جلدی کر!"

شیبانی خان کے قاصد کو خط کا جواب دینے کے بعد شاہ ایران اسماعیل صفوی جنگ کا آغاز کرنے کے ۔۔۔
آگے بڑھا۔ پہلے اقدام کے طور پر اس نے خراسان سے ازبک حاکم کو نکال دیا۔ پھر یہ سلسلہ طویل تر ۔۔۔
گیا۔ تمام علاقوں سے ازبک قوم کے حاکموں کو بے دخل کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ شاہ اسماعیل صفوی پیش ۔۔۔
کرتا ہوا "مرو" کے گرد و نواح میں پہنچ گیا۔

شیبانی خان نے شاہ اسماعیل صفوی کی مسلسل یلغار کی خبریں سنیں تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ ازبک سردار ۔۔۔
وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہ فوری طور پر اس قدر خوفناک جنگی اقدامات کرے گا۔ اسی صورتحال کے ۔۔۔
شیبانی نے اسماعیل صفوی کے ساتھ معرکہ آرائی سے گریز کیا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر جب قاصد شاہ ایران کا خط لے کر پہنچا اور شیبانی خان نے وہ انتہائی ذلت آمیز عبارت پڑھی ۔۔۔
اسماعیل صفوی کے بھیجے ہوئے تحائف دیکھے تو وہ شرم و ندامت کے پسینے میں نہا گیا اور پھر اس کی رگوں ۔۔۔
دوڑنے والا خون جلنے لگا۔

شیبانی خان کے امراء نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کسی طرح ان سنگین لمحات کو ٹال دے کہ ابھی فضا اس ۔۔۔
حق میں سازگار نہیں ہے...... مگر ازبک سردار کی سماعتوں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس نے بظاہر ۔۔۔
مشیروں کا ایک ایک حرف سنا لیکن اس طرح کہ جیسے پاگلوں کا کوئی گروہ ہذیان بک رہا ہے یا پھر راستہ ۔۔۔

ہوئے قافلے کے پیچھے کتے بھونک رہے ہیں۔

"مجھے اس گداگر سے مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔" شیبانی نے امراء کے مشوروں کے جواب میں چیخ کر کہا۔ "اس نے میری شاہانہ حیثیت کو للکارا ہے۔ بھلا میں کس طرح خاموش رہ سکتا ہوں۔ کبھی کسی شاہین نے چیل کوؤں کے ڈر سے اپنی پرواز کا زاویہ تبدیل کیا ہے۔ میں نسلاً ایک عقاب ہوں اور عقاب طوفانی ہواؤں کے جھکڑوں میں بھی اپنی اڑان ترک نہیں کرتا۔"

شیبانی خان احمق نہیں تھا کہ محاذ جنگ کا اندازہ کئے بغیر موت کے منہ میں چلا جاتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شاہ اسماعیل صفوی کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر وہ اس بات کے لئے مجبور تھا کہ قلعے سے باہر نکلے اور قزلباشوں کے سامنے صف آراء ہو جائے۔ شاہ ایران نے اسے مہذب پیرائے میں خوب کھری کھری سنائی تھیں۔ اگرچہ شرفاء کو ذلیل کرنے کا کاروبار خود شیبانی خان نے شروع کیا تھا' لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وقت کے گنبد میں وہ اپنی آواز کی بازگشت اسی شدت کے ساتھ سنے گا۔ ازبک سردار کا خیال تھا کہ اسماعیل صفوی تحقیر آمیز خط پڑھ کر اس سے مرعوب ہو جائے گا اور اس طرح شیبانی خان نفسیاتی محاذ پر شاہ ایران کو شکست دے کر اپنی چیرہ دستیوں کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ ازبک سردار نے بہت سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ ترتیب دیا تھا' مگر شاہ اسماعیل صفوی نے اپنی ذہانت و جرأت سے اس منصوبے کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے اور شیبانی خان کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کے علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ازبک سردار کچھ دن انتظار کر کے ان گراں لمحات کو ٹال سکتا تھا' مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ شاہ ایران کے ذلت آمیز مکتوب اور بھیجے ہوئے تحائف نے شیبانی خان کو خود اس کے درباریوں کی نظر میں ذلیل کر دیا تھا۔ اگر شیبانی خان' اسماعیل صفوی سے مقابلہ کے لئے میدان جنگ کا رخ نہ کرتا تو ازبک سپاہیوں کے دلوں سے اس کی ہیبت ختم ہو جاتی اور اس طرح بہت جلد اس کا اقتدار ختم ہو جاتا' یہی وجہ تھی کہ شیبانی خان نے قلعے سے نکل کر دشمن کے ساتھ معرکہ آرائی کا فیصلہ کیا۔

جب وہ اپنے محافظوں کو قلعے کے دروازے کھول دینے کا حکم دے رہا تھا تو بعض ازبک امراء نے ڈرتے ڈرتے اپنے حکمران کو آخری مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ خراسان کے نظم و نسق پر مامور کر دیا ہے۔ ان حالات میں دشمن کے مقابل آنا کوئی بہتر حکمت عملی ثابت نہیں ہوگی۔ شاہ ایران کی جنگی تیاریاں اور اس کے سپاہیوں کی تعداد ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہے۔" ازبک امراء شیبانی خان کو جنگ سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

اگرچہ شیبانی خان کے فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی' لیکن "مرو" کے قلعے میں صرف پچیس ہزار سپاہی موجود تھے۔ افرادی قوت کی اسی کمی کے باعث ازبک امراء شاہ اسماعیل صفوی کا مقابلہ کرنے سے گریزاں نظر آ رہے تھے۔

شیبانی خان کی بدبختیوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ نتیجتاً اس نے اپنے ہوش مند امراء کے مشوروں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ "اس گداگر کی سرکوبی کے لئے میرے یہی جانباز کافی ہیں۔" ازبک امراء کے سامنے اپنے جاہ و جلال اور غرور و تکبر کا بھرم رکھنے کے لئے اسی انداز سے لاف زنی کر رہا تھا جو اس کی خاص عادت تھی۔

اور پھر ازبک امراء کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ شیبانی خان پچیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر لے کر

قلعے سے باہر نکلا' اسے یقین تھا کہ یہ جنگی مقابلہ بہت زیادہ طول کھینچے گا اور اسی دوران دوسرے علاقوں میں بچے ہوئے باقی سپاہی بھی اس سے آملیں گے۔ مگر جب ازبک فوجی میدان جنگ میں نمودار ہوئے اور شاہ اسماعیل صفوی کے لشکر جرار سے آمنا سامنا ہوا تو ان کی آنکھیں حیرت و پریشانی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ شاہ ایران' فوجی طمطراق دیکھ کر ازبک ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ کسی مقابلے کے بغیر ہی میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ شیبانی خان شدید عالم وحشت میں چیخ چیخ کر پکارتا رہا' مگر کسی ایک نے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ازبکوں کی تاریخ کا وہ عجیب دن تھا جب سپاہی رسم جاں فروشی بھول گئے تھے اور جاں نثاروں نے تمام عہد پیماں توڑ ڈالے تھے۔ عجیب معرکہ تھا کہ شاہ اسماعیل صفوی کا ایک سپاہی بھی ہلاک نہیں ہوا تھا اور اس نے جنگ جیت لی تھی۔ شیبانی خان کے عقاب چڑیوں کی مانند پرواز کر رہے تھے اور موت کے خوف سے اس طرح اڑے چلے جا رہے تھے کہ انہیں اپنی سمت کا بھی اندازہ نہیں رہا تھا۔

موت کو قریب پا کر شیبانی خان بھی اپنے پانچ سو سواروں کے ہمراہ بھاگ کھڑا ہوا۔

شاہ اسماعیل صفوی نے دشمن سپاہیوں کے قتل عام کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اسی حکم کے پیش نظر قزلباش ازبکوں کا تعاقب کر رہے تھے اور بے دریغ انہیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔

شیبانی خان اور اس کے تمام ساتھی ہاتھیوں پر سوار تھے۔ منصب و جاہ کے اعتبار سے یہ سب کے سب امرا اور امیر زادے تھے۔ شاہ اسماعیل صفوی کے سپاہی چاروں طرف پھیل گئے تھے اور اس طرح انہوں نے شیبانی خان کے فرار کے امکانی راستے بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

موت کے قدموں کی چاپ لحظہ بہ لحظہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب کھلے راستے پر شیبانی خان کے لئے بھاگنا ناممکن ہو گیا تھا۔ مجبوراً وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جانوروں کے باڑے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک طویل عریض باڑہ تھا جسے چار دیواری کے ذریعے محفوظ بنا دیا گیا تھا۔ شیبانی خان کا خیال تھا کہ وہ اس باڑے کے ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے گا۔ مگر جب وہ باڑے کے آخری حصے میں پہنچا اس پر یہ خوفناک راز فاش ہوا کہ اس چار دیواری کا دوسرا دروازہ نہیں ہے۔ شیبانی خان گھبرا کر واپس پلٹا تا کہ باڑے سے نکل کر کسی محفوظ مقام کی طرف فرار ہو جائے۔ مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ شیبانی خان اور اس کے ساتھیوں نے ابھی جانوروں کے باڑے کا نصف فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ انہیں قزلباش سپاہی دروازے کے اندر داخل ہوتے نظر آئے۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں شاہ اسماعیل صفوی کے فوجیوں نے شیبانی کے تمام ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ ازبک سردار آخری وقت تک فرار ہونے کی کوشش کرتا رہا اور اسی کشمکش میں وہ ہاتھی سے گر پڑا۔

پھر جب قزلباش سپاہی شیبانی خان کا سر کاٹنے کے لئے آگے بڑھے تو اسے عالیہ تاجدار کے آخری الفاظ یاد آئے۔

''شیبانی خان! آج جس طرح میں اس کمرے میں تنہا مر رہی ہوں تو بھی اپنے لئے کسی ایسی ہی جگہ کا انتخاب کر لے۔''

ازبک سردار لرز کر رہ گیا۔ عالیہ تاجدار تو پھر بھی قصر شاہی کے ایک آراستہ کمرے کے اندر ریشمی بستر پر مری تھی۔ مگر شیبانی خان کی موت بڑی عبرتناک تھی۔ وہ چوپایوں کے طبیلے میں پڑا تھا اور اس کی قبائے زرنگار

جانوروں کی غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی۔ شیبانی خان کو ایک ایک کر کے اپنے سارے مظالم یاد آنے لگے' لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتا تھا' مگر اس پر توبہ کے دروازے بند ہو چکے تھے۔

''مجھے زندہ گرفتار کر کے اسماعیل صفوی کے پاس لے چلو۔ میں شہنشاہ سے اپنی خطاؤں پر معذرت طلب کر لوں گا۔'' دنیا کا ہر ظالم فطرتاً بزدل ہوتا ہے۔ اس لئے شیبانی خان بھی موت کو اپنے نزدیک پا کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اگر وہ مرد شجاع ہوتا تو زنجیر وطوق کا بوجھ اٹھانے کے بجائے سر میدان تلوار کے زخم کھا کر مر جاتا۔

''شہنشاہ کا حکم ہے کہ وہ مکار لومڑی جہاں ملے' اسے ہلاک کر دیا جائے۔'' شاہ اسماعیل صفوی کے سپاہیوں نے جھوٹ بولا۔ وہ دراصل گراں قدر انعام کی طلب میں شیبانی خان کا سر کاٹ کر اپنے شہنشاہ کے حضور پیش کر دینا چاہتے تھے۔

ازبک سردار نے لہجہ بدل کر رحم کی درخواست کی' مگر ابھی اس کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ ایک سپاہی نے پوری طاقت سے اپنا نیزہ شیبانی خان کے سینے پر مارا۔ ایک دردناک چیخ فضا میں ابھری۔ دشمن فوجی کا نیزہ ازبک سردار کی پسلیاں توڑ کر سینے کے پار ہو گیا تھا۔ دوسرے قزلباش سپاہی نے اسی انداز سے شیبانی خان پر ایک اور وار کیا۔ ازبک سردار پھر چیخا' مگر یہ چیخ بہت کمزور تھی۔ شاہ ایران کے تیسرے سپاہی کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی۔ ایک اور نیزہ شیبانی خان کے سینے میں اتر گیا۔ کچھ دیر تک یہ مشق ستم جاری رہی' آخر شیبانی خان تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ پھر ایک سپاہی جھکا اور اس نے اپنی تلوار سے ازبک حکمران کا سر کاٹ لیا۔

¤ ¤ ¤

اسی دوران بابر کے ایک چچا زاد بھائی خان مرزا کو شاہ اسماعیل صفوی کی فتح کی خبر ملی۔ خان مرزا اس وقت بدخشاں میں مقیم تھا' اس نے فوراً ایک تفصیلی خط لکھ کر بابر کو روانہ کیا اور ساتھ ہی بدخشاں آنے کی دعوت دی۔ خط پڑھ کر بابر سجدے میں گر گیا اور بہت دیر تک اپنے خالق حقیقی کا شکر ادا کرتا رہا' پھر بابر نے اپنے درباری امراء کو طلب کر کے یہ خوشخبری سنائی کہ اس کا سب سے بڑا دشمن ذلت و رسوائی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس فتح کا تعلق براہ راست بابر سے نہیں تھا' لیکن پھر بھی درباری امراء نے شیبانی خان کے قتل پر مغل شہنشاہ کو مبارکباد پیش کی۔ بابر بہت خوش تھا' مگر گفتگو کے دوران اس کے سرخ و سفید چہرے پر ایک ناآسودہ حسرت کا دھواں پھیل جاتا تھا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ مچل جاتے تھے۔

''کاش! میں شیبانی خان کے مظالم کا قرض ادا کر سکتا' مگر کیا کروں کہ وہ سود و زیاں کی قید سے نکل کر بہت دور جا چکا ہے۔ میں بظاہر خوش ہوں' مگر میرا دل بہت اداس ہے۔ سینے کا یہ زخم ہمیشہ سلگتا ہی رہے گا۔ کاش! مجھے قسمت ایک موقع فراہم کرتی۔''

شیبانی خان کی شکست اور موت کے بعد مغل شہنشاہ میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ نتیجتاً وہ خان مرزا کا دعوت نامہ موصول ہوتے ہی برق رفتاری کے ساتھ بدخشاں کی طرف بڑھا۔ بابر اپنے چچا زاد بھائی کی مدد سے قلعے میں داخل ہونا چاہتا تھا' مگر ازبک سپاہی قبل از وقت مغل شہنشاہ کی آمد سے باخبر ہو گئے تھے' اس لئے بابر اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

بدخشاں کے محاصرے کے دوران ہی بابر کو شاہ اسماعیل صفوی کا خط ملا۔ جس میں شیبانی خان کی شکست اور موت کے تفصیلی حالات درج تھے اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی تحریر تھی کہ وہ اپنے ایک فوجی دستے کی نگرانی میں خانہ زاد بیگم اور دوسری مغل شہزادیوں کو اس کے پاس بھیج رہا ہے۔

اپنے بدترین دشمن سے نجات پانے کے علاوہ بابر کو ایک اور ناقابل بیان خوشی حاصل ہوئی۔ حقیقی بہن اور دوسری رشتے دار خواتین کی جدائی اس کی روح کا ناسور بن چکی تھی۔ شاہ ایران کے خط نے اس کے لاعلاج زخم پر شفاء کا مرہم رکھ دیا۔

یہ خبر سن کر احمد جمال بھی بہت خوش تھا۔ آج پہلی بار اس کی آنکھوں میں کسی کے انتظار کا عکس نظر آیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ بار بار اس شاہراہ کی طرف دیکھ رہا تھا' جس سے گزر کر مغل شہزادیوں کے قافلے کو ''قندز'' پہنچنا تھا۔ احمد جمال کی بے چین نگاہیں عالیہ تاجدار کی منتظر تھیں۔

¤ ¤ ¤

شاہ اسماعیل صفوی کے جاں باز سپاہیوں کا ایک دستہ پوری حفاظتی تیاریوں کے ساتھ شہنشاہ بابر کی چھوٹی بہن اور شیبانی خان کی بیوہ خانہ زاد بیگم کو لے کر ''قندز'' کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''مرو'' اور ''قندز'' کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا گیا۔ پھر ایک ایک کر کے دن گنے جانے لگے۔ مغل سرداروں کو خوشی تھی کہ ان کا فرمانروا ایک طویل انتظار کے بعد اپنی حقیقی ہمشیرہ اور دوسری رشتے دار خواتین سے مل کر سکون قلب حاصل کرے گا اور برسوں سے اس کے سینے کی گہرائیوں میں کھٹکنے والی زہریلی پھانس ہمیشہ کے لئے نکل جائے گی...... اور پھر مغل شہنشاہ یکسو ہو کر اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہو سکے گا۔ ان کی سوچ اور جذبات کا دائرہ بس یہیں تک محدود تھا۔ اس لئے کہ وہ صاحب معاملہ نہیں تھے' اگر ان میں سے کسی سردار کی بہن پر یہ قیامت گزر جاتی تو اس کے سوچنے کا انداز بہت مختلف ہوتا۔

مغل سرداروں کو اندازہ نہیں تھا کہ بابر اپنی بہن اور دوسری عورتوں کے سلسلے میں کتنا حساس ہے اور کس قدر نازک جذبات رکھتا ہے۔ اس حادثے کے بعد کوئی دن ایسا نہیں آیا جب بابر جی کھول کر ہنسا ہو اور کوئی رات ایسی نہیں گزری جب اس نے خانہ زاد بیگم کو خواب میں نہ دیکھا ہو۔ شاہ ایران کا خط ملتے ہی بابر پر شدید اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی تھی' اسے انتظار کا ایک ایک لمحہ اپنی طوالت میں صدیوں کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ یہی حال احمد جمال کا بھی تھا۔ خانہ زاد بیگم تو اس کی آغوش میں پلی تھی۔ پھر جب وہ خوبصورت لڑکی ایک المناک حادثے میں بچھڑ گئی تو احمد جمال اکثر تنہائی میں خانہ زاد بیگم کو یاد کر کے رویا کرتا تھا۔ اس نے کبھی بابر کے سامنے ذاتی جذبوں کی نمائش نہیں کی' مگر حقیقتاً وہ خانہ زاد بیگم کو اپنے ہی جسم کا حصہ سمجھتا تھا۔ احمد جمال نہ صرف ماں باپ کی محبتوں سے محروم رہا تھا بلکہ بہن بھائی اور دوسرے خونی رشتوں کی قربت سے بھی آشنا نہ ہو سکا تھا۔ اسی لئے وہ بابر کے چہرے میں اپنے چھوٹے بھائی اور خانہ زاد بیگم کی شکل میں چھوٹی بہن کا عکس تلاش کرتا رہا تھا۔

خانہ زاد بیگم کے علاوہ ایک اور ہستی بھی تھی جس کا احمد جمال کو شدت سے انتظار تھا۔ عالیہ تاجدار جب تک قریب رہی وہ اسے نظر انداز کرتا رہا...... مگر جب درمیان میں طویل فاصلے حائل ہو گئے تو احمد جمال کو احساس ہوا کہ جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس احساس میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی...... اور اب یہ کیفیت تھی کہ جب سے اس نے عالیہ تاجدار کی آمد کے بارے میں سنا تھا' وہ ایک رات بھی چین سے نہیں سو سکا تھا۔

پھر جب سورج طلوع ہوا تو بابر اپنے ایک مخصوص فوجی دستے کے ساتھ محل سے باہر نکلا۔ احمد جمال بھی ار ، ے ہمراہ تھا۔ مغل شہنشاہ جوش جذبات میں ''قندز'' کی سرحدوں سے دور نکل آیا۔ وہ شدید اضطراب کے عالم میں بار بار اس شاہراہ کی طرف دیکھ رہا تھا' جس سے گزر کر خانزاد بیگم اور مغل شہزادیوں کو اس تک پہنچنا تھا

جب دور تک کوئی متحرک سوار نظر نہ آتا تو بابر احمد جمال کو مخاطب کر کے بے ساختہ پکار اٹھتا۔ ''احمد! یہ وقت تھم کر کیوں رہ گیا ہے؟ فاصلے ختم کیوں نہیں ہوتے اور وہ لوگ آ کیوں نہیں جاتے؟ آخر میں کب تک ان کا انتظار کروں گا؟''

احمد جمال خود بھی مغل شہنشاہ سے یہی سوالات کرنا چاہتا تھا' مگر وہ بابر کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے سے قاصر تھا......

''ہر فاصلہ ختم ہونے ہی کے لئے ہے شہنشاہ! بس آنے والے آیا ہی چاہتے ہیں۔ کچھ دیر کی بات ہے زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے......'' انتہائی کوشش کے باوجود احمد جمال اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا' بات کرتے وقت اس کی سانس پھولنے لگی تھی' جیسے اس نے ایک طویل فاصلہ بھاگ کر طے کیا ہو۔

کچھ دیر اور اسی جذباتی کشمکش میں گزر گئی۔ مغل شہنشاہ مزید آگے بڑھ کر اپنی بہن کا استقبال کرنا چاہتا تھا۔ مگر احمد جمال نے اسے یہ کہہ کر روک دیا...... ''آپ قندز کی آخری سرحد پر کھڑے ہیں۔ یہاں سے آگے جانا دور اندیشی اور مصلحت کے سخت خلاف ہے۔ قدم قدم پر منافقت و ریاکاری کے جال بچھے ہیں اور ہر موڑ پر دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں۔''

احمد جمال کا مشورہ سن کر بابر سنبھل گیا' مگر اس کی آنکھوں کی پتلیاں اسی طرح چاروں طرف گردش کرتی رہیں۔ وہ خانزاد بیگم کے ساتھ آنے والے فوجی قافلے کا منتظر تھا۔

پھر اچانک ایک سمت سے غبار اٹھنے لگا۔ بابر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ راستے سے اٹھنے والا غبار کسی قافلے کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ یہ فوجیوں کا قافلہ بھی ہو سکتا تھا اور تاجروں کا کارواں بھی...... فاصلہ زیادہ تھا اور انسانی چہرے دھول میں چھپے ہوئے تھے۔ اس لئے کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے کون ہیں؟

احمد جمال نے بھی مضطرب نگاہوں سے اپنے بائیں جانب اٹھنے والے غبار کو دیکھا' پھر فوراً پلٹ کر تمام سپاہیوں کو مستعد رہنے کا حکم دیا۔

''نہیں احمد! یہ دوستوں کا قافلہ ہے...... آنے والے محسنوں کا کارواں ہے...... وہ محسن جنہوں نے تمہارے شہنشاہ پر احسان عظیم کیا ہے......'' بابر نے شدید جذباتی لہجے میں کہا۔

''شہنشاہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ گرد و غبار کی فطرت کیا ہے؟'' احمد جمال ہیجانی کیفیت کا شکار ہونے ہوئے بھی ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا...... ''غبار انسانی خد و خال کو مٹا دیتا ہے' کوئی نہیں جانتا کہ غبار کے پیچھے کون ہے' دوست یا دشمن؟ اب تک تو غبار چھٹنے کے بعد ہمارے دشمن ہی نمودار ہوئے ہیں۔'' احمد جمال ماضی کے بے شمار تجربات کی روشنی میں گفتگو کر رہا تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو احمد!'' مغل شہنشاہ نے اپنے جاں نثار ساتھی کے اشارے کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس غبار کے پیچھے میری معصوم بہن اور بے گناہ مغل شہزادیوں کے چہرے ہیں یا ان مسیحاؤں کی شفیق و مہربان

صورتیں' جو میرے دل کے زخموں کا علاج کرنے کے لئے اس طرف آ رہے ہیں۔''

''کاش! ایسا ہی ہو۔'' احمد جمال نے کہا اور چند سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر صحیح صورتحال دریافت کریں۔

مغل سپاہی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے اور آنے والے قافلے سے جا ملے۔ پھر تیزی سے واپس آ کر انتہائی پرجوش لہجے میں بابر کو بتانے لگے۔ وہ شاہ اسماعیل صفوی کے سپاہی ہیں جو......''

ابھی سپاہیوں کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ بابر درمیان میں بول اٹھا...... ''کیا خانزاد بیگم بھی ان کے ساتھ ہے؟'' مغل شہنشاہ کا اضطراب اور تجسس ناقابل بیان تھا۔

''شہزادی معظمہ بھی ان کے ہمراہ ہیں......'' سپاہیوں نے بیک زبان کہا۔

بابر اپنے فوجیوں سے مزید سوال کئے بغیر گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا اور شاہ ایران کے سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا۔

احمد جمال اور دوسرے سپاہی بھی اپنے شہنشاہ کی تقلید میں آگے بڑھے۔

شاہ اسماعیل صفوی کے سپاہی بابر کو کوئی مغل سردار سمجھ رہے تھے...... مگر جب احمد جمال نے انہیں بتایا کہ شہنشاہ ظہیر الدین بابر بہ نفس نفیس اپنی ہمشیرہ کے استقبال کے لئے تشریف لائے ہیں تو قزلباش فوجی اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے اور سروں کے ساتھ اپنی شمشیریں جھکا کر مغل فرمانروا کو فوجی سلام پیش کیا۔

''خوش آمدید! خوش آمدید!''

بابر نے اپنی تلوار فضا میں لہرا کر قزلباش سپاہیوں کے سلام کا جواب دیا اور اس محمل نما سواری تک جا پہنچا جس میں خانزاد بیگم موجود تھی۔ شاہ ایران نے مغل شہزادی کے لئے ایک اعلیٰ درجے کے رتھ کا انتظام کیا تھا' جسے چار گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ شاہی خاندان کی دوسری خواتین بھی اسی طرح کی سواریوں میں سفر کر رہی تھیں' مگر خانزاد بیگم کا رتھ دوسرے رتھوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں تھا۔

بابر اسی وقت اپنی ہمشیرہ سے ملنا چاہتا تھا' لیکن ایک پردہ دار شہزادی نامحرموں کے سامنے کس طرح پردے سے باہر آتی؟ یہی سوچ کر مغل شہنشاہ خانزاد بیگم کی سواری کے ساتھ ساتھ چلتا رہا' اگرچہ بابر کا اضطراب عروج پر تھا لیکن پھر بھی اسے ایک عجیب سی طمانیت حاصل تھی۔

احمد جمال گھبرا گھبرا کر تمام رتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا' اس کی مضطرب نگاہیں اس سواری کو تلاش کر رہی تھیں جس میں عالیہ تاجدار سفر کر رہی تھی۔ یکایک احمد جمال کی نظروں کے سامنے اس کے ماضی کے کچھ نقوش ابھر آئے اور پھر شدید ندامت کا احساس اس کے اعصاب پر غالب آ گیا۔

''میں کس طرح عالیہ کا سامنا کر سکوں گا؟'' احمد جمال نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''وہ عالی نسب شہزادی ہوتے ہوئے بھی ایک عام انسان کے لئے مسلسل قربانیاں دیتی رہی...... اور اس عام انسان نے شہزادی کے لئے کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔'' یہی وہ مقام تھا' جہاں پہنچ کر احمد جمال کو عجیب سی ندامت کا احساس ہونے لگتا تھا...... ''میں نے کسی سے کب کہا تھا کہ وہ میرے لئے ساری دنیا کی آسائش ترک کر دے؟'' احمد جمال نے اپنی بے رخی کا جواز تلاش کرنا چاہا۔ ''میں کسی سے محبت و ہمدردی کا طلبگار نہیں تھا۔'' احمد جمال اپنے آپ سے الجھ رہا تھا۔

"پھر اس کا انتظار کیوں کر رہا ہے؟" احمد جمال کو محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی ہو۔

"اب مجھے اس کی وفا پر اعتبار آنے لگا ہے' اسی لئے انتظار کر رہا ہوں۔" احمد جمال نے اس سرگوشی کے جواب میں کہا اور یکایک اسے امیرالدین یاد آ گیا۔

امیرالدین کے کردار نے احمد جمال کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور اسی تاثر کے سبب اس کے دل میں عالیہ کے لئے ایک خاص کسک پیدا ہوئی تھی۔ عالیہ تاجدار نے اس کی خاطر قتلغ خانم کا ہر ظلم برداشت کیا تھا...... امیرالدین اپنے عہد وفا کو نبھانے کے لئے بار بار موت کی وادیوں سے گزر رہا تھا۔ یہ دونوں افرادِ عشق کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

احمد جمال خود بھی عشق کے اسی خاندان کا ایک فرد تھا' مگر تلخ تجربات کے باعث اس نے اپنے سینے میں اٹھنے والے جذباتی طوفان کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عشق کی آگ سے اپنا دامن بچا کر چپ چاپ گزر جائے گا لیکن امیرالدین کے حوالے سے اجودھیا میں پیش آنے والے واقعات نے احمد جمال کو عالیہ تاجدار کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عجیب و غریب صورتحال تھی۔ شکنتلا کی زندگی میں جو کردار امیرالدین ادا کر رہا تھا وہی کردار عالیہ تاجدار احمد جمال کی زندگی میں ادا کر رہی تھی۔ امیرالدین اور عالیہ تاجدار اہل وفا میں سے تھے اور عشق کے جانبازوں میں ان کا شمار ہوتا تھا...... مگر شکنتلا؟ وہ تو ایک عہد شکن اور ...ناک عورت تھی۔

"کیا وہ خود بھی شکنتلا کے گروہ کا ایک فرد ہے؟"

احمد جمال نے گھبرا کر سوچا...... "معاذاللہ! کہاں وہ بدعہد عورت اور کہاں میں؟" احمد جمال اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے دل ہی دل میں جواب دے رہا تھا۔

"مگر یہ بھی خودغرضی اور بے حسی کی ایک بدترین مثال ہے کہ کوئی شخص کسی کے لئے اپنی جان سے گزر جائے اور وہ اس کا حال تک نہ پوچھے۔" احمد جمال کے ذہن میں نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔

"میں اس جاں فروش لڑکی سے کئے جانے والے تغافل پر معذرت طلب کر لوں گا' یہی جواں مردی ہے کہ پوری سچائی کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لیا جائے۔" آخر احمد جمال غائبانہ طور پر عالیہ تاجدار کے سامنے خم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ بڑا رقت انگیز اور المناک منظر تھا جب بابر ایک طویل عرصے کے بعد اپنی چھوٹی بہن سے ملا۔ خانہ زاد بیگم معصوم بچے کی طرح اس بھائی کے سینے پر سر رکھے رو رہی تھی جو باپ کی طرح شفیق و مہربان تھا۔

قصر شاہی کے سارے مکین اشکبار تھے' مگر ان کے آنسوؤں کے پیچھے خوشی کا ایک دھندلا سا منظر بھی جھلک رہا تھا۔

بابر بہت دیر تک اپنی سوگوار بہن کو تسلیاں دیتا رہا......

"تیرا بھائی مجبور ضرور تھا' خانم! مگر بے غیرت نہیں تھا...... کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب میں نے شیبانی خان

سے اس ذلت آمیز سلوک کا انتقام لینے کی کوشش نہ کی ہو' لیکن کاتب تقدیر نے اس کی بربادی میرے ہاتھوں نہیں لکھی تھی' میں کیا کرتا؟ زمین پر رہنے والے آسمانی فیصلوں سے انحراف کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں تیرا تصور لئے کہاں کہاں پھرا ہوں؟ میری خانہ بدوشی سے پوچھ اور میری دشت نوردی سے دریافت کر! تیرے بغیر ایک رات بھی چین سے نہیں سویا اور تجھ سے کیا کہوں؟ بس صبر کر! تیری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تو ایک بھیڑیے کی بیوی بن جائے اور پھر وہ خون آشام درندہ تجھے عین جوانی میں بیوگی کا لباس پہنا کر خود ایک کتے کی موت مر جائے۔" شیبانی خان کا ذکر کرتے ہوئے بابر کے ہونٹوں سے نفرت و غضب کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"اپنی موت کے وقت شیبانی خان میرا شوہر نہیں تھا۔" خانہ زاد بیگم نے ایک عجیب انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

بابر شدید حیرت کے عالم میں اپنی بہن کی طرف دیکھنے لگا۔ "خانم! آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

بابر کے سوال پر آتش غضب سے خانہ زاد بیگم کا چہرہ جلنے لگا' پھر وہ بے اختیار آگے بڑھی اور بھائی کے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"اس نے شادی کے کچھ دن بعد ہی مجھے طلاق دے دی تھی۔ میں بہت خوش تھی کہ اس طرح مجھے اس وحشی سے نجات مل گئی تھی...... مگر وہ ایک ایسا اذیت پسند درندہ تھا جو اپنے شکار کو سسکتا دیکھ کر لذت حاصل کرتا تھا' طلاق دے کر اس نے مجھے ایک ازبک سردار سے شادی پر مجبور کر دیا تھا۔"

اذیت و کرب کی شدت سے بابر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ بار بار اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

"شیبانی خان کی درندگی کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا......"

خانہ زاد بیگم کی سسکیاں کچھ اور تیز ہو گئی تھیں...... "کچھ دن بعد اس کے حکم پر ازبک سردار نے مجھے طلاق دے دی۔ پھر شیبانی خان نے مجھے دوسرے ازبک سردار سے شادی پر مجبور کر دیا۔ وہ میری ذلت و بربادی کے نئے نئے سامان کرتا تھا اور اعلیٰ نسب شہزادی کی بے کسی دیکھ کر وحشیانہ قہقہے لگاتا تھا۔ اگر شیبانی خان اور زندہ رہتا تو اپنی درندگی کے کاروبار کو اسی طرح جاری رکھتا۔ میں سمرقند میں ایک ادنیٰ درجے کی کنیز بن کر رہ گئی تھی' جو اقتدار کی نیلام گاہ میں بار بار نیلام ہوتی تھی اور خدمت گاری کے منصب کے لوگ اس کی بولیاں لگاتے تھے۔"

بابر کے ہونٹ سرخ ہو گئے تھے اور بہنے والا خون اس کی ڈاڑھی تک پہنچ گیا تھا۔ "پھر تو زندہ کیوں رہی خانم؟" مغل شہنشاہ کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ "اتنی بے آبروئی کے بعد تو موت ہی انسان کی آخری منزل ہوتی ہے' اس طرح فروخت ہونے سے تو بہتر تھا کہ تو نے سمرقند میں اپنے لئے قبر کی جگہ تلاش کر لی ہوتی' اس بے ننگ و نام درندے کے مظالم کا کیا شکوہ کروں؟ گلہ تو تجھ سے ہے خانم کہ تو مغلوں کی روایت پر قربان کیوں نہ ہو گئی؟"

"موت سے بہت ڈر لگتا تھا شہنشاہ!" خانہ زاد بیگم نے سر اٹھا کر خونبار آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھا...... "اور پھر دھندلی سی آس بھی باقی تھی کہ شاید آپ سے ملاقات ہو جائے...... اور میں آپ کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کر سکوں کہ آپ کے سوا کون میری زبان سمجھتا؟"

بابر ایک نوعمر اور بے یارومددگار لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھتا تھا' اس نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پالیا اور حسب عادت انتہائی مہربان لہجے میں چھوٹی بہن کے غموں کا مداوا کرنے لگا۔

''تیرے بھائی کی عدالت تو بہت کمزور تھی خانم! وہاں تیری دادرسی کس طرح ہوتی؟ شکر کر کہ سب سے بڑی عدالت میں تیرا مقدمہ پیش ہوگیا تو نے اپنی آنکھوں سے ظالم کا انجام نہیں دیکھا' مگر شاہ اسماعیل صفوی نے مجھے تحریر کیا ہے کہ شیبانی خان کا انجام ایک پاگل کتے کے انجام سے مختلف نہیں تھا۔ اب تو اپنے سارے دکھوں کو بھول جا اور آزادی کے خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو' کہ یہ موسم خوش نصیبوں کو میسر آتا ہے۔ خدا تجھے ہمیشہ شادوآباد رکھے۔'' یہ کہہ کر بابر نے خانزادہ بیگم کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہاتھ جو مرحوم ماں کی محبتوں کا آنچل بنا ہوا تھا۔

بابر کے بعد احمد جمال خانزادہ بیگم سے ملا۔ وہ شکستہ حال لڑکی اسی طرح احمد جمال سے لپٹ کر روتی رہی۔ خانزادہ بیگم کی داستان الم اتنی دردناک تھی کہ اس نے احمد جمال کے سینے میں بھی شگاف ڈال دیا' وہ آہنی اعصاب رکھنے والا سپاہی بھی حرم سرا کی خواتین کے ساتھ مل کر آنسو بہاتا رہا۔

پھر اشکوں کا یہ سیلاب ٹھہرا تو اس نے غبار آلود نظروں سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا' اس کی مضطرب نگاہیں شاہی خواتین اور کنیزوں کے ہجوم میں عالیہ تاجدار کو تلاش کر رہی تھیں..... مگر مطلوبہ ہستی کا دور دور بھی پتا نہیں تھا۔ احمد جمال حرم سرا میں داخل ہونے سے پہلے سوچ رہا تھا کہ عالیہ تاجدار تمام مغل شہزادیوں میں نمائش ہوگی' لیکن جب وہ بہت دیر تک نظر نہ آئی تو احمد جمال نے یہی خیال کیا کہ عالیہ اس سے ناراض ہے اور اس خفگی کے پیش نظر وہ اس کا سامنا کرنے سے گریزاں ہے۔ کئی بار احمد جمال کے جی میں آئی کہ وہ خانزادہ بیگم سے عالیہ تاجدار کے بارے میں دریافت کرے' اگر وہ ایسا کرتا تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ ہوتی' وہ خود بھی شاہی خاندان کے ایک محترم فرد کی حیثیت رکھتا تھا..... مگر احمد جمال اپنی روایتی غیرت وحیا کے باعث چھوٹی بہن کے سامنے دل کی بات نہ کہہ سکا..... اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔

¤ ¤ ¤

فرغانہ میں عالیہ تاجدار کا معمول تھا کہ وہ نصف شب کے قریب احمد جمال سے ملنے آتی تھی۔ ماضی کی ان ہی یادوں کے زیر اثر احمد جمال ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکا۔ اسے عالیہ تاجدار کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ وہ بار بار بستر سے اٹھتا اور کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ ہر آہٹ پر اسے گمان ہوتا تھا کہ عالیہ تاجدار اس کے کمرے کے قریب پہنچ چکی ہے اور چند لمحوں بعد ہی دروازے پر دستک دینے والی ہے۔ مگر یہ فریب سماعت تھا اور سراسر خوش گمانیوں کی نیرنگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کسی کنیز یا خدمت گار کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور پھر آہستہ آہستہ ڈوب جاتی' اس مختصر سے وقت میں احمد جمال امید وبیم کی ناقابل بیان کیفیت سے دوچار رہتا اور پھر اس کے حسین وشاداب چہرے پر رات کے اندھیرے کی طرح مایوسیوں کی گہری دھند پھیل جاتی۔

''وہ یقیناً بہت زیادہ ناراض ہے۔'' احمد جمال کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا..... ''اور اسے ناراض ہونا بھی چاہئے۔'' احمد جمال نے دل ہی دل میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرلیا۔ وہ ایک سچا' بیباک اور

حقیقت پسند انسان تھا۔ عالیہ تاجدار سے بے نیازی کا سبب احمد جمال کا زخم خوردہ ماضی تھا' جس نے اسے بے اعتباری کی آخری منزل تک پہنچا دیا تھا..... مگر جب اس نے اجودھیا میں امیرالدین کی بے پناہ قربانیاں دیکھیں تو وہ عشق کی حقیقت کو سمجھا..... اور پھر اس پر عالیہ کا جذبہ ایثار اپنی تمام تر عظمتوں کے ساتھ منکشف ہوا..... اور اب یہی ادراک اس کی آنکھوں سے نیندیں اڑا کر لے گیا تھا..... ''اگر وہ نہیں آئی تو پھر کیا ہوگا؟'' احمد جمال نے اپنے آپ سے ایک اور سوال کیا..... ''تو پھر مجھے خود اس کے پاس جانا چاہئے' اب تک وہی تو آتی رہی ہے۔''

احمد جمال نے کسی ذہنی کشمکش کے بغیر اپنے سوال کا جواب دے دیا۔

اس جواب سے اسے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک عجیب سی سرشاری کا احساس ہوا تھا اور چند لمحوں میں تمام تر اضطرابی کیفیت ختم ہوگئی تھی۔ احمد جمال بستر پر دراز ہوگیا' مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا کہ اسے آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی عالیہ تاجدار کا انتظار تھا۔ یہ اس کا اپنی ذات پر بے پناہ اعتماد تھا یا احساس برتری؟ احمد جمال کو یقین تھا کہ عالیہ تاجدار اس سے ملنے ضرور آئے گی۔

اور پھر یکایک اس کے یقین نے جیتی جاگتی شکل اختیار کرلی۔ احمد جمال کو اپنے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی تھی۔ یہ اس کی سماعت کا فریب تھا یا شدت انتظار نے کسی آہٹ کو دستک سمجھ لیا تھا۔ احمد جمال بڑی تیزی کے ساتھ بستر سے اٹھا اور دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب اور جسم پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔ آج سے پہلے سینکڑوں بار عالیہ تاجدار اس کے کمرے میں آئی تھی' مگر احمد جمال کبھی اس کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر تک راہداری میں سناٹا طاری رہا۔ احمد جمال کی سانسیں متوازن ہونے لگیں اور اس کا سرخ چہرہ آہستہ آہستہ بجھنے لگا۔ کشمکش انتظار اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی..... اور رنگین تصورات کا پرفریب طلسم ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ وہ کوئی اور ہی آواز تھی' جسے احمد جمال دستک سمجھ بیٹھا تھا۔ اب باہر کے اندھیرے کی طرح اس کے اندر بھی گہری تاریکی اترتی جا رہی تھی۔ وہ کسی طویل مسافت طے کرنے والے نڈھال مسافر کی طرح اپنے بستر کی طرف بڑھا..... مگر ابھی اس نے اپنے پیروں کو جنبش ہی دی تھی کہ دوسری بار دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دستک دنیا کی ہر موسیقی سے زیادہ مترنم تھی' جلتے ہوئے موسم میں پہلی بارش کی طرح نغمہ باز' ایک لمحے کی بات تھی۔ بے جان مٹی میں جان پڑ گئی۔ احمد جمال بہت تیزی سے پلٹا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ راہداری میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس لئے وہ آنے والے کو پہچان نہ سکا۔ پھر بھی جسمانی ساخت سے اتنا اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ آنے والی کوئی عورت ہے..... اور وہ عورت عالیہ تاجدار کے سوا کون ہوسکتی تھی؟ احمد جمال کو اپنے اندازے پر پورا یقین تھا اور اس نے اپنے اسی یقین کے سہارے آنے والے سے مخاطب ہوکر کہا تھا۔

''اندر آجاؤ عالیہ!'' یہ کہہ کر احمد جمال دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

''میں عالیہ نہیں ہوں بیٹے!'' ایک بوڑھی عورت نے اندر آتے ہوئے کہا..... ''میں صاحب عالم عمر شیخ مرزا کی کنیز سعدیہ ہوں۔''

احمد جمال کو اپنے ذہن میں ایک دھماکہ سا محسوس ہوا' مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا' اس نے سوچا کہ کنیز سعدیہ عالیہ تاجدار کا کوئی پیغام لے کر آئی ہوگی' محبوب نہ سہی' اس کا پیغام ہی سہی۔

''بی بی! آپ اور اس وقت؟'' احمد جمال نے حیرت زدہ لہجے میں بوڑھی کنیز سے کہا۔

''بیٹے! دروازہ بند کردو......'' کنیز سعدیہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

احمد جمال نے صورتحال سے بے خبر ہونے کے باوجود بوڑھی کنیز کی ہدایت پر عمل کیا اور آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔ جب وہ پلٹ کر سعدیہ کے قریب آیا تو بوڑھی عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''یہ سب کیا ہے بی بی؟ آدھی رات کے بعد پراسرار انداز میں یہاں تک آنا اور پھر آنکھوں میں یہ آنسو؟'' احمد جمال عمر شیخ مرزا کی معتمد کنیز کو 'بی بی' کہہ کر پکارتا تھا۔ اس شفیق و مہربان عورت نے ملکہ فرغانہ قتلغ خانم کی شدید ناراضی کے باوجود احمد جمال سے ماں جیسا سلوک کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کنیز سعدیہ اس کے سامنے آتی تھی' وہ احتراماً کھڑا ہوجاتا تھا' اس وقت بھی احمد جمال سعدیہ کے سامنے کھڑا تھا اور اس سے اس کی بے وقت آمد اور بہتے ہوئے آنسوؤں کا سبب دریافت کررہا تھا۔

''جب ساری دنیا سوگئی تو میں نے تمہارے کمرے کا رخ کیا بیٹے!'' بوڑھی سعدیہ انتہائی شکستہ لہجے میں رک رک کر بول رہی تھی۔ ''پھر بھی ایک دھڑکا سا لگا ہوا ہے کہ کہیں کسی نے مجھے اس طرف آتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا؟'' سعدیہ پر ایک دہشت سی طاری تھی۔

''کون دیکھے گا؟'' احمد جمال کی آواز کسی قدر تیز ہوگئی تھی...... ''اور اگر دیکھ بھی لے گا تو کیا ہوگا؟'' یہ کہتے ہوئے احمد جمال کے چہرے پر تلخی کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔

''آہستہ بات کرو بیٹے!'' بوڑھی سعدیہ کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کا رنگ کچھ اور گہرا ہوگیا تھا...... ''اسی لئے میں نے تم سے دروازہ بند کرنے کو کہا تھا...... رازداری کی قسم کھائی ہے تو اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔ چاہے اس کشاکش میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ امانت کا تحفظ آسان نہیں ہوتا۔ کون جانے کہ موت کا قزاق کب زندگی کے قافلے پر شب خون مار کے متاع جاں لوٹ لے اور انسان نہ چاہتے ہوئے بھی خائن بن کر رہ جائے۔ میرے مالک کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ میں امانت کے منتقل کرنے تک زندہ رہی۔''

''رازداری؟ امانت؟ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا بی بی!'' احمد جمال سعدیہ کی باتیں سن کر الجھ گیا تھا۔

''میرے قریب آجاؤ بیٹے! اور قریب آجاؤ۔'' بوڑھی سعدیہ قالین ہی پر بیٹھ گئی تھی۔

احمد جمال شدید حیرت کے عالم میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کنیز کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

سعدیہ جلد جلدی اپنی گٹھری کھولنے لگی۔ احمد جمال پلکیں جھپکائے بغیر' شاہی کنیز کے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ بند گرہیں کھلتے ہی سعدیہ کی گٹھری سے ایک بہت مختصر سی چاندی کی ڈبیا برآمد ہوئی۔ ''یہ تمہاری امانت ہے بیٹے! اور گواہی دو کہ میں اس بار گراں سے سبکدوش ہوئی۔'' احمد جمال کی طرف وہ مخصوص ڈبیا بڑھاتے وقت بوڑھی سعدیہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں زیادہ شدت پیدا ہوگئی تھی۔

''اس میں کیا ہے بی بی؟'' احمد جمال نے سعدیہ کے ہاتھ سے چاندی کی ڈبیا لیتے ہوئے کہا۔

''اس کے اندر عالیہ بی بی کا خط ہے۔'' یہ کہتے کہتے سعدیہ کے حلق میں کانٹے سے بھر گئے اور اس کی آواز سے خون کی بوندیں سی ٹپکنے لگیں۔ ''یہ خط شہزادی نے سمرقند کے قلعے میں میرے حوالے کیا تھا...... اور ہدایت کی تھی کہ میں اسے ہر حال میں تم تک پہنچا دوں۔''

سعدیہ کی بات سن کر احمد جمال کے ذہن میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ پھر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بوڑھی کنیز سے پوچھنے لگا۔ ''عالیہ اس وقت کہاں ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں معلوم بیٹے!'' یہ کہہ کر سعدیہ نے منہ پھیر لیا۔ ''تم ان کا خط پڑھ لو۔ پھر تمہیں خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ اس وقت عالیہ بی بی کہاں ہیں؟''

احمد جمال کے ذہن میں برق سی لہرانے لگی۔ اگرچہ سعدیہ کی گفتگو انتہائی مبہم تھی' لیکن پھر بھی وہ اتنا سمجھ چکا تھا کہ عالیہ تاجدار شاہی خواتین کے قافلے کے ساتھ ''قندز'' نہیں پہنچی ہے...... اور سعدیہ کے بہتے ہوئے آنسو اس طرف کھلا ہوا اشارہ کررہے تھے کہ عالیہ تاجدار نے کسی دوسرے راستے کا انتخاب کرلیا ہے۔

''پھر یہ خط کیسا ہے؟'' احمد جمال کی نظریں چاندی کی ڈبیا پر مرکوز تھیں اور اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ''اس نے خط کے ذریعے اپنے نئے فیصلے کی اطلاع دی ہوگی۔'' احمد جمال اپنے آپ ہی سوال کر رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی احمد جمال بوڑھی سعدیہ کے بہتے ہوئے آنسوؤں کا مفہوم بھی سمجھ گیا تھا۔ سعدیہ اس راز سے باخبر تھی کہ عالیہ تاجدار احمد جمال سے بے پناہ محبت کرتی ہے...... اور جب عالیہ احمد جمال کو چھوڑ کر نئی منزل کی طرف مڑ گئی تو رازداں سعدیہ محبت کے اس المناک انجام پر اشک ریزی کرنے لگی۔ احمد جمال نے عالیہ کا خط پڑھے بغیر خیالوں ہی خیالوں میں کئی فیصلے کر ڈالے تھے۔

''جب جانے والے چلے ہی گئے تو پھر ان کا آخری پیغام پڑھ کر کیا کروں گا؟'' یہ کہتے ہوئے احمد جمال نے وہ ڈبیا کنیز سعدیہ کی طرف بڑھا دی...... ''بی بی! آپ خود ہی بتا دیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے اور عالیہ دوسری شاہی خواتین کے ساتھ یہاں کیوں نہیں آئی۔''

''نہیں بیٹے! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں عالیہ بی بی کے نہ آنے کی وجہ بیان کرسکوں۔'' الفاظ بوڑھی سعدیہ کے ہونٹوں کی قید سے بمشکل آزاد ہورہے تھے...... ''اور پھر میں جانتی بھی نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟ ان کی مرضی کے بغیر پڑھ لیتی تو امین کہاں رہتی' خائن ہوجاتی۔ اللہ مجھے اس آخری وقت میں ہر گناہ سے محفوظ رکھے۔''

سعدیہ کی گفتگو نے صورتحال کو کچھ اور الجھا دیا تھا۔ اتنی دیر میں احمد جمال نے اپنے ذہن کے سہارے قیاس آرائیوں کا جو محل تراشا تھا اس میں یکایک کچھ شگاف پڑ گئے تھے' دراصل عالیہ تاجدار کے ''قندز'' نہ پہنچنے کی وجہ سے احمد جمال کے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ مغل شہزادی نے اس سے مایوس ہوکر شاہانہ زندگی قبول کرلی ہے اور اب وہ خط کے ذریعے بتانا چاہتی ہے کہ اس کی ٹھکرائی ہوئی محبت کو نئی پناہ مل گئی ہے۔ ماضی میں خود احمد جمال نے بار بار عالیہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی خاندانی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی اعلیٰ نسب شہزادے یا سردار سے شادی کرلے...... اگر اس وقت عالیہ ایسا کوئی قدم اٹھاتی تو احمد جمال خوشی سے اسے برداشت کردیتا کہ وہ یہی چاہتا تھا...... لیکن اب جبکہ اس کے دل میں عالیہ کے عشق کی آگ بھڑک اٹھی تھی تو وہ حرف انکار سننے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ عالیہ کا خط پڑھنے سے گریز اختیار کررہا تھا...... مگر جب بوڑھی سعدیہ نے اعتراف کرلیا کہ وہ عالیہ کے خط کی عبارت سے واقف نہیں ہے تو مجبوراً احمد جمال نے چاندی کی ڈبیا کو کھول دیا' ڈبیا میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ رکھا تھا۔

احمد جمال چند لمحوں تک کاغذ کے اس پرزے کو دیکھتا رہا' جس پر بمشکل چند سطریں تحریر کی جاسکتی تھیں' پھر

اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ خط اٹھالیا۔ عالیہ تاجدار نے اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''احمد! شیبانی خان میرے دل پر تو کیا قبضہ کرتا وہ تو میرے جسم پر بھی تصرف حاصل نہ کر سکا' حالانکہ وہ بڑا بااختیار تھا...'' ابھی احمد جمال نے عالیہ تاجدار کے تحریر کردہ خط کے چند جملے ہی پڑھے تھے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ''اے خدا تیری پناہ!'' بے اختیار احمد جمال کے منہ سے نکلا اور وہ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ پھر نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی تاریکی ختم ہوئی تو وہ دوبارہ عالیہ تاجدار کا خط پڑھنے لگا۔

''میں جا رہی ہوں احمد! کاش! ایسا ہو کہ میرے چلے جانے کے بعد تمہیں اہل وفا پر اعتبار آ جائے۔ اگر دنیا کے ہنگاموں سے فرصت ملے تو ایک بار میری لحد پر ضرور آنا' میں اسی قبرستان میں سو رہی ہوں' جہاں تمہارے والد محترم محو خواب ہیں...... الفراق!''

عالیہ تاجدار کا لکھا ہوا آخری لفظ پڑھتے ہی احمد جمال کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر قالین پر گر پڑا اور اس کے منہ سے ایسی چیخ نکلی کہ جیسے کسی نے کوئی تیز نشتر اس کے دل میں اتار دیا ہو۔

''یہ کیا ہو گیا بی بی؟'' احمد جمال کسی بچے کی طرح سعدیہ سے لپٹا رو رہا تھا...... ''اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا اور اتنی خاموشی سے چلی گئی۔''

''نہیں بیٹے! اس نے آخری سانس تک تمہارا انتظار کیا۔'' بوڑھی سعدیہ اس چٹان جیسے بچے کو تسلیاں دے رہی تھی جس کے سینے میں زلزلے سے کئی شگاف پڑ گئے تھے اور ان شگافوں سے مسلسل پانی ابل رہا تھا۔

''عالیہ بی بی اکثر کہا کرتی تھیں کہ احمد ناراض ضرور ہے' مگر وہ مجھے اس حال میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ ایک دن ضرور آئے گا...... اور اسے آنا ہی ہوگا کہ میرے سوا اس کا اس دنیا میں کون ہے؟''

''میں اس سے ناراض کب تھا بی بی؟'' احمد جمال ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا...... ''میں تو اسے دنیا کے رنج والم سے بچانا چاہتا تھا' لیکن وہ ہر حال میں آفات و مصائب ہی خریدنا چاہتی تھی۔ وہ بڑی ضدی لڑکی تھی۔ آخر اس نے دنیا کا سب سے بڑا غم خرید لیا اور مطمئن ہو کر زیر خاک سو گئی...... مگر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اور کب تک اپنی ہستی کے زنداں خانے میں تنہا جاگوں؟''

احمد جمال بہت دیر تک روتا رہا اور بوڑھی سعدیہ ایک ماں کی طرح اس بچے کو تسلیاں دیتی رہی' جو اپنی آخری محبت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔

پھر جب اشکوں کا سیلاب رکا اور جذبات کی آندھیوں کا زور ٹوٹنے لگا تو احمد جمال سعدیہ کی آغوش سے جدا ہوا اور بوڑھی کنیز سے پوچھنے لگا۔

''اس درندے شیبانی خان نے عالیہ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا بی بی؟''

سعدیہ اس جاں گداز داستان کو ایسے نازک لمحات میں دہرانا نہیں چاہتی تھی' اس لئے مصلحتاً خاموش رہی۔

''میرے دل کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہے بی بی؟'' یکایک احمد جمال کا لہجہ بدل گیا تھا اور اب وہ ایک سپاہی کے انداز میں بول رہا تھا...... ''دل تو کبھی کا ٹوٹ چکا اور میں کچھ دیر پہلے شکست دل کا آخری مرثیہ بھی پڑھ چکا۔ پھر کیا باقی رہ گیا ہے جسے تم بچانا چاہتی ہو؟''

پھر جب سعدیہ نے شیبانی خان کے جبر اور عالیہ کی مزاحمت کا خوں رنگ فسانہ پوری تفصیل کے ساتھ سنایا تو احمد جمال کے ہونٹوں پر گہرا تبسم ابھر آیا اور چند ساعتوں کے بعد یہی تبسم ایک بلند قہقہے میں تبدیل ہو گیا' بوڑھی

سعدیہ نے چونک کر احمد جمال کی طرف دیکھا۔ شاہی کنیز کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں عالیہ تاجدار کی موت کے صدمے سے احمد جمال کا ذہنی توازن نہ بگڑ گیا ہو۔ وہ بہت دیر تک ہنستا رہا' یہاں تک کہ اس کی آنکھیں دوبارہ آنسوؤں سے بھر گئیں۔

کنیز سعدیہ بدحواس ہو کر اس کے قریب آئی...... ''بیٹے! تجھے یہ کیا ہو گیا ہے؟'' سعدیہ کے ذہن میں بڑا خوفناک خیال گردش کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ غالباً احمد جمال شدت غم سے پاگل ہو گیا ہے...... ''بیٹے! ہوش میں آ۔'' سعدیہ نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''میں پورے ہوش و حواس میں ہوں بی بی! اور مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔'' احمد جمال نے اپنی آستین سے آنسو خشک کئے اور بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا...... ''بی بی! ایک بار اور اس درندے کی ذلت آمیز شکست کا احوال بیان کرو۔''

سعدیہ نے احمد جمال کے شدید اصرار پر وہی فسانۂ غم دہرایا۔ پھر جب بوڑھی کنیز شیبانی خان کی بے چارگی اور عالیہ تاجدار کی خوں رنگ موت کا ذکر کر چکی تو احمد جمال نے بے اختیار کہا۔

''بے شک! میری عالیہ اتنی ہی غیرت مند اور جاں باز تھی۔ خدائے لم یزل کی قسم! اگر ہزار شیبانی خان پیدا ہوتے اور ہزار بار عالیہ کو آزماتے تو وہ ہر مرتبہ ایک ہی راستہ اختیار کرتی' آبرو مندانہ موت کا پرخار راستہ...... جس دوشیزہ کو چاند اور ستاروں نے بے نقاب نہ دیکھا اسے شیبانی خان جیسا بے غیرت انسان کسی طرح بے حجاب دیکھ سکتا تھا۔ دنیا میں شاہ اسماعیل صفوی کی فوجی طاقت کا بڑا شور ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شاہ ایران کے جانباز سپاہیوں نے شیبانی خان کو ہلاک کر ڈالا...... مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سارے دعوے غلط ہیں' وہ درندہ قزلباش سپاہیوں کی شمشیروں کا ہدف بن ہی نہیں سکتا تھا۔ شیبانی خان کو اس کے مظالم نے خاک میں ملا دیا...... اور عالیہ تاجدار کے صبر نے اسے کھالیا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے!'' بوڑھی سعدیہ ایک بار پھر احمد جمال کو تسلیاں دینے لگی۔

احمد جمال کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس طرف منہ کر کے کہنے لگا جدھر سمرقند آباد تھا۔

''اے خاک سمرقند! تجھے میرا اسلام کہ تو نے میری تمام محبوب ہستیوں کو اپنی آغوش میں جگہ دے دی۔ بس ایک میں باقی رہ گیا ہوں۔ سو تجھ سے بہت جلد آ ملوں گا' میرا انتظار کر! میرا انتظار کر!''

یہ الفاظ ادا کرتے وقت احمد جمال کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرتوں کے سائے بھی تھے اور حسین یادوں کا دھواں بھی...... انتقام کے شعلے بھی تھے اور شکستگی کے آنسو بھی۔

⌑ ⌑ ⌑

خانہ زاد بیگم کی واپسی کے بعد مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے شاہ اسماعیل صفوی کو شکر گزاری کے طور پر ایک طویل خط لکھا۔

''میں اس بات کے لئے تاحیات ممنون کرم رہوں گا کہ شاہ والا نے آل تیمور کے عزت و ناموس کی حفاظت کی۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں کہ وقت گزرتے ہی اس یادگار محبت کو بھلا بیٹھوں اور اپنے محسنوں کی طرف سے آنکھیں پھیر لوں۔ اگر کبھی آزمائش کا وقت آیا تو آپ بچشم خود میدان عمل میں میرے الفاظ کو زندہ

متحرک دیکھیں گے۔"

اس خط کے ساتھ ہی بابر نے شاہ ایران کی خدمت میں قیمتی تحائف روانہ کئے۔

اگرچہ شیبانی خان کا قصہ پاک ہو چکا تھا لیکن ازبکوں کا ایک ایک ظلم اسے یاد تھا...... اور یہ ان ہی مظالم کی گونج تھی' جسے سن کر بابر کی آتش انتقام ایک بار پھر بھڑک اٹھی تھی...... اور قلت افواج کے باوجود اس نے بدخشاں پر حملہ کر دیا تھا۔ ازبک سپاہی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ محاصرہ اٹھا کر چلا جانے والا بابر کسی زخمی شیر کی طرح پلٹ پڑے گا۔ مغلوں کا یہ حملہ بڑا خوفناک تھا۔ غریب الوطنی کی حالت میں قتلغ خانم کی موت...... خانزادہ بیگم کے ساتھ شیبانی خان کا وحشیانہ سلوک...... تیمور کے وارث کے ساتھ ازبکوں کا تحقیر آمیز رویہ...... غرض یہی وہ عوامل تھے جنہوں نے بابر جیسے متحمل مزاج حکمران کو بھی وحشی بنا دیا تھا۔

دوسری طرف احمد جمال بھی پاگل ہو رہا تھا۔ عالیہ تاجدار کی موت نے اس کا صبر و سکون غارت کر دیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر کتاب اور قلم کا آدمی تھا لیکن گردش وقت کے سبب شمشیر و سناں نے کتاب و قلم کی جگہ لے لی تھی' اس نے بابر کے ساتھ بے شمار جنگیں لڑی تھیں اور وہ بلاضرورت انسانی خون بہانے سے گریز کرتا تھا...... مگر آج اس کے تیور بہت مختلف تھے۔

بدخشاں پر حملے کے وقت احمد جمال کے شوق معرکہ آرائی نے جنون کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ بابر کی طرح اس کے دل میں بھی یہ خلش رہ گئی تھی کہ کاش شیبانی خان زندہ ہوتا اور وہ ازبک حکمران سے عالیہ تاجدار کے ایک ایک قطرہ خون کا حساب طلب کرتا۔ پھر احمد جمال کے سینے کی یہی خلش وحشت میں تبدیل ہو گئی اور وہ شیبانی خان کے مظالم کا حساب اس کی قوم سے مانگنے لگا۔

بدخشاں کے اس معرکے میں بابر اور احمد جمال نے تن تنہا سینکڑوں ازبکوں کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ بدخشاں کے گلی کوچے دشمن کی لاشوں سے بھر گئے۔ اسی دوران بابر کے چچا زاد بھائی سلطان مرزا اور مہدی سلطان بھی ازبکوں کی قید سے چھوٹ گئے۔ جنگ اپنے آخری مرحلے میں تھی کہ اچانک خان مرزا بھی شاہ اسماعیل کی بھیجی ہوئی فوج لے کر بدخشاں پہنچ گیا۔ اب باقی ماندہ ازبکوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ مجبوراً وہ فرار ہو گئے۔ یہ پہلی بڑی جنگ تھی جس میں بابر نے ازبکوں کے خلاف نمایاں فتح حاصل کی تھی۔

بدخشاں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد بابر امدادی فوج کو لے کر آگے بڑھا اور اس نے کسی بڑی خونریزی کے بغیر حصار اور ختلات پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت مغل شہنشاہ کا لشکر ساٹھ ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ سیاسی فضا بابر کے حق میں ہموار ہو چکی تھی اور وہ اس فضا سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ نتیجتاً مغل شہنشاہ نے بخارا پر حملہ کر دیا۔

اس وقت بخارا پر ازبکوں کی حکومت تھی اور ان کا سردار عبداللہ خاں تھا۔ یہاں بھی ایک خونریز معرکہ ہوا۔ ہزاروں ازبک قتل کر دیئے گئے اور ان کا سردار عبداللہ خاں فرار ہو کر قلعہ "افراس" میں پناہ گزیں ہو گیا۔ اس جنگ میں احمد جمال شدید زخمی ہوا۔ اگر وہ دوسری جنگوں کی طرح محتاط انداز میں لڑتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی...... مگر ازبکوں کے قتل کرنے کا جنونی جذبہ اسے دشمنوں کے نرغے میں لے گیا۔ انجام کار اس کے جسم پر بے شمار زخم آئے لیکن تقدیر یاوری کر رہی تھی۔ اس لئے موت کے منہ میں جاتے جاتے پلٹ آیا۔

بابر نے دن رات تیمارداری کی۔ پھر جب احمد جمال خطرات سے نکل گیا تو ایک دن مغل شہنشاہ نے اسے

تنہائی میں بہت ڈانٹا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو۔ تمہارے جنگ کرنے کا یہ انداز تو کبھی نہیں تھا۔ کیا تم اپنی جان گنوا دینا چاہتے ہو۔" بابر کے غصے میں بے پناہ محبت کی آمیزش تھی۔

"شہنشاہ خوب جانتے ہیں کہ اس خادم نے کبھی زندگی کی پروا نہیں کی۔" احمد جمال بابر کی تنبیہ کے جواب میں مسکرانے لگا۔

"مگر مجھے تو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔" بابر کا لہجہ ایک بار پھر سخت ہو گیا تھا۔ "اگر اپنے لئے نہیں تو کم سے کم میری خاطر ان سانسوں کی قدر کرو۔ ابھی ہمارے سامنے بے شمار محاذ ہیں...... اور تم ایک عام سے محاذ پر جان کی بازی ہار دینا چاہتے ہو۔"

احمد جمال خاموش ہو گیا۔ وہ مغل شہنشاہ کو کس طرح بتاتا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

پھر جب احمد جمال صحت یاب ہو گیا تو بابر نے بخارا میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کر دیا۔

ہنگاموں سے فراغت پا کر مغل شہنشاہ نے اپنے بھائی ناصر مرزا کو کابل کی حکومت عنایت کی اور شاہ اسماعیل صفوی کے بھیجے ہوئے فوجی سرداروں کو خلعتیں اور انعامات دے کر رخصت کر دیا۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے بابر نے آٹھ مہینے شکار اور آرام میں بسر کئے۔

⌑ ⌑ ⌑

سردیوں کا زمانہ گزرتے ہی بابر سمرقند کی تسخیر کا منصوبہ تیار کرنے لگا۔ اس سلسلے میں احمد جمال بہت زیادہ پُرجوش نظر آ رہا تھا اور اس جوش و خروش کی ایک ہی وجہ تھی کہ وہ جلد از جلد سمرقند پہنچ کر عالیہ تاجدار کی قبر پر حاضری دینا چاہتا تھا...... ابھی یہ منصوبہ زیر ترتیب تھا کہ ازبک اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے تیموری خاندان کے ایک مفرور شخص تیمور سلطان کے گرد جمع ہونے لگے۔ پھر انہوں نے شیبانی خان کی جگہ اسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ تیمور سلطان کچھ دن تک جنگی تیاریاں کرتا رہا۔ پھر ایک لشکر جرار لے کر بخارا کی طرف بڑھا۔ کوئی صف بندی نہ ہونے کے سبب شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو کر حصار شادماں کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔

اسی زمانے میں شاہ اسماعیل صفوی کی طرف سے نجم ثانی اصفہانی ایک کثیر فوج لے کر بخارا پہنچ گیا۔ بابر نے اس سے ملاقات کی اور پھر دونوں نے مل کر "قلعہ افراس" پر حملہ کر دیا۔ اس معرکے میں سردار عبداللہ خاں کے ساتھ پندرہ ہزار ازبک سپاہی ہلاک ہوئے۔ کوئی ایک فوجی بھی زندہ بچ کر واپس نہ جا سکا۔

نجم ثانی اس فتح کے بعد اپنے آپ کو رستم ثانی سمجھ رہا تھا اور ازبکوں کے خلاف اس قدر جوش میں تھا کہ انہیں دنیا سے نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ بابر بھی مصلحتاً قزلباشوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ جب ازبکوں نے اپنے طاقتور دشمنوں کو مقابل پایا تو خود بھی متحد ہو گئے۔ نجم ثانی فتح کے نشے سے سرشار تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ازبکوں کی زیر زمین سرگرمیاں کیا ہیں؟ وہ انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم شدہ ایک منتشر قوم سمجھ رہا تھا...... مگر جب وہ نجم ثانی کے سامنے صف آرا ہوئے تو اصفہانی سردار حیرت زدہ رہ گیا' ازبکوں کے لشکر کی تعداد نجم ثانی اور بابر کے اندازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ پھر جب دونوں فوجوں میں رن پڑا تو ازبک سپاہی لکیر کھینچ کر لڑے۔

اس بار انہوں نے صرف آگے بڑھنے کی قسم کھائی تھی۔ انجام کار شام ہونے سے پہلے ہی ازبکوں نے جنگ جیت لی۔ نجم ثانی کو فرار ہونے کا بھی موقع نہ مل سکا اور وہ اپنے تمام لشکر کے ساتھ خون میں نہا کر پیوند خاک ہوگیا۔

مجبوراً بابر بھی اپنی مختصر سی فوج لے کر قلعہ شادماں کی طرف چلا گیا۔

ان پریشان کن حالات میں ایک اور خوفناک واقعہ پیش آیا۔ مغلوں کی ایک شوریدہ سر جماعت نے بابر پر اس وقت حملہ کردیا جب وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ پہرے داروں کی چیخ پکار سن کر مغل شہنشاہ شب خوابی کے لباس میں باہر نکل آیا اور اسے جوتا پہننے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ بابر ننگے پاؤں بھاگتا ہوا محل سے باہر نکلا اور گھوڑے سوار ہو کر رات کی گہری تاریکی میں بالا حصار کی طرف روانہ ہوگیا۔

¤ ¤ ¤

بابر شدید پریشانی کے عالم میں سمرقند پہنچا۔ یہاں کے لوگ پہلے ہی شیبانی خان اور ازبکوں کے مظالم سے بیزار تھے۔ اپنی اسی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے یہاں کے باشندوں نے شیبانی خان کی موت پر ہنگامہ خیز جشن منایا تھا۔ جب مقامی لوگوں نے مغل شہنشاہ کی آمد کے بارے میں سنا تو وہ قطار در قطار بابر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے حسب سابق اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔

سمرقند کی حدود میں داخل ہو کر بابر نے اطمینان کی گہری سانس لی تھی' مگر احمد جمال کے دل کا سکون غارت ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت اس قبرستان میں گزارتا' جہاں اس کے والد شیخ احمد غیاث اور عالیہ تاجدار زیر خاک سو رہے تھے۔ وہ جب تک قبرستان میں رہتا' اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ پھر شام کے قریب نکل جانے سے پہلے عالیہ کی قبر کو مخاطب کر کے کہتا۔

''خبر نہیں کہ میرا قافلہ حیات کہاں ٹھہرے گا' لیکن اگر کبھی مجھے اپنی زندگی پر اختیار حاصل ہوا تو سمرقند ہی میرا آخری ٹھکانا ہوگا۔ بہت دیر سے آیا لیکن تمہارے قریب آ تو گیا۔ ہوسکتا ہے کہ سیاست کی ہنگامہ آرائیاں پھر مجھے تم سے دور لے جائیں' مگر میرے نزدیک زمان و مکان کے فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے' میں ہمہ وقت اسی قبرستان میں تمہارے نزدیک رہوں گا۔''

بابر کو جمال کی مستقل غیر حاضری کا علم ہوا تو مغل شہنشاہ نے ایک دن اس سے پوچھا۔

''احمد! میں نے کچھ ضروری کاموں کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لئے تمہیں کئی بار طلب کیا' مگر ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ تم قصر شاہی میں موجود نہیں ہو' پھر بتانے والوں نے مجھے بتایا کہ تم اپنا زیادہ وقت یہاں کے ایک قبرستان میں گزارتے ہو۔'' بابر کے کسی لفظ میں طنز کا شائبہ تک نہیں تھا' مگر پھر بھی اسے احمد جمال کے اس طرز عمل پر حیرت ضرور تھی۔

احمد جمال ایک لمحے کے لئے گھبرا سا گیا۔ اسے خیال گزرا کہ بابر اس کے معمولات سے آگاہ ہوگیا ہے اور کسی مخبر نے شہنشاہ کو بتا دیا ہے کہ وہ روزانہ پابندی کے ساتھ عالیہ تاجدار کی قبر پر جاتا ہے۔ اگرچہ بابر دونوں کے جذباتی تعلق سے باخبر تھا' لیکن احمد جمال نہیں چاہتا تھا کہ دنیا کا کوئی بھی شخص اس کے حوالے سے عالیہ تاجدار کے بارے میں کچھ سوچے۔ بدگمانی تو کجا' وہ عالیہ کے سلسلے میں کسی غیر کی خوش گمانی کا بھی قائل نہیں تھا۔ اسرار پردوں میں چھپ کر محبت کرنے والا اپنے محبوب کو بعد از مرگ تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بابر نے قبرستان جانے کا ذکر کیا تو احمد جمال کچھ پریشان سا نظر آنے لگا' مگر فوراً ہی اس نے ایک معقول جواز تلاش کر لیا۔

"اس قبرستان میں میرے والد محترم آرام فرما ہیں۔ میں ان ہی کی خدمت میں حاضر ہونے جاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے احمد جمال کے لہجے سے اداسی جھلکنے لگی تھی۔

"میں سمجھتا ہوں۔" بابر نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "مگر کیا ایک قبر پر روزانہ حاضری د کچھ عجب سا نہیں لگتا؟"

مغل شہنشاہ کا سوال بڑا معنی خیز تھا۔ احمد جمال کے نزدیک اس سوال میں کئی مفاہیم پوشیدہ تھے۔ اگر عالِ تاجدار کی قبر وہاں نہ ہوتی تو احمد جمال کچھ سوچے سمجھے بغیر بابر کے سوال کا جواب دے دیتا...... لیکن اس وقۃ ایک نازک صورتحال موجود تھی۔ اس لئے احمد جمال بہت سنبھل کر بول رہا تھا۔ "بچپن میں انہیں دیکھا نہیں تھا پھر اس محرومی کا ازالہ کیسے ہوتا؟ یہی سوچ کر چلا جاتا ہوں۔"

احمد جمال نے اپنے جذبے کی صحیح عکاسی کی تھی، مگر مغل شہنشاہ اس کی گہرائی تک نہ پہنچ سکا۔ "اور کب تک وہاں جاتے رہو گے؟" بابر نے ایک اور سوال کیا۔

"جب تک میں سمرقند میں موجود ہوں۔" احمد جمال نے صاف صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اس ش میں میری موجودگی کا ایک ہی مطلب ہے کہ میں ہر وقت والد محترم کی خدمت میں حاضر رہوں۔"

"احمد! میں نے آج تک ایسا مردہ پرست انسان نہیں دیکھا۔" بابر کے لہجے میں طنز کے بجائے وہی تحیر کیفیت تھی۔

"مردہ پرست نہیں شہنشاہ! زندہ پرست۔" احمد جمال نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شیخ ا غیاث کے جسم کو موت آ گئی، مگر ان کا علم ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

"میں اس حقیقت کو بھی جانتا ہوں۔" بابر نے محض احمد جمال کی دلجوئی کی خاطر یہ بات کہہ دی تھی ورنہ شیخ احمد غیاث کے علم کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا تھا، مغل شہنشاہ نے بچپن سے لے کر آج تک صرف شعر و اد اور نجوم کی تعلیم حاصل کی تھی...... اور وہ ان ہی مخصوص موضوعات کو افضل ترین علوم سمجھتا تھا۔ مذہب سے ا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس لئے وہ شیخ احمد غیاث کے علم اور ان کی شخصیت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اسے اس باپ عمر شیخ مرزا نے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ سلطان ابو سعید مرزا نے احمد جمال کے والد شیخ احمد غیاث کو بے قصور قتل کرا دیا تھا۔ بابر نے یہ جانگداز واقعہ اس وقت سنا تھا جب اس کی عمر صرف دس سال تھی۔ وہ فطرتاً نرم دل تھا اس لئے شیخ احمد غیاث کے قتل کی روداد سن کر بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ مگر جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی اور مسلسل زمانے کے نشیب و فراز سے گزرتا رہا تو اسے اندازہ ہوا کہ آئین سیاست میں ایسی سزائیں بھی جا ہیں۔ وقت پڑنے پر خود اس نے بھی کئی ہزار افراد کو قتل کیا تھا۔ اپنے ان ہی تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر وہ احمد غیاث کی موت کو بھی ایک سیاسی ضرورت سمجھتا تھا۔ بابر کے خیال میں اگر شیخ احمد غیاث قتل نہ کئے جاتے سلطان ابو سعید مرزا کا جاہ و جلال بے اثر ہو جاتا اور ایک حکمران کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر حال میں رعایا کے دلوں پر اپنی ہیبت قائم رکھے۔ بابر کے اسی انداز فکر نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ احمد جمال سے روزانہ قبرستا جانے کا سبب دریافت کرے۔ پھر جب احمد جمال نے اپنی حاضری کی وجہ بیان کی تو مغل شہنشاہ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ "میں اس حقیقت کو مانتا ہوں، مگر زندہ انسانوں کی مصروفیات مردہ لوگوں سے بہت مختلف ہوتی ہیں، میں تمہیں اس عمل سے روکتا نہیں، لیکن یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ سیاسی اور درباری امور بھی تمہار

ظر رہتے ہیں...... اور تم قبرستان کے سناٹوں میں کھوئے رہتے ہو۔"

"میں اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں رہا۔" اگرچہ احمد جمال کو بابر کا استفہامیہ انداز گراں گزرا تھا، لیکن ر بھی اس نے بڑی متانت کے ساتھ احترام شاہی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ غفلت نہیں تو اور کیا ہے؟" یکایک بابر کے لہجے سے آقائیت کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔

احمد جمال بمشکل تلخی کے اس گھونٹ کو اپنے حلق سے اتار سکا۔ "اگر میری ضرورت محسوس کی جا رہی تھی تو ہنشاہ کسی بھی وقت مجھے طلب کر سکتے تھے۔"

"تمہیں خود اس کا احساس ہونا چاہئے کہ تمہارا شہنشاہ دنیا کا سب سے زیادہ مصروف انسان ہے۔" بابر کی اواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔ "اسے ہزاروں کام ہیں۔ اس صورتحال میں تم پر لازم ہے کہ ہمہ وقت اس کے زدیک رہو۔ پتہ نہیں کب تمہاری ضرورت پڑ جائے۔"

"میں نے تو اپنا پورا بچپن اور آدھی جوانی آپ ہی کے قریب رہ کر گزاری ہے شہنشاہ!" احمد جمال کے لہجے سے شکایت کا رنگ نمایاں تھا۔ "اگر کچھ دن کے لئے باپ کی قبر پر چلا گیا تو مجھ سے اس قدر خفگی کیوں؟ میں ہوں سے آپ کی بساط سیاست پر شطرنج کے ایک مہرے کی طرح گردش کر رہا ہوں۔ موت کے محاذ پر مجھے بھیجا گیا' آفات و مصائب کے جہنم میں مجھے جھونکا گیا۔ پھر بھی کبھی آپ نے میری زبان سے حرف انکار سنا...... کبھی ری آنکھوں میں ناگواری یا سرکشی کا رنگ دیکھا؟ حالانکہ میں جنگ و جدل کی دنیا کا آدمی ہی نہیں تھا۔ پھر بھی پ کے اشارے پر سربکف رہتا ہوں کہ جہاں حکم ہو وہیں نذرانہ جاں پیش کر دوں۔"

"پھر تم کس دنیا کے آدمی ہو احمد؟" بابر نے چونک کر کہا۔

"شہنشاہ خوب جانتے ہیں کہ میں کتاب و قلم کا آدمی ہوں......" احمد جمال نے شدید جذباتی لہجے میں کہا۔ میں اس شخص کا وارث ہوں جو مدرسے کے فرش پر بیٹھ کر بے خبر انسانوں کو آگہی کا سبق دیا کرتا تھا...... لیکن ردش وقت نے درسگاہ کے بام و در گرا دیئے اور معلم کو تہ تیغ کر کے موت کی نیند سلا دیا۔" احمد جمال انتہائی لکتہ لہجے میں بابر کے دادا سلطان ابو سعید مرزا کا فسانہ جبر و ستم بیان کر رہا تھا۔ "ایک غیرت مند بیٹے کا فرض ہے کہ وہ اپنے باپ کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچائے۔ مگر میری یہ حالت ہے کہ میں اب تک اپنے فرض کی ایگی سے قاصر رہا ہوں، اس لئے روزانہ والد محترم سے معافی مانگنے چلا جاتا ہوں کہ چند روز کی مہلت اور ے دیجئے۔"

"آخر تمہیں اپنے فرض کی ادائیگی سے کس نے روکا ہے؟" بابر کے لہجے کی حیرت بدستور تھی۔

"سید مہدیؒ نے۔" احمد جمال کے طرز گفتگو میں کوئی سیاست، کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ "میں نہیں جانتا کہ مہدیؒ نے میرے ہاتھ سے قلم چھین کر مجھے شمشیر کیوں سونپ دی؟"

"کیا یہ شمشیر تمہیں اتنی ہی گراں محسوس ہوتی ہے؟" مغل شہنشاہ نے ایک اور سوال کیا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر شمشیر کو ہاتھ سے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" بابر کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی آمیزش تھی۔

"کئی بار سوچا، مگر سید نے ہر مرتبہ یہی تنبیہ کی، خبردار! ایسا ہرگز نہ کرنا۔" جوش جذبات میں احمد جمال نے خاص راز ظاہر کر دیا، جو صرف اس کے اور سید مہدیؒ کے درمیان کسی خفیہ معاہدے کی طرح تھا۔

"آخر سید ایسا کیوں چاہتے تھے؟" بابر نے اس سلسلے میں مزید وضاحت طلب کی۔

احمد جمال سنبھل چکا تھا۔ ”شہنشاہ! اس ذکر کو چھوڑیں‘ صرف میری کوتاہیوں کی نشاندہی کریں۔“
”تم سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ بس تمہاری مسلسل غیر حاضری سے پریشان سا رہتا ہوں۔“ اح جمال کو آمادہ نہ پا کر بابر نے بھی موضوع بدل دیا تھا۔ ”اس بار مجھے سمرقند کی فضا کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی ہے۔“

”میں شہنشاہ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔“ احمد جمال نے رک رک کر کہا۔
”مقامی باشندوں کی محبت میں نمایاں کمی آ گئی ہے۔“
بابر نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کی عام رعایا بھی میرا مذاق اڑا رہی ہے۔“
”یہ شہنشاہ کا فریب نظر ہی ہوسکتا ہے۔“ احمد جمال نے بابر کے اندیشوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ”اہل سمرقند آپ کے ساتھ ایسا تحقیر آمیز سلوک نہیں کر سکتے۔“
”وہ ایسا ہی کر رہے ہیں احمد!“ بابر کا چہرہ بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔ ”سمرقند اور بخارا کے امراء نے میرا حکم ماننے سے انکار کردیا ہے۔“
”کیسا حکم؟“ احمد جمال حیرت زدہ رہ گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے شہنشاہ؟ جن لوگوں نے شیبانی خان جیسے درندے کے مقابلے میں آپ کا ساتھ دیا‘ ان کا رویہ کس طرح بدل سکتا ہے؟“
”میں نے سمرقند اور بخارا کے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بھی شاہ اسماعیل صفوی کے فوجیوں کی ہم رنگ وردی پہنا کریں اور قزلباشوں کی طرح اپنے سروں پر سرخ تاج لگایا کریں۔“ بابر نے اپنے حکم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”آپ نے ایسا کیوں کیا شہنشاہ؟“ فرط حیرت سے احمد جمال کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
”میں شاہ اسماعیل صفوی کے احسانات کا قرض اتارنا چاہتا تھا۔“ مغل شہنشاہ نے بے جھجک کہا۔
”احسان اتارنے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ آپ سمرقند و بخارا کے سپاہیوں کو قزلباشوں کے رنگ میں رنگ ڈالیں؟“ یکایک احمد جمال کے چہرے پر اذیت و کرب کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ ”شاہ اسماعیل صفوی نے کڑے وقت میں آپ کی مدد کی تھی۔ اگر شاہ ایران پر کبھی ایسا کوئی وقت آ جاتا تو آپ بھی مالی یا فوجی امداد پیشکش کر دیتے۔“
بابر شدید پریشانی کے ساتھ احمد جمال کی گفتگو سن رہا تھا۔
”بے شک! احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔“ احمد جمال نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”مگر احسان کا بار گراں اس طرح بھی نہیں اتارا جاتا کہ آپ اپنی ذات ہی کی نفی کر ڈالیں...... اور اپنے جانبازوں کو ذہنی طور پر شاہ اسماعیل صفوی کا غلام بنا ڈالیں۔“
”تم کیا کہنا چاہتے ہو احمد؟“ بابر کا لہجہ ناخوشگوار ہوگیا تھا۔
”شاہ اسماعیل صفوی آخر کون ہیں؟“ احمد جمال نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”محض ایک ا پرست حکمران جو ہمہ وقت اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی فکر میں غرق رہتے ہیں۔ آپ سے ان کی یہ محبت ایک سیاسی ضرورت ہے‘ اس کے سوا کچھ نہیں‘ شیبانی خان کے مقابلے میں انہوں نے آپ کی مدد اس لئے نہیں کی کہ وہ آل تیمور سے کسی قسم کی عقیدت رکھتے ہیں‘ محبت و تعاون کے سارے مظاہرے صرف اس لئے تھے کہ

شیبانی خان ان کے راستے سے ہٹ جائے۔ وہ ازبکوں کی فوجی طاقت کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے منصوبوں میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور ان کا سب سے زیادہ طاقتور حریف شیبانی خان مارا اب شاہ اسماعیل صفوی کو روکنے والا کون ہے؟ بظاہر کوئی بھی نہیں۔ آپ ایک حساس اور غیرت مند حکمران آپ نے شاہ کے احسانات کو اتنی شدت سے محسوس کیا کہ شاید ان کی اولاد بھی اس طرح محسوس نہ کر سکے۔ راسی شدت احساس میں آپ نے وہ حکم جاری کر دیا جو سمرقند اور بخارا کے امیروں کو ناگوار گزرا ہے۔ ں معاف! تمام امراء اپنی ناگواری کے اظہار میں حق بجانب ہیں۔ وہ آل تیمور کو آزاد اور سربلند دیکھنا ہیں۔ اگر آپ کے حکم کے مطابق ان لوگوں نے اپنے سروں پر ”سرخ تاج“ سجا لیا اور اپنی وردیوں کو ؤں کی وردیوں کے ہم رنگ بنا لیا تو عظیم مغلوں کی پہچان کہاں باقی رہے گی؟ دیکھنے والے آپ کے ںکو دیکھ کر یہی کہیں گے کہ مغل سپاہی بھی قزلباشوں کی فوج کا ایک حصہ ہیں۔ پہلے یہ تاثر عام ہوگا‘ پھر کہنے یہ کہیں گے کہ مغل شہنشاہ بھی اسماعیل صفوی کے ایک مخصوص کارندے ہیں۔ کیا آپ مستقبل قریب میں یہ ارا کریں گے؟“ یکایک احمد جمال کا لہجہ بہت زیادہ پر جوش ہوگیا تھا۔
احمد جمال کی گفتگو سن کر بابر سناٹے میں آ گیا۔ اس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی اور وہ بہت دیر تک ے کے اس عجیب پہلو پر سوچتا رہا۔ پھر احمد جمال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اگر میں تمہیں حکم دوں کہ قزلباشوں ح فوجی وردی پہن لو اور اپنے سر پر سرخ تاج سجا لو۔“
”میری بات اور ہے شہنشاہ!“ احمد جمال نے اہل وفا کے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں تو اپنے عہد کا پابند کر دل سے مجھے بھی یہ گوارا نہیں ہوگا کہ میرے شہنشاہ کا سایہ کسی دوسرے فرمانروا کے سایہ اقتدار میں ضم ے۔ میں اشرفیوں کے ڈھیر یا پنج ہزاری اور دس ہزاری منصب کے لئے رسم وفا نہیں نبھا رہا ہوں۔ میں نے وز و شب کا سکون اور آسائشیں اس لئے قربان کی ہیں کہ آپ معرکہ حیات میں معزز و محترم ٹھہریں...... ے اپنا خون اس لئے ارزاں کیا ہے کہ آپ کے قصر جاہ و جلال کے نقش و نگار اور زیادہ دلکش ہو جائیں۔ یہ جاں سوزی اس لئے نہیں کہ اہل دنیا آپ کو شاہ اسماعیل صفوی کا فرمانبردار کارندہ کہہ کر پکاریں۔ شہنشاہ! ں حکم کو واپس لے لیجئے کہ یہ حکم آپ کے عظمت و جبروت کی نفی کرتا ہے۔ ہم بے سرو ساماں سہی مگر جاننے وب جانتے ہیں کہ ہم نے بھوک اور پیاس کے بدترین موسم میں بھی گداگرانہ لہجہ اختیار نہیں کیا ہے۔ اگر قدموں کے نیچے دو گز زمین بھی نہ رہے تو ہم اپنی شناخت کھونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“
حمد جمال کے دلائل میں بڑا وزن تھا اور ان سے سیاست کے کئی نازک گوشے بے نقاب ہو رہے تھے‘ مگر بابر اپنا یہ مخصوص حکم واپس لینے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ ”میں تمہاری باتوں سے بڑی حد تک اتفاق کرتا ں‘ لیکن احکام شاہی کی واپسی حکمران کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس فیصلے کے بعد سمرقند و بخارا کے امراء کی ں میں میری کیا حیثیت باقی رہے گی؟ اگر آج ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرلوں تو کل وہ کوئی دوسرا مطالبہ پیش ں گے۔ پھر تم جانتے ہو کہ مطالبات کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ٹھہرے گا؟“
”نہیں‘ والا حشم! یہ کوئی مطالبہ نہیں ہے۔“ احمد جمال نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”ان کے جذبوں کی طرف ، دیکھئے۔ وہ اپنے شہنشاہ کو دوسرے حکمران کے تسلط سے بچانا چاہتے ہیں۔“
حمد جمال نے بہت دیر تک بحث کی‘ مگر بابر اپنا حکم واپس لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

مجبوراً احمد جمال نے سمرقند و بخارا کے ناراض امراء سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں۔
''آخر شہنشاہ کے اس حکم کی تعمیل میں آپ کو کیا قباحت محسوس ہوتی ہے؟'' احمد جمال نے ہر امیر سے ا
ہی سوال کیا۔
''ہم مغل شہنشاہ کو اتنا عاقبت نااندیش نہیں سمجھتے تھے۔ ناراض امراء میں سے ہر ایک کا جواب بھی یک
تھا'' ہمارے احسان کا بدلہ سیاست ہی سے اتارا جاتا ہے۔ شہنشاہ چاہتے ہیں کہ ہم قزلباش کا لباس پہن کر ا
... لوفا کر دیں۔ ہم سیاسی تقاضوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے...... مگر شاہ اسماعیل صفوی اور ہمارے عا
میں ... الرق ہے۔ شہنشاہ کو چاہئے کہ وہ دوستی کے اس رشتے کو اپنی ذات تک محدود رکھیں۔''
احمد جمال سمرقند و بخارا کے امیروں کی گفتگو سن کر حیران رہ گیا۔ بہت دیر بعد اس پر ایک خوفناک حقیقا
... ف ہوئی تھی۔ ہر امیر بابر کی نیت پر شک کر رہا تھا...... اور یہ صورتحال اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ بابر ایک ذ
... ر اور روشن خیال انسان تھا اور اس کی اس روشن خیالی پر سمرقند و بخارا کے امراء شک کرنے لگے تھے۔
بعض امیروں نے تو احمد جمال سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بابر اپنے مفادات کی خاطر ان علاقوں کو شا
ایران کے پاس رہن رکھ دینا چاہتا ہے۔
مغل شہنشاہ پر یہ بڑا سنگین الزام تھا۔ احمد جمال نے امراء کے شکوک و شبہات دور کرنے کی بہت کوشش
مگر بات بگڑ چکی تھی۔ آخر احمد جمال نے اتمام حجت کے طور پر کہا۔ ''اگر شہنشاہ اپنا یہ حکم واپس لے لیں تو ا
آپ حضرات کا ردعمل کیا ہوگا؟''
''اب کچھ نہیں ہوگا۔'' تمام امراء نے بیک زبان کہا۔ ''ہم بابر کا بہت احترام کرتے تھے اور اس اولوالع
نوجوان کی شکل میں مستقبل کے ایک مدبر اور طاقتور حکمران کا چہرہ دیکھتے تھے...... مگر اس شخص کی نادانیوں ن
سب کچھ ضائع کر دیا ہے۔ وہ اسماعیل صفوی کو اپنا نجات دہندہ سمجھے' یہ اس کا اپنا ذاتی فعل ہے...... لیکن ہمار
دل اور تلواریں اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ سیاست لاکھ ضرورتوں کا نام ہو' مگر یہ کاروبار بھی اعتبار کے بغیر نہیں چ
سکتا...... اور بابر اپنا اعتبار کھو چکا۔ اب اس کی طرف سے کیا جانے والا اعلان کسی مصلحت کے تحت ہوگا...... ا
ہم مصلحت کے بندے نہیں ہیں۔ ہم نے بابر سے کسی غرض کے بغیر محبت کی تھی' مگر اس نے ہمارے جذبوں ک
قدر نہیں کی۔''
احمد جمال سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مغل شہنشاہ کی ایک جذباتی غلطی اتنا بھیانک رخ اختیار کر لے گی۔ ا
ناکام و نامراد واپس لوٹ آیا اور اس نے ساری صورتحال بابر کے گوش گزار کر دی۔
'ہاں! یہ میری غلطی تھی۔'' بابر نے ایک حقیقت شناس اور حوصلہ مند انسان کی طرح کھلے دل سے اعتراف
کر لیا۔ ''اور مجھ سے یہ غلطی اس لئے سرزد ہوئی کہ میں جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا ورنہ میرا یہ ارادہ ہرگز نہ
تھا کہ میں شاہ ایران کی غلامی کا طوق پہن لوں اور اپنی قوم کے پیروں میں بھی کسی غیر کی اطاعت کی زنجیر
ڈال دوں' خدا کی قسم! ان لوگوں نے مجھے بہت غلط سمجھا۔'' یہ کہتے کہتے بابر بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔
''شہنشاہ! موجودہ فضا میں یہ ایک انتہائی ناخوشگوار واقعہ ہے۔'' احمد جمال نے اظہار تاسف کرتے ہو
کہا۔ ''کاش! ایسا نہ ہوتا۔''
''ہونے دو' جو کچھ ہو رہا ہے احمد۔'' یکا یک بابر کا غرور شاہی لوٹ آیا تھا۔ ''وہ کون سا دن تھا جب ہمار

جسموں کے اندر خونیں آندھیاں نہیں چلیں...... اور وہ کون سی رات تھی جب سیلاب بلا ہمارے سروں سے نہیں
گزرا۔ ہم سے زیادہ موسم کی نامہربانیوں سے کون واقف ہوگا؟ ہم آغوش حوادث کے پروردہ ہیں' کیف و نشاط
کے پرستار ہماری زبان کیا سمجھیں گے؟ جاؤ اور اپنے تمام خیمے اکھاڑ ڈالو۔ ہم سمرقند کے صحرا میں رہنے والے
خانہ بدوش تھے۔ کل صبح ہوتے ہی کسی اور طرف کوچ کر جائیں گے۔''
اس کے بعد بابر نے گنتی کے چند جاں نثاروں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا اور نئے سفر کی تیاریاں شروع
کر دیں۔
سمرقند اور بخارا کے سیاسی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ابھی وہ لوگ مختلف قیاس آرائیوں میں
الجھے ہوئے تھے کہ بابر نے تمام مقامی امراء کو دربار میں طلب کیا۔
''مجھے اپنے دست راست احمد جمال کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ میری طرف سے سخت بدگمانیوں میں
مبتلا ہو گئے ہو۔'' بابر انتہائی پرجلال لہجے میں سمرقند و بخارا کے امیروں سے خطاب کر رہا تھا۔ ''اور مجھے یہ بھی پتہ
چلا ہے کہ احمد جمال نے میری بھرپور وکالت کی تھی' مگر وہ تمہارے ذہنوں پر چھائے ہوئے شکوک و شبہات کے
غبار کو دور نہ کر سکا۔ اس نے تم سے یہ بھی کہا کہ اگر شہنشاہ اپنا وہ مخصوص حکم واپس لے لیں تو کیا تمہارے دل
صاف ہو جائیں گے۔ حالانکہ احمد کو اس بات کا اختیار نہیں تھا' لیکن وہ میری اور تمہاری بھلائی کے لئے امن و
آشتی کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ دوستی کا یہی انداز ہوتا ہے اور رسم جاں نثاری اسی کو کہتے ہیں۔ مگر اس کی پیشکش
کے جواب میں تم سب نے ایک ہی بات کہی کہ آئندہ میرا ہر عمل کسی مصلحت کے تحت ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی
میں ایسی بے اعتباری کہیں نہیں دیکھی۔ اگرچہ میرے حقیقی بھائیوں نے کئی بار میری پشت پر انتہائی خوفناک وار
کئے' لیکن وہ بدعہد انسان بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں ان سے مصلحت اور ریاکاری کے پردے میں بات
کرتا ہوں۔ تم نے میری خوب تواضع کی۔ میں تمام عمر تمہارا شکرگزار رہوں گا۔'' بابر کا لہجہ باوقار تھا' لیکن اس میں
گہرے طنز کی آمیزش بھی تھی۔ ''تم لوگ یہ بات غور سے سن لو کہ میں دوسرے حکمرانوں کی طرح کبھی بے جا ضد
اور سرکشی کا اسیر نہیں رہا۔ میں تعمیر اور اعتراف کا آدمی ہوں۔ برسرعام اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے والا...... مگر آج
مجھے اپنی کسی کوتاہی پر ندامت نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم نے میری محبتوں پر شک کیا۔''
سمرقند و بخارا کے امیر اپنی اپنی نشستوں پر پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ انہیں نوجوان شہنشاہ
کے علم و فضل کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ بابر کو اپنی ہی طرح محض ایک جنگجو اور بہادر حکمران سمجھتے تھے' مگر آج جب
تیمور کا وارث ان سے مخاطب ہوا تو انہیں پتہ چلا کہ بابر بیک وقت دو شمشیروں کا مالک ہے۔ ایک
اس کے ہاتھ میں ہے جو کم خطرناک نظر آتی ہے...... اور دوسری شمشیر اس کی زبان میں ہے جس کی کاٹ فولاد
سے بھی زیادہ ہے۔
''اس بدگمانی کے بعد تم سے کسی تعاون کا سوال کرنا میرے لئے باعث ننگ ہے۔'' بابر نے بلند آواز میں
کہا۔ ''میں تم سے بہت دور جا رہا ہوں۔ اپنی طاقت کے یہ وسائل سنبھال کر رکھنا' کسی دن تمہارے ہی کام
آئیں گے۔''
یہ کہہ کر بابر دربار سے نکلا اور اپنے سپاہیوں کو کوچ کا حکم دے دیا۔
احمد جمال نے شہنشاہ سے اجازت طلب کی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اس قبرستان میں پہنچا جہاں اس کی

والدہ صفیہ خاتون دفن تھیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنی ماں کے لئے دعائے خیر کرتا رہا۔ پھر نیچے کی طرف جھکا اور مٹھی بھر قبر کی مٹی اٹھا کر ایک رومال میں باندھ لی۔

پھر وہ کچھ فاصلے پر واقع دوسرے قبرستان میں پہنچا۔ جہاں اس کے والد محترم شیخ احمد غیاث اور عالیہ تاجدار آسودہ خاک تھے۔ مختصر دعا کے بعد احمد جمال نے شیخ احمد غیاث اور عالیہ تاجدار کی قبروں کی مٹی بھی اسی رومال میں باندھ لی تھی۔ اب تین مٹیاں اس طرح آپس میں مل گئی تھیں کہ انہیں علیحدہ کرنا ناممکن تھا۔

''اس بار میں آپ لوگوں کو اپنے ہمراہ لئے جا رہا ہوں۔'' احمد جمال اپنے والد اور عالیہ تاجدار کی قبروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ''اب مجھے کسی سنبل و ریحان' کسی لالہ و گل اور کسی یاسمین و نسترن کی ضرورت نہیں' بس اسی مٹی کی خوشبو سے میرا مشام جاں ہمیشہ معطر رہے گا۔''

احمد جمال کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں اور وہ بار بار گھوڑے کو ایڑ دے رہا تھا تاکہ جلد از جلد اپنے فوجی قافلے سے جا ملے۔

بابر اور اس کے سپاہی ابھی سمرقند کی سرحدوں سے کچھ دور ہی پہنچے تھے کہ احمد جمال بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب اس مختصر سے فوجی قافلے کا رخ کابل کی طرف تھا۔

⌑ ⌑ ⌑

بابر کی عدم موجودگی میں کابل پر اس کا چچا زاد بھائی سلطان ناصر مرزا حکومت کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے مغل شہنشاہ کی آمد کی خبر سنی' وہ بابر کے استقبال کے لئے کابل کی حدود سے باہر آیا اور بڑے والہانہ انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''میں ہر حال میں شہنشاہ کا مطیع و فرمانبردار ہوں۔'' سلطان ناصر مرزا بابر کے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے چل رہا تھا۔ ''کابل کا تخت آپ کی امانت ہے۔ جب بھی حکم دیں گے' تخت سے اتر کر خدمت گاروں کی صف میں کھڑا ہو جاؤں گا۔''

شہنشاہ ظہیر الدین بابر اپنے بھائی کے اس طرز گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور اس نے خوشدلی کے ساتھ غزنی کی حکومت ناصر مرزا کے حوالے کر دی۔

کچھ دن کابل میں ٹھہر کر بابر نے ایک مختصر سی فوج کے ساتھ یوسف زئی افغانوں کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ مقامی پٹھانوں کے پاس جدید اسلحہ بھی نہیں تھا اور وہ مغل شہنشاہ کے طریقہ جنگ سے بھی واقف نہیں تھے۔ اس لئے کثرت کے باوجود بہت جلد بابر سے شکست کھا گئے۔ اس لڑائی میں تین ہزار افغان قتل ہوئے اور بہت سے گرفتار کر لئے گئے۔ بابر نے یوسف زئی پٹھانوں کا علاقہ اپنے ایک معتمد سردار خواجہ کلاں کے سپرد کر دیا۔

وہ 925ھ کا زمانہ تھا۔ اسی دوران ہندوستان سے یہ خبر آئی کہ سلطان سکندر لودھی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان ابراہیم لودھی بادشاہ بن گیا ہے۔ بابر کے لئے یہ بڑی عجیب خبر تھی۔ وہ کسی مسلمان کی موت سے خوش ہونے والا شخص نہیں تھا' لیکن پھر بھی یہ ایک بڑے انقلاب کے قدموں کی چاپ تھی' جسے وہ بغور سننا چاہتا تھا۔ اجودھیا کے قیام کے دوران سید مبارک علی نے بابر کو تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ سلطان سکندر لودھی ایک ہمدرد اور عادل حکمران ہے اور اس کے دور حکومت میں اس کی رعایا چین کی نیند سوتی ہے۔ سیاسی تجربات و مشاہدات نے بابر کو یہ راز سمجھا دیا تھا کہ جس فرمانروا سے اس کی رعایا راضی و مطمئن ہو' اس سے جنگ کرنا آسان نہیں ہوتا۔

سلطان سکندر لودھی کے انتقال کے بعد بابر کو ایک دوسری اہم خبر کا انتظار تھا۔ اسے یہ جاننے کی شدید خواہش تھی کہ مرحوم سلطان کا بیٹا ابراہیم لودھی کس مزاج اور کردار کا انسان ہے؟ دراصل سلطان ابراہیم لودھی کے کردار پر ہی بابر کی آئندہ جنگی مہم کا انحصار تھا۔ مغل شہنشاہ سوچ رہا تھا کہ اگر ابراہیم لودھی اپنے باپ کی روش پر چل رہا ہے تو پھر بیرونی مداخلت کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ بیرونی مداخلت وہیں کارگر ثابت ہوتی ہے جہاں اندرونی حالات انتشار کی لپیٹ میں آ جائیں اور حکمران اپنے عوام کا اعتبار کھو بیٹھیں۔ بابر کو زیادہ دنوں تک اس خبر کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بس چند ماہ بعد ہی اس کے مخبروں نے یہ اطلاع بھیج دی کہ سلطان ابراہیم لودھی ایک نہایت خود غرض اور درشت مزاج حکمران ہے۔ بابر نے اپنے جاسوسوں کا پرچا پڑھ کر اطمینان کی سانس لی اور اس کے ذہن میں کئی جنگی محاذوں کے دھندلے خاکے ابھرنے لگے۔

⌑ ⌑ ⌑

سلطان سکندر لودھی ایک لائق ترین افغان حکمران تھا۔ اس کے دور حکومت میں ضرورت کی ہر چیز ارزاں تھی اور عوام خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ سلطان سکندر لودھی روزانہ دربار منعقد کرتا اور رعایا کی ایک ایک فریاد سنتا بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ وہ امور سلطنت سرانجام دینے میں صبح سے شام تک مصروف رہتا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز ایک ہی مجلس میں پڑھ لیتا۔ اس کے دور حکومت میں زمیندار بہت کم سرکشی کرتے تھے اور سب نے بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر لی تھی۔ سلطان سکندر لودھی امیر و غریب' توانا اور کمزور' بوڑھے اور جوان سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتا اور ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لیتا۔ وہ اپنے اللہ سے بہت ڈرتا تھا اور یہ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ جب تک زندہ رہا' مخلوق خدا پر رحم و کرم کی بارش کرتا رہا۔

روایت ہے کہ جس زمانے میں سلطان سکندر لودھی اپنے بھائی باربک شاہ سے جنگ میں مصروف تھا' اس وقت ایک فقیر آیا اور اس نے سلطان کا ہاتھ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی' سکندر لودھی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ فقیر بہت دیر تک مختلف زاویوں سے سلطان کا ہاتھ دیکھتا رہا۔ پھر انتہائی پرجوش لہجے میں کہنے لگا۔ ''جا! فتح تیری ہوگی۔''

ابھی فقیر کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ سلطان سکندر لودھی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور نہایت غضبناک لہجے میں بولا۔ ''جب دو مسلمانوں میں معرکہ آرائی ہو رہی ہو تو کبھی یکطرفہ فیصلہ نہیں کرنا چاہئے اور یہ کہنا درست ہے کہ اللہ ایسا کر دے جس میں اسلام کی بھلائی ہو۔''

سلطان سکندر لودھی سال میں دو مرتبہ فقیروں' غریبوں اور درویشوں کی فہرست منگاتا۔ پھر حسب ضرورت ہر ایک کو وظائف اور عطیات دیتا۔ سردیوں میں شالیں اور گرم کپڑے بانٹتا۔ ہر جمعہ کو شہر کے تمام غریبوں میں روپیہ تقسیم کرتا۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر سال فتوحات کا بہانہ کر کے حاجت مندوں کو کثیر تعداد میں نقد رقم دیتا۔ مختصر یہ کہ سلطان سکندر لودھی عجیب مرد سخی تھا۔ وہ مسکینوں اور ضرورت مندوں میں دولت لٹانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔

اپنی اسی سخاوت کی وجہ سے سلطان ان امراء کو بہت عزیز رکھتا تھا جو راہ خدا میں صدقہ و خیرات کرتے تھے۔ جب بھی ایسا کوئی واقعہ سکندر لودھی کے علم میں آتا' وہ اس مخصوص امیر کو سر دربار طلب کرتا اور تمام

درباریوں کے سامنے باآواز بلند کہتا۔

''تم ایک عظیم انسان ہو۔ اس لئے کہ تم نے خیر و برکت کی بنیاد رکھی ہے۔ انشاء اللہ امور دنیا میں کبھی ناکام نہ ہوگے۔''

سلطان کی اسی حوصلہ افزائی کے سبب بہت سے امراء غریبوں اور مسکینوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ سلطان سکندر لودھی کی حدود مملکت میں بہت کم لوگ فاقہ کشی کا شکار ہوتے تھے۔

جو شخص ملازمت کرنے کے لئے آتا' بادشاہ پہلے اس کا حسب و نسب دریافت کرتا۔ اس کے بعد حسب مراتب اس کو عہدہ دیتا۔ اگر کسی کے پاس گھوڑا' سواری اور دوسرا ضروری سامان نہ ہوتا تو اسے جاگیر عطا کر دیتا تاکہ وہ اپنی ظاہری حیثیت اور معاشی حالت درست کر سکے۔ اپنی رعایا سے سلطان سکندر لودھی کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اسے ایک ایک شخص کے ذاتی حالات تک کی خبر رہتی تھی۔ اکثر سلطان جب لوگوں کو ان کے اندرونی حالات بتا دیتا تو لوگ حیران رہ جاتے اور سوچنے لگتے کہ شاید کوئی جن سلطان کے قبضے میں ہے' جو اسے ان کے گھروں کے اندر کی خبریں پہنچاتا رہتا ہے۔ سلطان کی ڈاک کا نظام اس قدر منضبط تھا کہ ضروری احکامات کی ایک جگہ سے دوسری جگہ ترسیل میں معمولی سی بھی تاخیر نہیں ہوتی تھی' دن ہو یا رات' ڈاک لے جانے والے سپاہی ہر وقت پابہ رکاب رہتے تھے۔

جس علاقے کے امیر کے نام حکم نامہ ارسال کیا جاتا وہ اسے چبوترے کے نیچے اتر کر وصول کرتا اور بڑے احترام سے اپنے سر پر رکھ لیتا۔ اگر سلطان کا فرمان ہوتا تو اسی جگہ پڑھ کر سنایا جاتا ورنہ پھر سلطان کے حکم کے مطابق مسجد میں منبر پر باآواز بلند سنا دیا جاتا۔ اگر کوئی راز کی بات ہوتی تو فرمان پوشیدہ طور پر پڑھا جاتا۔ سلطان سکندر لودھی کے دربار میں جیسا کہ علاؤالدین خلجی کے دربار کا دستور تھا' روزانہ اناج کے بھاؤ تمام درباریوں کے سامنے پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ اگر کوئی تاجر سلطان کے حکم سے سرمو بھی تجاوز کرتا تو سکندر لودھی فوراً اس کی روک تھام کرتا اور سختی کے ساتھ ملکی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرتا۔

بچپن ہی سے سلطان سکندر لودھی کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ پھر جب اس نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو وہ دوسرے شہزادوں سے بہت زیدہ مختلف نظر آتا تھا۔ رقص و موسیقی اور کیف و نشاط کے ہنگاموں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس کے باپ سلطان بہلول لودھی کا انتقال ہو گیا۔ سکندر لودھی اس وقت دارالحکومت سے دور تھا۔ افغان سرداروں نے باہم مشورے کے بعد اسے تخت نشینی کے لئے طلب کیا۔ اگر وہ حرص و ہوس کے جذبات کا اسیر کوئی رنگین مزاج شہزادہ ہوتا تو برق رفتاری کے ساتھ قصر شاہی پہنچتا اور تاج زرنگار اپنے سر پر سجا لیتا۔ مگر سکندر لودھی نے اس طریق کار سے گریز کیا۔ افغان سرداروں کی طلبی پر وہ دارالحکومت ضرور پہنچا' لیکن قصر شاہی میں داخل ہونے کے بجائے حضرت شیخ بہاء الدینؒ کی خانقاہ کی طرف چلا گیا۔

حضرت شیخ بہاء الدینؒ اپنے وقت کے ولی کامل تھے۔ سکندر لودھی بڑے ادب و احترام کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ افغان حکمران کے فرزند کو دیکھ کر شیخ مسکرائے اور بڑے مشفقانہ لہجے میں مخاطب ہوئے۔

''اس فقیر کی کوٹھڑی کی طرف کیسے آنا ہوا شہزادے؟''

''شیخ جانتے ہیں کہ والد محترم اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔'' سکندر لودھی نے اس طرح کہا کہ اس کی

نظریں خانقاہ کے فرش پر مرکوز تھیں۔

''میں تم سے تمہارے والد محترم کے انتقال پر تعزیت کرتا ہوں شہزادے!'' حضرت شیخ بہاء الدینؒ نے انتہائی پرسوز لہجے میں کہا۔ ''اللہ سلطان کی مغفرت فرمائے اور تمہیں صبر جمیل عطا کرے۔''

سکندر لودھی اپنے والد مرحوم کے ذکر پر کچھ دیر تک افسردہ سوگوار بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

''افغان امیروں نے مجھے سلطان بہلول لودھی کی جانشینی کے لئے طلب کیا ہے۔''

''تو پھر یہاں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟'' حضرت شیخ بہاء الدینؒ نے اسی تبسم دلنواز کے ساتھ کہا۔

''جلدی کرو! تخت شاہی بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کرسی اقتدار کو خالی نہیں چھوڑتے۔ کون جانے' کب کس کی نیت بدل جائے۔ دشمن قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ جلدی کرو شہزادے! جلدی کرو۔''

''آپ کی دعاؤں کے بغیر کیسے چلا جاؤں؟'' یہ کہتے کہتے سکندر لودھی کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

''میری دعاؤں میں کیا رکھا ہے شہزادے؟'' حضرت شیخ نے فرمایا۔ ''جب اپنی ہی جان نہیں سنبھلتی تو کسی دوسرے کے کیا کام آؤں گا؟ اللہ تمہیں اس حسن ظن کی جزا دے' مگر حقیقت یہ ہے شہزادے کہ میں بہت ناکارہ انسان ہوں۔''

شیخ نے اسے مختلف بہانوں سے ٹالنے کی کوشش کی لیکن سکندر لودھی مسلسل دعاؤں کے لئے اصرار کرتا رہا۔

آخر حضرت بہاء الدین افغان شہزادے کے جذبہ عقیدت سے مجبور ہو گئے اور کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد شیخ نے اپنے قریب رکھی ہوئی ''کتاب میزان'' اٹھائی اور سکندر لودھی سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

''شہزادے! میری خواہش ہے کہ میں یہ کتاب تمہارے سامنے پڑھوں۔''

''بسم اللہ! سکندر لودھی نے عقیدت سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''میرے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی؟''

حضرت نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کتاب پڑھنی شروع کی۔ جب شیخ اس جملے پر پہنچے۔ ''اللہ تجھے دین و دنیا میں نیک بخت کرے۔'' تو سکندر لودھی نے بصد عجز و انکسار عرض کیا۔

''شیخ عالی مقام! میری درخواست ہے کہ آپ اس جملے کی تکرار کریں۔''

جب حضرت بہاء الدینؒ اپنی زبان مبارک سے اس مخصوص جملے کو تین بار ادا کر چکے تو سکندر لودھی اٹھا اور شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر خانقاہ سے روانہ ہو گیا۔

یہ حضرت شیخ بہاء الدینؒ کی دعاؤں ہی کا اثر تھا کہ سکندر لودھی نے اپنے بے شمار دشمنوں پر غلبہ حاصل کیا اور ''سلطانی'' کے منصب پر فائز ہوا۔

سلطان سکندر لودھی شرع کا بہت پابند تھا۔ اس کے دور حکومت میں عورتوں کو مزارات پر جانے کی سخت ممانعت تھی۔ سکندر لودھی نے مملکت کی تمام مسجدوں اور مزاروں کا انتظام کرنے والے خطیب' قاری اور دوسرے کارندے بطور خاص مقرر کیے تھے۔ سلطان نے مختلف علوم و فنون کی بھی سرپرستی کی۔ اس کے عہد حکومت میں ہر طبقے کے لوگ جن میں امراء اور دیگر اراکین سلطنت بھی شامل تھے' مختلف علوم سیکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ سلطان سکندر ہی کے دور میں ہندو بھی فارسی زبان کی طرف متوجہ ہوئے ورنہ اس سے پہلے اہل ہنود مسلمانوں کی زبان سے بے نیازی برتنے کے عادی ہو گئے تھے۔ سلطان کے زمانہ اقتدار میں فن سپاہ گری نے بھی بہت زیادہ

ا، ل۔

اپنی رعایا کے لئے ایک باپ کی طرح شفیق و مہربان حکمران' بالآخر 7 ذیقعد 923ھ کو دنیا سے رخصت

سلطان سکندر لودھی نے اٹھائیس سال پانچ مہینے حکومت کی۔

⌑ ⌑ ⌑

سکندر لودھی کا انتقال آگرہ میں ہوا تھا۔ سلطان کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا ابراہیم لودھی

...ن ہوا۔ ہر خاص و عام کا یہی خیال تھا کہ ابراہیم لودھی سلطان سکندر کا حقیقی وارث ثابت ہوگا اور باپ ...

... خدا کے ساتھ محبت و انصاف کے جس نظام کو قائم کیا تھا وہ اسے مزید استقامت بخشے گا۔ مگر خوش گمانیوں

... اس وقت ریزہ ریزہ ہوگیا جب ابراہیم لودھی نے رعایا کی طرف سے پیش کردہ نذروں کو بڑی حقارت سے

...ٹھکرا دیا۔

''ایک سلطان کو دوسرا سلطان اور ایک بادشاہ کو دوسرا بادشاہ ہی نذر پیش کرسکتا ہے۔'' رعایا کے نمائندوں

...شاہی سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے ابراہیم لودھی نے کہا۔ ''غلام اپنے آقا کے سامنے سجدہ ریز ہو کے

...ے کوئی تحفہ پیش کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ اس مملکت میں جو کچھ ہے وہ میرا ہے۔ پھر مجھے میری ہی چیز

...نے والے تم کون ہو؟ اگر تم اپنی وراثت یا جاگیر میں سے کوئی قیمتی شے لاسکتے ہو تو شوق سے لاؤ۔ لیکن کہا

...ؤ گے کہ ہر وراثت اور جاگیر میرے خزانوں کی زکوٰۃ ہے۔''

ابراہیم لودھی بڑے متکبرانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ تمام افغان سردار اپنے نئے حکمران کی باتیں سن کر سنا...

...ں آ گئے تھے۔

اگرچہ ذی ہوش امرائے سلطنت نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا' لیکن پھر بھی وہ رسم دنیا سے مجبور تھے اور بجھے

...ے دلوں کے ساتھ ابراہیم لودھی کے حضور قیمتی نذریں پیش کر رہے تھے۔

سلطان نے اپنے امراء کی نذریں قبول کرلی تھیں' مگر اس طرح کہ جیسے اس کے نزدیک یہ کوئی مکروہ ...

...ناپسندیدہ فعل ہو۔

جب تاجپوشی کے جشن کی ہنگامہ آرائیاں ختم ہوگئیں تو سلطان ابراہیم لودھی نے ایک اور اعلان کیا' جس کا

ہر لفظ غرور و تکبر اور نفس پرستی کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔

''تم میں سے ہر شخص آج اس حقیقت کو جان لے کہ کوئی افغان سردار یا سپاہی میرا رشتے دار نہیں ہے ...

اگر بالفرض کسی قسم کی رشتے داری ہے بھی تو ہر فرد اپنے سلطان کا نوکر ہے۔''

سلطان ابراہیم لودھی کا یہ اعلان سن کر خاندان شاہی سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کے چہرے مسخ ہوگئے

تھے اور ان کی آنکھوں سے ویرانی برسنے لگی تھی۔ ہر شخص ذلت و رسوائی کے پسینے میں نہایا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ

آگرے کے دربار میں نہیں' وقت کی نیلام گاہ میں غلاموں کا لباس پہنے کھڑا ہے اور اسی کا ایک عزیز بڑی بے رحمی

کے ساتھ اس کی بولی لگا رہا ہے۔

ابراہیم لودھی کے اس متکبرانہ اور وحشیانہ فیصلے کے بعد قریبی رشتے داروں کو بھی خدمت گاروں کا درجہ ملا ...

وہ افغانی امراء جو سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتے تھے' اب ان کا یہ حال تو

کہ دربار کی اگلی قطار میں دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔

جب بابر کے جاسوسوں نے یہ ساری اطلاعات کابل ارسال کیں تو مغل شہنشاہ کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ ابھر آئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔''

پھر اس نے ہندوستان کے نقشے پر اپنا خنجر رکھ دیا اور پنجاب سے آگرے تک نقشے کو چیرتا چلا گیا۔ ''اب اس خونیں انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔''

اس کے بعد بابر نے اپنے گھوڑوں کا رخ ہندوستان کی طرف موڑ دیا۔

⌑ ⌑ ⌑

مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے 925ھ میں ٹک کے ساحل تک یلغار کی اور پنجاب کی سرحدوں پر آ
گھکڑوں اور دوسری قوموں کو صلح کا پیغام دیا۔ بابر کے سفیروں نے صاف صاف کہا۔

''اگر تم شہنشاہ کو گزرنے کا راستہ دے دو گے تو عزت مآب تمہیں اپنے حلقہ کرم میں شامل فرمالیں
ورنہ ساری دنیا کو خبر ہے کہ آل تیمور کس طرح جنگ کرتی ہے اور بابر کی شمشیر کی کاٹ کس قدر ہلاکت خیز ہے
شہنشاہ کے اس پیغام کے بعد جن مقامی لوگوں نے سر اطاعت خم کر دیا وہ بابر کے قہر و غضب سے محفوظ
رہے۔ ان کی جانیں بھی بخش دی گئیں اور جاگیریں بھی...... مگر جن سرکشوں نے بابر کے مصالحانہ پیغام کو فو
کمزوری سے تعبیر کیا اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز اس پیشکش کا مذاق اڑایا وہ بڑے خسارے
رہے۔ بابر نے ایسے تمام مفسدوں کو بے دریغ قتل کیا اور ان کی املاک لوٹ کر مکانوں کو آگ لگا دی۔

ان سرکشوں سے نجات پانے کے بعد بابر نے دریائے سندھ پار کیا اور پنجاب کے ایک مخصوص علا
تک اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ یہ مقام پہلے بھی آل تیمور کے زیر اقتدار رہ چکا تھا۔ اس لئے اس علاقے کو
کرنے کے لئے بابر کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یہاں کی رعایا نے خوشی خوشی بابر کا استقبال کیا۔
مغل شہنشاہ نے بھی ان لوگوں پر الطاف و عنایات کی بارش کی۔

اس کے بعد شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے اپنے ایک سفیر کو خط دے کر سلطان ابراہیم لودھی کے دربار میں
بابر نے اپنے اس مکتوب میں کسی تکلف اور رعایت کے بغیر تحریر کیا تھا۔

''سلطان اس وقت جن علاقوں پر قابض ہیں' وہ کسی زمانے میں آل تیمور کی میراث سمجھے جاتے۔ گر
وقت کے باعث صاحبقراں امیر تیمور کا کوئی وارث ادھر نہیں آیا' اس لئے تمام جاگیریں خالی پڑی رہیں اور
مالکان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر غیروں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ میں اس خط کے ذریعے اپنا نسب نامہ
کر رہا ہوں۔ میرے تحریر کردہ ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھئے اور اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کیجئے میں ہوں شہنشاہ
ظہیر الدین بابر ابن عمر شیخ مرزا...... ابن سلطان ابو سعید مرزا...... ابن سلطان محمد مرزا...... ابن میران شاہ مرزا
ابن امیر تیمور صاحبقراں...... میرے نسب نامے میں کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔ اپنے باخبر درباریوں سے پوچھ
دیکھئے۔ وہ آپ کو بے خوف و خطر بتا دیں گے کہ میں ہی امیر تیمور کا حقیقی وارث ہوں اور اپنی آبائی جا
غاصبوں کے ناجائز قبضے سے آزاد کرانے کے لئے ہندوستان آیا ہوں۔ اگر آپ نے میرا خط ملتے ہی مطا
علاقے خالی کر دیئے تو میں کوئی باز پرس نہیں کروں گا اور آپ کا شمار بھی غاصبوں میں نہیں ہوگا۔'' بابر کا انداز
بڑا عجیب تھا۔ وہ شائستہ لہجے میں انتہائی ماہرانہ گفتگو کر رہا تھا...... ''اگر آپ نے دوسرے بد دماغ حکمرانوں

رح میری اس مصالحانہ پیشکش کی قدر نہیں کی تو پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لیجئے کہ میں اپنی موروثی
اگیروں کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ مخلوق خدا گھر سے بے گھر ہو جائے...... گلی کوچوں
ں لاشوں کے انبار لگ جائیں...... ہندوستان کے کئی دریاؤں کے پانی کا رنگ سرخ ہو جائے اور یتیم بچوں اور
ہ عورتوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو جائے کہ میں تمام عمر اپنے سینے پر ایک ناقابل برداشت بوجھ لئے پھرتا
ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا' اگر ہندوستان کسی خونی حادثے سے دوچار ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری
پ پر عائد ہوگی......''

خط لکھنے کے بعد بابر نے اپنے چند خاص مشیروں کو بھی یہ تحریر دکھائی تھی...... اور سلطنت مغلیہ سے وابستہ یہ
نشمند لوگ اپنے فرمانروا کا مکتوب پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے کہ بیک وقت اس کا انداز مصالحانہ بھی تھا اور
ابرانہ بھی۔

''اگر آپ حضرات کا مشورہ ہو تو اس خط میں مزید اضافہ کر دیا جائے۔'' بابر دوستانہ لہجے میں اپنے مشیروں
سے گفتگو کر رہا تھا۔

''نہیں عالی جاہ!'' تمام مشیروں نے بیک زبان کہا۔ ''عزت مآب نے جو کچھ تحریر فرما دیا وہ سلطان ابراہیم
دھی کو بے قرار کرنے کے لئے کافی ہے۔''

''میں اسے بے قرار کرنا نہیں چاہتا......'' بابر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمایاں
ا...... ''میں چاہتا ہوں کہ وہ میرا نسب نامہ پڑھ کر یا تو نفسیاتی طور پر مغلوب ہو جائے یا پھر جوش وحشت میں سر
بار ہذیان بکنے لگے۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سلطان ابراہیم لودھی بابر کا خط پڑھ کر شدت غضب میں تخت شاہی پر کھڑا ہو گیا۔ وہ
غل فرمانروا کے مکتوب کو چاک کر کے اس کے ٹکڑے سفیر کے حوالے کر دینا چاہتا تھا...... مگر سلطان کے مشیروں
نے اسے سمجھایا۔

''فی الحال آپ بھی بابر کو الفاظ کے ہتھیار سے قتل کیجئے۔ اگر آپ نے مغل فرمانروا کے خط کو پرزوں میں
ریل کر دیا تو ہمیں سفارتی سطح پر شکست ہو جائے گی۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' فرط غضب میں سلطان ابراہیم لودھی اپنے مشیروں کے سیدھے سادے الفاظ کا بھی
ہوم نہیں سمجھ سکا۔

''آپ بھی بابر کے نام ایک تحقیر آمیز خط تحریر کر دیجئے۔'' سلطان کے مشیروں نے کہا...... ''ابھی تو صرف
اظ کی جنگ چھڑی ہے۔ آپ بھی حروف و معانی کے ہتھیار اٹھایئے۔ جب انسانی خون کی لے پر رقص فنا
وع ہوگا تو پھر بابر کی شمشیر ہلاکت کو بھی دیکھ لیں گے۔''

پھر سلطنت لودھی کے سیاسی مدبروں سے طویل مشوروں کے بعد مغل شہنشاہ کے خط کا جواب لکھا گیا۔

''ہم نے تیرے مکتوب کا ایک ایک حرف پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کسی صحیح الدماغ انسان کی تحریر
ہیں۔ اگر تو اپنے ہوش میں ہوتا تو یقیناً اس حقیقت کو سمجھ لیتا کہ تیرے آباؤ اجداد بے نشان ہو چکے ہیں اور آج
ہیں کوئی جانتا تک نہیں ہے۔ پھر ایسے گمنام اور بے اثر لوگوں کے وارثوں کو کون پہچانے گا؟ تجھے تیرے کسی مشیر
نے یہ نہیں بتایا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاست صرف ''لودھی'' خاندان کے عظمت و جبروت سے وابستہ ہے۔

خوب غور سے سن لے کہ ہم سرزمین ہند پر کرایہ دار نہیں ہیں۔ یہ ہماری موروثی جاگیر ہے اور ہم اپنی جا
حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں' غاصب تو تیرا پردادا تیمور تھا' جس نے کمزور انسانوں کی ملکیت پر جبراً قبضہ
تھا .... اور تو بھی اسی غاصب کی اولاد ہے جو اپنے بزرگوں کے کاروبار حرص و ہوس کو زندہ کرنے کے
گیدڑوں کی کثیر فوج لے کر ایک شیر کے جنگل میں آ پہنچا ہے۔" سلطان کے سیاسی مشیروں نے "شیر
جنگل" تحریر کر دیا تھا تا کہ ابراہیم لودھی کے افغان سپاہی اپنی اس تعریف سے خوش ہو جائیں اور سلطان کے
آمیز سلوک کے باعث ان کے دلوں میں جو غبار بھر گیا ہے وہ کسی طرح صاف ہو جائے ..... مگر اس مغرور حا
نے اپنے خط سے وہ لفظ حذف کرا دیا اور اس کی جگہ "ایک شیر" لکھوا دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ س
اپنی ذات کو تمام جاں نثاران سلطنت سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہے..... "منگول بھیڑ بکریوں نے آج تک
"شیر غاب" کا جاہ و جلال نہیں دیکھا۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تو اور تیرے سپاہی ایک بار اپنی آنکھوں سے"
اقتدار" کے خدوخال دیکھ لیں۔ پھر تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ شیر کسے کہتے ہیں اور قدرت نے جنگل کی حا
کے لئے شیر کو کیوں منتخب کیا ہے؟" خط کے آخر میں سلطان ابراہیم لودھی نے اپنا شجرہ تحریر کرایا تھا..... "اس
کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہم کسی حادثے کی پیداوار نہیں ہیں۔ ہم کبھی خدمت گزار سپاہیوں کی صف میں کھڑے
ہوئے..... اور ہم نے کسی کی پشت پر وار کر کے دھوکے اور فریب سے اقتدار حاصل نہیں کیا....." سلطان اب
لودھی نے اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرنے کے لئے کھلا ہوا جھوٹ بولا تھا۔ حالانکہ ہندوستان کے سیاسی حلقے
راز سے باخبر تھے کہ ابراہیم لودھی کا دادا سلطان بہلول لودھی ایک افغان سردار تھا' جو سلطان محمد شاہ کی دعو
دہلی آیا تھا۔ اس نے بڑی جانبازی کے ساتھ محمد شاہ کے دشمنوں سے جنگ کی تھی۔ بہلول لودھی کے اسی
سرفروشی سے متاثر ہو کر سلطان محمد شاہ نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ **849** ھ میں سلطان محمد شاہ کا انتقال ہو گیا
دہلی کے تخت پر اس کا بیٹا سلطان علاء الدین جلوہ افروز ہوا۔ تمام امرائے سلطنت نے سلطان کے روبرو
ہو کر سر دربار اپنی اطاعت گزاری کا اعلان کیا۔ علاء الدین کی نظریں بہلول لودھی کو تلاش کر رہی تھیں جو اس
باپ کا منہ بولا بیٹا تھا اور اسی رشتے سے سلطان اسے اپنا بڑا بھائی کہہ کر مخاطب کرتا تھا..... مگر بہلول لودھی
آداب سلطانی کے مطابق دربار میں حاضری بھی نہیں دی اور کسی خط کے ذریعے اپنی فرمانبرداری کا اقرار بھی
کیا۔ سلطان علاء الدین کو بہلول لودھی کا یہ طرز عمل سخت ناگوار گزرا' لیکن وہ ایک عاقبت نااندیش' کم ہمت
کمزور فرمانروا تھا۔ بس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور شدید خواہش کے باوجود بہلول لودھی کے خلا
کوئی تادیبی کارروائی نہ کر سکا' بہلول لودھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے ہم خیال افغانوں کو جمع کرتا رہا اور
جب اس کی فوجی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تو اس نے مختلف سیاسی چالیں چلیں اور سلطان علاء الد
دہلی چھوڑ کر بدایوں جانے پر مجبور کر دیا۔ بہلول لودھی یہی چاہتا تھا۔ آخر **855** ھ میں وہ دہلی کے تخت پر قا
ہو گیا اور اس نے خطبے سے سلطان علاء الدین کا نام خارج کرا دیا۔ یہ نمک حرامی اور غداری کی بدترین مثال
مگر بہلول لودھی نے محبت اور اعتبار کا خون کر کے اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر حاصل کر لی تھی۔ ایک لحاظ
سلطان علاء الدین اس کا محسن زادہ تھا اور دوسرے رشتے سے چھوٹا بھائی..... لیکن بہلول لودھی نے کسی رشتہ
احترام نہیں کیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ سلطان علاء الدین بدایوں کے حاکم کی حیثیت سے اٹھائیس سال تک گز
کی زندگی بسر کرتا رہا۔ شاید بہلول لودھی کی طرف سے اس نرمی کی وجہ یہ تھی کہ بدایوں کا علاقہ اس کے لئے کا

ذکر سیاسی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر بہلول لودھی کو معمولی سا بھی شک ہو جاتا کہ سلطان علاء الدین اس کے راستے کا پتھر ہے تو وہ کسی تاخیر کے بغیر اس پتھر کو ایک ہی بے رحمانہ ٹھوکر کے ذریعے ہٹا دیتا۔ سلطان ابراہیم لودھی نے اپنے دادا کی اس زمانہ سازی اور احسان فراموشی پر جھوٹ کا پردہ ڈالتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ کسی حادثے کی پیداوار نہیں اور اس کے آباؤ اجداد میں سے کسی کی گردن میں خدمت گزاری کا طوق نہیں ہے۔ خط کے آخر میں بابر کی تقلید کرتے ہوئے دہلی کے حکمران نے اپنا نسب نامہ تحریر کیا تھا۔

"میں ہوں سلطان ابراہیم لودھی..... ابن سلطان سکندر لودھی..... ابن سلطان بہلول لودھی....."

تیسری پشت کے بعد سلطان ابراہیم لودھی کے نسب نامے میں کسی مقتدر ہستی کا ذکر نہیں تھا' اگر اس زاویے سے بابر اور ابراہیم لودھی کا موازنہ کیا جاتا تو دہلی کے حکمران کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی..... کیونکہ بابر کا نسب نامہ صرف امیر تیمور پر ہی ختم نہیں ہوتا تھا۔ اگر نسلی تفاخر کے قصے کو زیادہ طول دیا جاتا تو بات بڑھتے بڑھتے ہلاکو اور چنگیز خان تک پہنچ جاتی..... اور یہ دونوں نامور فاتح بہرحال بابر کے مورث اعلیٰ تھے..... اور اگر صرف امیر تیمور کی ذات کو بنیاد بنا کر "قومی برتری" کے ترانے گائے جاتے تو ابراہیم لودھی کی آواز کون سنتا؟ فتوحات کے اعتبار سے اس کی پوری نسل میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں گزرا تھا جو صاحبقران کی عسکری طاقت کی گرد کو بھی پہنچ سکتا' اس مسلمہ حقیقت کے باوجود سلطان ابراہیم لودھی اپنا نسب نامہ بیان کر کے مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کو متاثر کرنا چاہتا تھا۔

جب بابر کے سفیر نے ابراہیم لودھی کا جواب اپنے فرمانروا کی خدمت میں پیش کیا اور افغان حکمران کے غیظ و غضب کا واقعہ زبانی سنایا تو بابر مسکرانے لگا۔

"میں یہی چاہتا تھا....." بابر نے اپنے مشیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس خط کے تحریر کرنے میں بس ایک ہی مصلحت پوشیدہ تھی کہ ابراہیم لودھی کے اعصاب کی قوت کا اندازہ کیا جا سکے۔ اگر وہ میرا خط پڑھ کر مسکرانے لگتا تو یقیناً اس کی اعصابی قوت بے مثال ہوتی اور وہ میدان جنگ میں بڑا خوفناک حریف ثابت ہوتا۔"

"اب کیا ہو گا شہنشاہ؟" احمد جمال نے پوچھا۔

"تم پہلے مرحلے کی جنگ جیت چکے ہو۔" بابر نے انتہائی پرسکون لہجے میں کہا۔ وہ ذاتی جنگ کو ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی جنگ کہا کرتا تھا۔

"کیا یہ جنگ مختلف مرحلوں میں لڑی جائے گی؟"

احمد جمال نے مغل شہنشاہ سے دوسرا سوال کیا۔

"یقیناً ایسا ہی ہو گا۔" بابر کا لہجہ پراعتماد تھا۔ "ابراہیم لودھی داخلی طور پر ایک کمزور بادشاہ ہے۔ اس نے اپنے نفس کی تسکین کے لئے شرفائے سلطنت اور امرائے وقت کو خدمت گزاروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اگر کبھی اس پر آزمائش کی گھڑی نازل ہوئی تو ایسے سنگین لمحوں میں کون اس کے لئے اپنی جان قربان کرے گا؟ کوئی بھی نہیں..... اور یاد رکھو کہ دنیا کی کوئی جنگ زندگی کا صدقہ دیئے بغیر جیتی نہیں جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت جلد مشتعل ہو جانے والا انسان ہے۔ ہم عنقریب اس کی اس کمزوری سے گراں قدر فائدہ اٹھائیں گے۔"

⌑ ⌑ ⌑

ابھی بابر مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اسی دوران اس کے یہاں دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ مغل شہنشاہ نے

ہندوستانی فتوحات کے حوالے سے اپنے نومولود بیٹے کا نام ہندال مرزا رکھا اور ایک یادگار جشن منایا۔

پھر جیسے ہی ہندال مرزا کے جشن ولادت کی نشاط انگیز ہنگامہ آرائیاں ختم ہوئیں' بابر گھکر قوم کی طرف م ہوا۔ اس وقت اس قوم کا سربراہ ہاتی گھکر تھا۔ ہاتی نے پرہالہ میں قلعہ بند ہو کر جنگ شروع کی اور غروب آفتا کے وقت ایک ایسے مقام پر صف آراء ہوا جو بہت زیادہ تنگ تھا اور جہاں ایک سپاہی سے زیادہ کے گزرنے' گنجائش نہیں تھی۔ اس جنگ میں سردار دوست بیگ مغل لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ دوست بیگ بڑی ذہانت ا شجاعت کے ساتھ لڑا۔ یہاں تک کہ ہاتی گھکر کو میدان جنگ سے فرار ہونا پڑا۔ ہاتی نے بہت کوشش کی کہ وہ کو طرح دوبارہ قلعے میں داخل ہو جائے مگر سردار دوست بیگ نے اس کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔ نتیجتاً گھکر اپنی جان بچانے کے لئے پہاڑوں میں چھپتا رہا اور اس کا تمام مال و متاع اور خزانہ بابر کے قبضے م آ گیا۔ مغل شہنشاہ اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا کہ اچانک کابل میں بغاوت کے سے حالات پ ہو گئے۔ فوراً بابر نے اپنے ایک معتمد سردار محمد علی خنگ کو سندھ اور پرہالہ کے درمیانی علاقوں کا حاکم بنایا اور فو کابل واپس لوٹ گیا۔

¤ ¤ ¤

925ھ کے آخر میں بابر نے لاہور کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ مغل شہنشاہ کا جنگی منصوبہ یہ تھا کہ وہ ب صورت پورے پنجاب پر مکمل غلبہ حاصل کر لے تاکہ اس کے لشکروں اور دہلی کی فوجوں کے درمیان فاصلہ کم سے کم ہو جائے۔ اس طرح وہ سلطان ابراہیم لودھی پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ پھر جیسے ہی مغل لشکر کا سے نکل کر ہندوستان کی طرف بڑھا تو یکایک بابر کو خیال آیا کہ یوسف زئی قبیلے کو سخت تنبیہ کر دی جائے۔ اس سیاسی حکمت عملی کو بروئے کار لانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سلطان ابراہیم لودھی اول و آخر خود بھی افغان تھا۔ اس لئے قومی رشتے کے حوالے سے یوسف زئی قبیلہ کسی وقت بھی ابراہیم لودھی کی حمایت کا اعلان کر سکتا تھا...... اور اگر ایسا نہ ہوتا تو افغانوں کی طاقتور جماعت خود اس کے اپنے راستے کی دیوار بن سکتی تھی۔ غرض اسی احتیاطی تدب کے پیش نظر بابر نے یوسف زئی قبیلے کے کھیتوں کو برباد کر ڈالا اور ان کا سارا مال و متاع لوٹ لیا۔ اس طرح مغل شہنشاہ نے اپنے راستے کے ایک بھاری پتھر کو ہٹا دیا تھا اور ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دریائے سندھ پار کرکے لاہور پر حملہ کر دے...... مگر اچانک ایک دن مغل شہنشاہ کو اطلاع ملی کہ سلطان سعید بدخشاں کو فتح کرنے کے لئے اس طرف آ رہا ہے۔ بابر نے فوری طور پر پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے قریبی عزیز مرزا محمد سلطان کو حکم دیا کہ وہ چار ہزار سپاہی لے کر لاہور روانہ ہو جائے۔ پھر جیسے ہی مرزا محمد سلطان لاہور کی جانب بڑھا' بابر کابل کی طرف پلٹ پڑا۔

یہ مغل شہنشاہ کی خوش بختی تھی کہ سلطان سعید کا ارادہ بدل گیا اور وہ بدخشاں پر حملے کئے بغیر اپنے علاقے کی طرف لوٹ گیا۔ اب بابر پوری یکسوئی کے ساتھ منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

926ھ میں مغل شہنشاہ نے پہلے "خضر خیل" کے افغانوں پر حملہ کرکے ان کا مال و اسباب لوٹا اور پھر بڑے خوفناک عزائم کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اپنے اس طویل سفر کے دوران بابر سرکش افغانوں کو تلاش کرکے سخت سزائیں دیتا اور ان کی املاک کو تباہ و برباد کر ڈالتا۔ اس کے برعکس پٹھانوں کے وہ قبائل' جو پرامن زندگی بسر کرنے کے خواہاں تھے بابر انہیں انعام و اکرام سے نوازتا ہوا آگے بڑھ جاتا' ایسے علاقوں سے گزرتے

ہر مقامی حاکموں کو ایک ہی پیغام دیتا۔

"میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے' میں تمہاری جاگیروں پر حریصانہ نظر نہیں رکھتا۔ میرا حریف صرف ابراہیم ہے' میں اس سے اپنا حساب بے باک کرنے دہلی کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر تم نے کسی بھی قسم کی مزاحمت برے راستے میں فتنہ و شرارت کے کانٹے بچھائے تو میں تمہارے سروں سے موج خون بن کر گزروں گا اور نے صلح پسند انسانوں کی طرح کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کیا تو یقین رکھو کہ میرے گزرنے کا انداز بادِ صبا کی مانند دماغوں کو مہکاتی ہے اور دلوں کو نئی لذت سے سرشار کرتی ہے۔"

کثر افغان قبائل نے دانشمندانہ رویہ اختیار کیا' اس طرح ان کی جانیں محفوظ رہیں اور مال و اسباب بھی۔ بابر نے یہ طویل سفر کسی دشواری کے بغیر طے کیا اور بڑھتے بڑھتے سیالکوٹ تک پہنچ گیا' یہاں کے ں نے بابر سے اپنے جان و مال کی پناہ مانگی۔ مغل شہنشاہ نے اعلیٰ ظرفی سے کام لیا اور مقامی لوگوں کی ں کو چھیڑے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد بابر کا لشکر سید پور پہنچا' یہ علاقہ لاہور کے زیر انتظام تھا۔ بابر ب روایت یہاں کے لوگوں کو بھی امن و عافیت کا پیغام دیا' مگر سید پور کے باشندے وقت کی رفتار کو سمجھنے رر ہے' ان کے برے دن آ گئے تھے اس لئے مغل شہنشاہ کے مقابل صف آراء ہو گئے۔ مغل سپاہیوں کے ت خوفناک تھے۔ ان کی شمشیریں سید پور کے سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ اس جنگ کا ر گھنٹوں میں ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے قبیلے کے تین ہزار مرد غلام بنا لئے گئے۔ مگر سید پور کے غیر مسلم ں کا چودھری جو افغانی امراء سے ملا ہوا تھا وہ کسی طرح بھی بابر کی اطاعت گزاری پر راضی نہ ہوتا تھا۔ آخر ی کشمکش کے بعد اسے بھی گرفتار کرکے تہ تیغ کر دیا گیا۔ اب سید پور کا کوئی حال اور کوئی مستقبل نہیں تھا۔ رف جلی ہوئی کھیتیاں تھیں' لٹے ہوئے مکانات تھے اور بے گور و کفن لاشوں کے انبار تھے۔ بابر نے اس لاقے پر اپنا نگران حاکم مقرر کر دیا اور خود بہت سا مال غنیمت لے کر کابل کی طرف لوٹ گیا۔ مغل شہنشاہ حکمت عملی بہت زیادہ کامیاب ثابت ہو رہی تھی' وہ تین بار ہندوستان آیا اور ہر مرتبہ اس نے کسی نہ کسی تح حاصل کی اور در پردہ ابراہیم لودھی پر ظاہر کر دیا کہ اب اسکے اور دہلی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

ید پور کی فتح کے بعد بابر کابل پہنچا اور بدخشاں کی حکومت شہزادہ ہمایوں کے حوالے کرکے گرم سیر کے تمام پہ قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اب اس کا رخ خراساں کی طرف تھا۔ اس وقت خراسان پر شہزادہ کی حکومت تھی اور شاہ بیگ اس کا اتالیق تھا۔ بابر نے صلح جوئی کے طور پر پہلے ہی کوشش کی کہ کسی جنگ زاسان کا قلعہ اس کے زیر انتظام آ جائے۔ مگر شاہ بیگ اس پر آمادہ نہیں ہوا اور بابر کے مقابلے میں ہلسپ کی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ سیاسی مذاکرات ناکام ہو جانے کے بعد بابر بڑھ کر خراسان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

کا ایک سردار امیر خان شاہ بیگ کا دوست تھا۔ اس نے اپنے دوست کی مدد کرنے کے لئے بابر سے بار ست کی کہ شہنشاہ قلعے کا محاصرہ ترک کر دیں...... مگر بابر نے امیر خان کی ایک نہ سنی اور تین سال تک صرہ جاری رکھا...... آخر مسلسل محاصرے سے تنگ آ کر شاہ بیگ باہر نکلا اور خراسان سے فرار ہو گیا۔ کہ اس نے سندھ کے نواحی علاقے بھکر میں جا کر پناہ لی۔ انجام کار 928ھ میں خراسان بھی آس نام علاقوں کے ساتھ سلطنت بابری کے حلقے میں شامل ہو گیا۔

⌑ ⌑ ⌑

اسی دوران ہندوستان میں ایک نیا سیاسی انقلاب رونما ہوا' سلطان ابراہیم لودھی کی بددماغیوں اور ذا
آمیز سلوک سے عاجز آ کر ایک نامور افغان سردار دولت خان لودھی حکومت دہلی سے بدظن ہو گیا اور در
سلطان کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کرنے لگا۔ دولت خان لودھی تنہا اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتا
مجبوراً اس نے مغل شہنشاہ بابر کی طرف دیکھا۔ دولت خان لودھی اس حقیقت سے باخبر تھا کہ شہنشاہ بابر ہی وہ
جان حریف ہے جو سلطان ابراہیم لودھی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہی سوچ کر دولت خان نے اپنے چند معتمد دوست
کو ایک خط مکتوب دے کر بابر کے پاس بھیجا' لودھی سردار نے اپنے عریضے میں لکھا تھا۔

"آپ ایک اعلیٰ نسب شہنشاہ ہیں' اس لئے صرف آپ ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک عزت دار شخ
کی فریاد کو ہمدردانہ جذبوں کے ساتھ سماعت فرمائیں گے۔ میں دولت خان لودھی ایک افغان سردار ہوں
میرے بزرگوں نے ہندوستان کی سرزمین پر نہایت باوقار زندگی گزاری ہے۔ مگر جب سے یہ کم ظرف انس
ابراہیم لودھی صریر آرائے سلطنت ہوا ہے شرفائے وقت کی جانوں پر بن گئی ہے' وہ سر دربار چھوٹے چھو
لوگوں کے سامنے امراء کی پگڑیاں اچھالتا ہے اور ان کی دستار فضیلت سے اپنے جوتے صاف کرتا ہے۔ دوسر
سرداروں کی طرح میں بھی آج کل اس کے قہر و ستم کا شکار ہوں' میری فریاد تنہا فریاد نہیں ہے' اس میں دیگر ا
کی آہیں بھی شامل ہیں۔ اگر شہنشاہ ہم سلطان گزیدہ انسانوں کو جبر کے خونی پنجوں سے نجات دلانے کے
ہندوستان پر حملہ آور ہوں گے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ بے شمار افغانوں کی تلواروں کو اپنی حمایت میں بلند ہوتا
دیکھیں گے۔

"عزت مآب کی آمد اور چشم کرم کا منتظر۔ سردار دولت خان لودھی۔"

یہ ایک فریب کار پیشکش اور انتہائی خوفناک سیاسی چال تھی' دراصل دولت خان لودھی بابر اور سلطان ابرا
کو لڑا کر خود اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جذبہ حکمرانی تو کم و بیش ہر سردار کے سینے میں پرورش پاتا رہتا ہے'
دولت خان لودھی کو جنون کی حد تک دہلی پر حکومت کرنے کی خواہش تھی اور اس خواہش کا بنیادی سبب یہ تھا'
دولت خان کے مورث اعلیٰ دوست خان لودھی نے 816ھ میں کچھ دنوں کے لئے اسی تاریخی شہر پر حکومت
تھی۔ اگرچہ دوست خان کو حادثاتی طور پر دہلی کا اقتدار حاصل ہو گیا تھا' لیکن دولت خان لودھی اسے اپنا مورو
حق سمجھ کر برسوں سے حکمرانی کے سنہری خواب دیکھ رہا تھا اور اب ان ہی خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے اس
سیاست کی زمین میں منافقت اور غداری کے بیج بو دیئے تھے۔

بابر نے بہت غور سے دولت خان لودھی کا خط پڑھا اور سلطان ابراہیم کی صفوں میں نمایاں ہونے وا
اس شگاف کو اپنے لئے نیک فال سمجھا۔ پھر اپنے امراء سے طویل مشوروں کے بعد مغل شہنشاہ 930ھ میں چو
بار ایک نئے عزم کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھا اور لاہور سے چھ کوس کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا۔

اس وقت نیاز خان' مبارک خان لودھی اور بھکن خان لوحانی پنجاب کے طاقتور امراء تھے۔ وہ اپنے ام
لشکر لے کر بابر سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ مغل شہنشاہ اپنے گزشتہ تجربات کی بناء پر یہی سمجھ رہا
کہ اس کے حریف زیادہ سخت جان ثابت نہیں ہوں گے اور وہ آسانی کے ساتھ اپنے مقاصد میں کامیابی حاص
کر لے گا۔ مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے صف آراء ہوئیں تو بابر افغانی امراء کی عسکری طاقت دیکھ کر حیرا

ہ۔ پنجاب کے حاکموں کو اس جنگ میں دو رعایتیں حاصل تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے علاقے اور اپنی پسند
ماذ پر دشمن سے نبرد آزما تھے اور دوسرے انہیں بابر پر افرادی برتری حاصل تھی۔ یہی وہ عوامل تھے کہ جن کے
ژ افغانی امراء کو اپنی فتح کا یقین تھا اور وہ قبل از وقت نصرت و کامیابی کے نشے سے سرشار نظر آ رہے تھے۔
بابر نے اپنے حریفوں کی کثرت تعداد پر نگاہ کی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جنگ شروع ہونے سے
قبل سرداروں نے اپنے فرمانروا کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"شہنشاہ! کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ اپنے منصوبے پر نظر ثانی فرمالیں؟"

مغل شہنشاہ نے چونک کر اپنے سرداروں کی طرف دیکھا۔ "وہ کس طرح؟" بابر نے ان کے سوال کا
دینے کے بجائے خود انہی سے ایک انتہائی مشکل سوال کر دیا تھا۔

اپنے شہنشاہ کے استفسار پر تمام مغل سردار گھبرا سے گئے۔ پھر طویل سکوت کے بعد ایک مقرر امیر نے رک
کر کہا۔ "شاید ہماری جنگی تیاریوں میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔" مغل امیر نے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ بابر کے
کا مبہم جواب دیا۔

"کہیں تم لوگ دشمن کی کثرت تعداد سے تو خائف نہیں؟" بابر کا لہجہ بے نیازانہ تھا' جیسے وہ میدان جنگ
بجائے کسی مجلس کیف و نشاط میں بیٹھا اپنے مصاحبین خاص سے گفتگو کر رہا ہو۔

"کثرتِ تعداد سے خوف زدہ تو نہیں' مگر ہمیں اپنے وسائل کی کمی کا احساس ضرور ہو رہا ہے۔" بابر کے
خاص نے کسی قدر بے تکلفانہ لہجہ اختیار کیا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے دل کی بات صاف صاف نہیں کہہ پا

"وسائل کی کمی کا احساس تو مجھے بھی ہو رہا ہے۔" مغل شہنشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر کہیں تمہارا یہ
یہ تو نہیں کہ موجودہ مسائل کے ساتھ دشمن سے جنگ نہیں کی جا سکتی؟"

"شاید!" مغل امیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں کابل کی طرف واپس لوٹ جاؤں؟" اب کی بار گفتگو کرتے وقت بابر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم
یا تھا۔

"کسی خاص مصلحت کے تحت محاذ جنگ کی طرف سے منہ پھیر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔" جب ایک
نے زبان کھولی تو دوسرے کو بھی دل کی بات کہنے کا حوصلہ ہوا۔

"خاموشی کے ساتھ واپس چلا جانا' اس قیام سے کہیں بہتر ہے جس کا انجام شکست و بربادی کی طرف کھلا
ارہ کر رہا ہو۔"

بابر نے ناپسندیدہ نظروں سے اپنے اس امیر کی طرف دیکھا جو بظاہر تو کسی خوف کا اظہار نہیں کر رہا تھا'
ن کی دلی خواہش یہی تھی کہ پنجاب کے افغانی امراء سے الجھنے کے بجائے خیمے اکھاڑ دیئے جائیں اور مغل
دارالسلطنت کابل کی طرف کوچ کا حکم دے دیا جائے۔ بابر کی پیشانی پر ابھری ہوئی لکیریں دیکھ کر مغل
ہرائے ہوئے لہجے میں دوبارہ اپنے فرمانروا سے مخاطب ہوا۔

"شہنشاہ! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ آپ ہندوستان کی مہم ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں۔"

"پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" بابر کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

''ہم کسی اچھے موسم میں اس طرف آئیں گے۔'' مغل سردار نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس موسم میں جب ہمارے پاس بہتر وسائل ہوں گے اور ہمارے لشکروں کو اپنی قلت تعداد کا کوئی خوف نہیں ہوگا بس کچھ دن......''

ابھی مغل سردار کی بات مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ مغل شہنشاہ درمیان ہی میں بول اٹھا۔ ''خوفزدہ تو تم ہو۔ کثرت دشمناں کے باوجود میرے سپاہی کسی احساس کمتری کا شکار نہیں' میں ان کے چہروں پر عزم و جاں نثاری کی روشن تحریریں دیکھ رہا ہوں۔'' اس مرتبہ بابر کا لہجہ بہت زیادہ برہم تھا۔ ''تم جس موسم کی بات کر رہے ہو وہ موسم کبھی نہیں آئے گا۔ تم وسائل کی کثرت کا انتظار کر رہے ہو' مگر میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ ہمارے پاس وسائل کے انبار کبھی جمع نہیں ہوں گے۔ زندہ رہنا ہے تو ان ہی وسائل کے ساتھ جیو...... اور اگر موت ہی ہمارا مقدر بن گئی ہے تو ان ہی وسائل کے ساتھ مرجاؤ۔ ہار گئے تو ہماری شکست پر وقت کی تاریخ طعنہ زن نہیں ہوگی۔ کہنے والے کہا کریں گے کہ کیسے جانباز لوگ تھے جو اپنی زمین چھوڑ کر دیار غیر میں آئے اور طاقت و وسائل کے پہاڑوں سے ٹکرا کر مر گئے...... مگر پشت پر کوئی زخم نہیں کھایا اور فرار کا کوئی راستہ تلاش نہیں کیا۔''

شہنشاہ کے تیور دیکھ کر مغل سرداروں نے اپنے الفاظ واپس لے لئے اور کھلے دل کے ساتھ بابر سے معذرت کرنے لگے۔

''اگر آج ہم کثرت وسائل سے ڈر کے واپس لوٹ گئے تو پنجاب کی زمین دوبارہ ہمارے قدموں کے وزن کو تسلیم نہیں کرے گی۔'' بابر نے افغانی امراء سے مقابلے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے چھوٹے حاکم اور جاگیردار ابراہیم لودھی سے جاملیں گے اور ہمارا وہ رعب و جلال فنا ہو جائے گا جس کی پرورش گزشتہ پانچ سال سے کی جا رہی ہے۔ ہمیں آج ہی دشمن سے لڑنا ہوگا۔ اگر ''آج'' رائیگاں گزر گیا تو ''کل'' پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔''

مغل سرداروں نے شہنشاہ کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور بابر رات بھر جاگ کر اپنے خیمے میں معرکہ جنگ کا نقشہ ترتیب دیتا رہا۔

آخر شب ی' فجر سے کچھ دیر پہلے احمد جمال بابر کی خیمہ گاہ میں داخل ہوا۔

''کیا تم سوئے نہیں احمد؟'' بابر نے اپنے جاں نثار ساتھی کو روبرو پا کر قدرے تعجب سے پوچھا۔

''کیا شہنشاہ مجھ سے سو جانے کی توقع رکھتے ہیں؟'' احمد جمال بہت زیادہ سنجیدہ اور کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔

''سو جانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا کہ صبح تازہ دم ہو کر تمہیں اپنے طاقتور دشمن سے جنگ کرنا ہے۔'' بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم اول و آخر سپاہی ہیں شہنشاہ! اور سپاہی ہمیشہ تازہ دم رہتے ہیں۔''

''میں تمہاری فرض شناسی پر نازاں ہوں احمد! مگر مجھے دوسرے مغل سردار بہت زیادہ تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' یکایک بابر کے لہجے سے گہری تشویش جھلکنے لگی تھی۔

''آپ مغل سرداروں کی تھکن کا زیادہ احساس نہ کریں کہ یہ جنگ ہمارے امراء نہیں' سپاہی لڑیں گے۔'' احمد جمال نے پر جوش آواز میں کہا۔ ''اس معرکے میں دشمنوں کی کثرت بے حقیقت ٹھہرے گی اور آپ دریائے

وں میں ڈوب کر بھی ساحل مراد پر ابھر آئیں گے۔''

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے احمد!'' بابر نے مسکرانے کی کوشش کی' مگر پھر بھی اس کے چہرے پر فکر تشویش کی ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ امراء کی طرف سے جنگ کئے بغیر کابل لوٹ جانے کے مشورے انشمندانہ بھی تھے اور وقت کی ضرورت بھی۔ بابر نے اپنے پرعزم لہجے اور جرأت مندانہ گفتگو سے بظاہر مغل رداروں کو قائل کر دیا تھا' مگر پھر بھی اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ امرائے سلطنت کی زبانیں اپنے حکمران کے ساتھ ہیں' لیکن ان کے ذہن کہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ اسی صورتحال نے بابر کو فکر و تشویش میں مبتلا کر دیا تا...... اور ماضی کے کئی تلخ تجربات بھی اس بات کے گواہ تھے کہ آزمائش کے سنگین لمحات میں مغل سردار اسے تنہا ی چھوڑ سکتے ہیں۔ بس یہی ایک ذہنی خلش تھی جس نے اسے ایک لمحے کے لئے بھی زمین پر بیٹھنے نہیں دیا تھا روہ رات بھر اپنے خیمے میں ٹہلتا رہا تھا۔ پھر جب احمد جمال صبح کے قریب بابر کی خدمت میں حاضر ہوا تو مغل ہنشاہ اپنے اندیشوں کے اظہار پر مجبور ہو گیا۔

''آپ تو صرف احساس کر رہے ہیں شہنشاہ! مگر میں فتح کی منزل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔'' احمد نال کا لہجہ بہت زیادہ جذباتی تھا۔

''تمہارے اس قدر پر یقین ہونے کی کوئی خاص وجہ؟'' بابر نے چونک کر احمد جمال سے پوچھا۔

''میں ہندوستان کی فتح کے سلسلے میں کبھی بے یقین نہیں رہا۔'' اچانک احمد جمال کا لہجہ کچھ سوگوار ہو گیا تھا راس کے چہرے سے اداسی کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ ''میں بھی آپ کی طرح ساری رات جاگتا رہا ہوں...... مگر کچھ ر پہلے چند لمحوں کے لئے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے اپنی پلکوں کو کھلا رکھنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن مجھ پر بند غالب آ گئی اور پھر میں نے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کو خواب میں دیکھا۔'' یہ کہتے کہتے احمد جمال کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

احمد جمال کی یہ اشک ریزی بے سبب نہیں تھی۔ بابر بھی پریشان سا نظر آنے لگا۔ ''تم نے خواب میں کیا یکھا احمد؟ بزرگ کچھ کہہ رہے تھے؟ میرے لئے ان کا کوئی پیغام ہے؟'' حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا ذکر سن کر مغل ہنشاہ پر اضطراب سا طاری ہو گیا تھا۔

''بہت کچھ فرما رہے تھے۔'' احمد جمال انتہائی شکستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''آپ ہی کے لئے تو وہ میرے واب میں تشریف لائے تھے۔''

''کیا کہا بزرگ نے؟'' بابر کی بیقراری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' احمد جمال کی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں اور الفاظ اس ی زبان سے بمشکل ادا ہو رہے تھے۔ ''شیخ نے فرمایا...... میرے سلام کے بعد شہنشاہ سے کہہ دینا کہ فقیر انتظار رتے کرتے تھک گیا تھا' اس لئے یہاں سے جا رہا ہے۔ کیا اہل وفا کے یہ انداز ہوتے ہیں کہ کسی غریب سے نے کا وعدہ کیا اور پھر جاہ طلبی کے ہنگاموں میں اسے فراموش کر دیا۔''

احمد جمال کا خواب سن کر شہنشاہ ظہیر الدین بابر سناٹے میں آ گیا۔ ''شیخ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے؟'' مغل رمانروا کے لہجے سے شدید تاسف کا اظہار ہو رہا تھا۔

''آپ کے سوا شیخ نے کبھی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہی۔'' احمد جمال کی آواز میں دل کا درد شامل

تھا۔ "پھر جب آپ نے بھی ان کی نہیں سنی تو وہ اور کیا کرتے؟ مایوس ہو کر چلے گئے۔"

"تم خوب جانتے ہو احمد کہ میں وعدہ فراموش نہیں ہوں۔" اب مغل شہنشاہ کے چہرے پر بھی اداسی کا سایہ پھیل گیا تھا اور اس کی آواز سے بھی افسردگی جھلکنے لگی تھی۔

"میں جانتا ہوں شہنشاہ! مگر جانے والے کو کون روک سکتا تھا؟" احمد جمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہ "پھر بھی میرے خیال میں ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ منزل نے خود آواز دے کر آپ کو بلایا ہے۔"

بابر نم آلود آنکھوں سے احمد جمال کی طرف دیکھنے لگا۔

"اگر دیر ہو جاتی تو شیخ میرے خواب میں تشریف نہ لاتے۔" یکا یک احمد جمال کے لہجے میں شد پیدا ہو گئی تھی۔ "آپ نے حضرت موسیٰ عاشقانؒ کے الفاظ پر غور نہیں کیا' شیخ کی شکایت میں بھی اسی محبت کی تڑ ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے ہمارے قیام اجودھیا کے دوران کیا تھا۔ وہ آپ کو بھولا ہوا وعدہ اس لئے یاد رہے ہیں کہ آپ بے دریغ آگے بڑھیں اور اجودھیا پہنچ کر اللہ کے گھر کی تعمیر کریں۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے شہنشہ مگر آپ اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ شیخ نے آپ کو مخاطب کر کے یہی تو فرمایا تھا کہ جب تمہار مرادیں بر آئیں تو اس ویران ٹیلے پر ایک شاندار مسجد تعمیر کرا دینا۔ آپ نے اس رمز پر غور نہیں کیا کہ اجودھ میں خانہ خدا کی تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب آپ پورے ہندوستان کو اپنے قدموں تلے روند ڈالیں۔" احمد جما اپنے خواب کی تعبیر بیان کر رہا تھا۔ "آپ بہت خوش نصیب انسان ہیں شہنشاہ کہ دو بزرگوں نے آپ کی فتح کا بشارت دی ہیں۔ پہلے سید مہدیؒ نے فرمایا کہ جب آپ پر فرغانہ کی سرزمین تنگ ہو جائے تو اجودھیا پہنچ کر حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی خدمت میں حاضر ہو جانا...... پھر جب آپ اجودھیا پہنچے تو حضرت موسیٰ عاشقانؒ نے فرمایا کہ اس ویرانے میں ایک مسجد تعمیر کرا دینا۔ یہ دونوں واقعات بے ربط اور بے سبب نہیں ہیں۔ بشرطیکہ ہم انہیں سمجھنے کی کوشش کریں۔

⌑ ⌑ ⌑

فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ بابر نے دوسرے مغل سرداروں کے ساتھ احمد جمال کی امامت میں نماز ادا کی۔ احمد جمال مذہبی عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش الحان قاری بھی تھا۔ اس نے اس انداز سے قرأت کی کہ شرکائے نماز پر وجد سا طاری ہو گیا۔ پھر اس نے حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی مغفرت اور بابر کی کامیابی کے لئے طویل دعا مانگی۔

مغل شہنشاہ اب بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ سورج طلوع ہوتے ہی اس نے آگے بڑھ کر افغانی امراء کے لشکروں پر حملہ کر دیا۔ پنجاب کے حاکم اپنی کثرت افواج کے باعث اتنے مطمئن تھے کہ وہ مغلوں کے حملے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بابر افغانیوں کا لشکر جرار دیکھ کر ناکام و نامراد چلا جائے گا...... مگر جب مغل شہنشاہ نے جنگ چھیڑنے میں پہل کی تو سلطان ابراہیم لودھی کے نمک خوار امراء بابر کی جرأت پر حیران رہ گئے۔ پھر انہوں نے امیر تیمور کے وارث کی اس حرکت کو خودکشی کے مترادف سمجھا اور اپنے اپنے لشکروں کو حکم دیا کہ وہ بابر کی مختصر سی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔

بابر دشمنوں کی اس جنگی چال سے باخبر تھا۔ اس نے اپنے لشکر کی صف بندی اس طرح کی تھی کہ حریفوں کے نرغے میں آنے سے محفوظ رہ سکے۔ مغل شہنشاہ کے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے کھلے میدان میں مختلف

ہاں پر جنگ کر رہے تھے۔

نیاز خان' مبارک خان لودھی اور بھکن خان لوحانی کے سپاہی بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے' مگر انکے تہ جنگ میں ہوش سے زیادہ جوش کارفرما تھا۔ بابر نے اپنے حریفوں کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ پ کی زمین انسانی خون سے سرخ ہو گئی اور فضا زخمیوں کی آہ و زاری سے گونجنے لگی۔ یہ ایک طویل اور خونریز بھی' مگر قسمت نے بابر کا ساتھ دیا اور سلطان ابراہیم لودھی کے نمک خوار امراء میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔

بابر بڑی شان کے ساتھ لاہور میں داخل ہوا اور اس نے چنگیز خان کی رسم کے مطابق نیک شگون کے لئے ں آگ جلائی۔

لاہور پر مغلوں کے قابض ہوتے ہی دولت خان لودھی بھی بابر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اس نے لہجے میں مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

"شہنشاہ کو یہ بے مثال فتح مبارک ہو۔ اب پورا ہندوستان آپ کی جاگیر ہے اور میں آپ کا ایک ادنیٰ نمک خوار۔"

بابر دولت خان لودھی کی اطاعت گزاری کے اس انداز سے بہت خوش ہوا اور اس نے کسی تامل کے بغیر فغان سردار کو سلطان پور اور جالندھر کے پرگنوں کا صوبیدار بنا دیا۔ دولت خان لودھی کے ہمراہ اس کے دو بیٹے ازی خان اور دلاور خان بھی تھے۔

ایک دن دولت خان لودھی نے بابر سے کہا...... "مجھے اطلاع ملی ہے کہ افغانوں کی ایک کثیر جماعت تمہارہ ی جانب سے اسماعیل جلوانی کی قیادت میں لاہور پر حملہ کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ اس حقیر کی رائے میں اگر اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ سرکشوں اور باغیوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے آگے روانہ کر دیا جائے تو زیادہ بہتر گا۔"

بابر دولت خان لودھی کے اس مشورے پر عمل کرنے ہی والا تھا کہ افغان سردار کا چھوٹا بیٹا دلاور خان رسے تنہائی میں ملا اور اس نے مغل شہنشاہ سے صاف صاف کہہ دیا۔

"میرے باپ کے کسی مشورے پر عمل نہ کرنا کہ وہ ایک انتہائی خودغرض' منافق اور دغاباز انسان ہے۔"

بابر نے چونک کر دلاور خان کی طرف دیکھا۔

"شہنشاہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ سلطان ابراہیم لودھی کا جاسوس ہے اور کسی نہ کسی بہانے آپ کی ن لینا چاہتا ہے۔"

⌑ ⌑ ⌑

مغل شہنشاہ دلاور خان کی زبانی یہ انکشاف سن کر حیران رہ گیا۔ ''کیا تمہارا باپ سلطان ابراہیم لودھ جا ؑوں ہے؟'' بابر کو دلاور خان کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''عالی جاہ! میں نے جو کچھ کہا وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔'' دلاور خان کا لہجہ بہت زیادہ پر جوش تھا۔ ''اگر بیان کردہ واقعہ تحقیق اور سچائی کی کسوٹی پر پورا نہ اترے تو اس زبان کو کسی دشمن کے سر کی طرح قطع کر دیا جائے لہجے کی یہ شدت دیکھ کر بابر کو محسوس ہوا کہ افغان نوجوان کے دعوے میں بظاہر کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ بھی اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد دلاور خان سے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب آسان نہیں تھا۔ ''اگر تم باپ دولت خان' سلطان ابراہیم لودھی کا جاسوس ہے تو پھر اس کے رشتے سے تم کون ہو؟'' مغل شہنشاہ کا خیال کہ دلاور خان یہ سوال سن کر گھبرا جائے گا' مگر دولت خان لودھی کا فرزند اسی شان بے نیازی کے ساتھ کھڑا ار اس کے چہرے پر خوف یا پریشانی کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

''شہنشاہ نے بجا فرمایا کہ رشتے کے لحاظ سے میں دولت خان لودھی کا سب سے قریبی حوالہ ہوں۔'' دلا خان پوری استقامت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ ''بے شک! سردار دولت خان لودھی ہی کا خون مم رگوں میں دوڑ رہا ہے' مگر میں اپنے باپ کی طرح منافق اور خودغرض نہیں ہوں۔''

''لیکن تمہارے اس دعوے کو کس طرح تسلیم کرلوں جبکہ تم بھی اپنے باپ کے شرمناک منصوبے کی تکمیا کے لئے اس کے ہمراہ میری حدودِ سلطنت میں داخل ہوئے تھے۔''

''ہاں! میں اپنے باپ کا ہم رکاب بھی تھا اور ہمنوا بھی۔'' دلاور خان لودھی کے لہجے میں وہی استقام تھی۔ ''مجھ سے بارہا یہی ایک بات کہی گئی تھی کہ بابر ایک متعصب' تنگ نظر اور جابر و سفاک حکمران ہے' جس زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ افغانوں کے ہاتھ سے ہندوستان کی حکومت چھین کر انہیں تباہ و برباد کر جائے۔ میرے باپ دولت خان لودھی نے میرے سامنے مغل شہنشاہ کی شخصیت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا تھا وہ چنگیز و ہلاکو اور امیر تیمور کا درندہ صفت وارث ہے اور اس کی مسلسل فتوحات سے افغانوں کے وجود کو شدید خط لاحق ہے۔''

''پھر تم نے مجھے کیسا پایا؟'' اچانک شہنشاہ بابر نے دلاور خان لودھی سے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح شہنشاہ کے حلقہ اعتبار میں شامل ہو جاؤں اور پھ ایک دن اندھیرے میں آپ کو قتل کر ڈالوں۔'' دلاور خان لودھی نے بابر کے سوال کو نظر انداز کر دیا تھا اور وہ پور تفصیل کے ساتھ حلقہ بابری میں شامل ہونے کا مقصد بیان کر رہا تھا۔

''پھر تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟'' شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے کسی قدر تند و تیز لہجے میں پوچھا۔ ''اگر چہ ہت دنوں سے میرے قریب ہو۔ پھر تم نے میرے خون سے اپنے باپ کے دھندلے خاکے میں رنگ کیوں بھرا؟''

''آپ کو قتل کیا کرتا' یہاں پہنچ کر خود ہی ہلاک ہو گیا۔'' دلاور خان لودھی کا لہجہ بہت پر سوز تھا۔

بابر چونک کر دولت خان لودھی کے چھوٹے لڑکے کی طرف دیکھنے لگا' جو عمر میں اس سے بہت چھوٹا تھا۔ ے کس نے قتل کیا؟''

''آپ کی بلند کرداری کی شمشیر آبدار نے اور آپ کی اعلیٰ ظرفی کے تیز نشتر نے۔'' یہ کہتے کہتے دلاور خان ا بہت جذباتی ہو گیا تھا اور اس کے لہجے سے ہلکی ہلکی رقت جھلکنے لگی تھی۔ ''میں نے کبھی دل کی گہرائیوں سے ، باپ کو پسند نہیں کیا۔ دولت خان لودھی کسی کا وفادار نہیں ہے' کبھی وہ سلطان ابراہیم لودھی کو قتل کر کے ستان کا اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کام میں آپ سے بھی تعاون کی درخواست کرتا ہے۔ مگر جب وہ شہنشاہ کی حدود مملکت میں پہنچتا ہے تو اپنے بیٹوں سے کہتا ہے کہ فریب و دھوکے سے بابر کا کام تمام کر دیا ے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایک صحیح الدماغ انسان ہیں یا ان کے ذہن میں کوئی خلل واقع ہو چکا ہے؟ یا پھر ان نافقت اور ریاکاری کی کوئی حد نہیں ہے۔ بے شک! مجھے اپنے باپ کو سمجھنے میں بہت دیر ہوئی ہے لیکن ال میں انہیں سمجھ چکا ہوں اور اب کسی صورت میں بھی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔''

''کیوں؟'' بابر نے انتہائی تعجب کے ساتھ پوچھا۔

''شاید شہنشاہ ایک افغان سردار کے جذبات کو حیرت کی نظر سے دیکھیں اور پھر یہی حیرت انہیں بے یقینی کی ت میں مبتلا کر دے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ میں سلطان ابراہیم لودھی سے بھی بیزار ہوں اور اپنے باپ دولت لودھی سے بھی۔ یہ سب کے سب اپنے نفس کی پرستش کر رہے ہیں' انہیں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا خیال ور نہ بندگان خدا کے حقوق کا۔ اگر یہ لوگ کچھ دن اور برسر اقتدار رہے تو اللہ کی زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے . میں اس عقیدے کا انسان نہیں ہوں کہ صرف میری قوم ہی ہندوستان پر حکومت کرے۔ میرے نزدیک ت کا حق اس شخص کو حاصل ہے جو عدالتوں میں انصاف قائم کرے اور اپنی مملکت کے گلی کوچوں کو عزت نفس لون و اطمینان کی دولت سے بھر دے۔ میں برسوں سے اسی شخص کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ آئے اور غربت و بروئی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی رعایا کو آزادی کی نعمت بخشے۔'' دلاور خان لودھی کے لہجے میں دل کا درد تھا۔

''کیا وہ شخص ابھی تک نہیں آیا؟'' شہنشاہ بابر نے دلاور خان لودھی سے ایک اور سوال کیا۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ وہ بلند حوصلہ اور اعلیٰ ظرف انسان میری زندگی ہی میں آ گیا اور اس کے ساتھ ھے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ میں اس وقت اس کی بارگاہ جلال میں موجود ہوں۔'' دلاور خان لودھی نے ت مندانہ نظروں سے بابر کی طرف دیکھا۔

''تیرے چہرے پر سچ کی روشنی تو نظر آتی ہے دلاور خان مگر تیری باتوں پر کس طرح اعتبار کر لیا جائے؟'' ہ ظہیرالدین بابر ایک عجیب سے تذبذب کا شکار تھا۔ ''سیاست اور دل کے قوانین بہت مختلف ہوتے ہیں . خان! دل تو کہتا ہے کہ تو اپنا بچھڑا ہوا ہمسفر تھا جو بالآخر کاروان درد سے آ ملا ہے۔ مگر سیاست تیرے

نظریات اور عقائد کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔"

"شہنشاہ با اختیار ہیں کہ وہ مجھے اپنا شریک سفر سمجھیں یا دشمن کا نقاب پوش کارندہ...... لیکن عالی مرتبت کو اتنا لحاظ ضرور رہنا چاہئے کہ اگر میرے جذبے صادق نہ ہوتے تو میں اپنے باپ اور بھائی کو اس شخص پر کیوں قربان کر دیتا جس سے بظاہر میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

دلاور خان لودھی کی دلیل سن کر بابر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

پھر مغل شہنشاہ نے اس واقعہ کی تحقیق و تفتیش کی تو دلاور خان کی بات درست نکلی۔ دولت خان لودھی یہی چاہتا تھا کہ جب مغل فوج اپنے بادشاہ سے دور ہو جائے تو بابر کو بے دست و پا کر کے اس پر حملہ کر دیا جائے۔ اس خوفناک منصوبے کا انکشاف ہوتے ہی بابر نے دولت خان لودھی اور اس کے بڑے بیٹے غازی خان کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا اور خود دریائے ستلج کو پار کر کے نوشہرہ پہنچا اور پھر وہیں ٹھہر گیا۔

کچھ دن بعد دولت خان لودھی اور غازی خان نے شہنشاہ کی خدمت میں رحم کی درخواست پیش کی اور اپنے جرم کی معافی چاہی۔ بابر نے اپنی روایتی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کا گناہ معاف کر دیا اور ساتھ ہی دولت خان لودھی کو سلطان پور کی جاگیر بھی بخش دی۔ سلطان پور کو دولت خان نے ہی آباد کیا تھا اور یہی اس کی جائے رہائش تھی۔

بابر، دلاور خان لودھی کے نظریات سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ اس نے دلاور خان کو "خان خاناں" کا خطاب دیا اور دولت خان لودھی اور غازی خان کی تمام جاگیریں انعام کے طور پر بخش دیں۔ دولت خان اور غازی خان نے یہ اعلان سنا تو پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ وہ دونوں وقت کی رفتار کو بدلنے سے قاصر تھے، اس لئے باپ بیٹے نے منافقانہ خاموشی اختیار کر لی۔

دولت خان لودھی اور غازی خان کی فتنہ انگیزیوں کے باعث بابر سرہند سے آگے نہ بڑھ سکا اور مجبوراً لاہور واپس لوٹ آیا۔ یہاں پہنچ کر مغل شہنشاہ نے عبدالعزیز امیر آخور کو لاہور کا داروغہ مقرر کیا۔ سیالکوٹ کی حکومت خسرو کوکلتاش کے سپرد کی اور بابا قشقہ مغل اور سلطان علاؤ الدین لودھی کو دیپال پور کا حاکم بنا دیا۔ سلطان علاؤالدین لودھی، سلطان سکندر لودھی کا چھوٹا بھائی اور سلطان ابراہیم لودھی کا حقیقی چچا تھا اور اپنے بھتیجے کے مقابلے میں حکومت ہند کا دعویدار تھا۔ سلطان علاؤالدین لودھی حال ہی میں دربدر پھرتا ہوا بابر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مغل شہنشاہ نے اس کی دلجوئی کے لئے دیپال پور کی حکومت بابا قشقہ مغل کے اشتراک کے ساتھ اس کے حوالے کر دی تھی۔ ان انتظامی امور سے فارغ ہو کر مغل شہنشاہ نے محمد علی خنگ کو کلانور کا حاکم مقرر کیا اور خود کابل کی طرف لوٹ گیا۔

⌑ ⌑ ⌑

دولت خان لودھی اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے شہنشاہ بابر کی عدم موجودگی سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پھر دونوں باپ بیٹوں نے مل کر مختلف حیلوں بہانوں سے دلاور خان کو گرفتار کر لیا۔ اس صورتحال پر قابو پاتے ہی دولت خان لودھی اور اس کا بیٹا غازی خان دیپال پور کے محاذ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ مغل شہنشاہ کی کابل واپسی کو اپنے حق میں تائید غیبی خیال کر رہے تھے، اسی وجہ سے دولت خان اور غازی خان بابر کے نامزد امراء کو

ں کے تمام علاقوں سے بے دخل کر دینا چاہتے تھے۔ اپنی اس ہوس اقتدار سے مغلوب ہو کر وہ دونوں سلطان اؤالدین لودھی اور بابا قشقہ مغل سے مقابلہ کرنے کے لئے فیروز پور کے میدان میں جمع ہوئے۔ بابر کے امراء نے دولت خان لودھی کے لشکر سے شکست فاش کھائی۔ سلطان علاؤالدین لودھی فرار ہو کر مغل شہنشاہ کے پاس ابل پہنچ گیا اور بابا قشقہ مغل نے بھاگ کر لاہور میں پناہ حاصل کی۔ دیپال پور کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بد دولت خان کی ہوس ملک گیری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ نتیجتاً وہ پانچ ہزار افغان سپاہیوں کے ساتھ سیالکوٹ ی طرف بڑھا، مگر اس سے پہلے کہ دولت خان کو اس کے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوتی، عبدالعزیز امیر خور اور لاہور کے دوسرے امراء کو اس کی اطلاع مل گئی اور یہ سب کے سب خسرو کوکلتاش کی مدد کرنے کے لئے بہت تیز رفتاری کے ساتھ لاہور پہنچے۔ دولت خان لودھی اپنے بیٹے دلاور خان کو گرفتار کرنے اور پھر دیپال ر کے محاذ پر نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بہت مغرور ہو گیا تھا۔ یہ اسی فتح کا نشہ تھا کہ دولت خان نے بری امراء کے اجتماع کو کوئی اہمیت نہیں دی اور آگے بڑھ کر اپنے دشمنوں کے مقابل صف آراء ہو گیا۔ پھر ولت خان لودھی کا خمار اس وقت ٹوٹا جب بابری امراء نے پہلے ہی حملے میں افغانوں کی صفیں الٹ یں۔ دولت خان لودھی مرد میدان نہیں تھا۔ اس لئے ناسازگار ہوا کے چند تھپیڑے کھاتے ہی میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اسی دوران سلطان ابراہیم لودھی کی فوج جو دولت خان اور غازی خان کی سرکوبی کے لئے مقرر کی گئی تھی، آ پہنچی اور اس نے سندھ کے قریب ہی اپنے خیمے نصب کئے۔ دولت خان جو مغل امراء سے شکست کھا کر آ رہا تھا، نتائج کی پروا کئے بغیر سلطان ابراہیم لودھی کی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے اس معرکہ آرائی سے پہلے ایک عجیب حکمت عملی اختیار کی اور ابراہیم لودھی کے لشکر کے پیچھے خیمہ زن ہوا۔ پھر دولت خان لودھی نے راتوں رات سلطان ابراہیم کے سپہ سالار سے ساز باز کر کے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ دولت خان لودھی نے بڑی گہری شاطرانہ چال چلی تھی۔ اگر اس کی یہ چال کامیاب ہو جاتی تو سلطان ابراہیم لودھی کے لشکروں کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑتا...... مگر یہ دولت خان کی بدنصیبی تھی کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے سلطان ابراہیم لودھی کے دوسرے امراء کو اس سازش کا پتہ چل گیا اور پوری فوج نصف شب کے قریب دہلی کی طرف کوچ کر گئی۔ دولت خان لودھی اس غیر متوقع صورتحال کے لئے تیار نہیں تھا۔ سورج نکلتے ہی جب اس نے دن کے اجالے میں میدان کی طرف دیکھا تو وہاں نہ کوئی فوجی خیمہ تھا اور نہ کوئی سپاہی۔ بس سلطان ابراہیم لودھی کے غدار سپہ سالار کا ایک خیمہ تھا جس کے دروازے پر وہ تنہا حیران و پریشان کھڑا تھا۔ جب دولت خان لودھی نے یہ صورتحال دیکھی تو اپنے ایک فوجی دستے کے ہمراہ گھوڑا دوڑاتا ہوا خیمے کے پاس پہنچا۔

"یہ سب کچھ کیا ہے؟" دولت خاں سلطان ابراہیم لودھی کے سپہ سالار کا گریبان پکڑے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں! خدا کی قسم! میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" سلطان ابراہیم لودھی کے غدار سپہ سالار کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ناقابل بیان دہشت برس رہی تھی۔

"تو نہیں جانتا تو وہ لوگ کیسے جان گئے؟" دولت خان لودھی نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سپہ سالار کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔

''تیری اس غیر ذمہ دارانہ حرکت نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔'' دولت خان لودھی کے ہونٹوں سے نفرت و غضب کی پگھلی ہوئی آگ ٹپک رہی تھی۔ ''اس وقت تک یہ میدان میرے دشمنوں کی لاشوں سے پٹ چکا ہوتا۔ مگر میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہاں کوئی مردہ جسم تو کجا زمین کے سینے پر انسانی خون کا کوئی ہلکا سا داغ بھی نہیں ہے۔ تیری حماقت کے سبب وہ لوگ اپنا سب کچھ بچا کر لے گئے۔ کاش! کچھ دیر پہلے مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی کہ تو راز دار بننے کے قابل نہیں ہے۔'' دولت خان لودھی بڑے وحشیانہ انداز میں کف افسوس مل رہا تھا۔

دہلی کے سپہ سالار نے اپنی بے نگاہی کے سلسلے میں کئی دلائل پیش کئے اور کئی قسمیں کھائیں' مگر دولت خان لودھی ہر بار یہی کہتا رہا۔ ''مجھے تیری کسی بات کا اعتبار نہیں ہے۔''

پھر دولت خان لودھی نے بڑی بے رحمی کے ساتھ دہلی کے سپہ سالار کو قتل کرا دیا۔

¤ ¤ ¤

اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی سلطان علاؤالدین لودھی جو کئی ماہ سے کابل میں پناہ گزین تھا' بابر کا ایک حکم نامہ لے کر لاہور آیا۔ بابر نے اس حکم نامے میں مغل امراء کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شاہی فوج سلطان علاؤالدین لودھی کی قیادت میں دہلی کی طرف بڑھے اور پھر ابراہیم لودھی سے مقابلہ کر کے تخت سلطنت پر قابض ہو جائے۔

دولت خان لودھی اور غازی خان نے بھی اڑتے اڑتے یہ خبر سن لی اور وہ دونوں عیار باپ بیٹے فوراً اس بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ انہیں سیاست کی نئی ہواؤں کے رخ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ دوسرے زمانہ ساز لوگوں کی طرح دولت خان لودھی نے اس نئے موسم سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اپنے ایک معتبر قاصد کو ایک درخواست دے کر شہنشاہ بابر کی خدمت میں کابل روانہ کیا۔ دولت خان لودھی نے اپنی درخواست میں تحریر کیا تھا کہ علاؤالدین لودھی ہمارا شہزادہ ہے اور ہماری اجتماعی کوششوں کا یہی مقصد ہے کہ یہ تخت دہلی پر حکمرانی کرے۔ اس لئے ہم سب کے سب شہنشاہ سے درخواست گزار ہیں کہ شہزادہ علاؤالدین کو ہماری نگرانی میں دے دیا جائے۔ اگر حضور والا نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ سرہند تک کے تمام شہروں سے شہنشاہ کے حق میں خوشی خوشی دست بردار ہو جائیں گے۔

بابر دولت خان لودھی اور غازی خان کی عہد شکنی اور منافقت سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے مغل شہنشاہ نے افغان سرداروں کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی اور دولت خان لودھی کے قاصد سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے اس شخص کے قول وقسم کا خوب تجربہ ہے اور میں آئندہ اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کروں گا۔

دولت خان لودھی کا قاصد ناکام و نامراد واپس لوٹا اور اس نے تمام صورتحال اپنے سردار کے سامنے بیان کر دی۔

شہنشاہ بابر کا جواب سن کر کچھ دیر کے لئے دولت خان لودھی کا چہرہ مسخ ہو گیا' پھر وہ عیار زمانہ شخص سنبھلا اور اس نے اپنے ہاتھ سے ایک عہد نامہ تحریر کیا۔ اس عہد نامے میں عجیب عجیب قسمیں کھائی گئی تھیں اور عجیب عجیب عہد و پیماں کئے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دولت خان نے اسی انداز کی دوسری درخواست تیار کی جو کچھ

پہلے کابل بھیجی جا چکی تھی اور جس کا جواب ناکامی کی صورت میں موصول ہوا تھا۔ اس درخواست نما دستاویز پر ...ر کے تمام امراء اور قاضیوں نے دستخط کئے' جن کے ذریعے مغل شہنشاہ کو یقین دلایا گیا تھا کہ درخواست میں جو لکھا گیا ہے وہ حرف بہ حرف درست ہے اور ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے عہد کا پابند ہے۔

بابر نے دولت خان لودھی کی دوسری درخواست پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا' مگر پھر بھی احتیاط کے پیش ...ر یہ معاملہ لاہور کے امراء کے حوالے کر دیا کہ وہ لوگ موجودہ حالات کے تحت جو مناسب سمجھیں اسی کے ...ابق عمل کریں۔

لاہور کے امراء کو دولت خان لودھی اور دوسرے اکابرین شہر کے قول وقسم پر اعتبار آ گیا۔ نتیجتاً انہوں نے ...ؤالدین لودھی کو غازی خان کے پاس بھیج دیا۔ غازی خان نے اس بات کو اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھا' مگر ...بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ اس نے فوری طور پر اپنے بھائیوں کو چند افغانی امراء کی سرکردگی میں دہلی ...انہ کر دیا اور خود دور اندیشی سے کام لے کر پنجاب ہی میں ٹھہرا رہا۔

کچھ دن تک علاؤالدین لودھی اپنی صفیں درست کرتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر ابراہیم لودھی کی فوجوں سے ٹکرا ...یا۔ اگرچہ جنگی تیاریاں بہت زور وشور کے ساتھ کی گئی تھیں' مگر یہ جنگ یکطرفہ ثابت ہوئی۔ علاؤالدین نے ...پنے بھتیجے سلطان ابراہیم لودھی کے مقابلے میں بری طرح شکست کھائی اور پنجاب میں واپس لوٹ آیا۔

غازی خان جیسے عہد شکن اور منافق انسان کو سلطان علاؤالدین لودھی کی اسی شکست کا انتظار تھا' پھر جیسے ہی ...ری امراء منتشر ہوئے' غازی خان نے اپنے سارے قول وقسم بھلا دیئے اور آگے بڑھ کر کلانور پر حملہ کر دیا۔ (کلانور ضلع گورداس پور کے علاقے میں ایک مشہور مقام ہے) محمد علی خنگ میں اس کے حملے کو روکنے کی طاقت ...یں تھی۔ مجبوراً وہ بھاگ کر لاہور چلا گیا۔ غازی خان کی پیش قدمی مسلسل جاری رہی۔ یہاں تک کہ اس نے ...انور پر قبضہ کر لیا اور کچھ دن ٹھہرنے کے بعد ضلع سیالکوٹ کے نواحی علاقے پسرور میں خیمہ زن ہو گیا۔

¤ ¤ ¤

جب مغل امراء شکست خوردہ حالت میں ادھر ادھر منہ چھپاتے پھر رہے تھے' عین اسی زمانے میں شہنشاہ ...ہیرالدین بابر کابل میں موسم بہار کا لطف لے رہا تھا اور دارالسلطنت میں ہر طرف کیف ونشاط کے ہنگامے برپا ...تھے۔

اس روز بھی ایک ایسی ہی محفل رقص وسرود آراستہ تھی۔ مغل شہنشاہ اپنے امرائے خاص کے ساتھ ساغرد ...راحی سے دل بہلا رہا تھا اور محفل کی رونق و دلکشی بڑھانے کے لئے ایک نوخیز ایرانی رقاصہ ہوشربا رقص پیش کر ...رہی تھی۔ پھر جب یہ مجلس کیف ونشاط اپنے عروج کو پہنچی تو اچانک ایک شاہی جاسوس اندر داخل ہوا اور اس نے ...پنجوں کے بل جھک کر بابر کے کان میں سرگوشی کی۔ شاہی جاسوس کی گفتگو بہت مختصر تھی' جیسے ہی اس کی زبان ...سے آخری لفظ ادا ہوا' مغل شہنشاہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

رقاصہ کی پازیب کی جھنکار کسی مرنے والے انسان کی نبض کی طرح رک گئی تھی' سازندوں کے متحرک ہاتھ ...ف کی مانند جم گئے تھے اور شرکائے مجلس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں' جیسے وہ زندہ دل انسان نہ ہوں' پتھر ...کے بے جان مجسمے ہوں۔ ہر شخص کی نظریں مغل شہنشاہ کے چہرے پر مرکوز تھیں' بابر کا سرخ رنگ آہستہ آہستہ گہرا

ہوتا جا رہا تھا۔ پھر یکا یک اس کی مخمور آنکھوں سے کیف و مستی کے بجائے غصہ جھلکنے لگا۔

"جب سینے پر زخم کھانے کا حوصلہ نہ تھا تو پھر دشمن کے مقابل صف آرا ہی کیوں ہوا۔" شہنشاہ بابر غائبانہ طور پر شکست خوردہ علاؤالدین لودھی کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ "شوق کشور کشائی تھا تو دہلی پہنچ کر دم لیا ہوتا... اور اگر یہ ممکن نہیں تھا تو اپنے خون اور گوشت و پوست کو میدان جنگ کی مٹی میں ملا دیا ہوتا...... زندہ رہنے کا کون سا انداز ہے جو خود بھی ذلیل ہو اور میرے جانباز سپاہیوں کو بھی رسوائی کے غبار میں گم کر دیا؟" بابر کے ۔ میں شدید غصہ بھی شامل تھا اور انتہائی کرب بھی۔

مجلس کیف و نشاط میں شریک ہونے والے امرائے خاص تصویر حیرت بنے ہوئے اپنے بادشاہ کا منہ تک رہے تھے۔ انہیں اندازے سے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ شاہی جاسوس نے سر محفل کسی شکست کی خبر دی ہے' مگر شکست کس نے کھائی ہے اور جنگ کس محاذ پر ہوئی تھی' اس کی انہیں خبر نہیں تھی۔

ان امراء میں سے بعض مصاحب ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ بادشاہ سے اس کی تبدیلی' مزاج کا سبب دریافت کریں کہ اچانک بابر مجلس رقص و سرود کے منتظمین سے مخاطب ہوا۔ "کیف و نشاط کی یہ خوش رنگ ا لذت انگیز بساط لپیٹ دو کہ اب اس کا موسم گزر گیا۔ نقیب وقت بار بار آواز دے رہا ہے کہ فضا بدل چکی۔ اب پازیب کی آواز کو شمشیروں کی جھنکار میں بدلنا ہوگا۔"

پھر جب مجلس کیف و نشاط درہم برہم ہوگئی تو شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے اپنے امرائے خاص کو بتایا' علاؤالدین لودھی سلطان ابراہیم لودھی کے مقابلے میں شکست کھا چکا ہے اور دولت خان لودھی اور غازی خان ۔ اپنے عہد نامے کو اپنے ہی ہاتھ سے چاک کر کے اس کی دھجیاں ہوا میں اڑا دی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دوسر۔ افغانی امراء بھی سرکشی پر اتر آئے ہیں۔

اس کے بعد کوئی مجلس کیف و نشاط منعقد نہیں کی گئی۔ بابر شب و روز فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔ پھر مغل شہنشاہ جمعہ کے دن یکم صفر 930ھ کو کابل سے روانہ ہو کر قریہ یعقوب پہنچا۔ بابر کی آمد کی خبر سنتے ہی خواجہ حسین دیوان جو لاہور کا خزانچی تھا' بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دن بعد شہزادہ ہمایوں بھی باپ کی مدد کے ۔ ایک بڑا لشکر لے کر بدخشاں سے یہاں پہنچ گیا۔ خواجہ کلال بیگ جو بابر کے مقربین خاص میں سے تھا' غزنی ۔ آ کر بادشاہ سے ملا۔ ان سب لوگوں کے جمع ہو جانے کے بعد شہنشاہ بابر نے ایک بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ اس موقع پر مغل حکمران نے ہر مستحق شخص کو انعام و اکرام سے نوازا اور خطابات سے سرفراز کیا۔ پھر کچھ دن بعد قریہ یعقوب سے روانہ ہوا اور شکار کھیلتا ہوا لاہور پہنچا۔

پہلی ربیع الاول 930ھ کو بابر نے دریائے سندھ عبور کیا۔ اس مرحلے پر جب بابر کے سپاہیوں کی تعداد شمار کیا گیا تو وہ دس ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔ مغل شہنشاہ بہت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر جب ا سیالکوٹ کے قریب پہنچا تو غازی خاں جس نے کچھ دن پہلے کلانور پر قبضہ کر لیا تھا اور اس وقت پسرور میں خیمہ زن تھا' بابر کی آمد کی خبر سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر ملوٹ پہنچا (ملوٹ نام کا مشہور قلعہ ضلع ہوشیار پور میں تھا' جس کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں) غازی خان اپنی بدعہدی کے سبب شہنشاہ بابر سے بہت زیادہ خائف تھا۔ اس لئے ملوٹ میں بھی زیادہ دن تک قیام نہ کر سکا۔ اس نے بیوی بچوں کو اسی مقام پر چھوڑا اور خود فرار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ پھر سلطان ابراہیم لودھی کی خدمت میں حاضر ہو کر گریہ و زاری کرنے لگا۔

"میں سلطان عالی مقام کے رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہوں۔"

"کیا ہوا غازی خان؟" سلطان ابراہیم لودھی نے بڑی نخوت کے ساتھ پوچھا۔

"غلام میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ بابر کی پیش قدمی کو روک سکتا۔" غازی خان بڑے گداگرانہ لہجے میں ں رہا تھا تا کہ سلطان اس کی سابقہ فریب کاریوں کے سلسلے میں کسی قسم کی بازپرس نہ کر سکے۔ "سلطان ذیشان ری کیجئے کہ اس بار مغلوں کے تیور بہت خطرناک ہیں۔"

"کیا مغل اور کیا ان کے تیور؟" سلطان ابراہیم لودھی نے اپنی کرسی زرنگار کے دونوں بازوؤں پر زور سے ہ مارتے ہوئے کہا۔ "جب بابر خود ہی بچنا نہیں چاہتا تو پھر اسے کون ہمارے قہر و غضب سے بچا سکتا ہے؟" طان ابراہیم لودھی کے غرور کا وہی عالم تھا' جیسے وہ کوئی بندہ نہ ہو' اس پوری کائنات کا آقا ہو اور نظام روز و شب ں کی مرضی سے چل رہا ہو۔ "اسے آنے دو کہ ہم نے بہت دن سے انسانوں کا شکار نہیں کھیلا ہے اور ہماری شیر خوں آشام کی پیاس روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جس طرح ما بدولت تم جیسے بھوکے اور ننگے انسانوں کو ق و لباس فراہم کرتے ہیں اسی طرح تمام شاہی ہتھیاروں کی کفالت بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ اگر ہم تیر و نگ' شمشیر و سناں' نیزوں اور برچھیوں کو انسانی خون نہیں پلائیں گے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی...... اور ہم اپنی ایا کے ایک ایک فرد کے ساتھ انصاف کرنا خوب جانتے ہیں۔"

غازی خان اپنے ماضی کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سراپا انکسار بن کر سلطان لودھی کے قدموں میں ہ گیا۔

"کھڑا ہو غازی خان!" سلطان ابراہیم نے اپنے خوشامدی سردار کو پاؤں کی ٹھوکر سے حکم دیتے ہوئے ہا......

"یہ بزدلوں کی طرح بیٹھنے کا وقت نہیں ہے...... واپس جا اور بابر کا سر کاٹ کر ہماری خدمت میں پیش ر دے...... اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مغلوں کی پیش قدمی کو سیالکوٹ تک محدود کر دے اور ہمارے حکم کا انتظار کر۔"

غازی خان ایک زمانہ ساز اور عہد شکن سردار تھا۔ اس کی ذات کی ان ہی خرابیوں نے اسے بزدل بنا دیا ا...... اور یہی بزدلی اسے شہنشاہ بابر کے سامنے صف آراء ہونے سے روک رہی تھی...... مگر سلطان ابراہیم کے مرانہ حکم نے اسے محاذ جنگ کی طرف جانے کے لئے مجبور کر دیا۔

غازی خان تقریباً بیس ہزار کا لشکر لے کر دہلی سے نکلا اور اپنے باپ دولت خان لودھی سے ملوٹ میں جا رل گیا۔

پھر دونوں باپ بیٹے تقریباً چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ لاہور کے پاس دریائے راوی کے ساحل پر ف آراء ہوئے...... مگر جیسے ہی انہیں مغل شہنشاہ کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ جنگ کئے بغیر ادھر ادھر چلے گئے۔ افق اور غدار کبھی مرد میدان نہیں ہوتے۔ یہ مثل دولت خان لودھی اور اس کے بیٹے غازی خان پر پوری طرح ادق آتی تھی' اگر یہ دونوں افغان سردار مرد میدان ہوتے تو بابر کو بڑی آسانی کے ساتھ شکست دے سکتے تھے' یونکہ افرادی قوت کے اعتبار سے مغل فوج اور افغانی لشکر میں کوئی تقابل ہی نہیں تھا۔ بالفرض اگر بابر کو شکست نہ تی تب بھی جنگ کی صورت میں اتنا خون بہہ سکتا تھا کہ مغلوں کی عسکری طاقت گھٹتے گھٹتے نصف یا اس سے بھی م رہ جاتی اور افغانوں کو اس جنگ سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا کہ بابر اپنی شکستہ حالت کی وجہ سے برسوں

ہندوستان کا رخ کرنے کے قابل نہ رہتا...... دولت خان لودھی اور غازی خان کے فرار نے بابر کے حوصلوں کو ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ بلند کر دیا تھا اور دوسری طرف ہندوستان میں افغانوں کے زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔

دولت خان لودھی اپنے دوسرے بیٹے علی خان کے ساتھ ملوٹ کے قلعے میں چھپ کر بیٹھ گیا اور غازی خان کوہ پایہ کی طرف بھاگ گیا۔ شہنشاہ ظہیر الدین بابر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے ملوٹ کے قلعے کو گھیر لیا۔ اب دولت خان لودھی کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مغل شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور جان کی امان طلب کرے' حسب روایت اس نے ایسا ہی کیا۔

دولت خان لودھی کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ بابر سے جنگ کرنے کے لئے دو تلواریں رکھتا ہے' پھر جب دولت خان لودھی قلعے سے نکل کر مغل بادشاہ کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا تو بابر کے کچھ خاص ملازموں نے اسے درمیانی راستے میں روک لیا۔

''تم لوگ مجھے روکنے والے کون ہو؟'' دولت خان لودھی نے بگڑ کر انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''میں ایک سردار ہوں اور دوسرے سردار سے ملنے جا رہا ہوں' پھر تم لوگ درمیان میں کہاں سے آ گئے؟ اپنی حیثیت کو پہچانو اور میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

''تو بڑی غلط فہمی کا شکار ہے دولت خان! شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے ایک ملازم خاص نے اونچی آواز میں کہا۔ ''تو محض ایک سردار ہے' منافق' فریب کار اور بدعہد سردار...... مگر تو جس کے دربار میں حاضری دینے کے لئے جا رہا ہے وہ ایک شہنشاہ ہے' اعلیٰ ظرف' رحم دل اور اپنے عہد کا پابند شہنشاہ۔ یاد رکھ کہ ایک معمولی سردار اور ایک عالی مرتبت شہنشاہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم تجھے اسی شہنشاہ معظم کے دربار میں حاضری دینے کے آداب سکھا رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر بابر کا وہ ملازم خاص آگے بڑھا اور اس نے دولت خان لودھی کی کمر سے اس کی دونوں تلواریں کھول لیں۔

''تو یہ کیا کر رہا ہے؟'' دولت خان لودھی بابر کے خدمت گار پر ایک بار پھر بگڑا۔ ''جانتا نہیں کہ ہتھیار مردوں کا زیور ہوتے ہیں۔''

''بے شک! ہتھیار ہی مردوں کا زیور ہوتے ہیں' مگر یہ قول تیری ذات سے مطابقت نہیں رکھتا۔'' بابر کا ملازم خاص نہایت تحقیر آمیز انداز میں ہنسا اور پھر اس نے دولت خان لودھی کی دونوں تلواریں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ گویا یہ بھی ایک انداز کا طوق غلامی تھا۔

پھر اسی حالت میں دولت خان لودھی کو شہنشاہ بابر کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ بزدل' مگر مغرور سردار مغل بادشاہ کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھنے میں اپنی توہین محسوس کرتا تھا...... لیکن بابر کے خدمت گاروں نے اس کو زبردستی بادشاہ کے روبرو ادب کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

''دولت خان! میں تجھ سے اس بات کی شکایت نہیں کرتا کہ تو نے کتنے عہد نامے تحریر کئے اور انہیں چاک کر ڈالا۔ تو نے کتنی قسمیں کھائیں اور توڑ ڈالیں۔ تو نے کتنے پیمان باندھے اور فراموش کر دیئے۔'' بظاہر بابر کا لہجہ بہت نرم تھا' مگر اس کی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ میں تیز نشتروں سے بھی زیادہ کاٹ تھی۔ ''میں اس بار بھی تجھے معاف کر سکتا ہوں' مگر اس شرط پر کہ تو احسان شناسی کے ساتھ شکرگزاری کا راستہ اختیار

ے۔''

بابر کی طویل گفتگو سننے کے بعد بھی دولت خان لودھی کے جسم کو حرکت نہ ہوئی' وہ بدستور سر جھکائے اور یں نیچی کئے خاموش بیٹھا رہا' شاید اب اس میں مغل شہنشاہ سے آنکھ ملانے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔

بابر نے اس شرط کے ساتھ دولت خان لودھی کی جان بخشی کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے سلطان ابراہیم لودھی بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائے...... مگر افغان سردار کا سکوت مسلسل دیکھ کر اہل دربار کو یہی اندازہ ہوتا کہ جیسے اس کی زبان کاٹ دی گئی ہے یا پھر وہ پیدائشی گونگا ہے۔ بابر بہت دیر تک اصرار کرتا رہا' مگر ایک بار ، دولت خان لودھی کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہو سکی' رعب شاہی کے آگے وہ پتھر کا انسان بن کر رہ گیا تھا یا پھر اپنی تی مکاری سے کام لیتے ہوئے اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بالآخر بابر نے یہ کہہ کر اسے معاف دیا۔

''اگرچہ تیرے جرائم قابل معافی نہیں ہیں' لیکن پھر بھی میں تجھے اور تیرے اہل و عیال کو پناہ دیتا ہوں۔''

ابھی خیمے میں مغل شہنشاہ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ احمد جمال اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور بابر کو مخاطب ر کے کہنے لگا۔ ''گستاخی معاف! عزت مآب کا یہ فیصلہ آئین سیاست کے منافی ہے۔''

بابر نے چونک کر کسی قدر ناگواری کے ساتھ احمد جمال کی طرف دیکھا۔

''میں اپنی دیرینہ رفاقت اور نمک خواری کی بناء پر یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ دولت خان لودھی جیسے بدعہد ر ریاکار انسان کو معاف کرنا کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہیں ہے۔'' احمد جمال نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ہا۔ ''اگرچہ ظلم و شقاوت میرا بھی عقیدہ نہیں لیکن اس جیسے فریب کار دشمن کا سر کاٹ کر گلیوں اور شاہراہوں پر رانا سیاست و جہاں بانی کے مذہب میں زیادہ مستحسن فعل ہے۔ عالی جاہ اس حقیقت کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں کہ الم کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی مظلوم پر جبر و تشدد کیا جائے' اگر آپ اپنی رحم دلی کے باعث ولت خان کو قتل نہیں کر سکتے تو اسے پابہ زنجیر کر کے قریہ بہ قریہ اور کوچہ بہ کوچہ پھرایئے تاکہ مقامی باشندوں کو برت حاصل ہو اور وہ سرکش و فتنہ گر' جو اپنی اپنی کمین گاہوں میں چھپے بیٹھے ہیں آئندہ ہر قسم کی شورشوں سے باز جائیں۔''

احمد جمال کی تجویز ہر اعتبار سے مناسب اور قابل عمل تھی' لیکن بابر نے یہ کہہ کر اپنے جاں نثار ساتھی کے شورے کو مسترد کر دیا۔ ''احمد! تم جس دولت خان لودھی کو دیکھ رہے ہو وہ بہت پہلے مر چکا ہے۔ یہ تو محض اس کی اش ہے' جسے وہ خود اپنی قوم کے سامنے اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے۔ اگر میں یا میرے سپاہی اس کے تن مردہ کو شاہراہوں پر کھینچیں گے تو دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ مجھ میں اور میرے مورث اعلیٰ چنگیز و ہلاکو اور امیر تیمور یں کوئی فرق نہیں ہے' میں ہندوستانی حاکموں کو شکست فاش دینا چاہتا ہوں لیکن رعایا کے دل جیتنا چاہتا ہوں۔ یہی میرا منصوبہ جنگ ہے۔''

احمد جمال اور دوسرے مغل امراء مجبوراً خاموش ہو گئے' مگر ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ انہیں بابر کے اس فیصلے سے شدید اختلاف ہے۔

پھر جیسے ہی دولت خان لودھی اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوا بابر کے سپاہی افغانوں پر ٹوٹ پڑے' تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہوا کہ اہل قلعہ کے لئے باہر

اٹھنا دشوار ہوگیا۔ جوانوں' بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کی گریہ وزاری کا یہ عالم تھا کہ بابر کی سماعت بھی اس شور سے محفوظ نہ رہ سکی۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ مغل سپاہیوں نے دولت خان لودھی کی رہائی کے فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ اس لئے وہ مقامی افغانوں سے شدید ترین انتقام لے رہے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی بابر بے قرار ہوگیا اور تیزی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوکر قلعے کے قریب پہنچا۔

"میں دولت خان لودھی سے خفا ہوں' افغانوں سے نہیں۔" بابر نے چیخ کر اپنے سپاہیوں کو مخاطب کیا "جب میں نے اس جیسے بدترین دشمن کو معاف کردیا تو پھر تم ان بے قصور اور معصوم انسانوں کو کیوں معاف کرتے......" مغل شہنشاہ مسلسل چیخ رہا تھا' مگر اس کے سپاہی لوٹ مار میں اس طرح مشغول تھے کہ انہیں ا فرمانروا کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے افغانیوں کی عزت و حرمت کا کس قدر ہے۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے کہ ایک فاتح نے مفتوح کے ساتھ کیسا بہیمانہ سلوک کیا؟ اپنے دراز ہاتھوں کو ر لو اور جو امان طلب کر رہے ہیں' انہیں امان دے دو۔"

اس ہنگامہ دار وگیر میں بابر کی آواز چند سپاہیوں تک پہنچی اور وہ وہیں جم کر رہ گئے..... مگر باقی لشکری طرح قتل و غارت اور لوٹ مار میں مصروف رہے۔

آخر بابر نے غضبناک ہوکر کئی تیر اپنے سپاہیوں کی طرف چھوڑ دیئے۔ شہنشاہ کے ان تیروں سے کئی سپاہی زخمی ہوئے اور ہمایوں کا ایک ملازم ہلاک ہوگیا۔ اس وقت فاتح لشکر نے پلٹ کر دیکھا اور پھر مغلو احساس ہوا کہ ان کا یہ فعل بابر کو سخت ناپسندیدہ ہے۔ مجبوراً وہ اپنے اپنے خیموں کی طرف لوٹ گئے۔

بابر اس وقت تک قلعہ کے دروازے پر کھڑا رہا جب تک تمام افغانوں کے بیوی بچے سلامتی کے ساتھ سے باہر نہیں نکل گئے۔

¤¤¤

جب ملوٹ کا قلعہ افغان مکینوں سے خالی ہوگیا تو بابر اندر داخل ہوا۔ بے شمار نوادرات کے ہاتھ آئے' ان سب میں زیادہ قیمتی غازی خاں کا کتب خانہ تھا۔ غازی خاں کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ شاعری کا معیار رکھتا تھا۔ اس نے بہت سی نایاب اور منتخب کتابیں جمع کی تھیں۔ بابر نے ان کتابوں میں سے چند اپنے مخصوص کرلیں' کچھ شہزادہ ہمایوں کو عنایت کردیں اور باقی کامران مرزا کے لئے کابل روانہ کردیں۔

کتابوں کی تقسیم کے بعد دوسرے دن ہی بابر غازی خان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ اسی دوران دو خاں لودھی کا سب سے چھوٹا لڑکا دلاور خاں جسے اس کے باپ اور بھائی نے زنداں میں ڈال رکھا تھا' کسی ط قید سے چھوٹ کر بابر سے آملا۔ مغل شہنشاہ نے بڑے والہانہ انداز میں دلاور خان کو گلے لگایا اور اسے ا مصاحبین خاص میں شامل کرلیا۔

بابر کی پیدل فوج آگے آگے چل رہی تھی اور بار بار غازی خاں کی فوج پر چھاپے مارتی تھی۔ نتیجتاً افغان سردار کو کہیں بھی پناہ نہ مل سکی۔ انجام کار وہ انتہائی شکستہ حالت میں دوبارہ دہلی چلا گیا۔

اس وقت ہندوستان کا سب سے زیادہ بدنصیب شخص دولت خاں لودھی تھا۔ نہ اقتدار رہا' نہ دولت او مکان۔ خانہ بدوشوں کی طرح مختلف علاقوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جہاں بھی جاتا' لوگ نفرت و حقارت کی

یکھتے اور اپنے یہاں پناہ دینے سے انکار کردیتے۔ دولت خاں غربت و افلاس اور ذلت و رسوائی کے اس ے کو برداشت نہ کرسکا اور بیمار پڑ گیا۔ پھر چند ماہ بعد ہی انتہائی کسمپرسی کی حالت میں مرگیا۔

¤¤¤

بابر کے حلقہ اقتدار میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا تھا اور پنجاب کے علاقوں پر اس کی گرفت پہلے سے مضبوط ہوگئی تھی۔ 932ھ کے شروع میں شہزادہ ہمایوں نے دوسرے مغل سرداروں کے ساتھ مل کر قلعہ ہ کے حاکم حمید خاں کو شکست دی۔ حمید خاں سلطان ابراہیم لودھی کا حامی تھا اور بابر کے راستے کی دیوار اتھا۔ شہزادہ ہمایوں کی یہ پہلی فتح تھی۔ بابر نے خوش ہوکر فیروزہ کا قلعہ اور جالندھر کے تمام علاقے اپنے دا اکبر کو عنایت کردیئے۔

حمید خان فرار ہوکر دہلی پہنچا۔ غازی خاں پہلے ہی سلطان ابراہیم لودھی کے قدموں سے لپٹا ہوا مغلوں کی ت و بربریت کے فرضی افسانے سنا رہا تھا۔ حمید خاں کو دیکھ کر سلطان بھڑک اٹھا۔

"کیا تم میں سے کوئی ایسا جوانمرد نہیں ہے' جو مجھے فتح کی خوشخبری سنائے؟ جو بھی جاتا ہے شکست کھا کر ی ہی طرف پلٹ آتا ہے۔"

اگر سلطان معظم نے اپنے خدمت گاروں کی دستگیری نہیں کی تو یہ سلسلہ اور بھی دراز ہوجائے گا۔" حمید خاں ے دست بستہ عرض کیا۔

اب تک ابراہیم لودھی کے عیاش اور خوشامدی امراء نے اسے بابری حملوں کے متعلق یہی بتایا تھا کہ چند ل لٹیرے ہیں جو پنجاب کے علاقوں میں لوٹ مار کرکے واپس چلے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک حقیقت بھی تھی ہ بابر چار مرتبہ کابل واپس جاچکا تھا..... لیکن ابراہیم لودھی کے بدمست مشیر یہ نہیں جانتے تھے کہ مغل شہنشاہ لی پر ایک بڑے اور فیصلہ کن حملے کی تیاریاں کررہا ہے۔

حمید خاں نے پہلی بار حقیقت پسندانہ بات کی تھی' جسے سن کر ابراہیم لودھی چونک پڑا تھا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی سلطان کا ایک معتمد امیر افغان جلوانی اپنے تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ بابر کے حلقہ اطاعت میں شامل ہوگیا۔ اب بابر کو یقین آگیا تھا کہ افغان فوج انتشار اور تباہی کا شکار ہورہی ہے اور س طرح اپنے حکمراں سے بغاوت کا اظہار کررہی ہے۔ افغان جلوانی کی اس حرکت نے سلطان ابراہیم لودھی کو ید غضبناک بنا دیا تھا۔

"اگر سلطان معظم نے گھر کی خبر نہ لی تو اسی طرح آہستہ آہستہ ساری اینٹیں الگ ہوجائیں گی اور پھر دیوار ں اتنا بڑا خلا پیدا ہوجائے گا کہ دشمن......" حمید خاں نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"پھر کیا کیا جائے؟" بابر کے حوالے سے پہلی بار ابراہیم لودھی نے سنجیدہ لہجہ اختیار کیا تھا۔

"آپ کے چھوٹے چھوٹے حاکم اور جاگیردار مغلوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔" حمید خاں بڑے ہوش ک اتیں کررہا تھا..... "آپ دارالسلطنت سے نکل کر ایک ہی وار میں مغلوں کا نام و نشان مٹا ڈالیں۔"

ابھی ابراہیم لودھی حمید خاں کی تجویز پر غور ہی کررہا تھا کہ اچانک گوالیار کے حاکم راجہ بکرماجیت کا قاصد ایک خاص پیغام لے کر دربار سلطانی میں حاضر ہوا۔

راجہ بکرماجیت نے اپنے خفیہ خط میں مغلوں کی مسلسل یورشوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک تجویز پیش کی تھی ا
دہلی کا سلطان اور گوالیار کا راجہ مل کر بابر کا مقابلہ کریں اور مستقبل کے اس خطرے کو ہمیشہ کے لئے مٹا ڈالیں۔
ابراہیم لودھی نے اپنے مشیروں سے طویل مذاکرات کے بعد راجہ بکرماجیت کی اس تجویز کو قبول کرلیا
دونوں کے درمیان یہ معاہدے طے پا گیا کہ فتح کے بعد بابر کے مقبوضہ علاقے ابراہیم لودھی ہی کے زیر اثر ر
گے' حکمران کی آمدنی برابر برابر سے تقسیم کرلی جائے گی۔
اس معاہدے کے بعد ابراہیم لودھی ایک ہزار جنگی ساتھیوں اور ایک لاکھ سواروں کا لشکر جرار لے کر پا
پت کی طرف روانہ ہوا۔

¤ ¤ ¤

پانی پت کی طرف کوچ کرنے سے پہلے سلطان ابراہیم لودھی نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا تھا۔ د
اور آگرہ کے حکمران نے اپنے خواب میں دیکھا کہ کسی میدان میں ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی شاخیں
تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یکایک چاروں طرف سے شکستہ اور درماندہ مسافروں کے قافلے نمودار ہوتے ہیں۔ شد
گرمی کا موسم ہے اور تیز دھوپ ان مسافروں کو جلائے دے رہی ہے۔ مسافر گھبرا کر اس گھنے اور طویل وعریض
درخت کو دیکھتے ہیں۔ پھر جھلسا دینے والی دھوپ سے بچنے کے لئے بھاگتے قدموں سے درخت کے گھرے سا
میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہی شکستہ حال مسافروں کے چہروں کی گمشدہ رونق لوٹ آتی ہے اور وہ سر
کے جھونکوں سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ پھر یہی خوشگوار ہوا اچانک آندھی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور درخ
کے سائے میں ٹھہرے ہوئے مسافر شدید پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ ناگہاں وہ طویل
عریض درخت ان مسافروں پر گر جاتا ہے اور بے شمار انسان اس کی شاخوں میں دب کر مر جاتے ہیں۔
دوسرے دن صبح ہوتے ہی سلطان ابراہیم لودھی نے اپنی ماں سے رات کا یہ خواب بیان کیا۔ وہ ایک د
آشنا' تجربہ کار اور انتہائی ذہین عورت تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کے خواب کو غیرمعمولی سمجھ کر اس کی اہمیت کو ب
زیادہ محسوس کیا' کئی دن تک وہ بڑی رازداری کے ساتھ غور وفکر میں مبتلا رہی' مگر جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سک
اس نے درباری علماء اور دانشوروں کو خلوت میں طلب کرکے سلطان ابراہیم کا خواب بیان کیا اور اس کی تع
دریافت کی۔
درباری علماء اور دانشوروں نے اپنے اپنے علم اور ذہنی رسائی کے مطابق اس خواب کے ہر گوشے پر غور ا
پھر ایک عالم نے سلطان ابراہیم لودھی سے سوال کرتے ہوئے کہا۔
''کیا سلطان معظم اس بات کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے کہ حملہ آور مغلوں اور افغان سپاہیوں
تعداد اور طاقت کے اعتبار سے کیا تناسب ہے؟''
''مغل لٹیروں کے مقابلے میں مابدولت کے جانباز سپاہیوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔'' سلطان ابر
لودھی نے انتہائی نفرت وحقارت کے لہجے میں کہا۔
''تو پھر اس خواب کی تعبیر آپ کے حق میں ظاہر ہوگی۔'' درباری عالم کی آواز بہت زیادہ پرجوش ہ
''خواب میں نظر آنے والے مسلمانوں کے قافلوں سے یہی مراد ہے کہ وہ غیرمقامی لوگ ہیں...... اور اس ط

یض سایہ دار درخت سے مراد آپ کی ذات گرامی ہے۔ تیز ہوا کا اچانک آندھی میں تبدیل ہوجانا اس بات
علامت ہے کہ آپ عنقریب اپنے دشمن سے برسرپیکار ہوں گے...... اور درخت کا گر جانا نتائج کے اس پہلو
نشاندہی کرتا ہے کہ آپ بہرحال اپنے دشمن پر غالب آجائیں گے۔''
بیٹے کے خواب کی تعبیر سن کر سلطان کی ماں بہت زیادہ خوش ہوئی اور اس نے فوری طور پر غریبوں میں
رقات تقسیم کئے۔
پھر کچھ دن بعد ہی جب گوالیار کے حکمران راجہ بکرماجیت نے ابراہیم لودھی کو ایک نئے فوجی معاہدے کی
بش کی تو سلطان کو یقین آگیا کہ اس کا خواب سچا ہے اور درباری علماء کی بیان کردہ تعبیر حرف بہ حرف درست
ہے۔ اس فوجی معاہدے کے بعد سلطان کی طاقت عام اندازوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اور اب بابر کی عسکری
ت سے اس کا کوئی تقابل ہی نہیں تھا۔
پھر کچھ دن بعد ہی فتح ونصرت کے نشے سے سرشار ہوکر سلطان ابراہیم لودھی دہلی سے نکلا اور آہستہ روی
ے ساتھ پانی پت کی طرف بڑھا۔

¤ ¤ ¤

سلطان کا ایک ناراض امیر افغان جلوانی جو اس وقت بابر کے حلقہ اطاعت میں شامل تھا‘ اس نے آتے ہی مغل شہنشاہ کو ابراہیم لودھی کے جنگی عزائم سے باخبر کر دیا تھا۔

بابر ابھی افغان جلوانی کی فراہم کردہ اطلاعات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس کے جاسوسوں نے ایک نئی خبر دیتے ہوئے کہا۔

”شہنشاہ! ابراہیم لودھی کے کچھ سردار ایک لشکر جرار لے کر سلطان کے آگے آگے آ رہے ہیں۔ دشمن کی اس جنگی حکمت عملی کا بظاہر ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا ہے کہ کسی طرح آپ کی پیش قدمی کو روک دیا جائے۔ یہاں تک کہ سلطان کا لشکر خاص اپنے اس لشکر سے آ ملے اور پھر تمام افغان یکجا ہو کر مغلوں پر بھرپور حملہ کر سکیں۔“

بابر نے شاہی جاسوسوں کی ان اطلاعات کو اپنے حق میں نیک فال سمجھا اور فوری طور پر چند مغل سرداروں کو آگے روانہ کر دیا تا کہ وہ سلطان ابراہیم کے اس جنگی منصوبے کو ناکام بنا سکیں۔

بابر کے معتمد سردار احمد جمال‘ حسین تیمور‘ سلطان مہدی خواجہ‘ محمد سلطان مرزا‘ عادل سلطان مرزا‘ سلطان جنید برلاس اور شاہ حسین برلاس مغل لشکر لے کر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے۔ بابر کے ان جانباز ساتھیوں نے رات کے اندھیرے میں بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ صبح ہوتے ہوتے وہ دشمن کے سر پر جا پہنچے۔

سلطان ابراہیم لودھی کے اس فوجی دستے کی قیادت مشہور افغان سردار داؤد خان اور حاتم خان کر رہے تھے۔ یہ فوجی دستہ تقریباً ستائیس ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ سردار داؤد خان اور حاتم خان نے بڑی حقارت کے ساتھ مختصر سے مغل لشکر کو دیکھا۔ افغانوں کا خیال تھا کہ مغلوں کی یہ چھوٹی سی فوج ان کے ایک حملے کی بھی تاب نہ لا سکے گی اور بری طرح پسپا ہو کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہو گی...... مگر جب آزمائش کا وقت آیا تو افغان سپاہیوں کی تمام قیاس آرائیاں کسی خواب پریشان کی طرح غلط ثابت ہوئیں۔

مغل فوجی اتنی بے جگری سے لڑے کہ انہوں نے آن کی آن میں افغان سپاہیوں کی ایک ایک صف کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ یہ جنگ صبح سویرے شروع ہوئی تھی اور دوپہر تک اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ افغانوں نے مغلوں کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ سردار داؤد خان فرار ہو گیا اور سردار حاتم خان میدان جنگ میں کام آیا۔

اس جنگ میں بہت سے ہندوستانی سپاہی گرفتار ہوئے اور سات کوہ پیکر ہاتھی مال غنیمت کے طور پر
ن کے ہاتھ لگے۔ بابر کا یہ فاتح لشکر تمام مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کو لے کر اپنے شہنشاہ کی خدمت میں
ضر ہوا۔ بابر نے مقامی لوگوں کی عبرت کے لئے ان تمام قیدیوں کو قتل کرا دیا۔ بعدازاں اس علاقے کا پوری
ح انتظام کر کے سلطان ابراہیم لودھی سے معرکہ آرائی کے لئے سرہند کی حدود سے نکل کر پانی پت کی طرف
ا۔

پھر جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہوئے تو اکثر مغل سردار بے اختیار پکار اٹھے۔
ہنشاہ! ہمارے اندازے اور شاہی جاسوسوں کی تمام اطلاعات غلط ثابت ہوئیں۔“

”آخر تم اپنے دشمن کے بارے میں کیا اندازے قائم کر رہے تھے۔“ بابر اپنے سرداروں کی گفتگو کا مفہوم
گیا تھا‘ مگر پھر بھی وہ اتمام حجت کے لئے سوال کر رہا تھا۔

”ہم صرف ابراہیم لودھی سے جنگ کرنے کے لئے آئے تھے۔“ مغل سرداروں کے لہجے میں فکر و پریشانی
رہی تھی۔ ”انسانوں کے اس ٹڈی دل کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ سارا ہندوستان ہی ہمارے خلاف ایک مرکز
ٹ آیا ہے۔ ہم کس کس سے جنگ کریں گے شہنشاہ؟ آپ دیکھتے نہیں کہ میدان جنگ میں سپاہیوں کے
پر رنگ رنگ کی پگڑیاں نظر آ رہی ہیں۔“ مغل سرداروں نے ابراہیم لودھی کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا‘
لطان کے لشکر میں افغانوں کے علاوہ راجپوت بھی شامل تھے۔ راجپوت فوجیوں کی قیادت گوالیار کا حکمران راجہ
ماجیت کر رہا تھا۔

”میدان جنگ میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ بابر کے لہجے سے تلخی نمایاں تھی۔ ”کیا تم کسی سبزہ زار کی سیر
نے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے تھے؟ یہ زندگی کا مقتل ہے میرے ساتھیو! یہاں تو ایسے ہی ہولناک مناظر
یکھنے میں آتے ہیں۔“

بابر کے فوجی سرداروں نے ایک بار پہلے بھی واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا...... اور آج پانی پت کے
دان میں بھی وہ سلطان ابراہیم لودھی کے مقابل صف آراء ہونے سے گریزاں نظر آ رہے تھے۔

بابر نے ان کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جمانے کے لئے کچھ دن پہلے لڑی جانے والی ایک جنگ کا
الہ دیتے ہوئے کہا......

”کیا تم نے سردار داؤد خان اور سردار حاتم خان کا حشر نہیں دیکھا؟ ایک میدان جنگ سے فرار ہو گیا اور
سرے کا سر تم نے اپنے گھوڑوں کے سموں سے روند ڈالا؟ وہ کون تھا جس نے اپنے سے چھ گنا لشکر کو شکست
ی تھی۔ تم ہی تو تھے۔ کیا ابراہیم لودھی کے سپاہیوں کی کثرت نے تمہارے ذہنوں کو اس قدر پریشان کر دیا
ہے کہ تم اپنے نام بھی بھول گئے؟“

بابر کی یہ جذباتی تقریر سن کر اکثر سرداروں نے اپنے سر جھکا لئے‘ مگر بعض سردار مغل شہنشاہ کی اس
باتی حرکت کو حماقت و دیوانگی سے تعبیر کر رہے تھے۔ انہوں نے بابر سے کسی رعایت و تکلف کے بغیر صاف
اف کہہ دیا۔

”شہنشاہ! جنگ آرزوؤں اور جذبوں کے بجائے ہوش و حواس اور کھلی آنکھوں کے ساتھ لڑی جاتی ہے۔
گستاخی معاف! اس وقت سلطان ابراہیم لودھی کی حیثیت اس خونی آندھی کی سی ہے‘ جو اپنے گرد و پیش کی ہر چیز

کو اڑا لے جانا چاہتی ہے۔...... اور آپ اس وقت ایک کمزور درخت کے سوا کچھ نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ آپ نے کس بنیاد پر ابراہیم لودھی سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ ایک ہم ہی نہیں' دنیا کا کوئی بھی ذی ہوش انسان اس کمزور درخت کی سلامتی کی ضمانت نہیں دے سکتا جس نے خود ہی اپنے آپ کو ایک تند و تیز اور ہلاکت خیز آندھی کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔"

بابر کے یہ سردار منطق کی زبان میں اپنے فرمانروا سے گفتگو کر رہے تھے۔ مغل شہنشاہ ان کی باتیں سن کر برہم نہیں ہوا بلکہ انتہائی نرم لہجے میں کہنے لگا۔...... "میرے پاس تمہاری تقریریں سننے کا وقت نہیں ہے' بس چند لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرو...... کیا تم جانا چاہتے ہو؟"

"ہم خود بھی اس فتنے سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں اور آپ کو بھی گرداب ہلاکت سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔"

بابر نے پھر ان سے کوئی بات نہیں کی اور دوسرے سرداروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم میں سے بھی جو کوئی عافیت کے سائبان کی طرف جانا چاہتا ہے' وہ اسی وقت چلا جائے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی...... لیکن ایک بات پورے ہوش و حواس اور ذمہ داری کے ساتھ سن لو کہ تمہارا شہنشاہ کسی فریب میں مبتلا رہنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں تمہارے عہد و پیمان یاد نہیں دلاتا اور تم سے پرانی رفاقتوں کا حساب بھی طلب نہیں کرتا۔ ہاں! اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ آج کے دن تم سب کے سب میرے سامنے بے نقاب ہو جاؤ۔ تم میں سے ہر شخص اپنا اپنا تعارف کرائے کہ وہ کون ہے اور مجھ سے اس کا کیا رشتہ ہے؟"

جیسے ہی بابر کی بات ختم ہوئی' چاروں طرف سے ایک عجیب سا شور اٹھا۔ مغل سرداروں کے ساتھ بہت سے سپاہی بھی ہم آہنگ ہو کر کہہ رہے تھے۔

"شہنشاہ! ہم وہی ہیں آپ کے دیرینہ خدمت گار' جن کی زبانیں بدلی ہیں' نہ دل بدلے ہیں اور نہ دماغ۔ بس ایک عہد وفا ہے جو ہمارے کاندھوں پر سروں کے باقی رہنے تک قائم ہے۔"

اپنے جاں نثاروں کا یہ جوش دیکھ کر بابر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور آنکھیں ایک جذبہ خاص کے زیر اثر چمکنے لگیں۔

"یہ سارے جذباتی نعرے ہیں شہنشاہ! ان کے سہارے جنگ نہیں لڑی جاتی......" وہ چند مغل سردار جو محاذ جنگ سے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جانا چاہتے تھے' انہوں نے آخری بار بابر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "مخلص وہ نہیں جو زبان اور لفظوں کا بھرم رکھنے کے لئے بے شمار انسانوں کو وادی فنا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ دراصل مخلص وہ ہیں' جو نعروں کی آگ سے انسانی خون کو نہیں گرماتے بلکہ سنگین لمحات میں آفات و مصائب کو ٹالنے کے لئے ذہنی رسائی کی آخری حد تک غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ ہم ایسے ہی مدبر ہیں شہنشاہ! ہماری تدبیروں کو جذباتی نعروں کی نیلام گاہ میں بے قیمت نہ ٹھہرائیے اور ہمارے مخلصانہ مشوروں پر بلاتاخیر عمل کیجئے۔ صاحبقراں کے جانباز وارث! ہمیں پہچاننے کی کوشش کیجئے۔ ہم آپ کے دشمن نہیں' بہترین خیر خواہ ہیں۔"

"میں تمہاری بہترین تدبیروں اور مخلصانہ مشوروں کو سلام کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے بابر مسکرانے لگا تھا۔ اس لئے مغل سردار اس کے لہجے میں پوشیدہ طنز کی شدت کو محسوس نہ کر سکے۔

"تو پھر ہمارے ساتھ اپنے گھوڑے کی باگیں موڑ لیجئے اور کابل پہنچ کر ازسر نو جنگ کی منصوبہ بندی کیجئے۔"

مغل سردار شہنشاہ بابر کی گفتگو کا حقیقی مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے تھے' اس لئے بہت زیادہ پرجوش لہجے میں بولنے لگے۔ "یقیناً ہمارا فرمانروا ایک ذہین اور معاملہ فہم شخص ہے۔ اس لئے ہمیں یقین تھا کہ ہمارے مشورے رائیگاں نہیں جائیں گے۔"

"نہیں ساتھیو! آج کے بعد سے میرے اور تمہارے راستے مختلف ہیں۔ اب تم کبھی میرے شریک سفر نہیں ہو سکتے۔" شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے کسی اشتعال اور غصے کے بغیر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

مغل سردار کچھ دیر تک شدید حیرت کے عالم میں خاموش کھڑے بابر کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ان کے جسموں کو حرکت ہوئی اور وہ آگے بڑھ کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ یہ تین مغل سردار ندیم مرزا' امین برلاس اور احسان بیگ تھے۔ "ہم اتمام حجت کر چکے۔ کاش! ایسا نہ ہوتا۔" تینوں مغل سرداروں نے بیک زبان کہا۔ "الفراق! ہمارے شہنشاہ الفراق! خدا آپ کے جاہ و جلال کی حفاظت کرے۔" یہ کہہ کر ندیم مرزا' امین برلاس اور احسان بیگ نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

ابھی ان تینوں مغل سرداروں نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ یکایک بابر کی پرجلال آواز ابھری۔ "ٹھہرو!"

تینوں مغل سرداروں نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور نیچے اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بابر کے قریب آئے۔

"اگر تم میرے آبائی علاقوں سے گزرو تو وہاں کی مٹی' وہاں کے مکانوں اور وہاں کی ہواؤں کو میرا سلام کہنا۔" شہنشاہ ظہیر الدین بابر انتہائی پرسوز لہجے میں بول رہا تھا۔ "اور اگر تمہیں یہ خبر ملے کہ بابر اس دنیا میں نہیں رہا تو میری قوم کو اور اہل فرغانہ کو پوری دیانت داری کے ساتھ بتا دینا کہ اس کے مٹھی بھر سپاہیوں اور سلطان ابراہیم لودھی کے لشکر جرار میں کوئی تقابل ہی نہیں تھا۔ پھر بھی صاحبقراں کا وارث فتح و کامرانی کے یقین کے ساتھ آخری سانس تک لڑا اور اس حالت میں مارا گیا کہ اس کے سینے پر لالہ رنگ زخموں کی بہار روشن تھی......"

تینوں مغل سرداروں نے اپنے حکمران کی بات سنی اور واپس جانے کے لئے مڑے۔

"اور اگر تم امانت کا مفہوم سمجھتے ہو اور امانت کو پوری دیانت داری کے ساتھ منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو تو اہل فرغانہ و سمرقند کو یہ بھی بتا دینا کہ تم اپنے شہنشاہ کو کس حال میں چھوڑ کر آئے تھے؟"

اہل دل کے لئے یہ بڑی شدید ضرب تھی' مگر ندیم مرزا' امین برلاس اور احسان بیگ اس ضرب کو محسوس ہی نہ کر سکے' انہیں اپنی جانوں سے پیار تھا۔ اس لئے وہ کسی عافیت گاہ کی تلاش میں کابل کی طرف چلے گئے۔

⌘⌘⌘

بابر کے سپاہیوں کی تعداد کسی بھی حال میں دس بارہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس سلطان ابراہیم لودھی کا لشکر ایک لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھا۔ اس طرح دونوں حریف ایک اور دس کے تناسب کے ساتھ میدان جنگ میں صف آراء ہوئے تھے۔ افرادی قوت کے علاوہ سلطان ابراہیم لودھی کو شہنشاہ بابر کی فوج پر ایک ہزار کوہ پیکر ہاتھیوں کی برتری بھی حاصل تھی۔ جب طاقت کے یہ پہاڑ اپنی جگہ سے حرکت کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے قدموں کی دھمک سے زمین کانپ رہی ہے۔ مختصر یہ کہ طاقت کا توازن مکمل طور پر افغانوں کے حق میں تھا

اور سلطان ابراہیم لودھی اور راجہ بکرماجیت کو اپنی فتح محض چند قدم کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔

شہنشاہ ظہیرالدین بابر کو اپنی قلت افواج اور دیگر جنگی وسائل کی کمی کا شدت سے احساس تھا۔ اگر اس کی جگہ سلطان ابراہیم لودھی کے مقابل کوئی دوسرا حریف ہوتا تو ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کی طویل اور مضبوط دیوار دیکھ کر ہی بھاگ کھڑا ہوتا...... لیکن وہ ظہیرالدین بابر تھا' ایک تاریخ ساز انسان جسے قدرت نے موت کے منہ میں ثابت قدم رہنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے اپنے فرزند اکبر ہمایوں مرزا کی قیادت میں تجربہ کار امیروں کو میمنہ پر مقرر کیا۔ اسی فوجی دستے میں احمد جمال بھی شامل تھا۔ اپنے ایک عزیز محمد سلطان مرزا کی سرکردگی میں ایک دلیر اور ہوشیار فوجی دستے کو میسرہ پر متعین کیا۔ اس کے بعد شہنشاہ بابر نے دوسرے تجربہ کار سرداروں کو فوج کے مختلف حصوں پر مامور کیا۔

پھر جب مقابلہ شروع ہوا تو دونوں طرف سے فوجیں غضب ناک موجوں کی صورت میں آگے بڑھیں اور اس طرح آپس میں ٹکرا گئیں' جیسے سیلاب کا تند و تیز پانی کسی پتھر کے بند سے ٹکرا کر پار نکل جانا چاہتا ہے۔ ہر طرف ایک ایسا شور برپا تھا کہ فوجیوں کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے نبرد آزما سپاہیوں کے دل دہلانے والے نعرے گونجتے اور میدان جنگ کی پوری فضا ہیبت و دہشت کی قبا اوڑھ لیتی۔ جدھر بھی نظر جاتی انسانی خون کے فوارے ابلتے نظر آتے۔ گھوڑوں کی بھاگ دوڑ نے آنکھوں کے سامنے گرد و غبار کی چادر کھڑی کر دی تھی۔ پھر جب سلطان ابراہیم لودھی کے ہاتھیوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو دونوں طرف کے سپاہیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے میدان جنگ میں زلزلہ سا آ گیا ہے...... اور جب کوہ پیکر ہاتھی زمین کو روندتے ہوئے آگے بڑھے تو اس قدر غبار اڑا کہ دیکھنے والوں کو دن پر رات کا گمان ہونے لگا۔ لوگ اس طرح برسرپیکار تھے کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ بس ہاتھوں کی گردش تھی' تلواروں کی کاٹ تھی اور زخمی ہونے والے انسانوں کی فلک شگاف چیخیں تھیں۔ عجیب ہنگامہ کارزار تھا۔ بیٹا باپ کو پہچانتا تھا اور نہ باپ بیٹے کو۔

شروع میں افغانوں کے لشکر نے بڑی تیزی دکھائی تھی' ان کے آگے بڑھنے کا انداز ایسا ہی تھا' جیسے بھوکی ٹڈیاں سرسبز و شاداب کھیتوں پر ٹوٹ پڑی ہوں۔ طلوع آفتاب سے دوپہر تک ہزاروں انسانوں کے سر گھوڑوں کے سموں سے روندے گئے۔ افغانوں کی اس برق رفتار پیش قدمی نے مغل فوجوں کے حوصلوں کی سیسہ پلائی دیوار میں کئی مقامات پر گہرے شگاف ڈال دیئے تھے...... اور بابر کو شکست کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا...... مگر دوپہر کے بعد جنگ کا نقشہ بدلنا شروع ہو گیا۔ افغان' اور راجپوت سپاہیوں کے درمیان کوئی منظم رابطہ نہیں تھا۔ بس وہ اپنے اپنے انداز میں اندھا دھند جنگ کر رہے تھے۔ نہ ان کا کوئی سالار تھا اور نہ وہ قائد کے فیصلے کے پابند تھے۔ پھر جب ہندوستانی فوجوں کا اپنے جنگی مرکز سے رابطہ ٹوٹا تو وہ اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح منتشر ہو کر رہ گئیں۔ دوسرے یہ کہ سلطان ابراہیم لودھی اور راجہ بکرماجیت کو اپنے سپاہیوں کی کثرت اور جنگی وسائل پر بڑا غرور تھا۔ نتیجتاً ہندوستانی فوجیں ہوش کے بجائے جوش سے کام لے رہی تھیں اور جوش اکثر مقامات پر انتہائی ناکارہ ہتھیار ثابت ہوا ہے۔

اس کے برخلاف بابر کی فوج بہت مختصر تھی لیکن انتہائی مضبوط اور مربوط...... مغل شہنشاہ کو اپنے ایک ایک سپاہی اور ایک ایک شمشیر کی قیمت کا احساس تھا۔ مزید یہ کہ بابر نے اپنی تمام کشتیاں جلا ڈالی تھیں اور وہ واپسی کے تمام دروازے بند کر چکا تھا۔ اس لئے پانی پت کی جنگ بابر کی زندگی اور موت کی جنگ تھی' بابر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ حکمران تھا۔ اسے علم ریاضی سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ وہ حساب اور اعداد و شمار کے اصولوں کو سامنے رکھ کر دس گنا بڑے دشمن سے جنگ کر رہا تھا۔ بابر نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یاد رکھو کہ یہ جنگ عام جنگوں کی طرح نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی معرکہ آرائی میں غلط طریقہ اختیار کرنے پر تمہارا محاسبہ نہیں کیا۔ کسی کوتاہی پر گرفت نہیں کی...... مگر اس جنگ میں تم سب سے ایک ایک لمحے اور ایک ایک حرکت کا حساب لیا جائے گا۔ تم پر یہ حقیقت واضح ہو جانا چاہئے کہ تمہارا دشمن تم سے دس گنا طاقتور ہے۔ اس لئے تمہیں اپنا طریقہ جنگ بدل دینا ہوگا اور لڑائی کا فیصلہ ہونے تک اپنا حساب درست رکھنا ہوگا۔''

تمام مغل سردار اور سپاہی حیرت سے اپنے فرمانروا کا منہ دیکھ رہے تھے۔ تمام باتیں ان کی سمجھ میں آ گئی تھیں' مگر حساب درست رکھنے کا معاملہ ان کے ذہنوں سے بالاتر تھا۔

شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے اپنے سپاہیوں کی ذہنی کشمکش کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''حساب درست رکھنے کا مسئلہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہیں قتل و غارت کے سلسلے میں توازن برقرار رکھنا ہوگا۔ کیا تم جانتے ہو کہ توازن کسے کہتے ہیں اور اسے کس طرح برقرار رکھا جاتا ہے؟'' بابر نے اپنے سپاہیوں سے ایک اور سوال کیا' مگر پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''جب تمہارے دشمن کے جسم سے خون کے دس قطرے بہہ جائیں تو تم اپنے لہو کا ایک قطرہ بہاؤ گے۔ اسی طرح جب ابراہیم لودھی کے دس فوجی موت کے گھاٹ اتر جائیں تو میرا ایک سپاہی وادی فنا کی طرف جائے گا۔ یہی وہ توازن ہے اور اسی کو حساب کی درستی کہتے ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے شہنشاہ!'' یک بیک بہت سے سپاہیوں کی آوازیں ابھریں۔ ''جب معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے اور جنگ مغلوبہ چھڑ جاتی ہے تو پھر کسی کو اپنے ارادے پر اختیار نہیں رہتا۔''

''مگر آج تمہیں اپنے ارادوں کو میری مرضی کا پابند بنانا ہوگا۔ یہی میرا حکم ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ تم نافرمانی جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرو گے۔ بس اب آگے بڑھو۔ منزل مراد تمہارے سامنے ہے۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھنا کہ پیچھے عدم کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اپنا وجود برقرار رکھنا ہے تو ابراہیم لودھی کے آخری سپاہی کے سر کی طرف دیکھو۔''

یہ بابر کی اسی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ مغل سپاہیوں نے سلطان ابراہیم لودھی کی صفیں الٹ کر رکھ دیں اور اس مقدار میں دشمنوں کا خون بہایا کہ زمین سرخ ہو گئی۔ بابر نے قتل و غارت کے سلسلے میں جس توازن کی بات کی تھی' مغل سپاہیوں نے اسے یہاں تک برقرار رکھا کہ جب سلطان ابراہیم لودھی کے 20 سپاہی ہلاک ہو جاتے تھے تو ایک مغل فوجی گھوڑے کی پشت سے نیچے گرتا تھا۔

جنگ کا نقشہ یکسر بدل چکا تھا۔ افغان اور راجپوت سپاہی ہر محاذ پر پسپا ہو رہے تھے۔ سلطان ابراہیم لودھی اور راجہ بکرماجیت پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایک ہی محاذ پر جنگ کر رہے تھے۔ جب ان دونوں نے عرصہ کارزار میں ہر طرف اپنے سپاہیوں کی لاشوں کے انبار دیکھے تو بدحواس ہو گئے۔ اب انہیں جنگ کا انجام صاف

نظر آنے لگا تھا۔

مجبوراً انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور میدان سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے...... لیکن گردش وقت نے انہیں سنبھلنے اور بچ نکلنے کی مہلت نہیں دی۔ جب وہ دونوں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے تو انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے' مگر اس بدنصیبی کا کیا علاج کہ اچانک مغل سپاہیوں کا ایک دستہ عقب سے نمودار ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر سلطان ابراہیم لودھی اور راجہ بکر ماجیت کا راستہ روک لیا۔ اب آگے بھی راستہ بند تھا اور پیچھے بھی۔ گویا افغان حکمران اور راجپوت راجہ دونوں عالم برزخ میں تھے۔ پھر بہت جلد مغل سپاہیوں نے ان دونوں فرمانرواؤں کو برزخ کے عذاب سے نجات دے دی۔ ایک مغل فوجی کا تیر شہ رگ کے قریب راجہ بکر ماجیت کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ چند لمحوں تک خون کا فوارہ ابلتا رہا اور پھر راجپوت حکمران خاک پر تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ سلطان ابراہیم لودھی نے بڑے کرب کے ساتھ اپنے ساتھی کی دردناک موت کا منظر دیکھا اور ایک بار پھر فرار کی نئی راہیں تلاش کرنے لگا' مگر تیرہ بختی کے سبب اس کی یہ کوششیں بھی لاحاصل ثابت ہوئیں۔ موت اپنی پوری رفتار کے ساتھ افغان حکمران کے تعاقب میں بڑھ رہی تھی۔

سلطان ابراہیم لودھی دشمن سے مقابلہ کرنے کے بجائے میدان جنگ سے بھاگنے کی فکر میں تھا اور اس بدحواسی نے اسے منزل فنا تک پہنچا دیا۔ اگر راجہ بکر ماجیت اور سلطان ابراہیم لودھی پورے نظم و ضبط اور بلند حوصلگی کے ساتھ مقابلہ کرتے تو شاید اس جنگ کا نتیجہ ان کے حق میں برآمد ہوتا...... اور اگر بالفرض یہ صورت پیش نہ آتی تو کم سے کم یہ جنگ طول ضرور کھینچتی اور پھر وہ دونوں آسانی سے فرار ہو سکتے تھے...... مگر سلطان ابراہیم لودھی اور راجہ بکر ماجیت اس انداز سے کیسے سوچتے اور کس طرح جنگ کرتے کہ قسام ازل کی طرف سے ان کی سانسوں کا شمار پورا ہو چکا تھا۔ ایک لاکھ سپاہی اور ایک ہزار ہاتھی رکھنے والے لشکر نے اپنی بدنظمی اور کم ہمتی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ کو صرف چند گھنٹوں میں غیر منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ سلطان کی رعایا بھی اس سے نالاں تھی اور فوج بھی بیزار' پھر وہ کس طرح دشمن کے مقابلے میں فتح حاصل کرتا؟ ابراہیم لودھی کے سپاہی کٹھ پتلیوں کے انداز میں جنگ کر رہے تھے۔ پھر جیسے ہی انہیں حرکت دینے والے ہاتھ رکے اور دھاگے ٹوٹے تو وہ سر میدان اوندھے منہ گر پڑے۔ یہاں تک کہ گنتی کے مغل شہ سواروں نے ایک شجاع قوم کے بے شمار افراد کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روند ڈالا۔

تمام عمر کے غرور و تکبر اور بندگان خدا کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کے حساب کا وقت آ گیا تھا۔ سلطان ابراہیم لودھی آنکھیں بند کئے بھاگ رہا تھا کہ ایک مغل سپاہی کا نیزہ اس کی پشت پر لگا اور ہڈیوں کو توڑتا ہوا سینے پر نمودار ہو گیا۔ افغان حکمران ڈگمگایا اور گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ پھر ابراہیم لودھی کے جسم کو اسی کے محافظ سپاہیوں کے گھوڑوں نے پامال کر دیا۔ سلطان کے مرتے ہی اس کی فوج نے بھی میدان چھوڑنا چاہا' مگر مغل سپاہی مسلسل تعاقب کر کے دشمنوں کو تہہ تیغ کر رہے تھے۔ بابر کے جانبازوں کی مستعدی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے جنگی ہاتھیوں کو بھی میدان سے بھاگنے نہیں دیا۔ یہ طاقتور جانور جنگی نقطہ نظر سے ایک قیمتی اثاثہ تھے۔ مغل سپاہیوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ابراہیم لودھی کے ان ہاتھیوں کو بھی گھیر لیا اور ان کے جھنڈ کے جھنڈ ہانک کر اپنے لشکر میں لے آئے۔ اس خونریز جنگ میں سولہ ہزار افغان اور پچاس ہزار دوسرے ہندوستانی سپاہی

ہوئے تھے۔

اس وقت تک ابراہیم لودھی کا قتل مشکوک تھا۔ اس لئے جو سپاہی بھی ملتا' اسے بے دریغ موت کے گھاٹ دیا جاتا۔ بالآخر قتل و غارت کا یہ طوفان اس وقت رکا جب بابر کی نظر ایک کچلی ہوئی لاش پر پڑی۔ مغل ناہ نے اس مرنے والے شخص کو بغور دیکھا اور فوراً ہی گھوڑے کی پشت سے نیچے اتر آیا۔ اس لاش کا لباس رے سپاہیوں سے مختلف بھی تھا اور نہایت قیمتی بھی۔ بس یہی وہ مخصوص علامت تھی' جسے دیکھ کر بابر کو چونک پڑا تھا۔

''ادھر آؤ! اسے دیکھو اور پہچانو۔ یہ کون ہے؟'' بابر اپنے چند معتمد سرداروں سے مخاطب تھا جو سائے کی ح اس کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ''کہیں یہ ابراہیم لودھی تو نہیں؟''

مغل سردار بھی اپنے فرمانروا کی تقلید میں اس لاش پر جھک گئے جس کا باقی جسم گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا چکا تھا' مگر حیرت انگیز طور پر چہرہ پوری طرح محفوظ تھا۔ مغل سردار کچھ دیر تک لاش پر جھکے رہے لیکن مرنے لے کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ ''شہنشاہ یہ شخص اپنی ظاہری وضع قطع سے یقیناً کوئی ذی حیثیت افغان ہے۔ بس ما سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

بابر نے فوری طور پر چند افغان قیدیوں کو اسی مقام پر طلب کر لیا اور ان سے تصدیق چاہی کہ مرنے والا نص سلطان ابراہیم لودھی ہے یا کوئی اور؟ افغان جنگی قیدی بھی مرنے والے کی شخصیت کا سراغ نہ دے سکے۔ فل شہنشاہ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر افغان جنگی اسیروں کی ایک اور جماعت کو سلطان ابراہیم لودھی کی شناخت کے لئے بلایا۔ بالآخر بڑی تگ و دو کے بعد ایک افغان قیدی نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ مرنے والا سلطان ابراہیم لودھی کے سوا کوئی اور نہیں۔

اس تصدیق کے ساتھ ہی بابر نے اعلان کرا دیا کہ شہنشاہ کو عظیم الشان فتح حاصل ہو چکی ہے اور سلطان ابراہیم لودھی مارا جا چکا ہے۔ اس لئے بے گناہ لوگوں کا قتل عام بند کر دیا جائے اور جو معافی طلب کرے اس کو معاف کر دیا جائے اور جو شاہی پناہ میں آنا چاہے اسے پناہ دے دی جائے۔

جب میدان جنگ میں ہر طرف نقیبوں کی آوازیں گونجنے لگیں تو دوسرے محاذوں پر لڑنے والے تمام مغل سردار فتح کی مبارکباد دینے کے لئے اپنے شہنشاہ کی طرف دوڑ پڑے۔ سب سے آخر میں شہزادہ ہمایوں مرزا اور احمد جمال بابر کے پاس پہنچے۔

ولی عہد سلطنت بڑے بے تابانہ انداز میں گھوڑے سے اترا اور دیوانہ وار بھاگتا ہوا باپ کے قریب آیا۔ پھر اس فرش خاک پر گھٹنوں کے بل جھک کر بے اختیار بابر کے ہاتھوں کو بوسے دینے لگا۔ ''شہنشاہ معظم کو یہ بے مثال فتح مبارک ہو۔''

بابر بھی بیٹے کی والہانہ محبت سے متاثر ہو کر جھکا اور دونوں بازو پکڑ کر شہزادہ ہمایوں مرزا کو کھڑا کیا۔ پھر ولی عہد سلطنت کی کشادہ اور روشن پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ''تمہیں بھی مبارک ہو فرزند کہ اس فتح میں جتنا تمہارے باپ کا حصہ ہے اسی قدر تمہارا بھی ہے۔''

شہزادہ ہمایوں کی مبارکباد وصول کرنے کے بعد بابر احمد جمال کی طرف متوجہ ہوا جو اپنی باری کا منتظر تھا۔ مغل شہنشاہ سے نظریں ملتے ہی احمد جمال چند قدم آگے بڑھا آداب شاہی کے مطابق نصف قد تک خم ہو کر

ام پیش کیا اور بہ آواز بلند بابر کو مبارکباد دینے لگا۔ ''عزت مآب کو یہ خادم سب سے آخر میں مبارکباد پیش کرتا ہے۔''

''سب سے آخر میں نہیں، سب سے پہلے۔'' بابر مسکرایا اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں احمد جمال کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''احمد! تمہیں تو اس فتح کے بارے میں اس وقت بھی بے یقینی نہیں تھی، جب میں خانہ بدوشی کی حالت میں در بدر مارا پھر رہا تھا۔''

''میرے یقین کی وجہ میرا ذاتی علم نہیں بلکہ سید مہدیؒ اور حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی ذات گرامی تھی۔''

احمد جمال انتہائی باوقار لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بول رہا تھا اور تمام مغل سردار جنہوں نے اپنے بادشاہ کے گرد ایک طویل دائرہ قائم کر لیا تھا بڑی حیرت سے اس پراسرار گفتگو کو سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سید مہدیؒ اور موسیٰ عاشقاںؒ کون ہیں اور ان لوگوں کا اس فتح سے کیا تعلق ہے؟

''تم نے درست کہا احمد!'' یکا یک بابر کا لہجہ پرسوز ہو گیا تھا۔ ''وہ بہت بڑے لوگ تھے اور ان کی آنکھوں کی روشنی ہماری بینائی سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے گنتی کے سپاہی اتنے بڑے لشکر کو آن کی آن میں تہہ تیغ کر ڈالیں گے۔ بے شک! یہ خدا ہی کی طاقت لازوال کا کرشمہ ہے اور انہی بزرگوں کی دعاؤں کا ثمر ہے جن کے ہاتھ میرے لئے برسوں دراز رہے ہیں۔''

''شہنشاہ ذی وقار! بلاشبہ یہ فتح بڑی نشاط انگیز اور کیف آور ہے، مگر بہ ایں ہمہ اس میں ایک خاص سامان عبرت بھی پوشیدہ ہے۔''

یکا یک احمد جمال بہت زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ ''وہ شخص جو خاک و خون میں نہایا ہوا زمین پر پڑا ہے اسے کچھ دیر پہلے بے شمار لوگ سلطان ابراہیم لودھی کہہ کر پکارتے تھے۔ اسے قدرت نے سنبھلنے کے لئے بہت مہلت دی، مگر وہ زندگی بھر حیوانوں کی طرح صرف اپنے نفس کی پرستش کرتا رہا۔ پھر ناگہاں غیبی ہاتھ نے اسے پکڑ لیا اور اس کی داستان حیات کو ورق ورق کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ ایک نظر تو دیکھئے کہ چاروں طرف کیسا سناٹا ہے؟ اس کے طبل و علم، تاج و تخت، دست بستہ امراء اور خدمت گار، کنیزوں اور لونڈیوں کی طویل قطاریں، مطرباؤں اور رقاصاؤں کے طائفے، سیم و زر کے انبار اور عیش و عشرت کے مینا بازار، یہ سب اسے چھوڑ کر یک بیک کہاں چلے گئے؟

میرے فاتح سردار! ذرا اس شخص کی بے چارگی تو دیکھئے کہ آج اس کی لاش پر نہ کوئی ماتم کرنے والا ہے اور نہ کوئی دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھانے والا۔ اللہ کسی شخص کو سب کچھ دے کر اتنا بھی محتاج نہ بنائے۔ اس نے اپنے چند روزہ اقتدار میں سب کو ناراض کر دیا تھا اور لوگوں کی یہ ناراضگی آپ کی فتح کا سبب بنی۔ خالق کائنات [illegible] اعلیٰ ظرف شہنشاہ کے دل و دماغ کو اتنا کشادہ کر دے کہ مخلوق خدا کی اکثریت اس سے راضی ہو جائے۔ [illegible] حقیقی فتح ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔''

[illegible] اس موقع پر دوسرے مغل سرداروں کو احمد جمال کی یہ خشک اور ناصحانہ گفتگو سخت گراں گزر رہی تھی، [illegible] چہرے پر ایک خاص تاثر نمایاں ہو چلا تھا۔ مغل فرماں روا بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے احمد [illegible] گلے لگا لیا۔ ''ایسا ہی ہو گا میرے بھائی، میرے دوست!'' بابر کے لہجے نے شدید جذباتیت اختیار کر لی [illegible] اس انداز میں کسی نے مبارکباد پیش نہیں کی۔ بس یہی تمہاری خاص ادا ہے کہ ہمیشہ حق بات

ہو اور کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔ اپنے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور ہر موسم میں انسان ہی رہے ہو اور ایسے انسانوں سے مجھے بڑی محبت ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم بڑے ناسازگار حالات میں میرے دوش بدوش رہے اور بڑی جرأت کے ساتھ مجھے غلط راستوں پر چلنے سے روکا۔''

مغل سرداروں کے چہروں پر ابھر آنے والا ناپسندیدگی کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا انہیں شہنشاہ بابر اور احمد جمال کے قریبی اور بے تکلفانہ مراسم سخت ناپسند تھے، مگر کوئی سازش اس لئے نہیں کرتے تھے کہ احمد جمال کو کسی عہدے یا اقتدار کی طلب نہیں تھی۔

⌑ ⌑ ⌑

کئی ماہ سے مختلف جنگوں میں مصروف رہنے کے باعث بابر بہت زیادہ تھک چکا تھا، مگر اس نے ایک دن کے لئے بھی آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا اور برق رفتاری کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا، آئے دن کی جنگوں کی وجہ سے پرانی دہلی کے بہت سے حصے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ اس لئے سلطان سکندر لودھی کے زمانے ہی سے آگرہ دارالحکومت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگرچہ مغل شہنشاہ نے جنگ جیت لی تھی لیکن دونوں تاریخی شہر ابھی اس کی دسترس سے دور تھے۔ اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے بابر نے شہزادہ ہمایوں اور احمد جمال کو اس ہدایت نامے کے ساتھ آگرہ روانہ کیا۔

''بے سبب قتل و غارت سے گریز کرنا، امان طلب کرنے والوں کو امان دینا، صلح پسندوں سے محبت و شفقت کا سلوک روا رکھنا تاکہ یہاں کی رعایا تمہیں ابراہیم لودھی سے بہتر انسان تصور کرے۔''

جب شہزادہ ہمایوں مرزا اور احمد جمال پانچ ہزار سواروں کے ہمراہ آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے تو بابر نے دہلی کا رخ کیا۔ مغل شہنشاہ بروز منگل 12 رجب 932ھ کو اس طرح دہلی کی حدود میں داخل ہوا کہ اس کے چہرے پر غرور تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔

مقامی لوگوں کا ایک ہجوم دہلی کے نئے حکمران کو دیکھنے کے لئے شاہراہوں پر سمٹ آیا تھا۔ بابر کے نقیب چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔

''شہنشاہ بابر کی طرف سے تم سب کے لئے امان ہے۔''

لوگوں کے چہروں پر اطمینان و سکون رقصاں تھا اور وہ بڑی محویت کے ساتھ ایک خوبصورت ترین حکمران کو اپنے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

بابر نے دہلی پہنچ کر قلعے اور شاہی محلات و باغات کی سیر کی۔ پھر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے بزرگان دین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا۔ احمد جمال کی طویل صحبت اور پانی پت کی غیر متوقع فتح نے اس کے نظریات میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ مذہب سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

دہلی میں دس روزہ قیام کے بعد بابر آگرہ روانہ ہوا۔

راجہ بکرماجیت نے جنگ میں ابراہیم لودھی کا ساتھ دیا تھا، اس لئے آگرہ کا قلعہ بھی اس کے آدمیوں کے قبضے میں تھا۔ شہزادہ ہمایوں مرزا نے دارالحکومت پہنچتے ہی قلعے کا محاصرہ کر لیا، دونوں حکمران میدان جنگ میں کام

آ چکے تھے' اس صورت میں ان کے مٹھی بھر اور بے دست و پا ملازمین ایک فاتح لشکر سے کیا مقابلہ کرتے؟
محاصرے کے پانچویں دن ہی راجہ بکرماجیت اور ابراہیم لودھی کے سہمے ہوئے خدمت گار ہمایوں کی بارگاہ جلا
میں حاضر ہوگئے اور قلعہ مغل شہزادے کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خدمت گار نے آٹھ مثقال
وزن کا ایک نایاب اور قیمتی الماس (ہیرا) ہمایوں کو بطور نذرانہ پیش کیا۔

یہ الماس دکن کی ایک جنگ میں سلطان علاؤ الدین خلجی کے ہاتھ آیا تھا' پھر جب بابر آگرہ پہنچا تو شہزا
ہمایوں مرزا نے یہ قیمتی ہیرا اپنے باپ کی نذر کر دیا۔ بابر نے بڑی حیرت سے اس تابناک پتھر کو دیکھا' واقعا
اپنی ساخت اور چمک دمک میں ایک بے مثال ہیرا تھا' جب مغل شہنشاہ نے ماہر جوہریوں کو طلب کر کے الما
کی قیمت متعین کرنے کے لئے کہا تو سارے جوہری عاجز رہ گئے۔ اکثر جوہر شناسوں نے ایک ہی بات کہی
اس ہیرے کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض جوہریوں کی رائے میں ساری دنیا کی ایک دن کی آمد
اس ہیرے کی قیمت کے برابر تھی۔

بابر نے یہ بات سنی تو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اگر واقعی یہ پتھر اتنا ہی قیمتی ہے تو پھر میں اسے ہمایوں کی نذ
کرتا ہوں کہ یہ اسی کے شایان شان ہے۔'' بابر کو اپنے بڑے بیٹے ہمایوں سے بے پناہ محبت تھی۔

¤¤¤

آگرہ پہنچنے کے دوسرے دن بابر نے قلعے میں پہلا دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں عام رعایا کو شریک
ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ دراصل مغل شہنشاہ مقامی باشندوں سے خطاب کر کے ان کے شکوک و شبہات د
کرنا چاہتا تھا۔ قلعے کے سبزہ زار میں بے شمار لوگ جمع تھے کہ اچانک محل کے ایک گوشے سے ایک عمر رسید
عورت چیختی ہوئی سبزہ زار کی طرف بڑھی۔

''جب تو نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا تو پھر مجھے بھی ہلاک کر دے ستمگر!''

بابر عورت کی ہذیانی چیخیں سن کر چونک اٹھا اور مغل سپاہیوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس عورت کو آگے
بڑھنے سے روکا۔

''یہ کون مظلوم عورت ہے؟'' بابر اس بوڑھی خاتون کی دلدوز چیخیں سن کر اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا تھا۔

ابراہیم لودھی اور راجہ بکرماجیت کے جو ملازم بابر کے حلقہ اطاعت میں شامل ہو گئے تھے' ان میں سے ایک
خدمت گار نے دست بستہ عرض کیا۔ ''یہ مقتول سلطان کی والدہ محترمہ ہیں۔ انہیں بیٹے کی موت کے صدمے نے
بدحواس کر دیا ہے۔''

یہ سن کر بابر کے چہرے کا رنگ اتر گیا اور بہ آواز بلند اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ان محترم خاتون کو میرے پاس آنے دو۔''

اپنے شہنشاہ کے حکم پر مغل سپاہیوں نے ابراہیم لودھی کی ماں کو تخت شاہی تک جانے کے لئے راستہ دے
دیا۔ بوڑھی عورت جس کے قوی اعصاب اس عمر میں بھی جوانوں جیسے تھے' تیز قدموں کے ساتھ بابر کے قریب
پہنچی اور انتہائی درشت لہجے میں مخاطب ہوئی۔

''جب تو نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا تو مجھے کس لئے زندہ چھوڑ دیا ہے۔''

''یہ تو جنگ کا منطقی نتیجہ ہے محترم خاتون!'' بابر کے لہجے کی شائستگی اور تحمل قابل دید تھے۔

''مجھے کسی کی موت اور زندگی پر کوئی اختیار نہیں' پھر بھی میں بہت نادم ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو یہ دن
پڑا۔''

''میں اس ذلت و بے چارگی کے ساتھ زندہ رہنا نہیں چاہتی۔'' ابراہیم لودھی کی ماں کا لہجہ بڑا گستاخانہ

''مجھے قتل کر کے اپنی فتوحات میں مزید اضافہ کر لے۔''

''مگر آپ اپنی زندگی سے اس قدر بیزار کیوں ہیں؟'' بابر مشتعل ہونے کے بجائے ایک غم زدہ ماں کی
کر رہا تھا۔

''کل تک جس عورت نے ہندوستان کے اتنے بڑے علاقے پر حکومت کی ہو' آج وہ نوکروں سے بھی بدتر
گزار رہی ہے۔''

بابر نے اسی وقت فرمان شاہی جاری کر دیا کہ سلطان ابراہیم لودھی کی والدہ معظمہ سے کسی معاملے میں کوئی
ں نہیں کی جائے گی اور ان کے تمام اختیارات ماضی کی طرح بحال رہیں گے۔ پھر مغل شہنشاہ نے ہزاروں
وں کی موجودگی میں اعلان کرتے ہوئے کہا۔

آج سے یہ محترم خاتون میرے لئے مادر گرامی کا درجہ رکھتی ہیں' ان کی تذلیل براہ راست شہنشاہ کی تذلیل
جائے گی اور ان کے احترام کو شہنشاہ کا احترام تصور کیا جائے گا۔''

آگرے کے مقامی باشندے بابر کے اس اعلان پر خوفزدہ تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ کس شان کا بادشاہ
جو اپنے دشمنوں کو معاف بھی کر رہا ہے اور ان کے زخموں کا مداوا بھی کر رہا ہے۔

¤¤¤

چند ماہ بعد جب مفتوحہ علاقوں کا انتظام مکمل ہو گیا تو بابر احمد جمال کو اپنے ہمراہ لے کر اجودھیا پہنچا۔ وہ
از جلد حضرت موسیٰ عاشقانؒ سے کئے ہوئے وعدے کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ سلطان سکندر لودھی کے مرتے
اس علاقے کے ہندو کچھ اور سرکش ہو گئے تھے۔ بابر پچیس سال بعد اس شہر میں دوبارہ داخل ہوا تھا' جب وہ
رت موسیٰ عاشقانؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا تو وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ پہلی بار وہ جن
بثوں سے ملا تھا' ان میں سے اکثر انتقال کر گئے تھے اور چند جو باقی رہ گئے تھے۔ بڑھاپے اور فاقوں کی
رت نے ان کی کمر دہری کر دی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ امیر الدین جو بابر ہی کا ہم عمر تھا۔ پینتالیس سال کی عمر
اسی برس کا بوڑھا نظر آتا تھا۔ اپنے وقت کے خوبصورت ترین مرد کا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا اور جسم پر جگہ جگہ
وں کے نشانات نمایاں تھے۔ احمد جمال تو اسے دیکھ کر رو پڑا تھا اور خود بابر کو بھی امیر الدین کی شکستگی کا بہت
وس تھا۔

جب مغل شہنشاہ نے امیر الدین سے اس کی صحت کی بربادی کا سبب پوچھا تو وہ کچھ دیر خاموش رہا' پھر اس
آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''شہنشاہ! بابا چلے گئے اور مجھے آتش فراق میں جلنے کے لئے تنہا چھوڑ گئے۔ شاید میں بھی چلا جاتا' مگر

آپ آنے کا وعدہ کر گئے تھے‘ اس لئے بڑی احتیاط سے سانس لیتا رہا کہ کہیں فضول خرچی کے سبب تمام سرما،
ہی ختم نہ ہو جائے۔‘‘

امیر الدین تو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے غموں کو چھپا گیا تھا‘ مگر ایک ساتھی درویش سے ضبط نہ ہو سکا ا
اس نے مغل شہنشاہ کو صاف صاف بتا دیا۔

’’امیر الدین کی صحت کی تباہی کا ذمہ دار شکنتلا کا جواں سال بیٹا بلرام سنگھ ہے‘ جو اپنی ماں کے کہنے پر ا
زدوکوب کرتا رہتا ہے۔ کئی بار تو یہ مرتے مرتے بچا۔‘‘

یہ واقعات اس قدر اندوہناک تھے کہ بابر بھی اپنا صبر و ضبط کھو بیٹھا‘ پھر اس نے شدید عالم غضب میں ا
سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ شکنتلا اور بلرام سنگھ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کریں۔

⌑ ⌑ ⌑

شہنشاہ بابر کا حکم سنتے ہی اس کے سپاہی راجپوتوں کی بستی کی طرف چلے گئے‘ مگر امیر الدین بہت زیادہ
ن نظر آنے لگا۔ ’’اس طرح تو اس کی بڑی رسوائی ہوگی شہنشاہ!‘‘ امیر الدین کے لہجے میں بڑی وحشت تھی‘
د تھا۔

’’کون رسوا ہوگا؟‘‘ اگرچہ بابر جانتا تھا کہ امیر الدین کس کی رسوائی کی طرف اشارہ کر رہا ہے لیکن پھر بھی
نے ایک عاشق جاں سوختہ سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

’’شکنتلا اور اس کا بیٹا بلرام سنگھ۔‘‘ امیر الدین نے خوفزدہ لہجے میں کہا اس کی آنکھوں میں بڑی بے چارگی

’’تمہیں ان ظالم حیوانوں کی اتنی فکر ہے؟‘‘ شہنشاہ بابر نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔ ’’آج سے پچیس
پہلے ایک خانہ بدوش کی حیثیت سے یہاں آیا تھا‘ اس وقت بھی میں نے ان درندہ صفت انسانوں کی
ن کے افسانے سنے تھے۔ پاؤ صدی گزر گئی‘ کتنے خونی انقلاب آئے اور کتنے سرکشوں کے غرور و ناز اور
حکمرانوں کے تاج و تخت خاک میں مل گئے‘ مگر ان ستمگروں کے آج بھی وہی انداز ہیں؟‘‘

غصے کی دھیمی دھیمی آگ سے بابر کا چہرہ تپنے لگا تھا۔

مغل شہنشاہ کے قہر و غضب کی یہ کیفیت دیکھ کر امیر الدین کچھ اور گھبرا گیا۔ ’’نہیں عالی جاہ! شکنتلا اور اس
بٹا بلرام سنگھ بے قصور ہیں۔ وہ تو اوباشوں کا ایک گروہ ہے جو مجھے میرے ماضی کے حوالے سے پریشان کرتا
ا ہے۔ یہ ان جنونی لوگوں کا ردعمل ہے جو میری تبدیلی مذہب سے خوش نہیں ہیں‘ وہ مجھے میرے اس جرم کی سزا
چاہتے ہیں کہ میں نے دیوی دیوتاؤں کو چھوڑ کر اسلام کیوں قبول کیا؟‘‘

امیر الدین شکنتلا اور اس کے بیٹے بلرام سنگھ کو غضب شاہی سے بچانے کے لئے کھلا ہوا جھوٹ بول رہا تھا۔
یلی مذہب کے آغاز میں مقامی برہمنوں اور راجپوتوں نے اسے کچھ دن تک ضرور ستایا تھا‘ مگر جب کچھ برہمن
راجپوت آفات ناگہانی کا شکار ہوئے تو اکثر ہندوؤں نے خوفزدہ ہو کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا‘ پھر
م سنگھ جوان ہوا تو ایک منتقم المزاج ماں نے بیٹے کو اپنے دودھ کا واسطہ دے کر اسے امیر الدین کے خلاف
کایا۔ بلرام سنگھ دولت‘ طاقت اور بڑے خاندانی پس منظر کے نشے میں اکثر امیر الدین کو زدوکوب کرتا اور کبھی
ی اس کے گلے میں اپنی پگڑی ڈال کر اس طرح کھینچتا کہ امیر الدین اوندھے منہ گر جاتا اور پھر بلرام سنگھ اسے
سیٹتا ہوا بہت دور تک لے جاتا۔ اس کشاکش میں امیر الدین کے سینے‘ ہاتھوں اور چہرے پر بہت سے زخم ابھر

آتے۔ سلطان سکندر لودھی کے دور اقتدار میں شمالی ہندوستان کے یہ شرقی علاقے کسی نہ کسی حد تک دہلی اور آئین کے پابند تھے' اسی لئے امیر الدین کچھ عرصے تک ظالموں کے جبر و تشدد سے محفوظ رہا تھا۔ مگر جب سلطان سکندر لودھی دنیا سے رخصت ہوا اور عنان حکومت اس کے مغرور اور جفا پیشہ بیٹے ابراہیم لودھی کے ہاتھوں میں آئی اجودھیا اور گردو پیش کے دوسرے علاقے مرکز سے کٹ کر من مانے طور پر زندگی گزارنے لگے۔ قدم قدم پر ظلم و ستم' لوٹ مار' شراب اور ہوس کاری کی دکانیں کھل گئیں۔ نیچ ذات کے لوگ جو پہلے ہی جانوروں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے' اس بدانتظامی کے دور میں نئے نئے مصائب کا شکار ہونے لگے۔ نہ عدالت تھی' نہ کوئی انصاف نہ قانون کے کارندے اور نہ کوئی منصف۔ بس دولت اور طاقت کا ایک رقص بلاخیز تھا جو شاہراہوں پر' چوراہوں گلی کوچوں میں' مکانوں میں' کھیتوں میں اور کھلیانوں میں پورے زور و شور کے ساتھ جاری تھا۔ سلطان ابراہیم لودھی کے دور حکومت میں شکنتلا کا بیٹا اپنی جوانی کی منزل کو پہنچا۔ پھر شدید انتشار کی فضا میں ٹھاکر کی بدمست جوانی بے لگام ہوگئی اور وہ مردہ قانون کی لاش پر کھڑے ہو کر وحشیانہ انداز میں ناچنے لگا۔ ٹھاکر بلرام سنگھ نئے انداز سے امیر الدین کو ستاتا اور اسے زخمی حالت میں چھوڑ کر یہ کہتا ہوا چلا جاتا۔

''دیوتاؤں کے غدار! میں تجھے اس وقت تک چین سے رہنے نہیں دوں گا جب تک تو میری ماں کے قدموں میں گر کر معافی نہیں مانگے گا اور اپنے نئے مذہب سے کنارہ کش ہو کر دوبارہ دیوتاؤں کے چرنوں میں پناہ نہیں ڈھونڈے گا۔''

ٹھاکر کا یہ اذیت رساں کھیل برسوں جاری رہا' مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ امیر الدین شکنتلا کے قدموں میں جھک جائے یا آفات و مصائب کی اس تیز دھوپ سے گھبرا کر قدآور مورتیوں اور مندروں کی دیواروں کا سایہ ڈھونڈنے لگتا۔ وہ ہر بار زخم کھا کر شکنتلا کی نشانی کو یہی دعائیں دیتا۔

''خدا تیری جوانی کو سلامت رکھے' مگر اس کے ساتھ ہی تجھے دیکھنے والی آنکھ بھی عطا کر دے۔''

ابھی بلرام سنگھ کے تشدد کا کاروبار جاری تھا کہ سلطان ابراہیم لودھی کو شکست ہوگئی اور شہنشاہ ظہیر الدین ان کے علاقوں کا مالک بن کر اجودھیا میں جلوہ افروز ہوا تا کہ حضرت موسیٰ عاشقانؒ سے کئے ہوئے پچیس سال پرانے عہد کی تکمیل کر سکے۔ بابر یہاں پہنچا تو ایک اور تکلیف دہ منظر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

مغل شہنشاہ نے بلاتاخیر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ شکنتلا اور بلرام سنگھ کو گرفتار کر کے اس کے حضور پیش کر دیں۔

بابر اپنے ایک کلمہ گو بھائی کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا تھا۔ مگر امیر الدین بار بار یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر سرے سے کوئی ظلم ہی نہیں ہوا ہے۔ پھر وہ شاہی عدالت میں اپنا مقدمہ کس طرح پیش کرے؟ شاید بابر امیر الدین کے پیش کردہ دلائل کو تسلیم کر لیتا لیکن حضرت موسیٰ عاشقانؒ کے ایک خدمت گزار درویش نے مغل شہنشاہ کے سامنے بلرام سنگھ کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم کی پوری داستان بے کم و کاست بیان کر دی۔

''امیر الدین! تمہارا یہ ساتھی کیا کہہ رہا ہے؟'' بابر نے اس کے ساتھی درویش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بیان کی روشنی میں تو تمہارا ہر دعویٰ غلط قرار پاتا ہے۔''

''یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے شہنشاہ!'' اچانک امیر الدین کے لہجے میں تندی و تیزی جھلکنے لگی تھی۔ ''میرے

حالات کا علم کسی دوسرے کو کس طرح ہو سکتا ہے؟''

''شہنشاہ عالی مرتبت!'' حضرت موسیٰ عاشقانؒ کے دوسرے خدمت گار نے عرض کیا۔ ''امیر الدین کے حالات تو ایک کھلی کتاب کی طرح ہیں' جسے اس بستی کے بے شمار لوگوں نے بار بار پڑھا ہے۔ آپ اجودھیا کے کسی بھی باشندے سے دریافت کر لیجئے۔''

''شہنشاہ! یہ سب لوگ میرے خلاف صف بستہ ہو گئے ہیں۔'' امیر الدین شدید بے چارگی کے عالم میں آب دیدہ ہو گیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں خود ہی عدالت عالیہ میں اپنا مقدمہ پیش نہیں کر رہا ہوں تو میرے وکیل اور ترجمان کہاں سے آگئے؟''

''تمہارے مقدمہ قائم کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' بابر کے لہجے سے جلال شاہی نمایاں تھا' لیکن ابھی اس کا انداز گفتگو دوستانہ تھا۔ ''تمہارے یہ وکیل اور ترجمان دراصل مظلومیت کے وکیل اور ترجمان ہیں' اگر یہ لوگ اس موقع پر خاموشی اختیار کر لیتے تو میں سمجھتا کہ حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی طویل صحبت کے باوجود ان کی تربیت نامکمل رہ گئی ہے۔ لیکن آج انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ سچے مسلمان ہیں' اگر ان کے عقائد کمزور ہوتے تو یہ تمہارے درد کی لہروں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس نہیں کرتے' انہیں تمہارے مقدمے کا گواہ بننا ہی چاہئے تھا۔''

''شہنشاہ کا ارشاد بجا' مگر میں تو کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔'' امیر الدین اپنی اس بات پر قائم تھا۔ ''میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ مجھے شکنتلا اور بلرام سنگھ سے کوئی شکایت نہیں ہے' عزت مآب! آپ کو خدا کا واسطہ! اپنے سپاہیوں کو واپس بلا لیجئے۔ اگر شہنشاہ کے خیال میں وہ لوگ ایذارسانی کے مجرم ہیں تو انہیں مجھ پر ظلم کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں انکے دیوتا کا باغی ہوں اور ایک باغی کی سزا کا خاتمہ اس کی موت سے پہلے نہیں ہوتا۔''

امیر الدین نے شکنتلا اور بلرام سنگھ کو بچانے کے لئے ایک عجیب دلیل پیش کی تھی' مگر شہنشاہ بابر نے بڑی سختی سے اس کی اس دلیل کو مسترد کر دیا۔ ''اگر دیوتاؤں کے پرستار اپنے ایک باغی پر ظلم کرنے کا حق رکھتے ہیں تو ان لوگوں کے بھی کچھ حقوق ہیں جو بتوں کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے اور ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ آج میں اپنا یہی حق استعمال کر رہا ہوں۔ میں نے شکنتلا اور اس کے بیٹے کو صرف اس لئے طلب کیا ہے کہ میں انہیں آخری بار تنبیہ کر سکوں' اگر وہ خوشی سے اپنے مظالم کا کاروبار بند کرنے پر آمادہ ہو گئے تو میں صرف تمہاری خاطر ان کے ماضی کی سفاکیوں کو فراموش کر دوں گا اور اگر انہوں نے کثرت تعداد کے نشے میں میری بات نہیں سنی تو پھر میں پوری ہندو قوم کو بتا دوں گا کہ اس زمین پر اللہ کے نام لیوا بے یارومددگار نہیں ہیں' جب کوئی سر پھرا صلح د
کی زبان نہیں سمجھتا تو پھر میں اس سے شمشیر و سناں کے لہجے میں گفتگو کرتا ہوں۔''

بابر کے تیور بہت خطرناک تھے۔ امیر الدین کچھ سہم سا گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔ ''شہنشاہ! ان دونوں کی طرف میرا کوئی حساب نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر معاف کر دیا۔ آپ بھی انہیں معاف کر دیجئے۔ یہ آپ کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔''

بابر امیر الدین کی گفتگو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ مغل شہنشاہ اس راز سے تو واقف تھا کہ امیر الدین قبول اسلام کے بعد بھی شکنتلا سے محبت کرتا ہے' مگر اسے اس محبت کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ بابر خود بھی ایک صاحب

دل انسان تھا' آج جب اس نے دوسرے صاحب دل کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیسا عجیب شخص تھا؟ مر جا!! چاہتا ہے' مگر محبوب کی شکایت نہیں کرتا۔ خود اس کی روح' دل اور جسم زخموں سے بھرے ہوئے ہیں' مگر ... کے چہرے پر کوئی زخم تو کجا' ہلکا سا عکس ملال بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ بابر کو امیر الدین کی وفا شعاری اور جاں ... نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔

''اگر یہ میرا ذاتی مسئلہ ہوتا تو شاید چشم پوشی اور درگزر سے کام لیتا' لیکن یہ براہ راست حقوق ... معاملہ ہے اور اس سلسلے میں میرا قانون بہت سخت ہے۔'' بابر نے مصنوعی طور پر اپنی آواز کو سخت بنا لیا تھا ... چہرے پر غصے کے آثار پیدا کر لئے تھے۔ ''کسی دشواری کے بغیر مجھے میرے فرائض ادا کرنے دو تا کہ اہل ... قانون بابری کی حیثیت واضح ہو جائے۔ یہاں کے لوگ صدیوں سے کسی کھلونے کی طرح قانون کے ساتھ ... پسندیدہ انداز میں کھیلتے رہے ہیں۔

مگر آج انہیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ ان کا کھیل ختم ہو چکا ہے اور سینکڑوں سال سے آئین کی بھوکی اس زمین کو اس کی غذا فراہم کر دی گئی ہے۔ اب یہاں ہر موڑ پر عدالتیں قائم ہوں گی اور مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر ہر شخص کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ بھلائی کی طرف آنے والوں کے ساتھ نرمی برتی جائے گی' چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں...... اور ظالموں کو ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا' چاہے وہ میری قوم سے تعلق رکھنے والے مغل ہی کیوں نہ ہوں؟''

بابر کی وضاحت کے باوجود امیر الدین بار بار مغل شہنشاہ سے یہی درخواست کرتا رہا کہ شکنتلا اور بلرام سنگھ سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے۔ وہ اپنے دل سے مجبور تھا اور شہنشاہ ظہیر الدین بابر اپنے قانون سے' یہاں تک کہ مغل سپاہی شکنتلا اور اس کے بیٹے بلرام سنگھ کو لے کر اپنے بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئے۔

شکنتلا اور بلرام سنگھ کے ہمراہ سینکڑوں راجپوت مرد بھی آئے تھے جو ان دونوں ٹھاکر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تمام راجپوت مسلح تھے اور ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گرد منڈلانے والے کسی سنگین خطرے سے بے خبر نہیں ہیں۔ شہنشاہ بابر نے ٹھاکروں کی چڑھی ہوئی مونچھوں اور ٹیڑھی گردنوں کو بغور دیکھا' پھر وہ ہندوستان کی سب سے زیادہ جنگجو اور شجاع قوم سے مخاطب ہوا۔

''یقیناً تم لوگ مجھ سے واقف ہو گے کہ میں کون ہوں اور یہاں کس لئے آیا ہوں؟'' بابر کے انتہائی پرجلال لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ مغل شہنشاہ کی آواز قدرتی طور پر بہت شیریں تھی لیکن جب وہ اپنی افواج اور رعایا سے گفتگو کرتا تھا تو سننے والوں کو اس کے لہجے میں ایک عجیب سی گرج اور دھمک محسوس ہوتی تھی۔ اجودھیا کے راجپوت بھی بابر کے لہجے کی اسی گرج اور دھمک کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔

''ہاں! ہم جانتے ہیں کہ آپ اس علاقے کے نئے مالک ہیں' مگر شکنتلا اور ٹھاکر بلرام سنگھ کی طلبی کا مقصد ہماری سمجھ سے باہر ہے۔'' ٹھاکر ہمیر سنگھ نے بلند آواز میں کہا۔ رشتے کے لحاظ سے یہ معزز اور طاقتور راجپوت شکنتلا کا بڑا بھائی اور بلرام سنگھ کا حقیقی ماموں تھا۔ ''شکنتلا ایک غمزدہ بیوہ ہے اور بلرام سنگھ ایک مظلوم اور یتیم لڑکا...... پھر ان دو بدنصیبوں سے سمراٹ کو کیا شکایت ہو سکتی ہے؟'' ٹھاکر ہمیر سنگھ ایک تجربہ کار اور حوادث آشنا انسان تھا۔ اس لئے پہلی نظر میں صورتحال کو سمجھ گیا اور آتے ہی اپنی بہن اور بھانجے کی وکالت کرنے لگا۔

''یہاں مظلوم کون ہے اور ظالم کون؟ اس کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا ٹھاکر! مگر میں یہ بات پورے وثوق سے ...کہتا ہوں کہ تم مجھے پہچانتے نہیں۔'' بابر نے ہمیر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ پر زور ...ہوئے کہا۔

ہمیر سنگھ نے گھبرا کر مغل شہنشاہ کی طرف دیکھا اور گہری نظروں سے اس شخص کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا' ...کی پیشانی پر نئے ہندوستان کی تقدیر لکھی ہوئی تھی۔

''یہ بہت پرانا قصہ ہے ٹھاکر!'' مغل شہنشاہ نے ہمیر سنگھ کی ذہنی کشمکش کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ...سے پچیس سال پہلے سمرقند و فرغانہ کے ایک معزول اور خانہ بدوش حکمران کی حیثیت سے حضرت موسیٰ ...ماں'' کی بارگاہ جلال میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت یہاں کے برہمن اور راجپوت میری جان کے درپے تھے اور ...میرے چند جاں نثاروں کے ساتھ اسی زمین میں دفن کر دینا چاہتے تھے...... مگر اللہ نے حضرت شیخ کی ...نیں سنیں اور مجھے تمہارے فتنہ و شر سے محفوظ رکھا۔'' یہ کہتے کہتے اچانک بابر اداس ہو گیا تھا۔ ''وہ مرد روشن ...بر جو کچھ دن پہلے تم نادانوں اور نابیناؤں کے درمیان سے اٹھ کر چلا گیا' اسی برگزیدہ انسان نے مجھ سے وعدہ ...تھا کہ جب میں اس سرزمین پر قدرت اختیار حاصل کر لوں تو اسی جگہ خانہ خدا کی بنیاد رکھوں اور اس کی ...ناروں کو اس حد تک بلند کروں کہ دور دور سے اس کے روشن مینار نظر آئیں۔ آج میں اسی عہد کی تکمیل کے ...لئے یہاں آیا ہوں۔''

ٹھاکر ہمیر سنگھ نے شہنشاہ ظہیر الدین کی باتوں کو غور سے سنا اور پھر بہت آہستہ سے بولا۔ ''لیکن مسجد کی تعمیر ...سے میری بیوہ بہن شکنتلا اور یتیم بھانجے کا کیا تعلق ہے؟'' ٹھاکر کے لہجے کی حیرت برقرار تھی۔ ''کیا ان دونوں ...نے آپ کے سپاہیوں کے ساتھ گستاخی کی ہے یا مسجد کی تعمیر پر کوئی اعتراض کیا ہے؟'' ہمیر سنگھ بڑی ہوشیاری ...سے بات بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بابر نے ماضی کا ذکر چھیڑا تو ایک ایک منظر ٹھاکر کی آنکھوں کے سامنے ...ابھر آیا اور پھر اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں مغل شہنشاہ اس بستی کے لوگوں سے شدید انتقام لے کر انہیں تباہ و برباد نہ ...کر ڈالے۔

''ٹھاکر! تو بہت خود غرض اور ہوشیار انسان ہے۔'' بابر نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''جب تیرے اپنے خونی رشتوں پر آنچ آئی تو میرے حضور فریاد کرنے چلا آیا' مگر جب میں نے ان درویشوں کا ذکر چھیڑا جو برسوں تیری قوم کے مظالم کا شکار رہے ہیں تو تُو اس طرح انجان بن گیا کہ جیسے تو اس بستی کا رہنے والا ہی نہیں ہے۔'' یکایک بابر کے لہجے کی گرج کچھ اور تیز ہو گئی تھی...... ''آخر میں ان معصوم اور بے ضرر انسانوں پر توڑی جانے والی قیامتوں کا حساب کس سے طلب کروں؟'' یہ کہہ کر مغل شہنشاہ نے ان تمام راجپوتوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جو ٹھاکر ہمیر سنگھ کے ہمراہ آئے تھے۔

بابر کا سوال سن کر ٹھاکروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پانی پت کی جنگ شروع ہونے سے پہلے اجودھیا کے برہمنوں اور راجپوتوں نے مغل حملہ آور کے بارے میں کچھ تصوراتی خاکے بنائے تھے کہ سلطان ابراہیم لودھی اور راجہ بکرماجیت جیسے طاقتور حکمرانوں کو ان کے علاقوں میں للکارنے والا' چنگیز و ہلاکو اور امیر تیمور کا وارث کوئی تند مزاج اور درشت خو طالع آزما ہو گا' جس کے چہرے پر وحشت و درندگی برس رہی ہو گی۔ مگر جب بابر ان کے روبرو آیا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں فرط حیرت سے پتھرا کر رہ گئیں۔ وہ ان کے اندازوں سے کہیں

زیادہ مہذب' شائستہ اور خوبصورت انسان تھا۔ سامنے کھڑے ہوئے راجپوتوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ان کے دیو مالائی کرداروں کی طرح بظاہر اس نرم و نازک اور حسین شخص نے دس بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ انتہائی مختصر سے وقت میں ایک لاکھ راجپوتوں اور افغانوں پر فیصلہ کن برتری حاصل کر کے انہیں شکست و بربادی کے تاریک غاروں میں دھکیل دیا تھا۔

''مجھے بتاؤ کہ میں حضرت موسیٰ عاشقاںؒ اور ان کے خدمت گاروں پر کئے جانے والے مظالم کا حساب کس سے طلب کروں؟'' بابر کی آواز دوبارہ گونجی۔

ٹھاکر ہمیر سنگھ اور دوسرے راجپوتوں نے گردنیں جھکا لیں۔

''ہے تم میں ایسا کوئی سورما' جو اپنے گناہوں کا کھلے عام اعتراف کرے۔'' مغل شہنشاہ نے تیسری بار پکار کر کہا۔

کون ہے وہ جوانمرد جو اپنے آپ کو محاسبے کے لئے میرے سامنے پیش کرے۔

راجپوتوں کے سر بدستور جھکے ہوئے تھے اور ان کی صفوں پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔

''کوئی نہیں۔'' مختصر سی خاموشی کے بعد بابر نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا کہ انسانوں کی اکثریت طاقت کے آگے سر جھکانے کی عادی ہے۔ کمزوروں کے سامنے خم ہونا بڑے حوصلے کی بات ہے اور وہ حوصلہ تم لوگوں میں نہیں۔''

راجپوت مغل شہنشاہ کی اس طعنہ زنی کو بھی برداشت کر گئے کہ رانا بکرماجیت کی شکست نے ان کی پیشانیوں اور گردنوں کے سارے بل نکال دیئے تھے۔

''پھر تم کیا سوچ کر ان درویشوں کی دل آزاری کیا کرتے تھے؟'' بابر کے لہجے میں وہی تپش تھی۔ ''کیا تم سمجھتے تھے کہ وقت کی گردش کا ایک ہی انداز رہے گا اور تمہاری من مانیوں کا سورج ایک ہی زاویے سے چمکے گا اور مجبوریوں کی ٹھٹھری ہوئی رات تم پر کبھی مسلط نہیں ہوگی؟''

اجودھیا کے راجپوتوں اور برہمنوں کے دل و دماغ کو بابر کے لہجے کی آگ جلائے ڈال رہی تھی' مگر وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے کہ ان کے جرائم بہت زیادہ تھے اور حساب لینے والا بہت سخت۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایک بیوہ عورت اور اس کے لڑکے سے انتقام لوں گا؟'' بابر نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''اگر میں انتقام لینے والا ہوتا تو تمہارے مکانوں کو جلا کر راکھ کر دیتا اور تمہارے گلی کوچوں کو تمہاری ہی لاشوں سے بھر دیتا۔ آج مجھے یہاں روکنے والا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔''

جب ٹھاکر ہمیر سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اس کے سر سے موت کا خطرہ ٹل چکا ہے تو اس نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔ ''جب سمراٹ اس پہاڑی ٹیلے پر ایک مسجد تعمیر کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں تو پھر میری بہن اور بھانجے کی طلبی کا کیا سبب ہے؟''

''یہ دونوں امیر الدین کے مجرم ہیں۔'' شہنشاہ بابر نے حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے مرید خاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شکنتلا راجپوتوں کی عام روایت کے مطابق لمبا گھونگھٹ نکالے کسی مجسمے کی مانند ساکت کھڑی تھی اور بلرام سنگھ کا چہرہ خوف دہشت سے زرد ہو رہا تھا۔

''تو اس پاکیزہ کردار اور بے گناہ شخص پر کس سبب سے بغیر تشدد کیوں کرتا ہے؟'' مغل شہنشاہ انتہائی درشت
یں نوجوان راجپوت بلرام سنگھ سے مخاطب ہوا' شدت غضب سے اس کی شریانوں میں خون کھولنے لگا تھا۔
نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟''

بلرام سنگھ بابر کی بات سن کر کانپنے لگا۔ اس نے آج تک اپنی خاندانی طاقت کے نشے میں صرف کمزور
دں کو ستایا تھا' آج جب ہندوستان کا سب سے زیادہ طاقتور انسان اس کے سامنے آیا تو وہ خوف و دہشت
رزنے لگا۔

''بزدل راجپوت زادے! اگر میں اپنے تازیانوں سے تیرا جسم لہولہان کر دوں اور تیری مضبوط ہڈیاں توڑ کر
اپاہج بنا ڈالوں تو میرا یہ عمل خلاف قانون ہرگز نہیں ہوگا۔'' بابر شعلہ بار لہجے میں بول رہا تھا۔

بلرام سنگھ کو چند قدم کے فاصلے پر اپنی موت رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ نتیجتاً اس کی ساری شجاعت اور سرکشی
ہو گئی اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ''سمراٹ! میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو میری ماں نے آج تک
بتایا کہ یہ شخص بڑا پاپی ہے اور اسی کی وجہ سے میرے باپ کی موت واقع ہوئی تھی۔''

بابر کچھ دیر پہلے امیر الدین کے ساتھ درویش کی زبانی تمام واقعات سن چکا تھا۔ اس لئے جیسے ہی بلرام سنگھ
بات مکمل ہوئی' بابر اس نوجوان لڑکے کو نظر انداز کر کے ہمیر سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ''ٹھاکر! آج اپنے بھانجے کو
کہ اس کے باپ کا قاتل کون ہے؟''

ہمیر سنگھ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجرمانہ لہجے میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''امرناتھ (امیر الدین) بلرام سنگھ کی
ت کا ذمے دار نہیں ہے۔ وہ تو خود اس برہمن زادے کو قتل کرنے گیا تھا' مگر اچانک گھوڑے سے گر کر مر گیا۔''

''اے اجودھیا کے راجپوتو! تم نے سنا کہ ٹھاکر ہمیر سنگھ کیا کہہ رہا ہے؟'' بابر نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔
پھر یہ پاگل لڑکا کس بنیاد پر امیر الدین کی جان کے درپے ہے؟ کیا تمہاری پوری بستی میں ایک بھی انصاف پسند
نہیں جو اس کے بے رحم ہاتھوں کو روک دیتا؟ اور کیا تم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس شہر میں کبھی کوئی عدالت آراستہ
یں ہوگی اور انصاف کرنے والے ادھر سے کبھی نہیں گزریں گے اور تمہارے ظلم کا کاروبار اسی طرح جاری رہے
گا؟''

راجپوت کیا جواب دیتے وہ تو خود موت و زیست کے درمیان معلق تھے۔

ٹھاکر ہمیر سنگھ کے انکشاف کے بعد بلرام سنگھ کی بری حالت تھی اور اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔
''میں تو آج تک ماتا جی کے دودھ کا حق ادا کرتا رہا ہوں۔'' نوجوان ٹھاکر کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔ ''اور
ماتا جی آج تک مجھ سے یہی مطالبہ کرتی رہی ہیں' سمراٹ! آپ ہی بتائیں کہ ایک بیٹا اور کیا کرتا؟'' بار ندامت
سے بلرام سنگھ کی گردن جھکی جا رہی تھی۔

''تو کیسا ٹھاکر ہے؟'' بابر کے لہجے میں شدید نفرت بھی تھی اور انتہا کا غصہ بھی۔ ''تو نے اس شخص کے جسم کو
زخموں سے بھر دیا جو تیری زندگی کو مہکانے کے لئے سدا بہار پھولوں کی دعائیں مانگتا ہے۔''

شرم و ندامت سے بلرام سنگھ کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔

''اور اے سنگدل عورت! تو بھی سن لے کہ قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی۔'' بابر مڑا اور شکنتلا
سے مخاطب ہوا' جو لمبے گھونگھٹ میں اپنا چہرہ چھپائے مٹی کی کسی مورت کی مانند بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

''تیری سفاک فطرت نے تجھے بیوگی کا لباس پہنایا اور تیرا جذبہ انتقام تجھے گیلی لکڑی کی طرح جلا رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تو کب تک جلے گی' مگر ایک دن بجھے گی ضرور...... اور وہ دن بڑا بھیانک ہوگا۔ لوگ تیری راکھ سمیٹتے ہوئے بھی ڈریں گے۔ میری عدالت کا فیصلہ تو یہی تھا کہ تجھے اور تیرے بیٹے کو ایسی سزا دوں کہ تم دونوں پر تمام عمر نزع کی سی کیفیت طاری رہے۔ مگر کیا کروں کہ امیرالدین کی التجا نے میرے قانون کو بے دست کردیا ہے۔ وہ اعلیٰ ظرف انسان آج بھی تمہاری بھلائی کے لئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے رکھتا ہے۔ ممکن کہ کل تم لوگ اس کی اعلیٰ ظرفی کو مجبوری و بے چارگی کا نام دیتے رہے ہو۔ مگر آج وہ تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ آزاد اور طاقتور ہے۔ جس طرح چاہے تم سے انتقام لے۔ میرا پورا لشکر اس کے اشارے کا منتظر ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں چاہتا۔ اس نے تمہیں معاف کردیا ہے۔ وہ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کا سچا پیروکار ہے۔ اس لئے برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتا ہے۔ میں بھی تمہیں امیرالدین کے طفیل معاف کرتا ہوں۔ میری طرف سے تمہیں اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے کی پوری آزادی ہے۔ مگر یاد رکھنا کہ میں اس آزادی کے جواب میں اپنے دینی بھائیوں کے لئے بھی مکمل آزادی چاہتا ہوں۔ اگر کسی مسلمان پر دائرہ حیات تنگ کیا گیا تو صرف زندگی ہی نہیں' تمہاری زمین بھی تم سے بے وفائی کرے گی۔ اجودھیا آگرے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر تم نے اپنی کثرت کے نشے میں کسی ایک مسلمان کا گھر اجاڑ دیا تو میں تمہارے پورے شہر کو کھنڈر بنا دوں گا۔''

راجپوت ڈرے سہمے واپس چلے گئے تھے اور امیرالدین نے اپنے دشمنوں کو نئی زندگی بخش دی تھی۔

☒ ☒ ☒

پھر بابر نے پورے اجودھیا کا دورہ کیا۔ ایک کھلے میدان میں تمام معتدر ہندو شہریوں کو جمع کر کے ان سے مخاطب ہوا۔

''میں سرجندی کے پار اس پہاڑی ٹیلے پر ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتا ہوں...... تم میں سے کسی شخص کو میرے اس عمل پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

برہمنوں اور راجپوتوں کا ہجوم خاموش کھڑا تھا۔ پھر مندر کے نئے پجاری پنڈت جیراج نے اس سکوت کو توڑا۔ ''سمراٹ! ہمیں مسجد کی تعمیر پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ یہ تو ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ اس مسجد کی تعمیر کے بعد ہمارے مسلمان بھائی بھی ایک خاص مقام پر اجتماعی عبادت کرسکیں گے۔'' پنڈت جیراج بڑے منافقانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ پنڈت رگھوناتھ کی موت کے بعد اجودھیا کے برہمنوں اور راجپوتوں نے اس ریاکار شخص کو بڑے مندر کا پجاری منتخب کیا تھا۔ جیراج کا خاندان اجودھیا کا دوسرا معزز برہمن خاندان تھا۔ صدیوں سے جیراج اور رگھوناتھ کے خاندان میں اقتدار کے لئے سرد جنگ جاری تھی' مگر رگھوناتھ کا گھرانا ہمیشہ اس جنگ میں غالب رہتا تھا۔ آخر کو سو سال کی کشمکش کے بعد جیراج کی خواہش پوری ہوئی اور وہ بڑے مندر کے منچ پر پجاری کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ اگر امرناتھ (امیرالدین) اپنا مذہب ترک کر کے مسلمان نہ ہو جاتا تو پنڈت جیراج بھی اسی طرح ناکام و نامراد دنیا سے چلا جاتا' جیسے اس کے دوسرے بزرگ اپنے سینوں پر ناآسودہ حسرتوں کے داغ سجائے چتا کی آگ میں جل گئے تھے۔ پنڈت جیراج رگھوناتھ سے بھی زیادہ ہوس پرست خودغرض اور متعصب برہمن تھا۔ اس کی منافقت کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی وہ دل ہی دل میں مغل شہنشاہ کو

گالیاں بک رہا تھا اور ظاہری طور پر اس طرح جھکا جا رہا تھا کہ اگر بابر ہلکا سا اشارہ کرے تو پنڈت جیراج بدے میں چلا جائے اور مغل شہنشاہ کے قدموں کی خاک اٹھا کر اپنے چہرے پر مل لے۔

بابر نے بہت غور سے اس ریاکار برہمن کو دیکھا۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ ''میں نے تم لوگوں کو اس لئے جمع ہیں کیا ہے کہ مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں تمہاری رضامندی حاصل کرسکوں۔'' یکایک بابر کا لہجہ سخت ہوگیا تھا۔ ''کوئی فاتح اپنی مفتوح رعایا سے اس کی مرضی نہیں پوچھتا...... دراصل میں اس علاقے کی جغرافیائی صورتحال سے قطعاً ناواقف ہوں' اس لئے میں نے بطور گواہ تم لوگوں کو کھلے میدان میں جمع کیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ یہ ویران پہاڑی ٹیلہ کس کی ملکیت ہے؟''

مغل شہنشاہ کا سوال سن کر کچھ دیر کے لئے برہمنوں' راجپوتوں اور دوسری ہندو قوموں کے مجمع پر سکوت طاری رہا۔ پھر یک بیک بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔ ''سمراٹ! یہ جگہ تو سینکڑوں سال سے اسی طرح ویران پڑی ہے' اجودھیا کے کسی شخص نے آج تک اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا۔''

''خوب اچھی طرح سوچ لو...... اگر ملکیت کا کوئی دعویدار ہے تو میرے سامنے آئے۔'' یہ کہہ کر بابر مقامی ہندوؤں کے ہجوم کو دیکھنے لگا۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی شخص آگے نہیں بڑھا تو مغل شہنشاہ نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پہاڑی کے گردونواح میں جس قدر بھی غریب لوگ آباد ہیں' میں اس جگہ کو ان ہی کی ملکیت تصور کرتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی بابر نے اودھ کے عامل میر باقی کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بڑی نقد رقم ان سب لوگوں میں برابر سے تقسیم کردے۔

پہاڑی ٹیلے کے گرد سارے کے سارے غریب اچھوت آباد تھے۔ جب اس پسماندہ قوم نے مغل شہنشاہ کا یہ اعلان سنا تو خوشی سے دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔ پھر جب غربت و افلاس کے مارے ہوئے ان لوگوں کا رقص تھما تو شہنشاہ ظہیرالدین بابر اجودھیا کے برہمنوں اور راجپوتوں سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ''تم لوگ گواہ رہنا کہ میں نے خود ہی اس ویران جگہ کے وارث پیدا کئے اور پھر تمام وارثوں کو ان کی جائیداد کی پوری پوری قیمت ادا کردی۔ اگر تم یہ راز جانتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ جب کوئی فاتح کسی ملک میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کی ہر چیز خود بخود اس کی جاگیر و ملکیت میں شمار ہونے لگتی ہے۔ میں تمہاری عبادت گاہوں کو 'فاتح کے قانون' میں شامل نہیں کرتا۔ مندروں اور دوسروں مذہبی مقامات کے علاوہ یہاں جو کچھ بھی ہے میرا ہے۔ تمہارے حکمران جنگ ہار چکے' اس لئے تم سب میرا مال غنیمت ہو' میں تمہیں جس طرح چاہوں لوٹ لوں اور جس انداز سے چاہوں برباد کرڈالوں۔'' بابر کے لہجے سے جلال شاہی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں تھا۔

مغل شہنشاہ کی یہ ادائے فاتحانہ دیکھ کر برہمنوں اور راجپوتوں کے چہروں پر موت کی پرچھائیاں لرزنے لگی۔

''آپ سچ کہتے ہیں سمراٹ!'' بہت سی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ ''ہم آپ کا دھن ہیں۔ ہمیں جس طرح چاہیں لٹائیں اور جس طرح چاہیں خرچ کرڈالیں۔'' یہ برہمنوں اور راجپوتوں کے دل کی آوازیں نہیں تھیں۔ وہ سب کے سب انتہائی جبر کے عالم میں بول رہے تھے۔

"مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔" بابر نے اسی طمطراق کے ساتھ کہا۔ "میں ایک مسلمان فاتح ہوں' اس لئے میرا قانون بھی دوسرے حملہ آوروں سے مختلف ہے۔ میں نے تمہارے مکانوں کو مسمار نہیں کیا' تمہارے کھیتوں اور سبزہ زاروں میں آگ نہیں لگائی' تمہارے مردوں کو قتل کر کے تمہاری عورتوں سے اپنے عشرت کدے آباد نہیں کئے اور تمہارے بچوں کو غلام نہیں بنایا۔ حالانکہ یہ سارے کام میرے حلقہ اختیار سے باہر نہیں۔ میں نے بلاتفریق تم سب لوگوں کو امان دی۔ اگرچہ تمہارے بہت سے ساتھی میری اس بخشش و عطا کے مستحق نہیں تھے۔ پھر بھی میں نے انسانیت اور رواداری کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی تاکہ تم اپنے ہم مذہبوں کو بتا سکو کہ کس شان کا شہنشاہ ہندوستان آیا ہے' جو کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھتا۔ اسی لئے میں نے تمہیں اس ویران پہاڑی کی قیمت بھی ادا کر دی ہے' جس کی ملکیت کا کوئی دعویدار نہیں تھا۔ اور آخری بات یہ کہ خود بھی عزت، وسکون کے ساتھ زندہ رہو اور میرے ہم مذہبوں کو بھی اسی انداز سے جینے دو۔ کسی شورش پسند سے دوستی نہ کرنا کہ ایسے لوگ بارگاہ شاہی میں معیوب قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ اگر تم نے میرے ساتھ وفا کی تو تمہاری زندگی کے موسم تم سے کبھی خفا نہیں ہوں گے اور اگر تم نے ماضی کی طرح منافقت اور غداری کا کاروبار جاری رکھا تو کالی گھٹاؤں سے خون برسے گا' نرم ہوا کے جھونکے شعلہ ریز آندھی میں بدل جائیں گے' دریاؤں کے میٹھے پانی میں زہر گھل جائے گا اور تمہارے کھیتوں سے اگنے والی ہر فصل موت کی فصل ہوگی۔"

مجمع منتشر ہو گیا' چھوٹی قوموں کے لوگ "سمراٹ بابر" زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور اجودھیا کے برہمن و راجپوت سینوں میں دبی ہوئی نفرتوں کی آگ لے کر اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔

⌑ ⌑ ⌑

شہنشاہ بابر نے اودھ کے ایک انتہائی دیانت دار اور محنتی شخص میر باقی کو اس علاقے کا نیا عامل مقرر کیا تھا۔ میر باقی سلطان ابراہیم لودھی کے دور اقتدار میں بھی اسی عہدے پر فائز تھا۔ اسے خوشامد اور مصاحبت کے انداز نہیں آتے تھے اور وہ اپنے ماتحتوں کو بھی رشوت اور دوسری بدعنوانیوں میں ملوث ہونے سے روکتا تھا' اس لئے چھوٹے افسران سلطان کے سامنے دن رات اس پر الزام تراشیاں کرتے رہتے تھے۔ نتیجتاً افغان حکمران نے اسے معزول کر دیا۔ دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد جب بابر کو اس علاقے کے لئے ایک دیانتدار منتظم کی جستجو ہوئی تو مقامی باشندوں کی اکثریت نے میر باقی کا نام لیا۔ آخر کچھ دن کی تحقیق کے بعد بابر نے اسے آگرہ طلب کر کے انعام و اکرام سے نوازا اور دوبارہ اسی عہدے پر بحال کر دیا۔ اب وہی میر باقی اجودھیا کے دورے میں نئے اعزاز کے ساتھ مغل شہنشاہ کے ہمراہ تھا۔

بابر نے میر باقی کو حکم دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں پہاڑی ٹیلے پر ایک ایسی عالیشان مسجد تعمیر کرائے جس سے خانہ خدا کے جلال و جمال کا بھرپور اظہار ہو۔ اس کے ساتھ ہی حضرت موسیٰ عاشقانؒ کے مزار اور اس کے قریب ہی درویشوں کے قیام کے لئے ایک خانقاہ کی تعمیر کا بھی حکم دیا۔ پھر جب مغل شہنشاہ اجودھیا سے رخصت ہونے لگا تو اس نے امیر الدین اور دوسرے درویشوں کے ماہانہ وظائف مقرر کئے۔

"شہنشاہ! اس کی ضرورت نہیں۔" امیر الدین نے ادب و احترام کے لہجے میں بابر کے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم فقیروں کے لئے دو سوکھی روٹیاں کافی ہیں۔"

"میں تم لوگوں کے لئے سامان تعیش کے انبار نہیں لگا رہا ہوں۔" بابر نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔ "میں نتا ہوں کہ تم بھوکے پیٹ رہ کر بھی اپنا ایک ایک عہد نباہ دو گے' مجھے تمہارے حوصلے اور ظرف پر ذرہ برابر بھی ـ نہیں ہے۔ میں تمہارے ہاتھوں کی عظمت و برکت سے خوب واقف ہوں کہ یہ ہاتھ جاں کنی کے عالم میں ی کشکول نہیں بنیں گے۔ مگر شاید تم اس راز سے باخبر نہیں کہ انسان ایک وقت میں ایک ہی کام انجام دے سکتا ہے۔ مجھے بتانے والوں نے بتایا ہے کہ تم دو روٹیاں حاصل کرنے کے لئے دن رات محنت کرتے ہو' پھر دینی اموں اور ریاضتوں کے لئے وقت کہاں سے لاؤ گے؟ اپنی کمزور جانوں پر حد سے زیادہ بار ڈالو گے' انجام کار نت سے پہلے تھک کر مر جاؤ گے یا پھر بیمار ہو کر خاک کا بستر پکڑ لو گے۔ پھر اس حالت میں تم اپنے فرائض کس رح انجام دو گے؟"

بابر کی باتیں سن کر امیر الدین اور اس کے تمام ساتھی درویش حیرت زدہ تھے۔ اگرچہ سلطان سکندر لودھی بھی یک شریف النفس حکمران تھا' لیکن اس نے بھی اس طرح درویشوں کی خبر گیری نہیں کی تھی۔

"تمہارے ذمے اتنے کام ہیں کہ تمہیں اپنی ذات کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی کب ملتی ہے؟" مغل شہنشاہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ حکومت وقت کا فرض ہے کہ وہ آبرومندانہ انداز میں تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے اور تمہیں معاشی طور پر اس قدر بے نیاز کر دے کہ تم کسی دشواری کے بغیر تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے سکو۔"

⌑ ⌑ ⌑

جب شہنشاہ بابر اجودھیا سے روانہ ہو کر آگرہ پہنچا تو بڑی پریشان کن خبریں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ مختلف علاقوں سے موصول ہونے والی بغاوت کی خبریں سن کر مغل سردار حوصلہ ہار بیٹھے تھے۔ بابر نے فوراً ہی اپنے ساتھیوں کی اس بے دلی کا اندازہ کر لیا تھا۔ نتیجتاً مغل بادشاہ نے آگرے کے قلعے میں ایک دربار عام منعقد کیا اور اراکین سلطنت سے لے کر عام و خاص اور تمام سپاہیوں کو بھی نہایت سختی سے تنبیہ کی کہ وہ اس دربار میں ضرور حاضر ہوں۔ پھر جب سلطنتِ مغلیہ سے تعلق رکھنے والا ایک ایک فرد، قلعے کے طویل و عریض میدان میں پہنچ گیا تو بابر اپنی مسند پر کھڑا ہوا اور انتہائی پُرجوش لہجے میں حاضرین سے خطاب کرنے لگا۔

"میرے جاں باز ساتھیو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رسالت پناہ حضور اکرم ﷺ کے بعد سے اس وقت تک تین فرمانروائے اسلام، ہندوستان آئے۔ اور انہوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ پہلے سلطان محمود غزنوی۔ اُس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات بھی شدید بدنظمی کا شکار تھے۔ بلکہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے راجہ حکومت کرتے تھے۔ پھر جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت وہ ماوراء النہر، خوارزم اور خراسان کا بھی حاکم تھا اور غزنوی فوج کی تعداد بھی ایک لاکھ سے کم نہ تھی۔ دوسرے شہاب الدین غوری۔ جس کے لے پالک بیٹوں نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے ناموں کا خطبہ پڑھوایا اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر اپنا تصرف قائم رکھا۔ اس طرح اگرچہ شہاب الدین غوری خراسان کا حکمران نہ تھا، تاہم اس کا بڑا بھائی غیاث الدین غوری ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ شہاب الدین غوری ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی لے کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی طرح شہاب الدین غوری کے وقت میں بھی ہندوستان میں ہر

طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ان حکمرانوں کے برعکس میرا یہ حال ہے کہ جب میں پہلی بار ہندوستان آیا تو ڈیڑھ دو ہزار سپاہی میرے ہمرکاب تھے۔ بے شک اُس وقت بدخشاں، کابل اور قندھار پر میری حکومت تھی۔ لیکن ان شہروں سے نصف خراج بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب میں نے ہندوستان کا رخ کیا تو ہندوستان کے ایک بڑے علاقے پر افغانوں کا تسلط تھا۔ اس طرح دشمن کی طاقت دیکھتے ہوئے میرے ساتھ پانچ لاکھ فوج ہونی چاہئے تھی۔ خود ابراہیم لودھی کا لشکر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ افغان حکمران کے دوسرے باجی حلیف بھی تھے۔ اور ایک ہزار کوہ پیکر جنگی ہاتھی بھی اس فوج میں شامل تھے۔ اور سب سے زیادہ اہم بات تھی کہ میں نے ازبک جیسے زبردست حریف کو اپنے پیچھے چھوڑ کر لودھی جیسے خونخوار دشمن سے ٹکر لی تھی۔ ظاہری اسباب اور مادی وسائل کے اعتبار سے میں یہ جنگ ہار چکا تھا۔ مگر ایسے سنگین لمحات میں صرف خدا کی ذات پر بھروسہ اور اس کا فضل ہی میرے کام آیا' میں اس کامیابی کو اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ یہ فتح محض اللہ کی عنایت اور کرم کے باعث مجھے نصیب ہوئی' یہی میرا ایمان ہے اور آئندہ بھی جو کچھ مجھے حاصل ہوگا وہ میرے اللہ ہی کی بخشش و عطا ہوگی۔''

بابر وقتی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ شہنشاہ کی اس اثر انگیز تقریر نے مغل سرداروں کو نیا حوصلہ بخشا تھا۔

دربار عام سے خطاب کرنے کے بعد دوسرے دن بابر نے شاہان ہند کے خزانوں کا معائنہ کیا' امرائے سلطنت کا خیال تھا کہ دوسرے بادشاہوں کی طرح ہندوؤں کی رسم کے مطابق دولت کے ان خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ جائے گا۔ مگر اس وقت عام سرداروں کی یہ قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی جب بابر نے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانی شروع کر دی۔

مغل شہنشاہ نے اپنے فرزند اکبر شہزادہ ہمایوں کو ساڑھے تین لاکھ روپے نقد اور ایک سربمہر خزانہ عطا کیا۔ اپنے چچا زاد بھائی سلطان مرزا کو ایک لاکھ روپے اور تمام امراء کو ان کے حسب مراتب نقد رقم دی۔ دوستوں' عزیزوں' سوداگروں اور طالبعلموں کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مکہ معظمہ' مدینہ منورہ' کربلائے معلیٰ' نجف اشرف اور دوسرے متبرک مقامات کے منتظمین کے لئے قیمتی تحائف بھیجے۔ انتہا یہ ہے کہ کابل کے ایک ایک باشندے کے لئے نقد رقم ارسال کی۔ الغرض بادشاہان ہند کا وہ خزانہ جو برسوں کی محنت' قتل و غارت اور بے شمار حق تلفیوں کے بعد جمع کیا گیا تھا' بابر نے اسے ایک ہی دن میں خالی کر دیا۔ پھر جب شاہی خزانے میں ایک سکہ بھی باقی نہیں رہا تو مغل شہنشاہ نے اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سونے چاندی کے ان بے حقیقت سکوں کی طرف کیوں دیکھتے ہو' میرے دل کی طرف دیکھو' یہ وہ خزانہ ہے جو تمہاری محبتوں سے ہمیشہ بھرا رہے گا۔''

اس روز مغل سرداروں کو اندازہ ہوا کہ ان کا حکمران صرف تاج و تخت کا ہی نہیں' دل کا بھی بادشاہ ہے۔

''اگر میں حصول دولت کے لئے جنگ کر رہا ہوتا تو ان خزانوں کو لے کر کابل کی طرف لوٹ جاتا۔'' یکایک بابر کا لہجہ اداس ہوگیا تھا۔

''ہمیں یقین ہے۔'' مغل سرداروں نے بیک زبان کہا۔ ''ہم نے کسی بھی حال میں آپ کو خودغرض اور تنگ نظر نہیں پایا۔''

''پھر بغاوتوں کی خبریں سن کر کیوں پریشان ہوتے ہو؟'' بابر نے اپنے امراء سے سوال کیا۔

دراصل مغل سردار ابراہیم لودھی کی شکست اور شاہان ہند کے خزانوں پر قبضے کے بعد کابل لوٹ جانا چاہتے تھے۔ انہیں رات دن یہی خوف ستاتا رہتا تھا کہ اگر وہ اس اجنبی ملک میں چاروں طرف سے گھر گئے تو ہندوستان ان کے لئے قبرستان بن کر رہ جائے گا۔ بابر نے اپنے سرداروں کی اس ذہنی کشمکش کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''ہم تو پریشان نہیں' مگر آپ کو یہاں کے لوگوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔'' مغل سرداروں نے ذرا پیچیدہ انداز میں بابر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''زندگی ہے تو اعتبار بھی کرنا پڑے گا۔'' بابر مسکرانے لگا۔ ''اگر میں لوگوں پر شک کرنے لگوں تو پھر بے اعتباری کا سلسلہ خود میری ذات پر ختم ہوگا۔''

مغل شہنشاہ نے بڑی عجیب بات کہی تھی' جسے سن کر امرائے سلطنت خاموش ہوگئے۔

☆☆☆

سیاسی انتشار میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ بابر بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اس بگڑتی ہوئی صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہندوستانی باشندے مغلوں سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے۔ اس لئے وہ شروع میں اطاعت گزاری کے بجائے بابر کی مخالفت پر کمربستہ رہتے تھے۔ نتیجتاً قاسم خاں نے سنبھل میں، علی خان قرملی نے میوات میں، محمد زیتون نے دیپال پور میں، تاتار خان بن مبارک خان نے گوالیار میں، قطب خان نے اٹاوہ میں عالم خاں نے کالپی میں اور ناظم خاں نے بیانہ میں خودمختاری کا اعلان کر دیا۔

دریائے گنگا کے اس پار کے علاقے پر طاقتور افغان امیر نصیر خان لوحانی اور معروف خاں قرملی قابض ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ دونوں سلطان ابراہیم لودھی کے مطیع و فرمانبردار نہ تھے، تاہم مصلحت وقت کے پیش نظر پانی پت کی جنگ کے بعد انہوں نے بہار خاں ولد دریا خاں لودھی کو سلطان محمد کا لقب دے کر اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا، پھر یہ سب کے سب ایک لشکر جرار لے کر قنوج سے آگرے کی طرف بڑھے۔ ہر علاقے کے حاکم کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا۔

''مغلوں کو ہندوستان سے نکالے بغیر ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

یہ بابر کے لئے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اسی دوران بلن خاں جلوانی بھی مغل شہنشاہ سے ناراض ہو کر سلطان محمد سے جا ملا، پھر ان لوگوں نے مل کر ہندوستانی رعایا کو اس حد تک بھڑکایا کہ شہروں اور قصبوں کے باشندے بھی بابر کی مخالفت کرنے لگے۔ پھر ایک دن نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انسانوں کو اناج اور جانوروں کو چارہ بھی بڑی مشکل سے دستیاب ہونے لگا، اسے گردش وقت ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سال خلاف معمول گرمی بھی بہت زیادہ پڑی۔ مغل سرد علاقوں کے رہنے والے تھے۔ وہ اس ناسازگار موسم کو برداشت نہ کر سکے، گرمی کی شدت اور لو سے کئی مغل سردار ہلاک ہو گئے۔ اس موقع پر خواجہ کلاں اور دوسرے معزز سرداروں نے بابر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''صرف مقامی باشندے ہی نہیں، یہاں کا موسم بھی ہمارے خلاف ہو چکا ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ جلد از جلد کابل لوٹ چلیں اور اس فتح کو غنیمت سمجھیں۔''

مغل سردار جو کچھ دن بابر کی پر جوش تقریر سن کر سنبھل گئے تھے، ایک بار پھر گھبرا کر اپنے وطن کی طرف دیکھنے لگے۔

بابر جو انتہائی ناگوار فضا میں بھی مسکرانے کا عادی تھا، اپنے سرداروں کا مشورہ سن کر غضبناک ہو گیا۔

''میں اپنی تمام عمر کی محنت پر خاک ڈال دوں اور فتح کئے ہوئے ملک کو چھوڑ کر کابل چلا جاؤں۔ پھر شطرنج کا بادشاہ بن کر اپنے بے چارگی کا تماشہ دیکھتا رہوں۔''

شہنشاہ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر دوسرے سردار تو خاموش بیٹھے رہے، مگر بابر کا دست راست خواجہ کلاں بے اختیار بول اٹھا۔

''شہنشاہ کچھ بھی کہیں مگر میں ہندوستان کے اس دوزخ میں جلنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ ہندوستان ہے یا بیمارستان؟''

''یہ جہنم اور بیماریوں کا گھر ہی سہی، مگر تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا خواجہ!'' بابر نے بڑے ناز کے ساتھ اپنے جانباز سپہ سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ وہی خواجہ کلاں تھا جس کی شمشیر آبدار نے بڑے بڑے دشمنوں کے سر قلم کئے تھے اور بابر کی فتوحات کے سلسلے نمایاں کردار کیا تھا۔

''نہیں عزت مآب!'' خواجہ کلاں نے صاف صاف کہا۔ ''یہ خادم اب ایک لمحے کے لئے بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا، بس غلام کو اجازت دیجئے۔'' خواجہ کلاں اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ اسے اپنے لہجے پر بھی قدرت حاصل نہیں رہی تھی اور وہ مغل شہنشاہ سے شدید طنزیہ گفتگو کر رہا تھا۔

بابر بڑی حسرت سے اپنے ایک جاں نثار ساتھی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ خواجہ کلاں نے ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت دہلی کی ایک عمارت پر نمایاں حروف میں فارسی زبان کا یہ شعر لکھ دیا۔

''میری دعا ہے کہ میں سلامتی کے ساتھ یہاں سے چلا جاؤں، اس کے بعد اگر پھر بھی میرے دل میں ہندوستان آنے کی خواہش پیدا ہو تو خدا اسی دنیا میں میرا منہ کالا کر دے۔''

⌘ ⌘ ⌘

شہنشاہ بابر کو اپنے معتمد خاص خواجہ کلاں کے ہندوستان سے چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔ مغل حکمران نے کئی روز تک اپنے دیگر امراء سے اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ پھر ایک دن بابر نے اپنے تمام با اثر اور نامور سرداروں کو خلوت میں طلب کیا۔

''تم سب لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ خواجہ کلاں میرا دست راست، میرا حرف اعتبار مجھے اس وقت چھوڑ کر چلا گیا جب میں چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا ہوں۔'' مغل شہنشاہ اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اگرچہ میں خواجہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو حکم شاہی کی زنجیر پہنا سکتا تھا لیکن مجھے اپنے ساتھیوں پر جبر کرنے کی عادت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر بابر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

مغل سردار بڑی حیرت سے اپنے فرمانروا کا چہرہ دیکھ رہے تھے جو ہمیشہ کی طرح شگفتہ و شاداب تھا۔ بابر کو خواجہ کلاں کی بچھڑ جانے کا قلق تھا، مگر لہجے میں غیظ و غضب یا تحقیر و نفرت کا رنگ نمایاں نہیں تھا۔

''میں تم پر بھی اپنی مرضی مسلط نہیں کرتا۔'' بابر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا...... ''میں نے تم لوگوں کی واپسی کے لئے قصر شاہی کے سارے دروازے کھول دیئے ہیں۔ جس دروازے سے چاہو نکل کر کابل چلے جاؤ۔'' بابر نے بڑے سہل انداز میں اتنا بڑا فیصلہ سنا دیا تھا، جیسے مغل سرداروں کا ہندوستان چھوڑ کر چلے جانا کوئی بہت ہی معمولی واقعہ ہو۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ہندوستان کے ہلاکت خیز موسم سے سخت بیزار ہیں......" مغل شہنشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بظاہر مغل سرداروں کے پاس بابر کے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا' لیکن پھر بھی وہ اپنی بات پر قائم رہے۔ "شہنشاہ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ ہندوستان اور کابل کے موسموں میں کوئی تقابل ہی نہیں ہے۔" دوسرے مغل سردار نے اپنی منطق پیش کرتے ہوئے کہا۔ "کہاں یہ انسانی جسموں کو جھلسا دینے والی بادسموم' نئے نئے امراض پیدا کرنے والی مسلسل بارش' پھر زندگی سے بیزار کر دینے والا حبس...... اور کہاں وہ جاں فزا ہوائیں اور خمار انگیز و حیات بخش موسم؟"

"موسموں کے اس فرق کو میں خود بھی تسلیم کرتا ہوں' مگر یاد رکھو کہ سمرقند و فرغانہ اور کابل کے موسم تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔" شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس اجنبی دیار کے باشندے شاید اس راز سے واقف نہ ہوں' مگر تم لوگ مجھے خوب جانتے ہو کہ میں نے کس قدر ناز و نعم کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ پھر میں تم سے ہندوستانی موسم کی شکایت کیوں نہیں کرتا؟ برساتی بیماریوں سے صرف تم ہی نہیں' میں بھی تو متاثر ہوں۔ موسم گرما کی آتش بار ہوائیں صرف تمہیں ہی نہیں' مجھے بھی پھونکے ڈال رہی ہیں' مگر میں نے تو اس موسم کا کبھی شکوہ نہیں کیا۔" یہ کہتے کہتے بابر کی آواز کسی قدر تیز ہوگئی تھی۔ "بات یہ نہیں کہ خواجہ کلاں موسم کی سختیوں سے بیزار ہو کر کابل چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ موت سے ڈر گیا...... اس نے گرمی کی شدت اور لو کے اثرات سے کئی مغل سرداروں کو ہلاک ہوتے دیکھا اور پھر اپنی نادانی کے سبب یہ سمجھ بیٹھا کہ ہندوستان کی شعلہ ریز ہوائیں اسے بھی جلا ڈالیں گی' حالانکہ وہ بڑا بے جگر انسان ہے' اس نے میرے دوش بدوش کئی خوفناک جنگیں لڑی ہیں' مگر پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا' جب اس جیسے جاں باز انسان کے آہنی اعصاب خوف و دہشت کا شکار ہوگئے۔"

"ہم بھی موت سے نہیں ڈرتے شہنشاہ!" بیک وقت کئی مغل سرداروں نے کہا...... "ہمیں تو بس ہندوستان کے اس بے ہودہ موسم سے شکایت ہے۔" بظاہر مغل سردار موسم کی سختیوں کا بہانہ کر کے کابل لوٹ جانا چاہتے تھے مگر حقیقتاً وہ سب کے سب نئی نئی بغاوتوں اور سیاسی انتشار سے خوفزدہ تھے۔

"تو کیا بدخشاں' سمرقند' بخارا اور کابل کا موسم تمہیں موت سے بچا لے گا؟" یکایک شہنشاہ بابر کے لہجے سے ہلکی سی تلخی جھلکنے لگی تھی...... "تم کیا جانو کہ موسم کسے کہتے ہیں؟ میں صرف ایک جنگجو حکمران ہی نہیں' نرم و نازک جذبوں کا شاعر بھی ہوں۔ ایک شاعر سے پوچھو کہ موسم کیا ہوتا ہے؟" بابر بہت زیادہ جذباتی ہوگیا تھا......

"جو لوگ موسم کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے' انہیں یہ گردش ماہ و سال حرف غلط کی طرح مٹا دیتی ہے۔ میں ہندوستان کی گرم ہوائیں اس لئے برداشت کر رہا ہوں کہ مجھے زیادہ سے زیادہ عزت اور زیادہ سربلندی درکار ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے زندہ رہنے کے لئے کون سا معیار مقرر کیا ہے؟ بہرحال تم میں سے جو شخص بھی کابل جانا چاہے میری اجازت کے بغیر چلا جائے۔ آج کسی کے لئے کوئی پابندی نہیں' کوئی قانونی جبر نہیں اور کسی رشتے کا کوئی حوالہ نہیں۔"

بابر کی بات سن کر مغل سرداروں کے چہروں پر خوشی کا گہرا رنگ جھلکنے لگا۔ "آپ بھی ہمارے ہمراہ کابل تشریف لے چلیے۔" بابر کے ایک معتمد امیر نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"اگر تمہارا یہ مشورہ میرے لئے قابل عمل ہوتا تو خواجہ کو تنہا کیوں جانے دیتا؟" بابر کے لہجے میں تلخی کا شائبہ تک نہ تھا' مگر پھر بھی اس کی آواز سرد تھی۔ "جب میں تم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتا تو تم لوگ بار بار ایک جرم کا ارتکاب کیوں کر رہے ہو؟ میں اپنی فتح کو نامکمل چھوڑ کر واپس نہیں جاؤں گا۔ میرا یہ مزاج نہیں کہ میں گوشہ عافیت کی تلاش میں بھاگتا رہوں اور بزدلی و فرار کے طعنے مسلسل میرا تعاقب کرتے رہیں' اب تو وقت ہی فیصلہ کرے گا۔ امیر تیمور کے وارث کی مکمل فتح یا پھر دیار غیر میں بابر کی قبر۔"

جب مغل سرداروں کو پورا یقین ہوگیا کہ بابر کسی صورت بھی ہندوستان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا تو خود انہوں نے بھی اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ پھر ان سب امراء نے بابر کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ کر نئے سرے سے عہد و پیمان کیے۔

"اب یا تو تمام دشمنوں کے قلعوں پر بابری پرچم لہرائے گا یا ہم بھی اسی زمین میں پیوند خاک ہو جائیں گے۔"

داخلی انتشار ختم ہو چکا تھا اور بابر ایک مختصر سی فوج رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو عزم و ہمت کا بلند ترین پہاڑ سمجھ رہا تھا۔

جب ہندی صوبیداروں کو یہ خبر ملی کہ شہنشاہ بابر صاحبقراں امیر تیمور کی طرح ہندوستان چھوڑ کر اپنی موروثی سلطنت پر قناعت نہیں کرے گا تو وہ بھی آہستہ آہستہ مغل فرمانروا کے حلقہ اطاعت میں واپس آنا شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے شیخ گھورن اپنے تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دوآبے سے آگرے آیا اور اس نے شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ شیخ گھورن کے فوراً بعد علی خان قرلی اپنے بیٹوں کے بلانے پر جو بابر کی قید میں تھے میوات سے آگرے چلا آیا اور بابر کے امراء میں شامل ہوگیا۔ بعدازاں فیروز خان اور شیخ بایزید قرلی اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابر نے اپنی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو نئی جاگیروں اور نئے منصب سے سرفراز کیا' سب سے آخر میں محمود خان لوحانی اور قاضی حبیب نے بھی حلقہ اطاعت میں شامل ہو کر اعلیٰ منصب حاصل کیے۔ ان سرداروں کے حلقہ بگوش ہونے کی وجہ سے سیاسی انتشار میں مزید کمی واقع ہوئی اور بہت سے پرگنے اور قصبے بابر کی سلطنت میں شامل ہوگئے۔

اسی زمانے میں بلن خان جلوانی نے سنبھل کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اب قلعے کے حاکم قاسم کے سامنے دو ہی راستے کھلے ہوئے تھے۔ پہلا یہ کہ قاسم تنہا جلوانی کا مقابلہ کرے اور شکست و ذلت سے دوچار ہو کر ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ بابر کے حلقہ اطاعت میں شامل ہو کر مغل شہنشاہ سے فوجی امداد کی درخواست کرے۔ قاسم نے بہت غور و فکر کے بعد دوسرا راستہ اختیار کیا۔ شہنشاہ بابر نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مرزا مہدی کوکلتاش کو قاسم کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ مہدی نے دریائے جمنا کو عبور کیا اور بڑے خوفناک انداز میں بلن خان جلوانی سے ٹکرا گیا۔ افغان سردار کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ سے فرار ہو کر سنبھل کی حدود سے بہت دور چلا گیا۔ قاسم نے شکر گزاری کے طور پر اپنا قلعہ مرزا مہدی کوکلتاش کے حوالے کر دیا اور خود شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے امراء میں شامل ہوگیا۔

بابر نے سنبھل کا قلعہ اپنے فرزند اکبر شہزادہ ہمایوں کے سپرد کر کے اسے مشرقی علاقوں کے افغانوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔

⌑ ⌑ ⌑

شہزادہ ہمایوں سنبھل سے روانہ ہو کر قنوج کے گردونواح میں پہنچا۔ اس علاقے میں بابر کے دشمنوں سلطنت مغلیہ کے باغیوں کا اجتماع تھا۔ وہ افغان سپاہی جو بابر سے سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کا انتقام چاہتے تھے ان کی تعداد چالیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ ہمایوں کا خیال تھا کہ اس مقام پر ایک خونریز جنگ ہو اور پھر اس کے بعد ہی کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے گا...... مگر اس وقت مغل شہزادے کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی' جب بہادر افغانوں کا لشکر کثیر جنگ کئے بغیر ہی جونپور کی طرف فرار ہو گیا۔ یہ شہنشاہ بابر کی بلند اقبالی ہی تھی کہ ہمایو نے اپنی تلواریں بھی بے نیام نہیں کیں اور نصرت و کامیابی نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چوم لئے۔ افغا امیروں میں صرف فتح خان شیروانی ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مغل شہزادے نے بڑی خوشدلی کے سات شیروانی کا استقبال کیا اور پھر اسے اپنے ایک معتمد امیر مہدی خواجہ کے ہمراہ شہنشاہ کی بارگاہ جلال میں روا کر دیا۔

بابر نے بھی بڑے بے تکلفانہ انداز میں فتح خان شیروانی کو خوش آمدید کہا۔ پھر اسے مجلس نشاط میں طلب کر کے اپنا خاص لباس عطا کیا اور ایک بڑی جاگیر بخشی۔ بابر کے اس مشفقانہ سلوک نے افغانوں کے دل و دما پر چھایا ہوا نفرت و انتقام کا سارا غبار دھو ڈالا۔ پھر وہ ایک ایک کر کے چغتائی خاندان کے اطاعت گزار او فرمانبردار بن گئے۔

بیانہ کا حاکم نظام خان بھی رانا سانگا سے خوفزدہ رہتا تھا۔ رانا سانگا نسلاً راجپوت تھا اور ہندوستان کے تما ہندو راجاؤں میں اسے سب سے زیادہ فوجی طاقت حاصل تھی۔ رانا سانگا نظام خان کی حکومت پر بری نظر رکھتا تھ اور بہت دنوں سے اس تاک میں تھا کہ کوئی مناسب موقع ملے اور وہ آگے بڑھ کر بیانہ پر قبضہ کر لے۔ پھر جب راجپوت حکمران نے ہر طرف سیاسی انتشار کی آندھیاں چلتی دیکھیں تو بیانہ پر لشکر کشی کے منصوبے بنانے لگا۔ نظام خان نے رانا سانگا کے خطرناک تیور دیکھ کر بابر کی خدمت میں یہ درخواست پیش کر دی کہ آج سے اسے بھی مغل سلطنت کا اطاعت گزار و وفادار تصور کیا جائے۔

شہنشاہ بابر نے بلا تاخیر نظام خان کی درخواست منظور کر لی اور اس کے ساتھ ہی ایک خط بھی تحریر کیا کہ وہ بیانہ کا قلعہ مغل فوج کے حوالے کر دے۔

نظام خان نے بابر کے اس مکتوب کے جواب میں لکھا کہ وہ ذاتی طور پر مغل شہنشاہ کا فرمانبردار ہے' مگر اپنا قلعہ چغتائیوں کے حوالے نہیں کرے گا۔

بابر نے نظام خان کا خط پڑھ کر فوری طور پر اپنے امراء کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ پھر جب اجلاس میں نظام خان کا جوابی خط پڑھ کر سنایا گیا تو اکثر مغل سرداروں نے بیک زبان کہا۔

''نظام خان کے اس خط سے نفاق اور مصلحت پرستی کی بو آتی ہے۔ وہ رانا سانگا کی فتنہ گری سے نجات حاصل کرنے کے لئے شہنشاہ کی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ جب راجپوت حکمران کا خطرہ مکمل طور پر ٹل جائے گا تو وہ بھی دوسرے بدعہدوں کی طرح اپنے تمام وعدوں سے منحرف ہو جائے گا۔''

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' بابر نے مغل سرداروں کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

پھر چند روز تک غور و فکر کرنے کے بعد مغل شہنشاہ نے اپنے ایک معتمد سردار بابا قلی بیگ کو بیانہ کے قلعے پر ہ کرنے کے لئے بھیجا...... اور اسکے ساتھ ہی فارسی زبان میں یہ قطعہ لکھ کر دیا۔

''اے بیانہ کے حاکم! اس ترک (بابر) کے ساتھ معرکہ آرائی نہ کر!

کیونکہ سارے ہندوستان پر ترک کی ذہانت اور مردانگی ظاہر ہو چکی ہے۔

اگر تو جلد از جلد خدمت شاہی میں حاضر نہ ہوا اور تو نے میری نصیحت نہ سنی۔

تو پھر کیا ہو گا' اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں!

یہ قطعہ بابا قلی بیگ کے حوالے کرنے کے بعد بابر نے اپنے سپہ سالار کو ہدایت کی...... ''سب سے پہلے رے یہ اشعار نظام خان تک پہنچا دینا۔ اگر وہ انہیں پڑھ کر قلعے سے باہر نکل آئے تو اس پر تلوار نہ کھینچنا اور اس ے دوستوں کی طرح سلوک کرنا...... اور اگر وہ میری تنبیہ کو مذاق میں اڑا دے تو پھر قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا نا۔''

مغل سردار بابا قلی بیگ نے ایسا ہی کیا اور نظام خان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ دوسرے دن قلعے کا وازہ کھلا۔ بابا قلی بیگ سمجھا کہ نظام خان نے شہنشاہ کے خط کے جواب میں مکمل اطاعت قبول کر لی ہے...... اور بیانہ کا قلعہ مغلوں کے حوالے کرنے کے لئے اپنے سفیروں کو بھیج رہا ہے...... مگر قلی بیگ کی یہ غلط فہمی اس وقت ر ہو گئی جب قلعے سے ہزاروں مسلح سپاہی نکلے اور اس میدان کی طرف بڑھنے لگے' جہاں مغل فوج خیمہ زن ی۔

پھر بیانہ کے نواح میں ایک خونریز جنگ ہوئی' جس میں بابا قلی بیگ نے شکست کھائی۔ مغل سردار کا خیال ا کہ نظام خان دور تک اس کا تعاقب کرے گا' مگر خلاف توقع حاکم بیانہ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ بابا قلی بیگ کو کست دے کر تیزی سے پلٹا اور دوبارہ قلعہ بند ہو گیا۔

رانا سانگا اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے جیسے ہی نظام خان کو مغل فوج سے الجھتے دیکھا' فوری طور اپنے لشکر کو بھی حرکت میں لے آیا۔ یہ نظام خان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے جاسوسوں نے اسے بروقت طلاع دے دی ورنہ راجپوت فرمانروا کا لشکر جرار بیانہ کی سرزمین کو روند ڈالتا۔ اب نظام خان کے پاس اس کے دا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ مغل شہنشاہ کی پناہ میں چلا جائے۔ مجبوراً اس نے بڑے عاجزانہ لہجے میں بابر سے اپنے صور کی معافی مانگی۔ بابر نے اپنی روایتی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظام خان کو معاف کر دیا۔ پھر شکر گزاری کے طور پر نظام خان بیانہ کا قلعہ مغل فوج کے حوالے کر کے خود آگے چلا آیا اور بابر کے معزز امراء میں شامل ہو گیا۔

سیاسی انتشار ختم ہوتا جا رہا تھا اور ہندوستان کی سرزمین پر مغل شہنشاہ کے قدم مضبوطی کے ساتھ جمتے جا رہے تھے۔ اسی دوران ایک اور واقعہ رونما ہوا جس نے بابر کے حلقہ اقتدار میں مزید وسعت پیدا کر دی۔ اس وقت تاتار خان قلعہ گوالیار کا حاکم تھا۔ اچانک اس کا ایک معتمد سردار خان جہاں باغی ہو کر منکٹ رائے سے جا ملا۔ منکٹ رائے گوالیار کے قدیم راجاؤں کا خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے باغی خان جہاں سے مل کر گوالیار پر حملہ کر دیا اور تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ منکٹ رائے کے حملہ آور ہوتے ہی گوالیار کے دوسرے زمیندار بھی باغیوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ تاتار خان بیک وقت کئی

محاذوں پر جنگ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ مجبوراً اس نے اپنا قاصد بھیج کر مغل شہنشاہ کی اطاعت کا اقرار کرلیا اور اس کے ساتھ ہی بابر کی خدمت میں فوجی امداد کی درخواست بھی پیش کردی۔ تاتار خان نے اپنی درخواست میں صاف صاف تحریر کیا تھا کہ اگر وہ منکٹ رائے اور دوسرے باغیوں پر غالب آ گیا تو گوالیار کا قلعہ مغل امیروں کے حوالے کر دے گا۔ بابر نے فوراً ہی رحیم داد اور شیخ گھورن کو تاتار خان کی مدد کے لئے روانہ کردیا۔ ان دونوں شاہی امراء نے منکٹ رائے کو شکست دی اور تاتار خان کو تمام باغیوں کے فتنوں سے نجات ملی۔

پھر جب گوالیار کی فضا شورش و بغاوت کے اثرات سے پاک ہوگئی اور کسی دشمن کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تو بابر کے امراء رحیم داد اور شیخ گھورن نے تاتار خان کو اس کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے کہا کہ وہ بلاتاخیر گوالیار کا قلعہ ان کے حوالے کردے۔

"کیسا وعدہ اور کہاں کا عہد؟" گوالیار کے حاکم تاتار خان نے نہایت عیاری کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تو برا وقت ٹالنے کی ایک سیاسی تدبیر تھی' جس میں مجھے بخیر وخوبی کامیابی حاصل ہوئی۔ تم لوگ آگرہ واپس چلے جاؤ اور اپنے بادشاہ سے جاکر کہہ دو کہ تاتار خان نے بابر سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور اس کے حضور میں مدد کی کوئی درخواست پیش نہیں کی تھی۔"

تاتار خان کی عہد شکنی کا یہ انداز دیکھ کر رحیم داد اور شیخ گھورن کے دل و دماغ سلگ اٹھے' مگر ان دونوں نے انتہائی قوت برداشت سے کام لیتے ہوئے اپنے اعصاب پر قابو رکھا اور کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم ایک خط میں ساری تفصیلات لکھ کر ایک برق رفتار قاصد کو آگرے روانہ کردیا اور خود گوالیار کے مضافات میں ٹھہر گئے۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ مشہور صاحب کرامت بزرگ تھے اور ان کے مریدوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس شہر میں موجود تھی۔ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ تاتار خان سے خوش نہیں تھے۔ شیخ اسے مذہبی قوانین کا پابند دیکھنا چاہتے تھے مگر تاتار خان ایک انتہائی دنیا دار انسان تھا اور وہ شیخ کی نصیحتوں کو لائق التفات نہیں سمجھتا تھا۔ حضرت شیخ گوالیاریؒ کی بہت دنوں سے بس ایک ہی خواہش تھی کہ تاتار خان اپنے اعمال کی اصلاح کر لے اور [illegible] بندگان خدا کے حقوق کا لحاظ رکھے...... یا پھر کوئی دوسرا باکردار مسلمان حاکم گوالیار پر قبضہ [illegible] خواب کی تعبیر پیش کر سکے۔ کچھ دن پہلے جب حضرت غوث گوالیاریؒ نے یہ خبر سنی تھی کہ تاتار خان [illegible] سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ ہوگیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے تھے' مگر جب ان پر تاتار خان [illegible] حال منکشف ہوا تو شیخ نے اس بدعہدی کو سخت ناپسند کیا اور اپنے ایک مرید خاص کو یہ پیغام [illegible] پاس بھیجا۔

"تم [illegible] داخل ہو جاؤ۔ پھر تاتار خان کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو جائے گا۔"

رحیم داد [illegible] ساتھ حضرت شیخ کا پیغام پڑھا اور قلعے میں داخل ہونے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ آخر [illegible] اس نے تاتار خان کے نام ایک خط لکھا' جس میں والئ گوالیار سے درخواست کی گئی تھی کہ منکٹ [illegible] کی وجہ سے شاہی فوج خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ اس لئے اگر اجازت مل جائے تو [illegible] کے ہمراہ قلعے کے اندر آ کر پناہ لے لے اور باقی لشکر قلعے کے باہر ہی موجود

ہے۔ اپنے خط کے آخر میں رحیم داد نے انتہائی عاجزانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ اگر تاتار خان نے قلعے میں پناہ دے دی تو وہ تمام عمر حاکم گوالیار کا احسان مند رہے گا۔

تاتار خان ایک خوشامد پسند انسان تھا۔ اس نے رحیم داد کی عاجزی کو شاہی لشکر کی بے چارگی سے تعبیر کیا اور فوراً ہی بابر کے امیر کو درماندہ سمجھ کر اس کی درخواست قبول کرلی۔ پھر اسی روز شام کے قریب رحیم داد اپنے چند آدمیوں کے ساتھ ڈرا سہما سا قلعے کے اندر داخل ہوا۔ تاتار خان کے حکم کے مطابق رحیم داد نے اپنے خادم کو دربانوں کے پاس چھوڑ دیا تا کہ وہ اس کے خاص آدمیوں کو پہچان کر قلعے کے اندر لے آئے۔

تاتار خان پر غرور کا نشہ طاری تھا۔ اس لئے وہ رحیم داد کی چال کو سمجھنے سے قاصر رہا اور بابر کے اس ہوشیار و دانا امیر کو محض ایک شکستہ حال پناہ گیر سمجھ کر غفلت کی گہری نیند سو گیا۔

قلعے کے اکثر دربان حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کے مرید تھے۔ وہ سب کے سب رحیم داد کے پیادہ سپاہیوں سے مل گئے۔ بعض دربان چند ضروری اشیاء لانے کا بہانہ کر کے رات کے اندھیرے میں قلعے سے باہر چلے گئے اور پھر ایک بڑی تعداد میں مغل سپاہیوں کو اندر لے آئے۔ قلعے کے کچھ محافظ حضرت شیخ گوالیاریؒ کے مریدوں میں شامل نہیں تھے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے مزاحمت کی تو بہت سی بے نیام شمشیروں نے ان کی زبانیں بند کردیں۔ پھر وہ لوگ انتہائی جبر کے عالم میں خاموشی کے ساتھ یہ پراسرار تماشا دیکھتے رہے۔

صبح جب تاتار خان نیند سے بیدار ہوا تو قلعے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بساط سیاست اس قدر ناقابل بیان اور حیرت انگیز طریقے سے الٹ دی جائے گی۔ تاتار خان نے بڑی بے بسی کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ اب وہ اپنے ہی گھر میں غیروں کا قیدی تھا۔

پھر تاتار خان نے چپ چاپ قلعہ شیخ گھورن رحیم داد کے حوالے کیا اور خود آگرہ پہنچ کر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوگیا۔

بابر حاکم گوالیار کو دیکھ کر مسکرایا۔ "تو یہاں کیسے آ گیا تاتار خان؟" بابر نے پرجلال لہجے میں سوال کیا۔

"میں اپنی غلطی پر بے حد نادم ہوں شہنشاہ!" تاتار خان کا لہجہ انتہائی معذرت خواہانہ تھا۔

"غلطی نہیں' بدعہدی۔" یکایک شہنشاہ بابر کی آواز بلند ہوگئی تھی اور اس سے کسی قدر غصہ جھلک رہا تھا۔

"دونوں میں بڑا فرق ہے تاتار خان!"

"عزت مآب! میں خوب جانتا ہوں۔" بار ندامت سے تاتار خان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"مگر تو بدعہدی کی سزا نہیں جانتا۔" شہنشاہ بابر کا لہجہ کچھ اور غضبناک ہوگیا تھا۔

تاتار خان نے گھبرا کر مغل حکمران کی طرف دیکھا۔ حاکم گوالیار نے بابر کے لہجے کی کاٹ اور لفظوں کی نشتریت کو محسوس کرلیا تھا اور اب اسے اپنے سر پر شمشیر قضا لہراتی نظر آ رہی تھی۔ "شہنشاہ اس پر قادر ہیں کہ مجھے معاف فرما دیں یا......" تاتار خان نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

"جب تو میرے حلقہ اطاعت میں شامل ہوا تھا اور تو نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی تو میں نے بھی اپنے آپ سے ایک عہد کیا تھا کہ تجھے ایک معزز و محترم امیر کا منصب دے کر گراں بہا انعام سے سرفراز کروں گا لیکن اب یہ سوچ رہا ہوں کہ تیری وعدہ فراموشی کے بعد میں اپنا عہد بھی توڑ ڈالوں۔" بابر کے لہجے کی تندی و تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔

تاتار خان کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی اور اسے اپنا خوفناک انجام قریب تر نظر آ رہا تھا۔

''مگر میں عام لوگوں کی طرح اپنا عہد نہیں توڑوں گا۔'' آج خلاف معمول بابر کے ہونٹوں سے لفظوں کی شکل میں نفرت و غضب کا لاوا ٹپک رہا تھا۔ ''جس طرح دنیا میں میرے عفو و درگزر کی داستانیں مشہور ہیں' اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ اطراف عالم میں میرے قہر و غضب کے قصوں کی گونج بھی سنائی دے۔'' مغل سردار بھی اپنے فرمانروا کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر سکتے کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ ''اگر میں تجھے زندان کے حوالے کر کے تیرے جسم کو مسلسل جبر و تشدد کا نشانہ بنا ڈالوں یا تیرا سر کاٹ کر گوالیار کے باشندوں کے پاس بھیج دوں تو کیا یہ ناانصافی ہوگی؟

شہنشاہ بابر کے خوفناک تیور دیکھ کر تاتار خان کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور وہ مغل شہنشاہ سے رحم کی نئی درخواست کرنا بھی بھول گیا تھا۔

کچھ دیر تک دربار شاہی پر موت کا سناٹا طاری رہا۔ پھر خود بابر ہی نے اس سکوت کو توڑا۔ ''مگر میں عہد شکنی نہیں کروں گا تاتار خان کہ عہد کی پاسداری ہی انسان ہونے کی دلیل ہے...... تو نے کھلی آنکھوں سے اس دنیا کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ لیتا تو تجھ پر یہ راز فاش ہو جاتا کہ بعض جانور بھی اپنا عہد نہیں توڑتے۔ تو میری مجلس میں سر جھکائے چلا آیا۔ بس میرے اطمینان کے لئے یہی کافی ہے۔ جا! میں نے تجھے معاف کیا اور اپنے معزز امراء کی جماعت میں شامل کر لیا۔'' اس کے ساتھ ہی بابر نے بیس لاکھ تنکے (چاندی کے سکے) تاتار خان کو بطور انعام بخشے۔

یہ اعلیٰ ظرفی اور رواداری کی ایک روشن مثال تھی' جس کے جواب میں تاتار خان نے سر دربار گھٹنوں کے بل جھک کر بابر کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''شہنشاہ! آپ نے میرے دل کو فتح کر لیا۔ بے شک! آپ عظیم ہیں اور ہندوستان پر حکمرانی کا حق صرف آپ ہی کو حاصل ہے۔''

¤ ¤ ¤

اب ہندوستان کی سیاسی فضا بڑی حد تک بابر کے حق میں ہموار ہو چکی تھی اور وہ مغل سردار' جو مسلسل بغاوت اور انتشار سے گھبرا کر کابل لوٹ جانا چاہتے تھے' اب نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ نئی فتوحات کے خواب دیکھنے لگے تھے...... مگر اسی دوران ایک ایسا ہولناک واقعہ پیش آیا کہ بابر کچھ دیر تک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہا اور مغل سردار ہر لمحے یہی سمجھتے رہے کہ صاحبقران امیر تیمور کا وارث اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔

واقعہ یوں تھا کہ بابر نے اپنی حساس طبیعت اور نرم دلی سے مجبور ہو کر سلطان ابراہیم لودھی کے تمام اہل خاندان کو نہ صرف معاف کر دیا تھا بلکہ انہیں مختلف مراعات بھی بخشی تھیں' خصوصاً اس نے ابراہیم لودھی کی ماں کو مادر گرامی کا خطاب بخشا تھا اور قلعے کے اندر ایک بے سہارا عورت کو اس قدر اختیار حاصل تھے کہ دیکھنے والے اسے ہندوستان کی ملکہ ہی سمجھتے تھے۔ وہ فضول خرچ عورت ہر ماہ بے شمار دولت صرف کیا کرتی تھی۔ وزیر مالیات نے کئی بار اسراف بے جا کے سلسلے میں بابر سے شکایت بھی کی' مگر مغل شہنشاہ ہر مرتبہ یہ کہہ کر ٹال دیتا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ میری ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک غمزدہ اور

شکست خوردہ خاتون ہیں۔ اس طرح اگر ان کا دل بہل جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے کسی عمل کا محاسبہ نہ کرو کہ وہ قلعے کی حدود کے اندر مکمل طور پر بااختیار ہیں۔''

بابر نے اپنے دشمنوں کو معاف کرنے اور ان سے محبت کے ساتھ پیش آنے کے سلسلے میں ایک اعلیٰ روایت قائم کی تھی...... مگر سلطان ابراہیم لودھی کی ماں ایک انتہائی مغرور' خود غرض اور احسان فراموش عورت تھی۔ اس نے بابر کی محبت کو حماقت سے تعبیر کیا اور مغل شہنشاہ کی بخشی ہوئی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

سلطان ابراہیم لودھی کی ماں شاہی خزانے سے حاصل کردہ تمام دولت بابر کے خلاف کی جانے والی ایک خوفناک سازش کے سلسلے میں بے دریغ خرچ کر رہی تھی۔ پہلے کچھ دن تک وہ اس منصوبے پر عمل کرتی رہی کہ کسی طرح بابر کے ذاتی محافظوں کو بہت بڑی رشوت دے کر مغل شہنشاہ کے قتل پر آمادہ کر لے...... مگر سلطان کی ماں کا یہ منصوبہ ناممکن العمل تھا' کیونکہ بابر نے اپنے ذاتی محافظ دستے میں کسی افغان یا ہندوستانی سپاہی کو شامل نہیں کیا تھا۔ شہنشاہ کے سارے نگہبان مغل تھے۔ گردش وقت کی بات اور ہے لیکن جہاں تک بابر کے محافظوں کے خلوص و دیانت داری کا سوال تھا تو ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی بڑی سے بڑی لالچ دینے کے باوجود خریدا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے سلطان ابراہیم لودھی کی ماں نے کچھ دن تک غور و فکر کرنے کے بعد اپنے اس منصوبے کو ترک کر دیا تھا۔ ابراہیم لودھی کی ماں فطرتاً ایک انتہائی منتقم المزاج اور دہری شخصیت رکھنے والی عورت تھی۔ وہ قصر شاہی کے تمام مکینوں کے سامنے بابر کو ''بیٹا بیٹا'' کہہ کر پکارتی تھی' مگر دل ہی دل میں روزانہ اپنی اس نیت کا اعادہ کرتی تھی کہ وہ ایک دن مغل شہنشاہ سے اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام ضرور لے گی۔ اگرچہ سلطان ابراہیم لودھی کی موت کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس دوران کوئی ایک رات بھی ایسی نہیں آئی تھی جب سلطان کی ماں نے اپنی خلوت میں بابر سے انتقام لینے کی قسم نہ کھائی ہو۔ وہ اکثر اپنی رازدار کنیزوں اور معتمد خدمت گاروں سے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا کرتی تھی۔

''جان کا بدلہ جان...... اس کے سوا کچھ نہیں۔ جس دن بابر کی لاش میرے سامنے پڑی ہوگی' اسی روز میرے سینے میں مسلسل بھڑکنے والی آتش انتقام بجھ جائے گی' ناآسودہ جذبے سیراب ہو جائیں گے اور بے چین تمنائیں قرار حاصل کر لیں گی۔''

اپنی اسی شدت انتقام کے باعث وہ مسلسل ایک دوسرے منصوبے پر غور کرتی رہی تھی...... اور یہ منصوبہ پہلے کے مقابلے میں نسبتاً آسان بھی تھا اور قابل عمل بھی۔ سلطان کی ماں نے ایک سال تک اپنی ظاہری حرکتوں سے بابر اور دوسرے اراکین سلطنت پر یہی ثابت کیا تھا کہ وہ ماضی کے جاں گداز واقعے کو بھول کر حال کی زندگی پر راضی ہو گئی ہے۔ اس کا یہ منافقانہ عمل صرف اس لئے تھا کہ بابر کے دل و دماغ پر اس کے اعتماد کی گرفت مضبوط ہو جائے' پھر اُسے یقین ہو گیا کہ بابر اس کی ذات پر بھروسہ کرنے لگا ہے تو وہ خوفناک عورت اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئی۔ اس نے اپنا نیا منصوبہ اس طرح ترتیب دیا کہ مغل شہنشاہ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ سلطان کی ماں کے اس منصوبے کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ شاہی مطبخ (باورچی خانے) کے نگران اس سازش میں شریک نہ ہو جائیں۔ اتفاق سے بابر کے مخصوص کھانے پکانے والا احمد چاشنی گیر اور دوسرے باورچی ابراہیم لودھی کے پرانے ملازم تھے۔ سلطان کی ماں نے اس سازگار صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن احمد چاشنی گیر کو تنہائی میں طلب کر لیا اور اس کے سامنے اپنا منصوبہ بیان کرتے

ہوئے کہا کہ...

''احمد! آج تیری نمک خواری کا امتحان ہے۔''

شاہی باورچی نے چونک کر سابق ملکہ عالیہ کی طرف دیکھا۔ ''مادر معظمہ! یہ ناچیز کس قابل ہے؟''

''نہیں احمد! آج تجھے حق نمک ادا کرنا ہی ہوگا۔'' سلطان کی ماں کا لہجہ انتہائی غضبناک تھا۔ ''تیرے آقا کا قاتل آزاد پھر رہا ہے اور تو عیش وعشرت کی فضاؤں میں اس قدر مست ہے کہ اپنا فرض بھی بھول گیا۔ کب تک یہ لعنت زدہ زندگی بسر کرے گا۔ آگے بڑھ اور بابر کو ہلاک کردے۔''

شدت خوف سے احمد چاشنی گیر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''مادر ملکہ! میں تو ایک غریب باورچی ہوں' میرے اختیار میں کیا ہے؟''

''تیرے ہاتھ میں تلوار سے بھی زیادہ خوفناک ہتھیار ہے۔'' سلطان کی ماں نے نہایت سفاکانہ لہجے میں کہا۔ ''بابر کے کھانے میں زہر ملادے اور حق نمک ادا کردے۔''

آخر بہت پس وپیش کے بعد احمد چاشنی گیر اور دوسرے باورچی اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے پر آمادہ ہو گئے۔

دوسرے دن سلطان ابراہیم لودھی کی ماں نے مغل شہنشاہ کی پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ بابر خشکہ اور خرگوش کا گوشت بہت شوق سے کھاتا تھا۔ احمد چاشنی گیر نے ان ہی دو کھانوں میں ایک خطرناک زہر کی آمیزش کی تھی۔

بابر نے ابھی چند لقمے ہی حلق میں اتارے تھے کہ یکایک اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ مغل شہنشاہ کو شبہ ہوگیا تھا کہ زہر آلود غذا اس کے جسم میں داخل ہو چکی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی بابر نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی دونوں انگلیاں حلق میں ڈال دیں اور زہر آلود کھانے کو جسم سے خارج کرنے کی کوشش کرنے لگا اسی دوران قلعے میں کہرام مچ گیا اور شاہی طبیب طعام گاہ کی طرف دوڑ پڑے' جب تک شاہی طبیب مغل فرمانروا کی خدمت میں حاضر ہوتے اس وقت تک بابر کئی بار قے کر چکا تھا۔ قدرت نے اس نازک ترین موقع پر بابر کے ہوش وحواس کو برقرار رکھا اور اس نے کسی طبیب کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی اپنا علاج شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ جب شاہی طبیب طعام گاہ تک پہنچے تو مغل شہنشاہ اس خطرناک زہر کے مہلک اثرات سے نجات حاصل کر چکا تھا' پھر بھی طبیبوں نے فوری طور پر کئی دافع سمیات دوائیں بابر کو پلائیں۔ تھوڑی دیر بعد مغل شہنشاہ کی طبیعت کچھ اور سنبھل گئی۔ نبض کی رفتار معمول پر آنے لگی اور دل کی دھڑکنوں میں توازن پیدا ہونے لگا۔

مغل امراء نے پہلے ہی سلطان ابراہیم لودھی کی ماں کے محل کے چاروں طرف سخت حفاظتی پہرے بٹھا دیئے تھے' مگر انہوں نے اس فتنہ گر عورت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ مغل سرداروں کو حکم شاہی کا انتظار تھا۔

جب بابر کی زندگی کو درپیش خطرہ مکمل طور پر ٹل گیا تو عدالت شاہی آراستہ کی گئی۔ اگرچہ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ مغل شہنشاہ کو غذا کے ذریعے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے بابر نے قبل از وقت کسی کو مجرم نہیں ٹھہرایا تھا۔ وہ بڑا اعلیٰ ظرف اور حوصلہ مند انسان تھا۔

موت کے خونی پنجوں کو اپنی رگ جان کے قریب دیکھ کر بھی بدحواس نہیں ہوا اور حقیقت جانے بغیر کسی پر الزام تراشی نہیں کی۔ ''پہلے اچھی طرح کھانے کی جانچ کی جائے کہ وہ زہر آلود تھا یا میرے اپنے ہی جسم کے اندر یکایک کوئی فساد برپا ہو گیا تھا۔''

بابر کے صبر وتحمل پر تمام مغل سرداروں اور دوسرے امیروں کے چہرے متغیر ہو گئے تھے۔ آخر احمد جمال کی قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ سرعدالت بول اٹھا۔ ''عزت مآب بار بار اپنے دشمنوں کو معاف کرتے ہیں اور یہ بے ضمیر واحسان فراموش لوگ بار بار اپنی خباثت نفسی کا بدترین مظاہرہ کرتے ہیں۔'' احمد جمال کا لہجہ بلند بھی تھا اور انتہائی تلخ بھی۔ ''میرے بار بار عرض کرنے کے باوجود آپ دشمن کی دعوت میں چلے گئے خاکم بدہن! اگر شاہ ذی وقار کو کچھ ہو جاتا تو مستقبل کا مؤرخ اس کے سوا کچھ تحریر نہ کرتا کہ ایک عظیم انسان اپنے دشمنوں کے گناہ معاف کرتے کرتے خود ہی مجرم بن گیا۔'' شدت جذبات میں احمد جمال کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ ''میں بصد احترام اپنے شہنشاہ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ وہ گل وشبنم کی زبان میں کب تک پتھروں سے کلام کرتے رہیں گے؟''

''تم تو ایسا نہ کہو احمد جمال!'' بابر کے ہونٹوں پر اک عجیب سی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ ''تم خود بھی تو آج تک پتھروں سے اسی لہجے میں بات کرتے رہے ہو۔''

''عالی جاہ! میرا ذکر نہ کریں کہ میں تو ایک عام انسان ہوں۔ اگر پتھروں سے ٹکرا کر مر بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا...... لیکن اگر آپ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تو یہ بندگان خدا کا نقصان عظیم ہوگا' یہ توہم پرست لوگ دو گز زمین کے لئے آپس میں لڑنے والے اور عہد کر کے توڑ دینے والے نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں اور آپ کی ہستی اس زمین کے لئے کتنی مبارک ہے۔''

بابر نے بہت گہری نظروں سے اپنے جاں نثار ساتھی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھرا' مگر فوراً ہی ڈوب گیا۔ ''تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ میں نے کبھی تمہارے جذبات کی ناقدری نہیں کی اور کبھی کسی آمر کی طرح تمہارے مشورے کو نہیں جھٹلایا...... مگر اس وقت تم اپنی نشست پر بیٹھ جاؤ اور مجھے انصاف کے تقاضے پورے کرنے دو۔''

اس کے بعد بابر نے شاہی طبیبوں کو حکم دیا کہ دعوت میں استعمال ہونے والی غذا کا مکمل کیمیائی تجزیہ کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ وہ غذا زہر آلود تھی یا شہنشاہ کی بگڑتی ہوئی حالت خود اس کے جسمانی تغیر کا نتیجہ تھی۔

شاہی طبیبوں نے کسی تاخیر کے بعد تھوڑی سی غذا ایک کتے کو استعمال کرائی' چند لمحوں بعد ہی کتے کی حالت غیر ہونے لگی' بابر نے شاہی طبیبوں کو دوسرا حکم دیا کہ اس معصوم جانور کو ہر صورت میں بچایا جائے۔ زہر آلود غذا کھاتے ہی کتے کا سارا جسم پھول گیا تھا۔ غریب ایک دن اور ایک رات اپنی جگہ پر پڑا ہوا ناقابل بیان اذیت برداشت کرتا رہا۔ کتے کے علاوہ بابر کے دو ملازموں نے بھی آزمائش کے طور پر تھوڑا سا کھانا کھایا تھا' وہ دونوں بھی اسی آفت کا شکار ہوئے اور جان کنی کی منزل تک پہنچ گئے۔ آخر بڑی مشکل سے ان بے چاروں کی جان بچائی گئی۔ اب بابر کو اس بات پر یقین آ گیا تھا کہ اسے زہر آلود غذا کے ذریعے ہلاک کرنے کی خوفناک سازش کی گئی تھی' مگر پھر بھی یہ بات تحقیق طلب تھی کہ اس سازش کے پیچھے کس کے ہاتھ حرکت کر رہے تھے۔ بابر نے

تفتیش کے لئے احمد چاشنی گیر اور دوسرے باورچیوں کو اپنی مخصوص عدالت میں طلب کرلیا۔ پہلے تو وہ اس سازش کے امکان یا وجود ہی سے انکار کرتے رہے' مگر جب جسموں پر تازیانوں کی بارش کی گئی اور وہ سر سے پاؤں تک لہولہان ہوگئے تو انہوں نے اقرار کرلیا کہ وہ سازش میں شریک ضرور تھے لیکن منصوبہ ساز نہیں تھے۔

"پھر کس شقی القلب انسان نے میری ہلاکت کا منصوبہ بنایا تھا؟" خلاف معمول بابر کے لہجے سے نفرت غضب کی آگ برس رہی تھی۔

"مادر ملکہ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا اور ہم حق نمک ادا کرنے کے لئے آپ کو زہر دینے پر مجبور تھے۔" احمد چاشنی گیر اور تمام باورچیوں نے بیک زبان کہا۔

"تم نمک تو میرا کھاتے ہو' پھر کس کے نمک کا حق ادا کر رہے تھے؟" مغل شہنشاہ کا لہجہ شرربار ہوگیا۔ "تمہارا آقا ابراہیم لودھی تو بہت دن سے زیر زمین سو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا رزق بھی ختم ہوگیا اور نمک بھی۔ گزشتہ ایک سال سے تم میرے ملازم ہو اور میرا ہی نمک کھا رہے ہو۔ پھر تمہیں ایسا کرتے وقت میرے نمک کا خیال کیوں نہیں آیا؟ منافقو! تم کسی کے نمک خوار نہیں۔ تمہارا وجود و عدم دونوں برابر ہیں۔ اس لئے تمہارا قتل ہوجانا ہی بہتر ہے تاکہ اہل دنیا نمک خواری اور نمک حرامی میں تمیز کرسکیں۔"

حکم شاہی کے مطابق احمد چاشنی گیر کی کھال کھینچی گئی۔ یہ سزا اتنی دردناک تھی کہ دیکھنے والے اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے تھے۔ دوسرے باورچیوں کو شمشیر کے ایک وار سے قتل کردیا گیا۔ احمد چاشنی گیر کے مقابلے میں نسبتاً یہ موت زیادہ آسان تھی۔

اس کے بعد سلطان ابراہیم لودھی کی ماں کو مغل شہنشاہ کی اسی مخصوص عدالت میں طلب کیا گیا۔ بڑا عبرتناک منظر تھا کہ ہندوستان کی سابق ملکہ کو مسلح سپاہیوں کے پہرے میں بابر کے سامنے لایا گیا۔ وہ بابر جو ایک دن پہلے تک اسے مادر گرامی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور جب بھی وہ کسی تقریب یا محفل میں نظر آجاتی تھی تو مغل شہنشاہ اس کے احترام میں اپنی نشست پر کھڑا ہوجاتا تھا۔

"آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟" سلطان ابراہیم لودھی کی ماں کو دیکھتے ہی بابر نے پوچھا۔ اس وقت بھی شہنشاہ کا لہجہ بہت مؤدبانہ تھا۔

"تو میرے بیٹے کا قاتل ہے اور میں اپنے بیٹے کے قاتل کو کسی بھی حال میں معاف نہیں کرسکتی۔" وہ بددماغ' مغرور اور کینہ پرور عورت اب بھی وقت کی رفتار کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

"مگر میں نے تو آپ کو معاف کردیا تھا' حالانکہ آپ میرے سب سے بڑی سیاسی حریف کی والدہ تھیں۔" بابر انتہائی شائستہ لہجے میں رک رک کر بول رہا تھا۔ "کیا آپ اس حقیقت سے باخبر نہیں کہ اگر میری تقدیر یاوری نہ کرتی تو پھر آپ کا بیٹا میرا قاتل ہوتا۔ خدا کی قسم! وہ مجھے ہرگز معاف نہ کرتا' مگر میں نے آئین سیاست کے خلاف عفو و درگزر کی روایت کو زندہ رکھا۔ صرف اس لئے کہ اقتدار کی کشمکش میں کم سے کم انسانوں کا خون بہے۔ مجھے مشورے دیئے گئے تھے کہ میں آپ کے پورے خاندان کو تہہ و تیغ کرڈالوں یا زنداں کے حوالے کرکے آپ سب کو اذیت ناک موت مرنے پر مجبور کردوں...... لیکن میں نے اس طرح آپ کی تالیف قلب کی کہ میرے بعد شاید کوئی دوسرا حکمران اس روش کو اختیار نہ کرسکے۔ میں نے آپ کو ماں کہہ کر پکارا اور اس لفظ کو اس کا حقیقی مفہوم بخشا۔ آپ نے مجھے ہزاروں انسانوں کے سامنے سینکڑوں بار بیٹا کہہ کر مخاطب کیا اور پھر اس بیٹے کو زہر دے کر

ہلاک کرنے کی کوشش کی' آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کے اس عمل نے انسانیت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے؟" بابر کے لہجے میں بڑا کرب تھا' بڑی حیرت تھی۔ "اب کون کس پر اعتبار کرے گا؟ آپ نے تو اعتبار اور وفا کے تمام راستے ہی بند کردیئے۔ کاش! آپ مجھے تمام عمر اپنے بیٹے کا قاتل ہی کہہ کر پکارتی رہتیں۔ میں خوش ہوتا کہ ایک بہت سچے اور بے باک دشمن سے میرا مقابلہ ہے...... مگر آج آپ کے حقیقی خدوخال دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ابراہیم لودھی آپ ہی کا تربیت یافتہ تھا۔"

اس کے بعد بابر کے حکم پر ابراہیم لودھی کی ماں کو ایک کمرے میں نظربند کردیا گیا اور چاروں طرف مسلح پہرے دار بٹھا دیئے گئے۔

⌑ ⌑ ⌑

ابھی ایک مصیبت سے پیچھا چھوٹا تھا کہ دوسری آفت اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔

رانا سانگا ہندو حکمرانوں میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے پہلے بھی حکومت و امارت اس خاندان کی امتیازی شان تھی۔ دہلی اور اجمیر کے حاکم' جو سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھوں تباہ ہوئے تھے وہ بھی رانا سانگا کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ دو چار پشتوں کے بعد ان سب کا سلسلہ نسب آپس میں مل جاتا ہے۔ بابر کے حملے کے وقت تقریباً ایک لاکھ راجپوت رانا سانگا کے تابع تھے۔ اس کے علاوہ سلطان ابراہیم لودھی کے بہت سے امیر جو بابر کے مخالف تھے اور اب تک مغل شہنشاہ کے حلقہ اطاعت میں داخل نہیں ہوئے تھے وہ بھی رانا کی بھرپور حمایت کر رہے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کا چھوٹا بیٹا محمود خان لودھی بھی اپنے دس ہزار سواروں کے ساتھ رانا سانگا سے جا ملا تھا۔ مارواڑ کے تمام راجے پرم دیو' نرسنگی دیو' میدنی رائے' راجہ چندر میری' راول دیو' راجہ ڈونگر پور' رائے چندر بھان چوہان' مانک چند چوہان اور رائے دلیپ وغیرہ بھی تقریباً ساٹھ ہزار لشکر رانا کے پرچم تلے جمع ہوگئے تھے۔ حسن خان میواتی بھی دس ہزار سوار لے کر رانا کی مدد کو پہنچا تھا۔ الغرض یہ تمام افغان اور راجپوت سردار دو لاکھ سپاہیوں کا لشکر عظیم لے کر بابر سے جنگ کرنے اور ہندوستان کو مغلوں کے اقتدار سے بچانے کے لئے آگرے کی طرف روانہ ہوئے۔

پانی پت کی جنگ کے بعد بوڑھا نجومی محمد شریف بھی آگرہ آگیا تھا اور اس کی پیش گوئیوں نے دور دور کے علاقوں میں ہلچل مچا دی تھی جو زبان سے کہہ دیتا وہی واقعہ کچھ دن بعد رونما ہوجاتا۔ لوگ محمد شریف کی پیش گوئیوں پر بہت زیادہ اعتبار کرتے تھے اور اسی وجہ سے چاروں طرف ایک خوف و ہراس سا پھیلا رہتا تھا۔

جب محمد شریف سے متوقع جنگ کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے بابر سے صاف صاف کہہ دیا۔

"اس وقت سیارہ مریخ مغرب کی جانب سے طلوع ہے۔ جو کوئی بھی اس طرف حملہ آور ہوگا اسے اپنے مقابل کے ہاتھوں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

یہ بابر کی شکست کے بارے میں کھلی ہوئی پیش گوئی تھی' جسے سن کر مغل سرداروں کے چہرے فق ہوگئے۔

⌑ ⌑ ⌑

دوسرے مغل امراء تو خاموش بیٹھے رہے' مگر احمد جمال سے یہ صورتحال برداشت نہ ہوسکی اور وہ انتہائی گستاخانہ لہجے میں بول اٹھا۔

''بوڑھے نجوی! تو بھی جھوٹا اور تیرا علم بھی جھوٹا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے' پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتا اور اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگتا۔''

احمد جمال کی یہ جرأت گفتار دیکھ کر بابر بھی حیرت زدہ تھا اور دیگر امرائے سلطنت بھی۔ خود نجوی محمد شریف کی یہ حالت تھی کہ اپنے بارے میں یہ تحقیر آمیز گفتگو سن کر اس کا چہرہ مسخ ہوگیا تھا۔

''شہنشاہ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے ساتھ یہ کیسا ذلت آمیز سلوک ہو رہا ہے؟'' شدت کرب سے محمد شریف کو اپنی زبان پر قابو نہیں رہا تھا اور سننے والے اس کی آواز کی لکنت کو صاف طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ ''جو شخص علم نجوم کی ابجد بھی نہیں جانتا وہ اس طرح سر دربار میرا مذاق اڑائے گا۔ عالی جاہ! میں اپنی اس توہین کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

شہنشاہ کو بھی ایک خاص علمی مسئلے میں احمد جمال کی یہ مداخلت گراں گزری تھی' مگر وہ اس لئے خاموش رہا کہ احمد جمال پہلے بھی کئی بار علم نجوم کا مذاق اڑا چکا تھا اور بعض اہم معاملات میں اس کے مشورے درست ثابت ہوئے تھے۔

''میں خود بھی شہنشاہ کے احترام میں خاموش ہوں اور صرف تمہیں جھوٹا کہنے پر قناعت کر رہا ہوں۔ اگر شہنشاہ اس معاملے میں مجھے بااختیار بنا دیتے تو پھر تیرے ساتھ میرا طرز عمل کچھ اور ہوتا۔'' احمد جمال نے نجوی محمد شریف کے احتجاج کے جواب میں کہا۔ ''رہتا زمین پر ہے اور آسمان کی خبریں لانے کا دعویٰ کرتا ہے؟ ایسے دعوے تو وہ مردان خدا بھی نہیں کرتے تھے جنہیں قدرت نے بڑا علم بخشا تھا اور جن کی آنکھوں پر مستقبل کے بہت سے واقعات زندہ تصویروں کی طرح روشن تھے۔ اگر تیرا علم سچا ہے تو پھر بتا کہ قصر شاہی کی اس دیوار کے پیچھے کون کس حالت میں کھڑا ہے؟''

''اس سے زیادہ اس عظیم علم کی توہین نہیں ہوسکتی شہنشاہ!'' احساس رسوائی کی تکلیف سے نجوی محمد شریف کراہنے لگا تھا۔ ''اور اس سے زیادہ جاہل انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا جو ایسے شرمناک انداز میں سر دربار اہل علم کی دستار اچھالتا ہے۔''

محمد شریف جسے ہندوستان کے توہم پرست لوگ ایک عظیم کاہن کا درجہ دیتے تھے' وہ دربار بابری میں اپنی یہ تذلیل کس طرح برداشت کرسکتا تھا۔ شدید عالم طیش میں اپنی نشست سے اٹھا اور یہ کہتا ہوا دربار سے نکل گیا۔

''اے جاہل شخص! عنقریب سب لوگ اپنی آنکھوں سے تماشا دیکھ لیں گے' پھر ساری دنیا گواہی دے گی کہ محمد شریف کیسا باخبر انسان ہے۔ افسوس! اس کے علم کی قدر نہیں کی گئی۔''

اس واقعہ کے کچھ دن بعد شہنشاہ بابر آگرے سے نکل کر کانوہ نام کے ایک قصبے میں پہنچا۔ یہ قصبہ بیانہ کے مضافات میں واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر بابر نے فیصلہ کیا کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ اس وقت تک جنگ جاری رکھے گا جب تک کسی ایک حریف کا سیاسی وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ اپنے اسی ارادے کے زیر اثر مغل شہنشاہ نئے انداز سے جنگ کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

بابر نے اپنی فوج کے کچھ خبر رساں دستے دشمن کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے کے لئے آگے کی طرف بھیجے' مگر یہ تمام سپاہی بہت جلد زخمی ہوکر اور شکست کھا کر واپس لوٹ آئے۔ پھر بیانہ کے رہنے والوں نے بھی قلعے کی چاردیواری سے نکل کر دشمن سے جنگ کی اور شکست کھا کر دوبارہ قلعہ بند ہوگئے۔ ان دونوں بری خبروں نے بابر کے لشکر میں سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ سپاہیوں کے ساتھ عام لوگ بھی طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہوکر سہم سے گئے تھے۔ بابر کا ایک ہندوستانی امیر ہیبت خان نیازی دشمن فوجوں کی کثرت دیکھ کر خوف و دہشت کے عالم میں سنبھل کے علاقے کی طرف فرار ہوگیا۔

اس واقعے کے بعد بابر نے آگے بڑھ کر دشمن کے مقابل صف آرا ہونا مناسب نہیں سمجھا اور وہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگرہ واپس لوٹ آیا' اس دوران کئی مغل سردار اور ہندوستانی امیر دبے الفاظ میں نجوی محمد شریف کی پیش گوئی پر تبصرہ کر رہے تھے کہ وہ ایک باخبر شخص ہے اور جو کہتا ہے درست کہتا ہے۔ اگر شہنشاہ اس وقت رانا سانگا سے مقابلے کی مہم کو ملتوی کردیں تو یہ ایک بہترین جنگی حکمت عملی ہوگی۔ بابر اپنے امراء کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے ان اندیشوں سے قطعاً بے خبر تھا' اس نے فوری طور پر ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا اور اپنے فوجی امراء سے جنگ کے بارے میں مشورہ کرنے لگا۔

اکثر امیروں اور سرداروں نے ایک ہی رائے دیتے ہوئے کہا۔

''دشمن کی روز بروز بڑھتی ہوئی قوت ہمارے سامنے ظاہر ہوچکی ہے' اس لئے بہتر یہی ہے کہ شہنشاہ بڑے بڑے قلعوں کو اپنے معتمد امراء کے حوالے کرکے خود پنجاب کی طرف تشریف لے جائیں اور وہاں پہنچ کر غیبی امداد کا انتظار کریں۔''

''بظاہر آگرے سے پنجاب کی طرف کوچ کر جانا ایک سیاسی مصلحت ہوسکتی ہے' مگر درپردہ تم لوگ انتہائی شائستہ الفاظ میں مجھے فرار کا مشورہ دے رہے ہو۔'' بابر نے کسی قدر برہم لہجے میں کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر تم لوگ کس منہ سے غیبی امداد کے انتظار کی بات کر رہے ہو؟ غیبی امداد تو ان لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو بدترین حالات میں بھی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے سربکف ہوکر اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ کم ہمت اور مفرور انسانوں کی کبھی مدد نہیں کرتا۔''

بابر کی اس بات کے بعد جنگ کا فلسفہ ہی تبدیل ہوگیا تھا۔ تمام مغل سرداروں اور ہندوستانی امیروں نے قسم کھا کر کہا کہ وہ کسی بھی حالت میں میدان جنگ سے منہ نہیں موڑیں گے۔ بابر نے بڑی خوشگوار حیرت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے دمکتے ہوئے چہروں کی طرف دیکھا' ان کی زبان اور جذبات میں کھلی ہوئی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

امرائے سلطنت نے بابر کے مزید اطمینان کے لئے قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا۔ ''ایک مسلمان کے لئے شہادت سے بڑھ کر کوئی دوسری سعادت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے خالق کے حضور میں دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں اس اعزاز سے شرف یاب کرے۔''

⌑ ⌑ ⌑

جمادی الآخر کی نو تاریخ کو بابر نے آگرے سے کوچ کیا' پھر مغل شہنشاہ کا لشکر دشمن سے تین کوس کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ ملک قاسم اور بابا قشقہ مغل کی نگرانی میں چغتائی بہادروں نے دشمن کے جاسوس دستوں کو بڑی آسانی سے مار بھگایا' اس کے بعد بابر نے مزید ایک کوس کا فاصلہ طے کیا اور خیمہ زن ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر مغل شہنشاہ نے مختلف جنگی محاذوں کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ گیا۔ جمادی الآخر کی تیرہ تاریخ کو بابر بیانہ کے مضافات میں داخل ہوکر قصبہ کانوہ میں مقیم ہوا' یہاں سے ایک کوس کے فاصلے پر دشمن کی فوجیں خیمہ زن تھیں۔ ابھی مغل لشکر کے سرفروشوں نے خیمے پوری طرح نصب بھی نہیں کئے تھے کہ رانا سانگا کی فوج جو دو لاکھ سے زیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھیں حشرات الارض کی طرح ہزاروں کوہ پیکر ہاتھیوں کے ساتھ چاروں طرف سے نمودار ہوئی۔

جب بابر نے بچشم خود دشمن کے جنگی وسائل کا جائزہ لیا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ دونوں سیاسی حریفوں کے فوجی طاقت میں کوئی توازن ہی نہیں تھا۔

دشمنوں کی کثرت دیکھ کر شاہی امراء کے چہرے اتر گئے تھے' وہ اپنے قول وقسم سے مجبور تھے ورنہ میدان جنگ چھوڑ کر کسی عافیت گاہ کی طرف جاچکے ہوتے۔ خود بابر نے بھی تین بار بڑی اداس نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھا۔

''اے بے پناہ طاقتوں اور لازوال قدرتوں کے مالک! یہ تیرا وعدہ ہے کہ تو اپنے نام لیواؤں کو مصیبت کی گھڑی میں بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا...... اور تو خوب دیکھ رہا ہے کہ تیرے ان بندوں پر اس سے زیادہ سنگین اور نازک گھڑی کوئی نہیں آئی۔ اپنے آسمانی لشکروں کو بھیج کہ تیری مدد کے بغیر ہمارے جسم کفار کی شمشیروں کی خوراک بن جائیں گے۔ بے شک! میں تیرا ایک بہت گنہگار بندہ ہوں اور میں نے تیرے احکام سے سرتابی کی ہے۔ میری اس سرکشی کو معاف فرما اور میری توبہ کو قبول کرلے۔ میں اسی وقت سے شراب نوشی کی لعنت کو ترک کرتا ہوں' آج کے بعد میرے دور اقتدار میں پھر کبھی کوئی مجلس کیف ونشاط آراستہ نہیں ہوگی۔ بس مجھے اس معرکے میں فتح مند کردے۔ پھر میں تیرے محبوب پیغمبرؐ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ بلاشبہ میرا یہ عہد مجبوری کا عہد ہے' مگر ساری کائنات ہمہ وقت اس امر پر گواہی دے رہی ہے کہ تو مجبور نہیں ہے۔ اپنی اسی بے نیازی کے صدقے میں مجھے بھی دشمنوں کی طاقت کے ذخیروں سے بے نیاز کردے۔'' بابر نے اس قدر اثر انگیز لہجے میں دعا مانگی کہ شدت جذبات سے اس کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔ اپنے فرمانروا کی یہ حالت جذب دیکھ کر بعض امرائے سلطنت بھی رونے لگے تھے۔

احمد جمال بھی زاروقطار رو رہا تھا' مگر اس کے ان آنسوؤں کے پیچھے ایک ناقابل بیان مسرت کی گہری جھلک بھی موجود تھی۔ جیسے ہی بابر کی دعا ختم ہوئی احمد جمال بڑی وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھا اور اس نے تین بار مغل حکمران کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ''شہنشاہ! میں تمام عمر اسی دن کا انتظار کرتا رہا ہوں...... اور اسی دن کے

، میں نے اپنی بے شمار راتیں گریہ وزاری میں بسر کی ہیں اور آنسوؤں کے لاتعداد نذرانے اپنے خالق کی اہ میں بھیجے ہیں۔ صد ہزار شکر کہ میری دعائیں قبول ہوئیں۔ اب آپ صحیح معنوں میں میرے مخدوم ہوگئے میں آپ کا ادنیٰ خدمت گار ایک مسلمان حکمران کو اپنے رب کا اتنا ہی شکر گزار ہونا چاہئے۔ اب آسمانی لشکر ، زمین پر ضرور اتریں گے۔ صرف اہل ایمان ہی نہیں' کافروں کا ہجوم بھی ان لشکروں کو اپنی آنکھوں سے بھے گا۔''

بابر کی طبیعت کا انقلاب اس قدر شدید تھا کہ اس نے ترک شراب نوشی اور مجالس نشاط کے ساتھ دیگر ۔وہات یہاں تک کہ داڑھی منڈھانے سے بھی توبہ کرلی۔ بابر حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والا ایک باکردار لمان تھا۔ اس نے کبھی نماز ترک نہیں کی' وہ بڑی پابندی سے ہر جمعہ کو روزہ رکھتا تھا' موسیقی' شاعری' انشاء اور انجوم میں اسے مہارت خاص حاصل تھی۔ نثر نگاری کے میدان میں بڑے بڑے علماء بابر کی استادی کو تسلیم رتے تھے۔ (سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد آج بھی اسے ترکی زبان کا دوسرا بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے) ہری اعتبار سے وہ اس قدر دلکش شخصیت کا مالک تھا کہ دیکھنے والے اسے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ خوش فتاری اور مسکراتے ہونٹوں نے اس کے حسن میں بہت اضافہ کردیا تھا۔ ذہانت وفطانت میں بھی بابر اپنی مثال پ تھا۔ وہ حقیقتاً صاحب سیف وقلم تھا (پوری تاریخ انسانی میں ایسی شخصیات خال خال ہی نظر آتی ہیں) وہ بشہ مظلوموں کی دادرسی کرتا تھا اور اس نے مسند عدالت پر بیٹھ کر کبھی ناانصافی نہیں کی۔ ان تمام تر صفات کے وجود بابر کی رنگین مزاجی بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی ساری زندگی میدان جنگ میں لزاری' لیکن وہ کیف ونشاط کی محفلیں آراستہ کرنے سے کبھی باز نہیں آیا' اس کی مجلس خاص میں پری چہرہ حسینوں ا ہجوم رہتا تھا۔ بابر نے کابل میں ایک انتہائی حسین و دلکش مرغزار تعمیر کرایا تھا۔ پھر اس کے درمیان میں ایک ذبصورت حوض بنا کر اسے شراب سے لبریز کردیا گیا تھا۔ وہ فرصت کے لمحات میں اس حوض کے کنارے اپنے وش مزاج ذہین اور اعلیٰ ظرف دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر عیش وعشرت کی محفلیں سجایا کرتا تھا۔ بابر نے اپنا ایک نعر بھی اس حوض پر کندہ کرادیا تھا۔

نوروز و نوبہار رومئے دلبری خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آج اسی بابر نے شیشے کے تمام ساغر اور صراحیاں توڑ ڈالی تھیں اور ساری شراب خیموں سے دور لے جاکر زمین پر بہادی تھی' قیمتی پتھروں سے آراستہ سونے کے برتنوں کے بارے میں حکم دیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد انہیں فروخت کرکے حاصل شدہ ساری رقم غریبوں میں تقسیم کردی جائے۔ کچھ سرداروں نے خوش دلی کے ساتھ اور کچھ امیروں نے جبراً اپنے بادشاہ کی تقلید میں یہی عمل دہرایا' رات بھر شاہی لشکر پر عجیب سی فضا طاری رہی' حکمران سے لے کر سپاہی تک اس قادر مطلق کو پکارتا رہا' جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا۔

⌑ ⌑ ⌑

بابر کی فوج صرف چوبیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی' شاہی لشکر میں دس بارہ ہزار مغل تھے اور باقی فوجی ان

ہندوستانی امیروں سے تعلق رکھتے تھے جو بابر کے حلقہ اطاعت میں شامل ہوگئے تھے۔ اس کے برعکس جو غیر مسـ
راجہ بابر سے جنگ کرنے کے لئے آئے تھے ان میں سے ہر شخص ہندوستان کے کسی نہ کسی علاقے کے ہندو دل
سردار تھا۔ ان تمام راجاؤں نے انتہائی رازدارانہ طور پر عہد و پیماں کئے تھے کہ وہ بابر سے جنگ کرنے ـ
بہانے تمام مسلمانوں کا خاتمہ کردیں گے۔ پہلے مغل بادشاہ کو شکست دی جائے گی' اس کے بعد ان مسلمان حلیفوا
کو تہہ تیغ کردیا جائے گا' جو اس جنگ میں رانا سانگا کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ ہندوؤں کا بڑا خوفناک منصو
تھا' مگر خود غرض اور عاقبت نااندیش مسلمان حاکم صرف بابر کی دشمنی میں ہندوؤں کے اس تباہ کار منصوبے
تقویت پہنچا رہے تھے۔

مسلمانوں کی فوج کو مرتب کرنے کا کام نظام الدین علی خلیفہ کے سپرد کیا گیا۔ نظام الدین نے بڑ
جانفشانی اور ذہانت سے یہ فریضہ انجام دیا اور اسی نے تجویز پیش کی کہ بادشاہ کا قیام لشکر کے "قول" میں ؛
(قول فوج کے اس حصے کو کہا جاتا ہے جو لشکر کے عین درمیان میں ہو) بابر نے نظام الدین علی خلیفہ کی اس تجو
سے اتفاق کیا۔ شہزادہ ہمایوں میمنہ کی نگرانی کر رہا تھا اور میسرہ پر سید خواجہ کو مامور کیا گیا تھا۔ سید خواجہ کے تحت د
سارے مغل سور ما تھے جو محمد سلطان مرزا کی زیر قیادت کئی معرکے جیت چکے تھے۔ بابر نے نظام الدین علی خلیف
کے مشورے سے چند ہزار سپاہی محفوظ فوج میں رکھے تاکہ جہاں بھی ضرورت پڑے وہ فوری طور پر مدد کے لئے
پہنچ جائیں۔

دن کی چار گھڑیاں گزرنے پر بابر نے اپنی فوج کو غنیم کے لشکر کی طرف حرکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے قتل
و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ انسانی خون اتنا ارزاں تھا کہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور میدان جنگ پر میدان حشر ک
سا گماں ہونے لگا تھا۔ زخمی سپاہیوں' گھوڑوں اور ہاتھیوں کی دلدوز چیخوں سے فضا لرز رہی تھی۔ ہندوؤں نے
اپنی جنگی حکمت عملی کے مطابق سب سے پہلے پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے "جرانغار" پر یلغار کی اور
بڑے خوفناک انداز میں خسرو کوکلتاش اور ملک قاسم پر حملہ آور ہوئے۔ (جرانغار دائیں طرف کی فوج کو کہا جاتا
ہے) بابر کا اشارہ پاتے ہی حسین تیمور سلطان جرانغار کی مدد کے لئے بھوکے عقاب کی طرح جھپٹا۔ مغل سردار کا یہ
حملہ اتنا شدید تھا کہ ہندوؤں کا لشکر اس کی تاب نہ لاسکا اور مسلسل پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مسلمانوں نے اس تصادم کو
اپنی فتح کی پہلی علامت سمجھا۔

اس کے بعد بابر نے مغلوں کے معروف طریقے کے مطابق چاروں جانب سے جنگ کا آغاز کردیا' جس
طرف بھی مدد کی ضرورت ہوتی' فوج کا بیشتر حصہ اسی طرف مصروف کار ہوجاتا۔ استاد علی قلی رومی اور دیگر
ہنرمندوں نے آتش بازی اور بارود کے آلات سے بھی خوب خوب کام لیا اور جگہ جگہ دشمن کی صفوں میں گہرے
شگاف ڈال دیئے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر ہندوؤں کی فوج نے بابری لشکر کے ایک پہلو کو اپنے حملوں کا ہدف بنایا
اور مسلسل دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔ حسن خان میواتی ہراول دستے کے دس ہزار سواروں اور دلیر راجپوتوں کی ایک
جماعت کو لے کر بڑے خونخوار انداز میں تابڑتوڑ حملے کر رہا تھا' وہ ساعت قریب تھی کہ اس کے حملوں سے چغتائی
لشکر کے قدم اکھڑ جاتے' عین اسی وقت بابر نے قلب کو آگے بڑھایا مغل جانباز برق کی طرح کافروں کے سر پر
چمکے اور غازیوں کی تکبیر سے پورا میدان جنگ کانپنے لگا۔ حسن خان میواتی نے ان بڑھتے ہوئے شہ سواروں کے
مقابلے پر اپنے تیر انداز دستوں کو آگے بڑھایا' حسن خان میواتی کی جنگی حکمت عملی سو فیصد درست تھی' مگر

جذبوں کے اس سیلاب کو کون روکتا' جو موت اور زندگی کے مفہوم سے بے نیاز ہوچکے تھے۔ مغل شہسوار اس طرح
آگے بڑھ رہے تھے جیسے ان پر تیروں کی نہیں پھولوں کی بارش ہو رہی ہو' تھوڑی ہی دیر میں بابر کے سپاہی
دشمنوں کے سروں پر جا پہنچے اور آن کی آن میں حسن خان میواتی کے ایک ایک تیر انداز کو قتل کر ڈالا۔ دفاع کی
سب سے مضبوط دیوار ٹوٹ چکی تھی۔ اس لئے کافر کی فوج کے اگلے دستے میدان جنگ سے منہ موڑ کر فرار کی
راہیں تلاش کرنے لگے۔ حسن خان میواتی جس کے باپ دادا دو سو برس سے اس علاقے پر حکمرانی کرتے چلے
آرہے تھے' ایک نیزے کی ضرب سے جاں بحق ہوا' رائے راول دیو' چندر بھان چوہان' مانک چند چوہان اور کرم
سنگھ راجپوت جیسے طاقتور راجہ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

فرار ہونے والے ہندو سپاہی اب رانا سانگا کے گرد جمع ہو رہے تھے تاکہ انہیں نئی طاقت حاصل ہوسکے......
مگر رانا ایک ہوشیار انسان تھا اور اپنی اسی ذہانت کے سبب اس نے پہلی ہی نظر میں نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا' اس
لئے وہ اپنے جاں نثاروں کو موت کے گرداب میں تنہا چھوڑ کر میدان جنگ سے فرار ہوگیا۔ یہ خونریز معرکہ تقریباً چار
بجے دن تک جاری رہا۔ بابر کی بلند اقبالی' فنی مہارت اور اولوالعزمی نے ہندوؤں کی کئی سالہ جنگی تیاریوں کو صرف
چند گھنٹے کے اندر خاک میں ملا دیا۔

اس عظیم الشان اور یادگار فتح کے بعد تمام لوگ بابر کو غازی کے لقب سے یاد کرنے لگے۔
مغل شہنشاہ نے اس خونی ہنگامے سے فراغت پانے کے بعد حکم دیا کہ قتل ہوجانے والے تمام دشمنوں کے
سر کاٹ کر سامنے والی پہاڑی پر ایک مینار تعمیر کیا جائے۔ اگرچہ بابر کا مورث اعلیٰ امیر تیمور اپنی شقاوت اور
سفاکی کی تسکین کے لئے انسانی سروں کے ایسے کئی مینار تعمیر کرا چکا تھا' لیکن بابر کے حکم میں قہر و ستم کے کسی
جذبے کو دخل نہیں تھا۔ وہ اہل ہند کی مسلسل بغاوتوں اور منافق امیروں کی شرانگیزیوں سے تنگ آچکا تھا۔ مجبوراً
اس نے دشمنوں کے سروں سے ایک بلند مینار بنایا تاکہ سیاسی فتنہ گروں کے ساتھ شورش پسند رعایا کے دلوں پر بھی
مغل سلطنت کا رعب و جلال قائم ہوسکے۔

⌑ ⌑ ⌑

اس کے بعد شہنشاہ بابر چندیری کے حاکم راجہ میدنی رائے کی طرف متوجہ ہوا' یہ رانا سانگا کا حلیف تھا اور
شکست کے آثار نمایاں ہوتے ہی میدان جنگ سے فرار ہوگیا تھا' شاید بابر اس کے اس جرم کو معاف کردیتا' مگر
میدنی رائے کی مسلم دشمنی اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔ مغل شہنشاہ اس کو اسی گناہ عظیم کی سزا دینے چندیری پہنچا'
جب میدنی رائے کو یہ خبر ملی تو وہ دوسرے راجپوتوں کے ساتھ ارک کے قلعے میں چلا گیا اور دروازے بند
کرلئے۔ بابر کو روکنے والا کون تھا؟ اس نے بے روک ٹوک آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ راجہ میدنی رائے
اپنے اس قلعے کو بہت زیادہ محفوظ سمجھ رہا تھا' مگر مسلمان سپاہیوں نے دوسرے ہی روز قلعہ تسخیر کرلیا۔ تقریباً پانچ
چھ ہزار راجپوتوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ یہ سنگین صورتحال دیکھ کر برہمنوں اور راجپوتوں کی ایک جماعت
اپنے بیوی بچوں کے ساتھ راجہ میدنی رائے کے محل میں پناہ گزیں ہوگئی۔ محل کے دروازے بند کرلئے گئے۔ بابر
نے محصورین کے نام پیغام بھیجا کہ اسے صرف میدنی رائے کی ضرورت ہے' باقی سب لوگ شہنشاہ کی اماں میں
ہیں' کچھ دیر تک جواب کا انتظار کرنے کے بعد بابر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ محل کے دروازے توڑ ڈالیں

اور راجہ میدنی رائے کو گرفتار کر کے شہنشاہ کے حضور میں پیش کر دیں۔

جب راجپوتوں نے دیکھا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے اور مسلمان سپاہیوں کی شمشیروں سے نجات کا کو راستہ نہیں ہے تو انہوں نے اپنی قدیم روایت کے مطابق ''جوہر'' کی رسم ادا کی۔ میدنی رائے کے محل کے اند آگ لگائی اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بہت سی عورتیں اور بچے جل کر راکھ ہو گئے۔ اب راجپوت مردوں باری تھی۔ انہوں نے شمشیریں بے نیام کیں اور اپنی شہ رگیں کاٹ ڈالیں' محل کے کمرے انسانی خون سے گئے۔ آخر میں راجہ میدنی رائے نے اپنے گلے پر تلوار پھیر دی' کچھ دیر تک مرغ بسمل کی طرح تڑپا اور پھر اس جسم ساکت ہو گیا۔

راجہ میدنی رائے نے اپنے دور اقتدار میں چندیری' سارنگ پور' رتھنبور اور رائے سین کی بہت سی مسجدوں جانوروں کا اصطبل بنا کر ان مقامات مقدسہ کے در و دیوار کو گائے کے گوبر سے لیپ پوت دیا تھا۔ جب بابر نے اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھے تو وہ شدت کرب سے رونے لگا۔

''اب میں راجہ میدنی رائے کے انجام سے مطمئن ہوں' اس درندے کا یہی حشر ہونا چاہئے تھا۔''

ہندوستان کے مشہور عالم شیخ زین صدر نے اپنی نگرانی میں مسلمانوں کی ان تمام عبادت گاہوں کو نجاست سے پاک کروایا' پھر بابر نے ان مساجد کے لئے مؤذن اور جاروب کش مقرر کئے اور ان کے اخراجات کے لئے خزانہ شاہی سے وظائف جاری کئے۔

¤ ¤ ¤

ابھی شہنشاہ بابر چندیری ہی میں مقیم تھا کہ اسے اپنے ان امراء کی شکست کی خبر ملی جنہیں شرقی علاقے کے افغانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے بھیجا گیا تھا' بابر یہ خبر سنتے ہی بہت تیز رفتاری کے ساتھ قنوج کی طرف روانہ ہوا۔ رابری کے مقام پر شکست خوردہ امراء بھی بادشاہ سے آملے۔ بابر بہت تیزی سے دریائے گنگا کے کنارے پہنچا اور پھر اس کے حکم سے دریا پر چالیس کشتیوں کا پل باندھا گیا۔ حسین تیمور سلطان اور دیگر امراء دریا پار کر کے کھلے میدان میں پہنچے تو افغانوں کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ حسین تیمور نے بہت دور تک تعاقب کر کے باغیوں کو اس علاقے سے باہر کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ بابر مطمئن ہو کر کچھ دن تک گنگا کے قرب و جوار میں شکار کھیلتا رہا۔ پھر آگرہ لوٹ آیا۔

اب تمام مقبوضہ علاقے کم و بیش پر سکون ہو گئے تھے۔ اس لئے بابر 5 محرم 935ھ کو بڑے اطمینان کے ساتھ گوالیار روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس نے گوالیار کے قلعہ' سنگی ہاتھی' راجہ بکرماجیت اور راجہ مان سنگھ کی تباہ شاہ اور ویران عمارتوں کی سیر کی۔ پھر مغل شہنشاہ نے اپنے معتمد امیر رحیم داد کے بنوائے ہوئے خوبصورت حوض اور دلکش باغ کو دیکھا۔ اس باغ میں بابر کو سرخ رنگ کے گلاب نظر آئے جو بہت ہی نایاب سمجھے جاتے تھے۔ بابر نے فوری حکم دیا کہ اس آتشی رنگ کے گلاب کی ایک شاخ آگرے میں لگوائی جائے۔ وہاں عام طور پر شفتالو رنگ کے گلاب پائے جاتے ہیں۔ قلعے اور باغ کی سیر کے بعد بابر نے سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد میں نماز ادا کی۔ مسجد کا طرز تعمیر اور نقش نگار اس قدر جاذب نظر تھے کہ بابر ان میں گم ہو کر رہ گیا۔ مغل شہنشاہ نے قیام گوالیار کے دوران کئی بار اس عظیم الشان تاریخی مسجد میں نماز پڑھی اور ہر مرتبہ سلطان شمس الدین التمش کی

نفرت کے لئے دعا کی۔ اسی مسجد کے حوالے سے بابر کو اجودھیا کی زیر تعمیر مسجد کا خیال آیا۔ اودھ کا حاکم اسے جد کے بارے میں مسلسل تفصیلی خبریں بھیج رہا تھا۔ چند ماہ پہلے میر باقی نے آخری خبر یہ بھیجی تھی کہ مسجد تقریباً مل ہو چکی ہے اور عنقریب شہنشاہ اس کے طرز تعمیر کو بچشم خود ملاحظہ کریں گے۔

پھر جب مغل فرمانروا گوالیار سے آگرہ پہنچا تو میر باقی کا قاصد دارالحکومت میں موجود تھا۔ اس نے اودھ ے حاکم کا خط شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ میر باقی نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا تھا کہ حضور والا نے جو مشکل م اس غلام کے سپرد کیا تھا' وہ تائید غیبی کے ذریعے تکمیل کو پہنچ گیا۔

بابر نے میر باقی کا خط پڑھ کر ناقابل بیان خوشی کا اظہار کیا۔ ''ایک دن تاج و تخت اور دولت اقتدار سب بھ خاک میں مل جائیں گے' میں بھی فنا ہو جاؤں گا اور وقت کی تیز آندھی میری فتوحات کے آثار کو بھی خس و شاک کی مانند اڑا کر لے جائے گی' مگر اس خانہ خدا کی تعمیر کے حوالے سے ہندوستان کے لوگ مجھے ہمیشہ یاد ہیں گے۔''

اس کے بعد بابر نے آگرے کے محتاجوں میں ایک بہت بڑی رقم تقسیم کی اور احمد جمال کو لے کر اجودھیا فیض آباد) روانہ ہو گیا۔

میر باقی نے اجودھیا کی حدود سے کئی میل باہر نکل کر شہنشاہ کا استقبال کیا۔ امیر الدین اور دوسرے درویش ی بابر کے استقبال کے لئے بہت دور تک چلے آئے تھے۔ امیر الدین چند سالوں میں مزید بوڑھا ہو گیا تھا۔ ل شہنشاہ تمام درویشوں سے بڑے عزت و احترام کے ساتھ ملا اور انہیں اپنے ہمراہ لے کر مسجد تک پہنچا۔

پھر جیسے ہی بابر کی نظر مسجد پر پڑی' وہ کچھ دیر کے لئے ساکت ہو گیا۔ خانہ خدا کا جاہ و جلال دیکھ کر مغل ہنشاہ کے چہرے پر عاجزی کا رنگ ابھر آیا تھا۔ اس کے بعد بابر ٹیلے پر چڑھا۔ مسجد کے مینار' دروازے' محرابیں ، طاق دیکھے۔ کاریگروں نے اپنے بہترین فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ مغل حکمران کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات ہوئے۔ ''زندہ باد! میر باقی زندہ باد۔''

پھر بابر نے اس مسجد میں نماز ادا کی اور دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ وہ بڑے پرسوز لہجے میں اپنے ب کا فضل مانگ رہا تھا۔ ''اے اللہ! تیرے راستے میں میری کوشش بہت حقیر ہے' مگر تیرا گھر تمام انسانوں کے ور سے بھی زیادہ عظیم و بلند ہے۔ اپنے گھر کی اسی عظمت و تقدس کے صدقے میں ہم سب کے گناہوں کو اف فرما اور میرے ساتھی میر باقی کو اس کی محنتوں کا اجر عظیم دے کہ تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں۔''

بابر کی دعا اس قدر اثر انگیز تھی کہ شرکائے نماز کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

ہر زاویے سے مسجد کی تعمیر کا مشاہدہ کرنے کے بعد بابر حضرت موسیٰ عاشقانؒ کی قبر پر ایصال ثواب کے ے حاضر ہوا۔ ''شیخ! اللہ آپ کے درجات بلند فرمائے کہ آپ کی دعاؤں سے ایک خانہ بدوش ہندوستان کا ہنشاہ بن گیا۔''

پھر کچھ دیر امیر الدین کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ درویشوں کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

''اب تمہیں وہ ظالم عورت' اس کا جفاکار بیٹا اور دوسرے راجپوت تنگ تو نہیں کرتے؟'' کھانے سے غ ہو کر بابر امیر الدین سے مخاطب ہوا۔

''نہیں شہنشاہ!'' امیر الدین نے نظریں جھکائے ہوئے بہت آہستہ سے کہا...... ''شاید ستم گروں کی جماعت

تھک گئی ہے۔"

"اب وہ اسے کیا ستائیں گے کہ یہ خود ان کا مسیحا بن گیا ہے۔"..... امیر الدین کے بجائے اس کے ساتھی درویشوں نے بابر کو بتایا....."اللہ نے اس کی زبان میں وہ تاثیر بخشی ہے کہ بیماروں کو شفا حاصل ہو جاتی ہے اور مفلسوں کے خالی دامن بھر جاتے ہیں۔"

امیر الدین نے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا....."شہنشاہ یہ لوگ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

"کہنے والے کہیں یا نہ کہیں مگر تمہاری دعاؤں میں اتنا اثر تو ہونا ہی چاہیے۔" بابر اس عاشق جاں سوختہ سے واقف تھا۔ پہلے وہ شکنتلا کے عشق کی آگ میں جلا' پھر یہی آگ بھڑکتے بھڑکتے معرفت کی آگ میں بدل گئی۔ اس آگ نے اسے روح کی گہرائیوں تک پھونک دیا۔ پھر امیر الدین پارس بن گیا۔ جسے چھو لیتا وہ خود بھی سونا بن جاتا۔

بابر کئی دن تک اجودھیا میں مقیم رہا۔ ہندو مسلمان کی تفریق کے بغیر اس نے ضرورت مندوں میں بے شمار دولت تقسیم کی۔ مسجد اور خانقاہ کے انتظامات کے لئے مزید وظائف مقرر کئے۔ پھر وہ آگرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بابر کی روانگی سے پہلے احمد جمال تنہائی میں امیر الدین سے ملا اور اپنے حق میں دعا کا طالب ہوا۔ امیر الدین بہت دیر تک اسے سینے سے لگائے روتا رہا اور احمد جمال کی آنکھیں بھی اشک برساتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی....."اللہ تمہیں سکون دے احمد! مگر فی الواقع یہاں سکون نام کی کوئی چیز نہیں۔ تم جس سکون کی تلاش میں ہو وہ تو دوسری ہی دنیا میں مل سکتا ہے.....اور اس کا حصول بھی مالک یوم جزا کی رحمت پر منحصر ہے' بہرحال ہم گنہگاروں کو اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے....." بڑی عجیب دعا تھی۔

احمد جمال امیر الدین سے یہ کہہ کر رخصت ہونے لگا....."میں عنقریب سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے نجات حاصل کر کے سمرقند چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہاری جدائی بہت شاق گزرے گی' مگر کیا کروں کہ وہاں کئی محبوب ہستیاں میری منتظر ہیں' سید مہدیؒ کی پہنائی ہوئی زنجیر سے مجبور تھا ورنہ کبھی کا چلا گیا ہوتا۔ پھر میں تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔ تم بھی میرے محبوب کا درجہ رکھتے ہو۔"

امیر الدین بے قرار ہو گیا اور اس نے زار و قطار روتے ہوئے احمد جمال کے ہاتھوں کو بوسہ دیا....."یہاں آ کر کیا کرو گے؟ جہاں جانا چاہتے ہو وہیں چلے جاؤ۔ ہاں! جب تم سید مہدیؒ کی قبر پر حاضر ہو تو غلام کا سلام ضرور عرض کر دینا۔"

¤ ¤ ¤

آگرہ پہنچ کر احمد جمال نے بابر سے سمرقند جانے کی اجازت طلب کی....."شہنشاہ! اب اس خادم کو سبکدوش کر دیا جائے کہ سید مہدیؒ کا بھی یہی حکم تھا۔ اللہ نے آپ کو معرکہ حیات میں سربلند کیا' بڑے بڑے زور آور دشمن سرنگوں ہو گئے اور بابری مسجد تعمیر ہو چکی۔"

احمد جمال کی جدائی کے تصور سے بابر کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں ہو گئے....."میں

ےطرح الوداع کہوں کہ یہ بہت مشکل کام ہے احمد!"

"عزت مآب میری مجبوریاں جانتے ہیں۔ اگر ایفائے عہد نہ کیا تو رسوا ہو جاؤں گا۔" احمد جمال کا لہجہ بھی دار تھا۔

"اچھا کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔" بابر کی آواز سے گہری اداسی جھلک رہی تھی....."کچھ ضروری مسائل باقی ںان کے ختم ہوتے ہی تم سمرقند چلے جانا....."

احمد جمال کو بادل ناخواستہ ٹھہر جانا پڑا۔

اس دوران بہار کے علاقے میں سیاسی انتشار پیدا ہوا اور ایک بار پھر افغانوں نے بغاوت کر دی۔ بابر بہ ں نفیس وہاں پہنچا' مغل شہنشاہ کی بلند اقبالی کا یہ عالم تھا کہ باغی اسے دیکھتے ہی فرار ہو گئے۔

ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ یکایک شہزادہ ہمایوں سنبھل میں..... بیمار پڑ گیا' پھر جب مرض نے رت اختیار کی تو ہمایوں آگرہ پہنچا۔ بابر اپنے بڑے بیٹے سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ولی عہد سلطنت کا یہ حال یکھا تو بابر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے....."جان پدر! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو نے باپ کو اپنی بیماری سے بے خبر یوں رکھا اور دار الحکومت پہنچنے میں اتنی تاخیر کیوں کی؟" بابر بہت غضب ناک نظر آ رہا تھا' مگر یہ غصہ اس کی بے اہ محبت کا دوسرا رنگ تھا۔

بہترین شاہی طبیب ہمایوں کا علاج کر رہے تھے' لیکن مرض میں کوئی افاقہ ہونے کے بجائے بیماری روز وز بڑھتی جا رہی تھی۔ ولی عہد سلطنت اس قدر لاغر و نحیف ہو چکا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا..... بابر بیٹے کی تکلیف کے سبب کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ آہنی اعصاب رکھنے والا انسان اولاد کی محبت میں اتنا چڑچڑا ر بدحواس ہو گیا تھا کہ بات بات پر طبیبوں کو ڈانٹ دیا کرتا تھا....."تم لوگ ابھی تک شہزادے کا مرض ہی تشخیص نہ کر سکے' پھر دوائیں کیسے اثر کریں گی؟"

شاہی طبیب رات رات بھر جاگ کر کتابوں کی ورق گردانی کرتے اور بہترین نسخے آزماتے' مگر ہمایوں پر کسی دوا کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

آخر ایک دن میر ابوالبقا نے شہنشاہ سے عرض کیا....."ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہزادے کی زندگی بہت بڑا صدقہ چاہتی ہے' جس کے بغیر موت نہیں آ سکے گی....." میر ابوالبقا ہندوستان کے ایک عالم و فاضل شخص تھے۔ اپنے اسی علم کی روشنی میں وہ مغل فرمانروا کو مشورہ دے رہے تھے....."اگر شہنشاہ وہ چیز صدقہ کر دیں جو انہیں سب سے زیادہ عزیز ہو تو پھر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ شہزادے کو شفا بخش دے گا۔"

میر ابوالبقا کی بات سن کر دوسرے امراء نے مشورہ دیا کہ سلطان علاء الدین خلجی کے جواہر خانے کا وہ قیمتی الماس جو آگرے کی فتح کے موقع پر شہنشاہ کے ہاتھ آیا تھا' اسے فروخت کر کے ساری رقم غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔

بابر امرائے سلطنت کے اس مشورے پر برہم ہو گیا....."وہ پتھر کا ٹکڑا میری اور میرے بیٹے کی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی نہیں ہے' ہمایوں کے بعد اگر مجھے کچھ عزیز ہے تو وہ میری اپنی جان ہے۔ اس لئے میں پتھر کے بجائے اپنے بیٹے پر اپنی جان ہی کو صدقہ کئے دیتا ہوں۔ شاید اللہ میری اس نذر کو قبول فرما لے۔"

اس وقت بابر کی عمر پچاس سال تھی۔ اگر مغل شہنشاہ کوئی تھکا ماندہ بیمار بوڑھا ہوتا تو دیکھنے اور سننے والے یہ

جواز پیش کر سکتے تھے کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گیا تھا' اس لئے اپنی ناکارہ جان کو بیٹے کی جان پر قربان کر دینا چاہتا تھا...... مگر وہ خود کم و بیش جواں سالی کی منزل سے گزر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا' زندگی کا صدقہ تو وہ اپاہج بھی پیش نہیں کرتے جن پر ایک ایک سانس گراں ہوتی ہے اور وہ گلی کوچوں میں گھسٹ گھسٹ کر بھیک مانگتے ہیں' امرائے سلطنت یہی سمجھ رہے تھے کہ بابر صرف بیٹے کی محبت میں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ایک ایسا دعویٰ کر رہا ہے جس پر لوگوں کی اکثریت کو عمل کرتے نہیں دیکھا گیا...... مگر جب بابر نے غسل کر کے سفید لباس پہنا' دو رکعت نماز ادا کی اور پھر شہزادہ ہمایوں کے بستر علالت کے قریب آیا تو امیروں' مصاحبوں' دوستوں' عزیزوں اور خدمت گاروں کی سانسیں رک گئیں۔

بابر نے تین بار ہمایوں کے گرد چکر لگائے اور با آواز بلند کہا۔

''برداشتم...... برداشتم...... برداشتم (میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی)

اسی دن سے ہمایوں کی صحت کے آثار پیدا ہو گئے اور بابر مضمحل نظر آنے لگا۔

ایک ماہ بعد ہمایوں نے غسل صحت کیا۔ اس خوشی میں ایک یادگار جشن منایا گیا۔ شہنشاہ امرائے سلطنت پر اپنی کمزوری ظاہر نہ کرنے کے لئے جبراً مسکرا رہا تھا' مگر اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اندر ہی اندر پگھلتا جا رہا تھا۔ ہمایوں صحت یاب ہو کر کالنجر چلا گیا اور بابر بستر پر دراز ہو گیا۔

شاہی طبیبوں نے بڑی جانفشانی سے علاج کیا' مگر بابر کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ امرائے سلطنت بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ بابر ان کے اداس چہروں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''یہ مرض الموت ہے۔ اس میں کوئی دوا کارگر نہیں ہو گی۔ میں اپنی جان تو پہلے ہمایوں کی جان پر قربان کر چکا۔ بس وقت معلوم کا انتظار ہے اور وہ آیا ہی چاہتا ہے......''

چارہ گر اپنی کوششوں میں مصروف رہے اور شہنشاہ کو جھوٹی تسلیاں دیتے رہے...... مگر بابر دعاؤں اور دواؤں سے بے نیاز سلطنت مغلیہ کے مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کرتا رہا۔ اس نے خفیہ طور پر اپنے برق رفتار قاصدوں کو کالنجر بھیجا۔ شاہی راز کے امانت داروں نے سرگوشی کے انداز میں ولی عہد سلطنت سے کچھ کہا۔ ہمایوں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر آگرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

دارالحکومت پہنچ کر جب شہزادے نے مغل فرمانروا کا یہ حال دیکھا تو باپ کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا...... ''ظل سبحانی! آپ نے مجھے اپنی بیماری سے بے خبر کیوں رکھا؟''

''جان پدر! یہ رونے کا وقت نہیں ہے' اپنی امانت سنبھالو اور باپ کو مردان شجاع کی طرح رخصت کرو۔''

اسی دن ہمایوں کی جانشینی کا اعلان کیا گیا...... اور اسی رات بابر نے احمد جمال کو خلوت میں طلب کر کے کہا...... ''مجھے امید ہے کہ تم عنقریب سمرقند روانہ ہو جاؤ گے۔''

احمد جمال رونے لگا...... ''شہنشاہ! میں نے آپ جیسا محبت کرنے والا کوئی انسان نہیں دیکھا۔ لوگ تو معمولی جاگیریں حاصل کرنے کے لئے ہوس کے مقتل میں اولاد کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں مگر آپ نے اپنا اقتدار' جاہ و جلال' غرور شاہی' یہاں تک کہ اپنی جان بھی بیٹے پر قربان کر دی۔''

''بس اب تم جاؤ احمد!'' بابر نے منہ پھیر لیا...... ''میں بھی جا رہا ہوں' تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ میری زیادتیوں کو معاف کر دینا اور جب تم سید مہدیؒ کے دربار میں حاضر ہو تو میرا سلام عرض کرنا اور مجھے ہمیشہ اپنی

دعاؤں میں یاد رکھنا کہ میرے گناہوں کا کوئی شمار نہیں۔''

احمد جمال نے بابر کے ہاتھ کو آخری بوسہ دیا اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ خلوت شاہی سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد بابر نے ہمایوں اور حرم شاہی کو طلب کیا۔ خواتین بلند آواز میں گریہ وزاری کر رہی تھیں۔ بابر آخری لمحے تک انہیں مردانہ وار تسلیاں دیتا رہا' مگر وہ کچھ دیر بعد پیش آنے والے حادثے کے تصور ہی سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔

یکایک بابر کی سانس اکھڑنے لگی۔ اس نے ہمایوں کو مخاطب کر کے بمشکل اپنی وصیت مکمل کی...... ''میرے جنازے کو کابل میں اس جگہ دفن کرنا جہاں حضور اکرمؐ کے قدم مبارک موجود ہیں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی بابر کی سانسوں کا شمار ختم ہو گیا۔ وہ ماہ رجب 936ء میں بیمار ہوا اور 5 جمادی الاول 937ھ کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بابر نے اڑتیس سال حکومت کی اور ایک مہم جو' شجاع' اعلیٰ ظرف اور منصف و عادل حکمران کی حیثیت سے تاریخ عالم کے اوراق میں کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ گیا۔

¤ ¤ ¤

کابل میں بابر کی تدفین کے وقت احمد جمال بہت زیادہ اداس اور دل شکستہ نظر آ رہا تھا۔ پینتیس سالہ رفاقت سے وابستہ ہزاروں یادیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ جلد از جلد ان یادوں سے اپنا دامن چھڑا کر سمرقند چلا جانا چاہتا تھا کہ یکایک اسے امیر الدین سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔

سوگ کی سرکاری رسم ادا ہوتے ہی احمد جمال کابل سے آگرہ آیا اور پھر اجودھیا پہنچ کر امیر الدین کی خانقاہ میں داخل ہوا۔ وہاں کی فضا بھی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جب احمد جمال نے امیر الدین سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ایک درویش نے اداس لہجے میں کہا۔

''اب وہ یہاں نہیں رہتے۔ کئی ماہ پہلے خانقاہ چھوڑ کر چلے گئے۔''

''کہاں چلے گئے؟'' احمد جمال نے چونک کر کہا...... ''مجھے ان سے ایک بہت ضروری کام تھا۔ میں اسی کام کے لئے کابل سے یہاں آیا ہوں۔''

''آیئے! میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتے۔'' اسی درویش نے جواب دیا۔

احمد جمال کے چہرے پر خوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ وہ امیر الدین کے چلے جانے کی خبر سن کر پریشان سا ہو گیا تھا۔

''آپ طویل سفر کے باعث تھک گئے ہوں گے۔ کچھ دیر آرام کر لیجئے۔'' دوسرے درویشوں نے رسم میزبانی ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ امیر الدین سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔''

''میری قسمت میں آرام کہاں؟ آپ براہ کرم مجھے امیر الدین کے پاس لے چلئے۔''

آخر ایک درویش احمد جمال کو اپنے ہمراہ لے کر خانقاہ سے نکلا۔

''امیر الدین کی صحت کیسی ہے؟'' احمد جمال نے درویش سے پوچھا۔ ''میں گزشتہ سال یہاں آیا تھا تو وہ

بہت کمزور نظر آ رہے تھے۔"

"کچھ دیر کی تو بات ہے۔ آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا کہ وہ کیسے ہیں؟" درویش کا لہجہ بہت شکستہ تھا' مگر احمد جمال نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

پھر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جب وہ درویش حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کی قبر کے نزدیک ٹھہر گیا تو احمد جمال نے چونک کر کہا...... "یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟"

"امیر الدین کے پاس۔" درویش انتہائی ضبط کے باوجود رو پڑا۔

احمد جمال نے گھبرا کر دیکھا۔ حضرت موسیٰ عاشقاںؒ کے مزار کے قریب ہی ایک کچی قبر تھی جہاں ایک غمزدہ عورت خاموش بیٹھی تھی۔

"یہ امیر الدین کی آخری آرام گاہ ہے۔" شدت غم سے درویش کی آواز لرز رہی تھی۔

احمد جمال پر بہت دیر تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔

⌑ ⌑ ⌑

"شکنتلا کا جواں سال بیٹا بلرام سنگھ ایک موذی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس کے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔" درویش احمد جمال کو امیر الدین کی موت کے بارے میں بتا رہا تھا......

آخر مایوس ہو کر شکنتلا امیر الدین کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ تیری دعاؤں سے کئی لاعلاج مریض شفایاب ہوئے ہیں۔ اس لئے میرے بیٹے کو بھی نئی زندگی دے۔ امیر الدین نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ ایک گنہگار انسان ہیں اور ان کی دعاؤں میں کوئی تاثیر نہیں' مگر شکنتلا بیٹے کی محبت میں اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ اس کے آنسوؤں کے سیلاب اور جگر شگاف چیخوں نے خانقاہ کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔ "امرناتھ! میرے بیٹے کو زندگی دے ورنہ میں بھی تیرے دروازے کے پتھروں سے سر ٹکرا کر مر جاؤں گی۔"

آخر امیر الدین بھی بے قرار ہو کر چیخ اٹھے۔ "خاموش ہو جا شکنتلا کہ میں تیرے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

"میری ہر خوشی بلرام سنگھ کی زندگی سے وابستہ تھی امرناتھ!" شکنتلا کی ہذیانی چیخوں میں کچھ اور شدت آ گئی تھی...... "اگر بلرام سنگھ مر گیا تو پھر آنسوؤں کا بڑا خوفناک سیلاب آئے گا اور میں تیرے سامنے اسی سیلاب میں غرق ہو جاؤں گی۔"

"تو گھر جا شکنتلا!" یہ کہتے ہوئے امیر الدین بھی رونے لگے...... "میں اپنے خدا سے تیرے بیٹے کی زندگی کے سوا کچھ نہیں مانگوں گا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی شکنتلا کے آنسو رک گئے اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔

پھر امیر الدین نے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور خالق کائنات کے آگے دامن پھیلا دیا...... "بلرام سنگھ کی سانسیں تو پوری ہو چکیں' مگر تو قادر مطلق ہے۔ اسے میری زندگی دے دے۔ لوح محفوظ بھی تیری' قلم بھی تیرا' تحریر بھی تیری' حکم بھی تیرا' جسے چاہے برقرار رکھے اور جسے چاہے مٹا دے۔"

شکنتلا گھر پہنچی تو بلرام سنگھ صحت یاب ہو چکا تھا۔ لوگ بے یقینی کا شکار تھے کہ ایک مردے کو نئی زندگی کس

طرح مل سکتی ہے؟

شکنتلا پاگلوں کی طرح واپس لوٹ آئی اور یہ کہتی ہوئی خانقاہ میں داخل ہوئی۔ "امرناتھ! پرماتما نے تیری پرارتھنا سن لی۔ بلرام سنگھ کو نیا جیون مل گیا۔"

مگر امیر الدین یہ خوشخبری نہ سن سکے۔ شکنتلا کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کے لئے خود انہوں نے اپنے سفینہ حیات کو موج فنا کے حوالے کر دیا تھا۔

پھر شکنتلا نے اپنے گھر' اپنے سماج اور اپنے مذہب سے تمام رشتے توڑ ڈالے۔ وہ لوٹ کر واپس نہیں گئی۔ سردی ہو یا گرمی' دھوپ ہو یا برسات' وہ امیر الدین کی قبر کے نزدیک ہی پڑی رہتی ہے۔ اس کا بیٹا بلرام سنگھ بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ وہی اسے کھلا پلا دیتا ہے ورنہ وہ خود کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کرتی۔

"یہی ہے شکنتلا!" امیر الدین کے ساتھی درویش نے شکستہ حال اور غمزدہ عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور احمد جمال کو محسوس ہوا جیسے کائنات کی بسیط فضاؤں میں ایک ہی آواز گونج رہی ہو۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

(تمت بالخیر)